جلد 23 ❖ شمارہ 03 ❖ جنوری 2013ء

مدیرہ اعلیٰ: عذرا رسول

مصور: شاہد حسین

شعبہ اشتہارات

منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789

نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391

رانا محمد حمید 0323-2895528

نمائندہ لاہور فراز علی ہاشمی 0300-4214400

◈◈◈

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زرسالانہ 700 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقام اشاعت: C-63، فیز II ایکسٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ، کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone: 35804200 Fax: 35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

ٹی وی پر 18 سالہ مدیحہ کی لاش دیکھی۔ اس مدیحہ کی جو گھر والوں کو فاقوں سے بچانے کے لیے نکلی تھی۔ صرف 250 روپے کی خاطر گھر گھر جا کر بچّے پولیو کو معذوری سے بچانے کی سعی میں مصروف تھی۔ اس کا یہی "جرم" کہ وہ آیندہ نسل پر احسان کر رہی تھی اس کی موت کا باعث بن گیا۔ اسی جرم میں چون سالہ نسیم اختر، انچاس سالہ فہمیدہ، چالیس سالہ کنیز فاطمہ اور چودہ سالہ فرزانہ کو گولی ماردی گئی۔ واقعی ان کے ساتھ یہی ہونا چاہیے تھا کیونکہ وہ مستقبل کے معماروں کی صحت کے لیے گھروں سے نکلی تھیں اور یہ بات انہیں کیسے پسند آتی جو ملک کے محافظوں کو کمزور دیکھنا چاہتے ہیں۔ معیشت کی طرح عوام کو بھی معذور بنا دینا چاہتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ جہاں تعلیم گاہوں کو نذرِ آتش کیا جارہا ہو۔ چن چن کر اساتذہ کو گولی ماری جارہی ہو، ڈاکٹرز اور انجینئرز کو موت کی نیند سلایا جارہا ہو، تا کہ دیگر اہلِ دانش خوفزدہ ہو کر ملک چھوڑ جائیں، اور بہت بڑی تعداد ایسا کر چکی ہے یا ارادہ باندھے ہے۔ پی آئی اے، محکمہ ریل، محکمہ ڈاک تباہی کے قریب ہے، محکمہ بجلی و گیس بھی اسی قطار میں کھڑے ہونے کی تیاری میں ہے۔ پبلک سیکٹر کی طرح پرائیویٹ سیکٹرز کو گھیرے میں لایا جارہا ہے۔ کارخانوں میں آگ لگ رہی ہے، لوڈشیڈنگ سے مزدوروں کے گھر فاقے ہورہے ہیں۔ یہ سب کیا ہے؟ کیوں ہے؟ کسی کے پاس جواب ہے؟ نہیں ناں! کیونکہ واقعات، حادثات سے پہلے ہم اس کے سدِباب کی کوشش نہیں کرتے۔ جب حادثہ رونما ہو جاتا ہے تب شور مچاتے ہیں، پولیو مہم کے خلاف جب "مہم" شروع ہوئی تھی اس وقت ہم سب خاموش تھے۔ جولائی 2012ء میں جب اسحاق نور کو کلینک میں گھس کر گولی ماری گئی، ٹیم کے ارکان کو مہم سے باز رکھنے کے لیے دھمکایا جارہا تھا۔ اب جب مختلف جگہوں پر اتنے سارے الم ناک واقعات رونما ہوگئے تب تھوڑی دیر کے لیے ہمیں ہوش آیا مگر اس مہم کو سبوتاژ کرنے کی مہم ہنوز جاری ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ قسم کھالی گئی ہے کہ ہم ان ممالک کی فہرست میں پاکستان کو آنے نہیں دیں گے جو پولیو سے پاک ممالک ہیں۔ معیشت تو پولیو زدہ بن ہی گئی ہے، آنے والی نسلوں کو بھی معذور بنا کر چھوڑیں گے۔ بقول وحید اختر

دیوار و در شہر پہ ہیں خون کے دھبے
رنگوں کا حسیں قافلہ صحرا میں لٹا ہے

معراج رسول

# موجد

سرگزشت

دنیا کے بڑے آدمیوں کی فہرست پہ نظر ڈالیں تو آپ کو ایسی بہت سی ہستیاں نظر آئیں گی جنہیں "تضادات" کا مجموعہ کہا جاسکتا ہے۔ آپ کو ان کی سرشت میں شیطانیت نظر آئے گی مگر ان کے اقوال سے "رحمانیت" ظاہر ہوگی۔ انہیں دو دھاری تلوار کہا جائے تو غلط نہ ہوگا جس کی ایک دھار میں زخم اور دوسری دھار میں مرہم ملے گا۔ جس شخص کا ذکر یہاں کیا جارہا ہے وہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ سویڈن میں پیدا ہونے والے اس شخص کے باپ کا نام تھا عمانیویل۔ یہ آدمی پیشے کے اعتبار سے ایک "پلائی ووڈ مینوفیکچر" تھا (Plywood Manufactorer) تھا۔

اس زمانے میں بارود کی صرف ایک ہی شکل محفوظ سمجھی جاتی تھی یعنی Gunpowder۔ اسے 1846ء میں ایک شخص سوبری رو (SOBRERO) نے ایجاد کیا تھا۔ یہ ایک رقیق تیل جیسا بارود تھا۔ جسے Nitro Glycrine کہا جاتا ہے۔ اس میں ایک بڑی خامی یہ تھی کہ کسی اشتباہ کے بغیر بھی پھٹ جاتا تھا۔

یہاں سے اس سبق میں وہ شخص داخل ہوتا ہے جس کا ذکر ہم اس وقت کر رہے ہیں۔ اس نے سب سے پہلے ایک Detouating Cap ایجاد کی جس میں اس نے Mercury Fulminat استعمال کیا تھا۔ اس CAP سے یہ فائدہ ہوا کہ نائٹروگلسرین جو بلا کسی اشارے کے پھٹ جاتی تھی، قابو میں آگئی۔ اسے اب آدمی اپنی مرضی سے دھماکا کرسکتا تھا۔ تب سے آج تک کنٹرول دھماکوں کے لیے اسی کی بنائی ہوئی CAP مستعمل ہے۔

مگر ابھی بھی اس کے پھٹنے کے خطرات پوری طرح درپیش ہوتے تھے سو اس شخص نے نائٹروگلسرین کو کاغذ، اینٹوں، گرد وغیرہ میں جذب کرنے کا تجربہ کیا۔ اس طرح یہ مادہ کہیں بھی بلا کسی خطرے کے لے جایا جاسکتا تھا۔ اسی تجربے کے دوران اس پر انکشاف ہوا کہ خشک SILICA کی ایک قسم میں یہ مادہ عمدگی سے جذب ہوجاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ دھماکا اس وقت ہوسکتا تھا جب CAP کا استعمال کیا جاتا۔ یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔ دنیا کو اس وقت پہلی بار Dynamite کا تحفہ ملا۔ اس نے ڈائنامائٹ 1866ء میں ایجاد کیا۔

پھر اس نے ڈائنامائٹ سے بھی زیادہ طاقت ور چیز ایجاد کی۔ نائٹروگلسرین اور گن کاٹن کے استعمال سے GELIGNITE ایجاد کی۔ یہ ڈائنامائٹ سے بھی آگے کی چیز تھی۔

اس سائنس دان نے اپنی ان ایجادات سے بے پناہ دولت کمائی۔ اب ذرا اس شخص کی اعلیٰ ظرفی دیکھیں۔ چونکہ سوبری رو وہ آدمی تھا جس نے گن پاؤڈر ایجاد کیا تھا۔ اور اسی کی ایجاد کو بنیاد بنا کر اس نے ڈائنامائٹ بنایا تھا اس نے سوبری رو کو بلایا اور اپنے ہاں تاحیات ملازمت دے دی۔

ہماری دنیا ہر سال دیے جانے والے ان انعامات سے اچھی طرح واقف ہے جو بہت سے شعبوں کے اعلیٰ اذہان کو دیے جاتے ہیں جنہیں NOBEL PRIZE کہا جاتا ہے۔ اس کی بنیاد اسی شخص نے رکھی تھی جس کا ذکر آپ پڑھ رہے ہیں۔ ان انعامات کا منبع وہی دولت ہے جو اس نے اپنی بربادکن ایجاد سے حاصل کی تھی۔ اس نے اسے دنیا کی تعمیر کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اس حیرت انگیز موجد کا نام ہے "الفریڈ برنارڈ نوبل"

# شہرِ خیال

✉ **اعجاز حسین سٹھار** کا خلوص نامہ نور پور تھل سے ''ہماری یہ پسندیدہ محفل کافی بارونق دکھائی دے رہی ہے۔ دوست اپنی معلومات کے تناظر میں دوسروں کو مستفید کررہے ہیں یہ اچھی روش ہے۔ مہوش رفیق صاحبہ، آپ کی تحریر خوبصورت اور پختہ ہے اور آپ کی خواہش ضرور پوری ہوگی اور کتنے حیرت کی بات ہے کہ میں بھی احمد یار خان، سابرہ تسکین، اجبوت، محبوب عالم اور ملک صفدر حیات کا زبردست فین ہوں۔ ''تعبیرِ خواب'' میں شاہد خان کی ہمت، قوتِ فیصلہ اور ذہانت کا ایک زمانہ معترف ہے تو ہماری رائے اور نیک جذبات تو بس خاک میں جائیں گے بہرحال ان کے خوابوں کی تعبیر اور ترقی کے لیے دعا کرسکتے ہیں اللہ ان کے ہر پیپرورک کو عملی تصویر بنائے، آمین! ''عکاسِ درد'' میں خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور کی زندگی سے متعلق چند معلومات ضرور ملی ہیں لیکن مضمون دلچسپ نہیں ہے۔ ''فلمی الف لیلہ'' کی یہ قسط ریکارڈ توڑ ہے۔ کئی ایسے اداکاروں اور ہنرمندوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کے نام اور ہنر سے ہم کم واقف تھے خاص طور پر سفیر اللہ صدیقی عرف لہری مرحوم، عمر شریف، ساقی اور وزیر محمد خان قابلِ ذکر ہیں۔ معین اختر کو تو ہم نے ٹی وی پر ہر رنگ میں دیکھا۔ درمیان میں خود آفاقی بھائی کی جو جھلک نظر آجاتی ہے وہ بھی دلچسپی اور مزے میں کم نہیں ہوتی۔ سچی بات ہے اس ماہ تو مطالعاتی لحاظ سے طبیعت سیر ہوگئی ہے اور خود کو ہشاش بشاش محسوس کررہے ہیں اور اس خوشی کے موقع پر زبان سے آفاقی بھائی کی صحت اور درازیٔ عمر کے لیے دعائیں نکل رہی ہیں۔ امید رکھتے ہیں وہ بھی جذبات ہمارے لیے رکھتے ہوں گے (ہم بھی آپ کے لیے دعاگو ہیں)۔ ''جان کا خطرہ'' میں دشمن کی ذہانت، ٹائمنگ اور منصوبہ بندی متاثر کن ہے۔ حکومتِ وقت کس طرح باغیوں سے مات کھاگئی اس غفلت اور بےپروائی پر حیرانی ہورہی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ دشمن کو کمزور اور بےخبر نہیں سمجھنا چاہیے، یہ وارننگ شروع سے سنتے آرہے ہیں، یہ تحریر اس کی زندہ مثال ہے۔ ''سراب'' میں کاشف زبیر پر میری اپیل کا ذرا اثر دکھائی نہیں دیا۔ موجودہ قسط اول تا آخر دھماکا خیز ہے بس دل قابو میں رہنا چاہیے لہو گرم رکھنے کا سارا سامان موجود ہے البتہ مانی سے مجھے دلی ہمدردی ہے اس نے ہم جیسا مزاج پایا ہے جو زیادہ ہنگامہ آرائی اور مار دھاڑ سے دور بھاگتا ہے۔ بھلا یہ اپنے بس میں کہاں ہوتا ہے لیکن افنان احمد جیسے چوہے بھی کبھی ہاتھ پیر پھیلا کر اپنے ہونے کا اظہار کردیتے ہیں۔ وہ کون ہے اور کیا مقاصد ہیں، زندگی ہے تو آنے والے ماہ تک ساری پُراسراریت سے پردہ اتر جائے گا۔ سچ بیانیوں کی ابتدا ہی ''خواب ہوگئے'' جیسی خوبصورت تحریر سے ہوئی ہے۔ اعجاز کا خاندان نسل در نسل سیلف میڈ رہا، جو بنایا اپنی محنت، لگن، ایمانداری اور اللہ کے بھروسے کا عمل دخل واضح رہا۔ یہ لت ان کی گھٹی میں شامل ہوگئی تھی لیکن جو بدنیت تھے، شارٹ کٹ لگا کر دولت ہتھیانے کے چکر میں رہے وہی کوڑی کوڑی کے محتاج ہوئے۔ یہ ڈھکی چھپی بات نہیں کہ احسان فیملی کی کار میں جاوید نے خرابی پیدا کردی اور وہ حادثے کا شکار ہوکر مرحوم ہوگئے لیکن اللہ نے نسل قائم رکھنا تھی کہ آخری لمحات میں اعجاز اتر گئے، سچ کہتے ہیں کہ مارنے والے سے بچانے والی ذات بڑی ہے۔ ''سبق آزما'' واقعی منفرد انداز کی کہانی ہے۔ مبشر کسی نفسیاتی عارضے میں مبتلا نہ تھے وہ سلجھاؤ کے راستے پر چل رہے تھے۔ شاید وہ کسی حد تک کامیاب رہے ہوں لیکن کوشش مثبت تھی پھر شاہین جیسی متوسط طبقے کی لڑکی کو زندگی کا ساتھی بنا کر مثال قائم کی ہے انہوں نے، قابلِ تقلید عمل کیا ہے جو ذہن اس ڈگر پر چلنے کا سوچیں گے راوی کے ایثار کا حق ادا ہوجائے گا۔ ''راستے کا پتھر'' میں سلطان کے احساسات سمجھنے کے لیے انتہائی غور و فکر کی ضرورت ہے۔ ''چشم تماشا'' میں دولت کے پیچھے سرپٹ دوڑنے والوں کا حال ہے۔ انسان کی بنیادی ضروریات ہی کتنی ہیں، ساری آسانیاں مل جائیں دو وقت کی روٹی سارے تکلفات کے ساتھ حاصل ہو پھر اتنی خواری، مغز ماری اور یہاں تک کہ خود کو خطروں میں جھونک دینا کہاں کی عقلمندی ہے جب سکون اور تحفظ ہی نہ ہو تو ڈھیروں ڈھیر دولت سے کیا لطف لیا جاسکتا ہے۔ ''جعلی عامل'' میں بھلا حیران ہونے کی کیا بات ہے، یہ سب اب بھی ہمارے خاص طور پر پسماندہ علاقوں میں ہورہا ہے۔ ایک وجہ غربت اور غربت کا ماحول ہے۔ یہ لوگ روز بہروپ بھر کر اپنی عیاری سے سادہ لوح عوام کو ہر طرح سے لوٹ رہے ہیں۔ ''کہانی قسمت کی'' میں ماڑہ نے انتقام لینے کے لیے صعوبتیں اٹھائیں جب اپنے مشن میں کامیابی حاصل کرلی تھی تو زندہ رہنا تھا اور اپنے حصے کی خوشیوں سے لطف لینا تھا۔ ''کالے میاں'' میں ایک زبردست پیغام ہے۔ ہم ظاہری چمک دمک پر مرمٹنے والے گناہ گار ہیں اس کی پاکیزگی تک نہ پہنچ سکیں گے۔ ''قصوروار'' میں شاہد تنہائی کی ملاقات میں بہک گئے تھے لیکن یہ نقطہ نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ تسنیم اپنی طرف راغب کرنے کے لیے اسے اس انتہا تک لائی تھی۔ وہ اپنی طرف سے مرد کی کمزوری ہاتھ میں رکھنا چاہتی تھی حالانکہ خود پامال ہورہی تھی۔ لڑکے تو ایسا شغل سمجھ کر کرتے ہیں یوں اسے شاہد بلیک میل بلکہ اس کی ازدواجی زندگی تباہ کرسکتا تھا۔ ''خواب، عذاب'' نہیں ہیں ہمارے رویے، خودغرضی اور من چاہے مقاصد ایسی بھیانک تصویریں تخلیق کرتے ہیں۔ جب دل میں چور ہو تو مات کھا کر بھی احتجاج نہیں کرسکتے اس میں استاد یا عام مرد میں کیا تفریق ہوسکتی ہے۔ وہ جس مقام و مرتبہ کا مالک ہو اور جس رنگ، نسل اور جسامت میں ہو، سانپ کی طرح فطرت ایک جیسی ہوتی ہے ہمیں اپنے اعتبار کو دوش دینا چاہیے۔ کئی ماہ سے میرے محترم بزرگ اور صاحبِ علم سید امتیاز حسین شاہ بخاری چکڑالوی حال مقیم چک 36 شمالی سرگودھا نظر نہیں آرہے۔ وہ اپنی صحت کی اطلاع کے ساتھ اس محفل میں اپنی حاضری کو یقینی بنائیں (ہم خود بھی ان کی کمی محسوس کررہے ہیں)''

✉ جدہ سعودی عرب سے **انصار حسین** لکھتے ہیں ''سرگزشت کا ہر شمارہ اپنی مثال آپ ہوتا ہے اس لیے میں ہر تین ماہ کا شمارہ یکجا کرکے جلد بندی کرالیتا ہوں۔ اس میں شامل آپ بیتیاں مجھے بہت پسند ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے میں ان کرداروں کے ساتھ ہوں۔''

✉ **فضل رؤف مروت** نے حزہ خیل لکی مروت سے لکھا ہے ''میں ماہنامہ سرگزشت ڈائجسٹ کا تین سال سے قاری ہوں۔ فلمی الف لیلہ ایسا سلسلہ ہے جس کی ہر قسط اپنی مثال آپ ہے۔ آپ کو یہ جان کر حیرانگی ہوگی کہ میں نے زندگی میں دس سے زائد فلمیں بھی نہیں دیکھی ہے۔ لیکن فلمی معلومات، اس کو کھوجنا، اداکاروں کی زندگی کے بارے میں معلومات حاصل کرنا اور فلمی واقعات کے بارے میں ورق گردانی میرا شوق اور مشغلہ ہے۔ الف لیلہ کی فلمی داستان ہر واقعہ پاکستانی فلمی صنعت کے عہد درخشاں کی عکاسی کرتا ہے۔ اس میں فلم کے ہر میدان ڈائریکشن، کہانی اور اداکاروں کے دل چسپ واقعات پر قلم اٹھایا، جس سے ہمیں کافی معلومات حاصل ہوئی۔ بس ایک شعبہ جس پر آپ نے اگر قلم روانی کی ہو، لیکن میری نظر سے نہیں گزرا ہے۔ وہ ہے ''تعلیم اور فلمی دنیا'' آج کل پاکستان کی فلمی زبوں حالی کی سب سے پہلی وجہ تعلیم کی کمی ہے۔ جب ان پڑھ کچھ سرمایہ لگا کر فلم بنانے لگے تو اس کی اپروچ آغا جی اے گل جیسی تو نہیں ہوسکتی۔ آپ ہماری فلمی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں، ہمارے اداکار، اداکارائیں، فلمساز اور ہدایت کار تعلیم کے زیور سے آراستہ تھے۔ ان میں سے چند جو میری معلومات میرا ساتھ دے رہی ہے وہ یہ ہے۔ خواجہ خورشید انور نے 1935ء میں پنجاب یونیورسٹی سے فلسفے میں ٹاپ کیا۔ اور 1939ء میں ICS میں پورے ہندوستان میں اول آئے۔ لیکن انگریز حکومت کے باغی کی وجہ سے کوئی ... عہدہ نہیں ملا۔ اسی طرح جب ان کا نام یونیورسٹی میں گولڈ میڈل دیتے وقت تقریب میں پکارا گیا تو وہ موجود نہیں تھے۔ اور کسی فلم کی موسیقی دے رہے تھے۔ تو مہمان خصوصی انگریز افسر نے کہا کہ ''واقعی یہ صحیح فلسفی ہے۔'' پاکستان کے لیجنڈ اداکار سنتوش کمار نے 1939ء میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن سے بی اے آنرز کیا تھا۔ لیجنڈ اداکار حبیب نے ٹرپل ماسٹر فارسی، تاریخ اور انگریزی میں کیے تھے۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ اس نے یہ سب ڈگریاں فلمی صنعت میں بطور اداکار کام کرتے ہوئے حاصل کی تھیں۔ حبیب ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اور جب اس کو ماہوار 500 روپے بطور اداکار ملنے لگے تو اس نے اپنی پڑھائی مکمل کی۔ وحید مراد نے کراچی یونیورسٹی سے ایم اے انگلش کیا تھا۔ اور اس کا شمار اپنے یونیورسٹی کے قابل اسٹوڈنٹس میں ہوتا تھا۔ اداکار ندیم نے گریجویشن کیا ہے۔ مصطفیٰ قریشی نے ایم اے اسلامک اسٹڈی کیا ہے۔ اداکار سید کمال بھی گریجویٹ تھے۔ غلام محی الدین نے بھی کراچی سے گریجویشن کی ہے۔ اداکار ننھا فلم میں آنے سے پہلے بینک میں جاب کرتے تھے۔ لیجنڈ اداکار آغا طالش نے برطانوی فوج میں دوسری جنگ عظیم میں خدمات انجام دی۔ ہدایت کار ریاض شاہد ایک تعلیم یافتہ صحافی تھے۔ موسیقار فیروز نظامی موسیقی کے بارے میں ایک انگریزی روزنامہ میں کالم لکھتے تھے۔ جن سے ان کی تعلیمی صلاحیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اداکارہ بہار بیگم نے اولیول کیا ہے۔ اداکار محمد علی اگرچہ میٹرک تک پڑھے تھے۔ لیکن ان کا مطالعہ ان کی شخصیت کی طرح ان کو دوسروں سے ممتاز کرتا ہے۔ اسی طرح اگر آج سید نور ملک کے صف اول کے ہدایت کار ہیں تو وہ اپنی تعلیم کی وجہ سے کیونکہ اس نے ایم اے جرنلزم کیا ہے۔ اور فلمی دنیا میں آنے سے پہلے ''کوہستان'' اخبار سے وابستہ تھے۔ اداکار ساقی بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ بلکہ ان کو 6 زبانوں اردو، سندھی، بلوچی، پشتو، انگریزی، سرائیکی پر عبور حاصل تھا۔ موجودہ اداکاروں میں اداکار شان نے ایچی سن کالج، سعود نے امریکا سے تعلیم حاصل کی۔ بابر علی نے بی کام کیا۔ احسن خان ایم اے انگلش کیا ہے۔ جبکہ اداکار سمیع خان نے سول انجینئرنگ کیا ہے۔ ارباز خان نے فائن آرٹس میں ماسٹر کیا ہے۔ اداکار ایاز نے بھی ماسٹر کیا تھا اور ایک بڑے ہوٹل میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ اظہار قاضی نے ایم اے اکنامکس کیا تھا۔ اور پاکستان اسٹیل مل میں منیجر تھے۔ توقیر ناصر نے جرنلزم میں ماسٹر کیا ہے۔ فرحان علی آغا نے CA کیا ہے۔ ہندوستان کی فلمی دنیا ہمیشہ سے تعلیم یافتہ اداکاروں سے خدمات لیتی رہی۔ جس کی بڑی مثال شاہ رخ خان ہے جس نے دہلی یونیورسٹی سے ایم اے جرنلزم "Sowrd of Honour" کیا ہے۔ اداکار امیتابھ بچن گریجویٹ ہیں اور لکھائی دونوں ہاتھوں سے کرتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ میری ناقص معلومات کے ساتھ اپنی معلومات کو شامل کرکے قارئین کی معلومات میں اضافہ کریں گے۔ حال ہی میں مسٹر پرفیکٹ عامر خان نے حج کیا۔ ہوسکے تو اپنی داستان میں فلمی دنیا میں موجود اور لوگوں کی دین کے ساتھ وابستگی کے بارے میں تحریر کریں۔''

✉ **ڈاکٹر آر ایم ای** نے ریاض سعودی عرب سے لکھا ہے ''مبنی حقائق پر مبنی تحریر ''روٹی والا'' بےحد متاثر کن تھی۔ پروفیسر فرحت خان سے پوچھنا ہے کہ آپ کا دینی اخلاص، سماجی و اخلاقی شعور آپ کی تحریر کی عکس بندی کا محرک ثابت ہوا۔ جزاک اللہ خیراً۔ اللہ مزید توفیق عطا

فرمائے۔ آمین! لیکن کیا اس داستانِ حقیقی کا اختتام دائرۂ بیان پر ہی محیط و موقوف ہوگیا یا اس میں مزید پیش رفت ہوئی اور اگر ہوئی تو اس کی نوعیت کیا اور کیسی تھی؟ کیا اس کا ماخذ یہی سمجھ لیا جائے کہ Performer کی پرفارمنس کا مطلوب ہدف پر کامرانی کے ساتھ اختتام پذیر ہوگیا۔ اور ادائیگی حسن کمال پر داد و تحسین سمیٹ کر دائرۂ حیات کی بھول بھلیوں میں پھر ہمہ تن گمن ہوگیا اور مجمع تحسین و عظمت کی داد دے کر اپنی راہ منزل ہولیا۔ کیا آپ نے اپنی صلاحیت اور علمی بصیرت کی استعداد برائے معقول اور مطلوب عملی گائیڈ لائنز سے نوازا جو خصوص و عام فوائد کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ محترم یہ حقیقت اور مصدقہ فیصلہ ہے کہ عالم وہی جس کے علم سے دوسروں کو نفع یا فائدہ ہو۔ اسلام نے اسی مناسبت سے رہبانیت کی سختی سے مخالفت کی کہ خالقِ مطلق کے تقاضہ حیات کے اصول اور مقاصد کی نفی ہوتی ہے خود نمائی اور خود فریبی کے سحر میں مبتلا ہوکر گوشہ نشینی کا اختیار کسی صورت جائز نہیں۔ حیات صالحہ کا بنیادی مقصد زندہ نفوس کے ساتھ جی جان اور عملی اشتراک حسنِ عمل کی ہم آہنگی سے مربوط ہوتا ہے۔ ہم جد و جہد کے تسلسل سے عبارت ہوتا ہے۔ خوشی و غم کی کیفیات کا دل و جان سے ادراک و احساس ہوتا ہے اور حسن عمل و کارکردگی سے مستحسن جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ ورنہ کچھ کم نہ تھے کروبیاں، حضرت علیؓ سے پوچھا گیا کہ معیاری اساس کے لحاظ سے لوگ ایک دوسرے سے کس فضیلت سے مختلف ہوتے ہیں۔ جواب میں فرمایا۔ ''احساسِ مسئولیہ (ذمہ داری)'' آپ کے حلقہ یاران اور علمی انجمن میں علم دوست۔ بجان بقراط، علم کے مشعل بردار عبقری ہوں گے اگر مناسب سمجھیں ان سے بھی استفسار فرمائیں۔ لیکن احساس مسئولیہ کی یاد دہانی اور اس کی اہمیت کو اجاگر کرنا ہوگا۔ آپ ایام تدریس کی کچھ جھلکیوں کو ملاحظہ کرلیں۔ آپ کے مشاہدہ علم کے مطابق کیا ٹیچنگ اسٹاف کا رویہ اور طریقہ کار یکساں تھا؟ کچھ تو ٹائم پاسنگ مس ہے دائی ہوں گے۔ کچھ غیر نصابی سرگرمیوں میں مصروف ہوں گے۔ جبکہ کچھ اپنی ذمہ داری اور اصول پرستی کے مطابق پوری محنت اور لگن سے اپنے فرائض کی ادائیگی میں مگن ہوں گے۔ ان کا دائرہ کار پیسے زیادہ بنانا اور اس کا حصول ہوگا وغیرہ۔ کم و بیش دیگر ادارے بھی اسی نہج پر رواں دواں ہیں۔ گویا ذمہ داری کے ادراک یا مفہوم سے تو اکثر واقف ہوں گے لیکن احساس مسئولیہ کی ادائیگی یا تکمیل اخلاص عمل پر منحصر ہوتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ نے ادنیٰ سے ادنیٰ اچھا اور برائی کے جزا کی بشارت دی۔ برسبیل تذکرہ ایک معمولی سے واقعے کو آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔ سعودی عرب میں رمضان المبارک میں دیگر اہتمامات کے علاوہ تراویح کے لیے عام مساجد میں مخیر حضرات نمازیوں کی ضرورت اور سہولت کے پیش نظر پانی کی بوتل فراہمی کو یقینی بناتے ہیں۔ نماز تراویح سے قبل میں جب کرسی پر معذور قسم کے عمر رسیدہ عرب شخص ... جانب پہنچا تو میں نے اس اندازے کے مطابق کہ اس کو اپنے مقابل بہ وقت ضرورت بوتل کو اٹھانے میں دشواری نہ ہو اس لیے ایک پانی کی بوتل اٹھا کر دی تو وہ شخص مسکرا رہا تھا۔ اس نے بوتل کو کرسی کی جانب رکھا اور مجھے ذرا رکنے کا اشارہ کیا۔ پھر اس نے کرسی کے دوسری جانب سے پانی کی موجود بوتل اٹھا کر سامنے رکھ دی۔ مجھے حیرت یوں تھی کہ اگر اس کے پاس پانی کی بوتل پہلے ہی موجود تھی تو مجھے منع کر دیتا تو اس کو اٹھ کر تکلیف نہ کرنا پڑتی۔ اس نے بھی میرے تاثرات کو پڑھ لیا۔ کہنے لگا تم نے جو بوتل دی وہ میری بوتل جیسی ہی تھی لیکن تمہاری بوتل میری بوتل سے زیادہ افضل ہے کیونکہ یہ ایک قسم کا ہدیہ ہے اور تمہارے احساس مسئولیہ کو واضح کرتا ہے یعنی احساس اور عمل اور انشاءاللہ تم کو ان دونوں کے لیے اجر ملے گا۔ اور میں نے اٹھ کر معمولی سی تکلیف برداشت کرکے پہلی بوتل کو واپس رکھ دیا تاکہ کوئی دوسرا اس سے مستفید ہو انشاءاللہ مجھے بھی اس احساس مسئولیہ کا اچھا اجر دے گا۔ وہ عام اور ہیچ عرب شخص تھا۔ اور میرے اندازے کے مطابق کوئی خاص زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھا۔ خلیل صاحب کا دینی شعور اور حسن اخلاق متاثر کن اور قابل ستائش ہے لیکن حسنِ عمل میں نکھار اور وسعت کا کافی اسکوپ ہے۔ اس نے معمولی باتوں کو دین و دنیا کی معیاری اور اعلیٰ معیار سمجھ کر ترقی و بھلائی کی ساری مطلوب و عملی راہیں مسدود کرلی ہیں اور شخصی و عمومی فوائد اور بھلائی کو اپنی کوتاہ بینی سے یکسر فراموش کردیا۔ گویا ایسا ہو کہ ایک شخص پانی کا کنواں کھود کر اس کے پانی کی ترسیل اور سپلائی کا معقول انتظام کرنے کی بجائے اسے مینڈکوں کے حوالے کردے۔ نہ تو خود اس پانی سے مستفید ہو اور نہ ہی دوسرے۔ پروفیسر صاحب ہیرا انگوٹھی کے نگینہ کی صورت میں ہی خود کو اور دوسروں کو تو عمدہ لگتا ہے۔ اس کی صحیح قدر و قیمت نگینہ کی صورت ہوتی ہے۔ اس کو جیب یا تھیلی میں بند کردینا اس کی ناقدری ہوتی ہے۔ خلیل صاحب نے اپنی خوبیوں، بہترین کاروباری تجربہ اور اعلیٰ صلاحیتوں کو اللہ تعالیٰ کی بخشش و برکات کی نعمتوں کی بادی نظر میں ناقدری اور ناشکری کی ہے۔ ایسے چراغ کی مانند جس کو نہ جلا کر نہ خود اس کی روشنی سے مستفید ہو اور نہ دوسرے مستفید ہوسکیں۔ اسے اس کی اہمیت سے آگاہ کریں۔ اس پر واضح کردیں کہ گمنامی کے اندھیرے میں مٹی کا بجھا دیا نہ بنے بلکہ روشن چراغ بن کر اس کی روشنی سے خود بھی مستفید ہو اور دوسروں کے لیے بھی مشعل راہ بن جائے۔ اللہ کو انسان کا روشن ستارے والا روپ ہی پسند ہے۔ بے ثمر شجر بننے کی بجائے ثمر آور شجر بن جائے۔ معاشرے کا گمنام کھمبا نہ بنے بلکہ کارآمد اور مفید روشنی کا مینار بن جائے جو نہ صرف خود کے لیے باعث شان ہو بلکہ دوسروں کے لیے بھی فوائد اور امید و حمایت حق کا منبع ہو۔ یہی تقاضہ حیات ہے۔ یہی زندگی کا حسن ہے۔ یہی لطافت کا مظہر ہے۔ بادی نظر میں خلیل صاحب کے کوائف، حالات اور عوامل کا عملی حل مندرجہ ذیل نقاط میں مضمر لگتا ہے۔ حالات کی مصلحتوں کے مدنظر تراجم کی جاسکتی ہیں اور اس کا مطمع نظر معلنۃ نفوس و معاشرہ کی بھلائی مقصود ہو۔ تجارت کو پھر ذریعہ اور وسیلہ معاش بنائیں۔ حضرت عثمان عفانؓ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ اور امام ابو حنیفہؒ وغیرہ نے تجارت کو ذریعہ اور وسیلہ معاش بنایا اور کتنے نفوس ان کی محنت و لگن سے مستفید ہوئے۔ یہ سنت رسولؐ ہے اور نبی کریمؐ نے بھی اس معزز اور مفید پیشے کے لیے اپنی پسندیدگی کا اظہار فرمایا اور یوم محشر اللہ تعالیٰ کے دربار میں عادل حکمران اور ایمان دار تاجر کے لیے ایک ممتاز حیثیت کی بشارت دی۔''

ملتان سے امبرین زہرہ کا خلوص نامہ ''سرگزشت کی لکھاری اور ملتان شہر کی معروف قانون داں محترمہ قرۃ العین ایڈووکیٹ کی والدہ محترمہ انتقال فرماگئیں۔ تمام احباب سے سورۂ فاتحہ کی درخواست ہے۔''



سدرہ بانو ناگوری کراچی سے رقمطراز ہیں ''امید ہے کہ آپ اور آنٹی عذرا خیریت سے ہوں گے انکل میں آپ کی بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے میرے تمام خطوط کو ''شہرِ خیال'' میں جگہ دے کر میری حوصلہ افزائی کی۔ سال 2012ء کا آخری شمارہ 28 نومبر کو ملا اور اسی دن کراچی کے علاقے صدر میں ایک نوجوان اسٹیٹ لائف کی بلڈنگ سے گر کر جاں بحق ہوگیا۔ اتنی اذیت اور دردناک موت کہ تصور کرتے ہی رونگٹے کھڑے ہوجائیں۔ آنکھوں میں مستقبل کے سپنے سجانے والے اس نوجوان کی موت خون کے آنسو رلا گئی۔ خدا تعالیٰ اس کی مغفرت کرے اور اس کے گھر والوں کو صبر دے، آمین! انکل کے اداریے سے ابتداء کی ٹی وی اور فلم انڈسٹری سے ہمیں کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ہے تو کیا تبصرہ کریں ''شہرِ خیال'' کی محفل میں پہنچے تو تمام ساتھیوں کے بھرپور تبصرے پڑھے۔ اب آتے ہیں ''سراب'' کی طرف۔ اس ایک ماہ کی انتظار کی کیفیت کوئی ہم سے پوچھے مورخ کا بڑا نقصان ہوگیا ہے۔ سفیر اور سونا سے تعزیت۔ آفاقی انکل کے ماضی کی زنبیل سے نکلنے والی معلومات ہنوز جاری ہیں اس بار لہری جی کا تذکرہ تھا بہت خوب اچھا لگا۔ لہری صاحب کی شرارتیں اچھی لگیں خاص طور پر برانڈی میں برف! لہری کے جانے سے مزاح کا ایک باب بند ہوگیا یہ دور ہی ایسا ہے کہ ایسے ایسے لوگ اٹھ رہے ہیں کہ جن کا خلاء کبھی پورا نہ ہوگا شاید اب بونوں کا دور آرہا ہے اس لیے قد آور لوگ اٹھتے جارہے ہیں خدا خیر کرے۔ تنویر ریاض نے ہاجرہ مسرور کا عکس زندگی بڑی خوبصورتی اور تفصیل سے بیان کیا ہے اور سچ پوچھئے تو اس سے پہلے ہم ان کے کام سے ہی نہیں بلکہ ان کے نام سے بھی ناواقف تھے۔ تنویر ریاض سے گزارش ہے کہ ساحر لدھیانوی کے حالاتِ زندگی پر ایک تحریر سرگزشت کی زینت بنائیں (ساحر لدھیانوی پر بھرپور مضمون شائع ہوچکا ہے) پہلی سچ بیانی ''خواب ہوگئے'' لاجواب رہی، واقعی خواب سچے ہوں تو منزل خود بخود آسان ہوجاتی ہے ''سبق آزما'' مبشر فاروقی کی ایک سبق آزما تحریر ہے اب یہ نوجوان لڑکیوں پر منحصر ہے کہ وہ اس سے کتنا سبق حاصل کرتی ہیں۔ چشم تماشا اپنی تیزی اور روانی کی وجہ سے حقیقت کے قریب تر رہی انسپکٹر اور تجربہ نے ہمارے ہیرو کو خوب چکر دیے لیکن نوید خان نے آخرکار اپنا مقصد حاصل کر ہی لیا۔ دوستوں کی تباہی پر نوید خان کا افسوس کرنا اچھا لگا۔ ''خواب عذاب'' فوزیہ کو خدا نے بروقت بدنامی سے بچالیا اور اس کے ماں باپ کے اعتماد کی لاج رکھ لی۔ میری تمام لڑکیوں سے گزارش ہے کہ خدارا اپنی آنکھوں کو ایسے خواب نہ دکھائیں کہ جن کی تعبیر عذاب کی صورت آپ کو مشکلات سے دوچار کردے۔''

مدیحہ خان، ماریہ خان راولپنڈی سے لکھتی ہیں ''علامہ جمیل مظہری اور نیاز فتح پوری کی حالات زندگی لکھیں۔ بھائی انجم فاروق ساحلی، کرسی صدارت مبارک۔ آپ کا، اعجاز سخاں، ناصر حسین رند کے طویل تبصرے دوسروں کا حق مارتے ہیں، تبصرے اچھے ہیں مگر آپ کی جنرل نالج پر حیرت ہے۔ آمانا بادشاہ کا گدھ کی پیٹھ پر بیٹھ کر شجر تولید لانا۔ صرف حضرت سلیمان کے زمانہ میں ممکن تھا ورنہ چوہا سو من لوہا کھالے اور چیل بچے کو اٹھالے جائے۔ یہ سبق والے واقعات عام حقیقت نہیں، کچھوا اور خرگوش کا مقابلہ جلد باز لوگوں کو نصیحت ہے۔ ہم یونیورسٹی سے فراغت ایجوکیشن سے وابستہ اتنے جاہل نہیں ہیں۔ برادر شاہد کراچی، کبوتر ہمارے گھر سے مفت لے جاکر ڈاک کے لیے سدھالیں، موجودہ حکومت میں کوئی ٹرین وقت پر نہ ملے گی۔ نہ رسالہ جلد ملے گا۔ سسٹر درشہوار خانیوال تبصرہ اچھا تھا، اور کیا مصروفیت ہے؟ احمد خان تو حیدی ریٹائرمنٹ سے پہلے ہی بوڑھے ہوگئے۔ تفسیر عباس اوکاڑہ، تبصرہ اچھا۔ سیاسی لیڈروں کا بس چلے تو شاعر مشرق و قائد ملت کے نام و نشان بھی ہڑپ کرجائیں۔ ٹرین، جہاز سب تباہ ہوگئے ہر طرف آگ ہی آگ۔ سرے بینک محفوظ ہیں۔''

انجم فاروقی ساحلی لاہور سے لکھتے ہیں ''ایکسپریس اخبار میں آپ کے شائع شدہ انٹرویو کی تاریخ معلوم نہیں پھر بھی اس کی تلاش جاری ہے جیسے ہی ملا اس کا مطالعہ ہوگا۔ ایک دن انور شعور کا انٹرویو بھی اتفاقاً ہاتھ لگ گیا تھا وہ بھی ایکسپریس میں تھا۔ (گوگل میں میرا نام لکھ کر انٹر کریں، مجھ سے متعلق تمام صفحات سامنے آجائیں گے) میری کہانیاں جس طرح لکھی جاتی ہیں تقریباً اس طرح چھپ جاتی ہیں۔ اگر آپ بیتیوں پر کام کی ضرورت ہے تو براہ مہربانی جلد از جلد توجہ فرمادیجیے۔ منظر امام صاحب کی آپ بیتی بھی سرگزشت کی پہلی آپ بیتی سے بالکل منفرد ہوتی ہے۔ پڑھنے والے معمول سے ہٹ کر تحریر دیکھنا چاہتے ہیں۔ جیمز بانڈ کا خالق مضمون اچھا تھا۔''

طاہر الدین بیگ نے میرپور خاص سے لکھا ہے ''سرگزشت دسمبر اور شہرِ خیال مگر اس سے پہلے نئے آنے والے 2013ء کے لیے دعا۔ میرے رب ملک پاکستان اور خاص طور پر کراچی کے حالات پر اپنا کرم اور فضل کردے۔ بھیج دے کوئی محمد بن قاسم کوئی طارق بن زیاد کوئی صلاح الدین ایوبی جو اس ملک خداداد کی تقدیر بدل دے۔ کرپشن اور اقربا پروری کی لعنت کو جڑ سے اکھاڑ دے۔ کرم کردے میرے رب کرم کردے آمین۔ شہرِ خیال میں انجم صاحب نے کافی خوبصورت تبصرہ لکھا تبصرے تو سخار صاحب درشہوار، سدرہ ناگوری اور رند صاحب بھی خوب لکھ رہے ہیں۔ اردو ادب کے لیے اختر اردو بہت معلوماتی اور بہت ہی خوبصورت تحریر تھی ڈاکٹر صاحب اب آئندہ کیا کمال دکھاتے ہیں انتظار ہے۔ کہانیاں لاجواب اور زبردست تھیں پڑھ کر زبردست معلومات حاصل ہوئیں۔ عز... اور دلیر شاہد خان کی روئیداد پڑھ کر بہت لطف آیا بلاشبہ انسان ہمت کرے تو کیا کام ہے جو مشکل ہو۔ دوسری دلچسپ کہانی جس نے محو حیرت بھی کیا اور معلومات میں بیش بہا اضافہ بھی وہ ہے جادوئی خزانہ، زبردست تحریر تھی۔ جان کا خطرہ بھی خوب تر تھی شروع کیا تو ختم کرکے ہی چین آیا۔ اسٹرکلن کی کہانی 32 سیکنڈ اب کیا تعریف کروں یہ دو تین کہانیاں ایسی ہیں جنہیں بڑے ذوق اور شوق سے اپنے دوستوں کو سنایا جتنی بار پڑھی وہی لطف اور مزہ آیا جو پہلی دفعہ پڑھنے میں آیا تھا۔ میں داد دیتا ہوں سرگزشت والوں کو کہ کہاں کہاں سے ایسی دلچسپ اور اثر انگیز کہانیاں حاصل کرتے ہیں۔ اللہ سلامت رکھے۔ اب دیکھیے آپ کی معلومات میں اور اضافہ کے لیے جیمز بانڈ کے خالق کی تحریر ہاتھ لگی ڈاکٹر نو، گولڈ فنگر وغیرہ ہم نے بھی دیکھی ہیں، خاص طور پر ڈاکٹر نو کے ٹائٹل ابھی تک ہم کو یاد ہیں کیا خوبصورت

لیبر رنگ تھے مزہ آجاتا ہے پھر پڑھی عکاس ورد محترمہ ماجدہ مسرور کی کہانی 'تنویر ریاض کی زبانی' افسانہ نگار اور شعر کہنے والی آپا ماجدہ مسرور کی خوبصورت اور معلوماتی تحریر ہے۔ آفاقی صاحب نے فلمی الف لیلہ میں لہری، ساقی اور عمر شریف پر بڑے ہی دل چسپ انداز میں لکھا ہے کہ جنہیں فلموں سے یا فلمی اداکاروں سے زیادہ دلچسپی نہیں وہ بھی شوق سے پڑھتے ہیں۔ آفاقی صاحب کی دل چسپ تحریر' بہت ہی اچھا لکھا ہے۔ کیا آپ بتانا پسند کریں گے آفاقی صاحب کہ سنتوش مرحوم نے انتظار کی زبردست کامیابی کے بعد بننے والی فلم زہر عشق معاہدہ کرنے کے بعد کیوں چھوڑ دی اور مسرت نذیر کو جب باری ملک نے اپنی فلم میں نہیں لیا تو وہ انڈسٹری سے روٹھ کر گھر بیٹھ گئیں آخر کیوں؟ زور آور ابھی جاری ہے اس کے بعد میں اظہار خیال فرمائیں گے۔ سچ بیانی میں سب سے زبردست سبق آزما رہی۔ لڑکیوں کو سبق دینے کا جو طریقہ آزمایا بہت خوب تھا۔ راستے کا پتھر بھی اچھی تحریر تھی اور دل چسپ بھی۔ چشم تماشا ہمارے پولیس والے ہمارے تھانے اور ہمارے پولیس آفیسر اس تحریر کو پڑھ کر بہت سے لوگوں کے چہرے تاریک ہو گئے ہوں گے۔''

✉ محمد انور نے باڑی مردان سے لکھا ہے'' سرگزشت کی تعریف نہ کرنا بہت ہی ظلم اور ناروائی ہے۔ علی سفیان آفاقی صاحب ایک اچھے لکھاری ہیں اور معلومات کا خزانہ رکھتے ہیں لیکن انسان ہیں۔ ماہ اکتوبر (سال حال) میں فلمی الف لیلہ میں نذر مرحوم کے متعلق لکھتے ہیں کہ فلم سچی میں شیر گل کا کردار بہت ہی مقبول ہوا کیا مشرقی پاکستان اور کیا مغربی پاکستان مردان جیسے شہر میں جبکہ اس وقت (1957ء) مردان کی آبادی کتنی کم تھی، بھی بہت مشہور ہوا۔ آفاقی صاحب فلم کا نام غلط لکھ گئے ہیں یہ فلم آخری نشان تھی۔ سدھیر، مینا شوری، الیاس کشمیری اور علاؤالدین نمایاں اداکار تھے۔ اگر ممکن ہو تو آفاقی صاحب سے میرا اسلام کہہ دیں۔ اور فلم انڈسٹری کے دیگر اداکاروں مثلاً شیراز، انوپ کمار، امرناتھ، جینت، غلام محمد، ایم اسماعیل، رنجن (مدراس والے) سریش کرن دیوان، شانتارام، بابوراؤ، ناڈیہ والی، پران، ہیرالال، امر، رتن کمار وغیرہ کے متعلق ذکر ہو تو بہت مزہ ہوگا شہر خیال کا خیال آتا ہے لیکن میرا خیال یہ ہے کہ مجھے لکھنا آتا نہیں اول جلول لکھوں گا اور وہ قلم زد ہوگا۔''

✉ ایم عارف مغل کا اوسلو ناروے سے مکتوب'' امید ہے کہ آپ بفضل خدا خیریت سے ہوں گی۔ گزارش ہے کہ میں گزشتہ کئی برسوں سے سرگزشت کا قاری ہوں۔ میرے بچپن کا کچھ عرصہ کراچی میں گزرا ہے اب گزشتہ بیالیس برسوں سے ناروے میں مقیم ہوں آج کے کراچی کے حالات دیکھ کر سن کر دل خون کے آنسو روتا ہے اب کچھ ان دنوں کا موازنہ تذکرہ تحریر کر رہا ہوں برائے مہربانی اس تحریر کو سرگزشت میں جگہ دیں ممنون ہوں گا۔ (سرگزشت کے مزاج سے ہم آہنگ تحریر بھیجیں۔ اس تحریر سے صرف اقتباس نکال کر شاملِ اشاعت ہو سکتا ہے)''

✉ قدیر رانا راولپنڈی سے رقمطراز ہیں'' ایک ہزل روانہ کی ہے۔ آنے والی کسی بھی اشاعت میں شائع کرکے مشکور فرمائیں۔ سرگزشت سے وابستہ تمام دوستوں کو سلام (جلد شاملِ اشاعت ہو جائے گی)''

✉ ڈاکٹر محمود فیضانی کنگ عبدالعزیز اسپتال، مکہ مکرمہ سے رقمطراز ہیں'' بیت بازی میں جن قارئین نے بیت بازی کے حوالے سے اشعار لکھے ہیں ان کے جواب میں ان کے ناموں کے ساتھ جوابی اشعار لکھ دیے ہیں، شاید عام طور پر لوگ اپنی پسند کے شعر کا جواب لکھتے ہوں گے لیکن چونکہ مجھے بچپن سے بیت بازی کا تجربہ ہے اس لیے سب کے جواب لکھ دیے ہیں۔ میری مرتب کردہ کتاب'' کامیاب بیت بازی'' لاہور سے چھپی ہے۔ آج کل اس کا دوسرا ایڈیشن چل رہا ہے، اس طرح کی کوئی کتاب برصغیر پاک و ہند میں پہلے نہ تھی۔ اشعار کو چھ حصوں میں ترتیب دیا گیا ہے۔ ہر حرف کے وہ اشعار جن کے آخر میں بھی وہی حرف آتا ہے، بلند پایہ اشعار، چھوٹی بحر والے آسان اشعار، وہ اشعار جن کے آخر کے حرف کا شعر لانا دشوار ہو، ضرب المثل اشعار، طنزیہ و مزاحیہ اشعار، اس میں ڑ اور ژ کو بھی نمائندگی دی گئی ہے۔ سرگزشت کے علاوہ میں کوئی اور پرچہ نہیں خریدرہا۔ کچھ پرچے لائف ممبر کے طور پر آتے ہیں اور کچھ اعزازی طور پر۔ میں چاہتا ہوں کہ سرگزشت میں جن شخصیتوں کے مفصل حالات لکھے جاتے ہیں انہیں کتابی صورت میں بھی چھاپا جائے۔''

✉ ایم اے ملک گلبن وڈ، مری لینڈ یو ایس اے سے لکھتے ہیں'' میں سرگزشت کے پہلے شمارے سے ہی اس کا Dediceted قاری ہوں۔ میرے دل میں اس کی ترقی اور بہتری و یسی ہی ہے جیسی کہ آپ کے دل میں ہے۔ روزِ اول سے ہی یہ میگزین اس قدر پسند آیا کہ باوجود ہر مشکل کے اس کو ہر ماہ ہر طور سے حاصل کیا۔ اور اس کے مطالعے کو یوں حرزِ جان بنالیا کہ آج تک صفحۂ اول سے صفحۂ آخر تک اس میں چھپی ہوئی ہر سطر ہر مضمون کو بڑے غور سے پڑھتا ہوں بلکہ یقین کیجیے کہ اس میں شائع شدہ اشتہارات بھی پڑھ لیتا ہوں (آپ کی محبت اور خلوص قابلِ قدر ہے) میری گزشتہ یا حالیہ تنقید خدانخواستہ بلاوجہ نہیں اپنے احساسات اور دیانت داری رائے سے مطلع کیا۔ اور اب بھی کر رہا ہوں۔ یہ آپ کی بڑائی اور اعلیٰ ظرفی ہے کہ آپ نے میری تنقید کو سرگزشت کے قیمتی صفحات میں جگہ دی۔ مدیر عزیز محترم اگر آپ غور فرمائیں تو آپ محسوس فرمائیں گے کہ سرگزشت بری طرح یکسانیت کا شکار ہو گیا۔ (اگر آپ کچھ مضامین کی نشاندہی کردیتے تو ہمیں سہولت ہوتی۔ ہم مزید کوشش کریں گے کہ یہ تاثر قائم نہ ہونے پائے) الف لیلہ ... اول تا قسط نمبر 206 آج بھی اتنی دلچسپ اور تروتازہ ہے کہ پڑھتے وقت نہ کوفت ہوتی ہے نہ ہی اس پرچہ بہ سازی کا شک ہوتا ہے۔ کچھ قارئین اس قسم کے مضامین پسند کرتے ہیں ضرور کرتے ہوں گے۔ مگر سرگزشت کی تعدادِ اشاعت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ کوئی اہم اکثریت نہیں ہے۔ ویسے بھی کچھ قارئین تو محض خط چھپ جانے کی خوشی میں تنقید کرنا نہیں چاہتے ہوں گے۔ (ایسا نہیں ہے تنقید ہمارے لیے مشعلِ راہ کا کام کرتی ہے اور شائع بھی کی جاتی ہے۔ تاہم تمام خطوط کو مختصر ضرور کیا جاتا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ قارئین کے خطوط شامل ہو سکیں) ماہنامہ سرگزشت



پڑھنے والوں کو دعوت دیں تو انشاء اللہ کوئی وجہ نہیں ہے کہ یہ دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی نہ کرے (یوں تو سرگزشت کا در ہر ایک کے لیے کھلا ہے اور ہر ماہ ایک دو نئے لکھاری کی تحریر ضرور شامل ہوتی ہے لیکن ہم ترجیح دیتے ہیں پختہ قلم کار کو کیونکہ تحریر میں معلومات مکمل اور مستند بھی تو ہونا ضروری ہے پھر بھی ہم آپ سے درخواست کریں گے کہ اگر کوئی مضمون یا کوئی خاص موضوع پر تحقیق پڑھنا چاہیں تو ہمیں ضرور آگاہ کریں ہمیں خوشی ہوگی) میں محترم تفسیر عباس بابر کا بے حد مشکور ہوں کہ انہوں نے آپ کی توجہ میری تنقید کی طرف مبذول کروائی۔ اب میں آتا ہوں دسمبر 2012ء کے شمارے کی طرف، ڈاکٹر ساجد امجد کا مضمون '' اختر اردو'' میں صرف نام، مقام اور ایک آدھ اضافے یا کمی کے بعد ان کے گزشتہ شماروں میں شائع شدہ مضامین کا چربہ تھا (آپ کی رائے ڈاکٹر صاحب تک پہنچا دی ہے لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ الگ الگ شخصیات کے واقعات آپ کو مشترک کیسے نظر آئے۔ یہ تمام مضامین ریسرچ ورک ہیں۔ انہیں بطور حوالہ استعمال کیا جاتا ہے کسی بھی شخص کے حالاتِ زندگی میں کوئی واقعہ اپنی طرف سے کیسے کوئی شامل کر سکتا ہے کیونکہ واقعات معروف لوگوں کے ہوتے ہیں اور ان کے چاہنے والے ایسی باتیں کبھی برداشت نہیں کریں گے) تعبیر خواب، ایک دلچسپ اور خوبصورت تحریر تھی جو شاید اور لوگوں کے لیے مشعلِ راہ بن سکے۔ میں خود بھی شاہد خان صاحب کے بارے میں کئی واقعات کا واقف ہوں۔ ماجدہ مسرور کے بارے میں تحریر خوب تھی جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں کہ فلمی الف لیلہ کی 206 قسط سے آج بھی اتنا ہی لطف اندوز ہوں کہ جتنا پہلی قسط کو پڑھ کر۔ آفاقی صاحب اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و سلامتی عطا فرمائے۔ اور اللہ آپ کے قلم کو یوں ہی رواں دواں رکھے۔ 32 سیکنڈ بھی ایک منفرد اور دلچسپ مضمون تھا۔ زور آور کے بارے میں گزارش ہے کہ یہ داستان میں کسی اور جگہ بھی پڑھ چکا ہوں۔ لگتا ہے کہ اس میں نام، مقام اور چند واقعات تبدیل کر دیے گئے ہیں ورنہ ہو بہو وہی تحریر ہے جو میں چند سال پہلے پڑھ چکا ہوں۔ (اگر ممکن ہے تو فوٹو اسٹیٹ یا شمارے کا نام بھجوا دیں ویسے یہ بتا دوں کہ خیر بخش وحشی بخش سندھ کے معروف پہلوان ہیں۔ ان پر جہاں بھی مضمون شائع ہوا ہوگا انہی کی زندگی کے واقعات سے سجا ہوا ہوگا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی نے بھی انہی واقعات کو جمع کرکے کہانی کی شکل دی ہوگی) جادوئی خزانہ ایک بے حد بور اور بے معنی تحریر تھی۔ '' جان کا خطرہ'' سے ملتی جلتی کہانی بھی کہیں اور پڑھ چکا ہوں (یہ واقعہ ریڈرز ڈائجسٹ کے علاوہ بھی کئی مشہور جریدے میں آچکا ہے کیونکہ ایک ملک کے صدر کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا ہو کیا خبروں میں نہیں آیا ہوگا) اب آتے ہیں سچ بیانیوں کی طرف۔ مدیر محترم ان کے بارے میں ... محتاط اور حقیقی رائے یہ ہے کہ جب تک ان سچ بیانیوں میں چند فلمی موڑ نہ آجائیں یہ سچ بیانیاں کہانیاں نہیں بن سکتیں۔ اور ایسے ایسے فلمی موڑ کہ ان کی صداقت میں شبہ ہونے لگتا ہے۔ خدارا یا تو ان سے سچ بیانیوں کا لیبل اتار دیں یا پھر ان کے بارے میں گہرے غور و فکر کرنے کے بعد شاملِ اشاعت کریں۔ (سچ بیانیاں ہمیں ڈاک سے موصول ہوتی ہیں جنہیں مختلف رائٹرز سے لکھوایا جاتا ہے ممکن ہے اس وجہ سے آپ کو ایسا لگا ہو لیکن کہانیاں حقیقی ہوتی ہیں) اللہ تعالیٰ آپ کو آپ کے عملے اور رسائل کو دن دوگنی رات چوگنی ترقی اور صحت عطا فرمائے۔''

✉ رانا محمد شاہد کا خلوص نامہ بورے والا سے'' دسمبر کا شمارہ ایک اداس دوشیزہ کے ساتھ ملا۔ سرورق کے کونے پر آج کی ایک بڑی ادیبہ ماجدہ مسرور کی تصویر تھی، وہ حقیقتاً اردو ادب کا سرمایہ تھیں۔ اسی طرح اردو کے ایک اور بڑے ادیب اختر حسین رائے پوری کے بارے میں ڈاکٹر ساجد صاحب نے ان کی شخصیت کے بارے میں مفید معلومات فراہم کیں۔ اداریے میں معراج صاحب نے ایک نہایت باریک نقطے پر قلم اٹھایا۔ اپنے ملک کا نقصان کرنے والے، اس کی صنعتوں و معیشت کو نقصان پہنچانے والے لوگ بھی ہمارے درمیان ہی موجود ہیں جو اپنے ذاتی مفادات کے لیے ملک کی غیرت اور معیشت کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ ان خود غرض اور بے حس لوگوں کی وجہ سے ہی آج ہمارا ملک کرپشن اور دہشت گردی کا شکار ہے۔ آپ یہ پڑھ کر یقیناً حیران ہوں گے۔ ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل کی حالیہ رپورٹ کے مطابق پاکستان دنیا کے 179 ممالک میں سے کرپشن کے لحاظ سے 33 ویں نمبر پر ہے۔ اور یہ پڑھ کر تو شاید آپ کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں کہ پاکستان میں روزانہ 7 ارب روپے کی کرپشن ہو رہی ہے۔ آپ اور میں تو شاید یہ بھی نہ جانتے ہوں کہ ارب کے ساتھ کتنے صفر لگتے ہیں۔ بے شرم حکمرانوں نے ملک کو معاشی پسماندگی میں دھکیل دیا ہے۔ رانا فیصل نے صحیح لکھا کہ کشمیر کے ساتھ ہماری ناقص پالیسیوں کا نتیجہ ہے کہ آج کشمیری اپنے دل میں ہمارے لئے کوئی نرم گوشہ نہیں رکھتے۔ ڈراموں کے حوالے سے بھی ان کی بات ٹھیک ہے۔ دھوپ کنارے، تنہائیاں، ان کہی، اندھیرا اجالا اور راہیں جیسے ڈرامے آج بھی لوگوں کو یاد ہیں۔ طاہر الدین بیگ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ آپ حکمرانوں کو کہہ کے دیکھ لیں کہ کرپشن چھوڑ دو، سرکاری اداروں پی آئی اے، ریلوے کو تباہ نہ کرو، عوام کو بنیادی سہولیات سے محروم نہ کرو۔ مہنگائی نہ کرو، ان کا ایک ہی جواب ہوگا، ایسی باتیں نہ کریں جمہوریت کو خطرہ ہے۔ جیسے ہم کرتے جائیں عوام قبول کرتے جائیں، اس لئے کہ جمہوریت کو خطرہ ہے۔ افتخار روزانچ کی تاریخی شہر لاہور کے حوالے سے تجویز اچھی ہے۔ لیکن ایک خصوصی گوشہ ٹھیک رہے گا نہ کہ پورا شمارہ ہی ہو۔ پاکستان کے تمام تاریخی شہروں پر ایک نمبر نکالا جائے تو الگ بات ہے۔ '' تعبیر خواب'' ایک ایسے پاکستانی نژاد امریکی کی روداد زندگی ہے جس نے اپنی محنت اور ہمت سے وہ مقام حاصل کر لیا جو بہت کم لوگوں کو ملتا ہے۔ شاہد خان کی کہانی نا امید اور مایوس لوگوں کے لیے پیغام ہے کہ ہمت و کوشش انسان کو دوسرے انسانوں کے لئے ایک مثال بنا دیتی ہے۔ شکیل ادریس نے ہالی ووڈ کے معروف کردار جیمز بانڈ کے خالق آئن فلیمنگ کے بارے میں بہت زبردست لکھا۔ آئن فلیمنگ اپنے تخلیق کردہ کردار کی بدولت لوگوں کے دلوں میں زندہ رہے گا۔ اختر شہاب کی تحریر مختصر مگر دلچسپی سے بھرپور تھی۔ عفان آزاد نے جادوئی خزانہ میں تاریخ کے حوالے سے اہم معلومات فراہم کیں، معلومات اور دلچسپی دونوں موجود

> ✉ ش فرحت خان کی ارسال کردہ تحریر'' رتی والے'' کے مرکزی کردار خلیل صاحب کی سعودی عرب کے ہمارے ایک قاری مدد کرنا چاہتے ہیں لیکن ان کا پتا ہمارے پاس نہیں ہے۔ اگر کسی صاحب کے علم میں ہو تو ہمیں فی الفور روانہ کردیں۔ پروفیسر صاحب خود پڑھیں تو دفتر کے فون نمبر پر رابطہ کریں۔

تھیں۔ ایس امتیاز احمد، اعجاز جوزی اور مبشر فاروقی کی تحریریں بھی اچھی تھیں۔"

✉ زہرہ گلزار کی آمد پشاور سے "انکل نے ٹھیک کہا کہ آج کل ہر طرف ملالہ ہی ملالہ ہے۔ اے میرے پاکستان کے بے حس، پتھر دل اور بے وقوف عوام کب تک سائے کے پیچھے بھاگو گے۔ ملالہ کوئی آسمان سے اتری ہوئی ہے کہ اس کو ایشو بنا دیا۔ یہ بھی سپر پاور کا ایک ڈھکوسلا ہے۔ یہ سیدھے سادے اور جذباتی عوام کے ہاتھوں اپنے ہی ملک کو ایک مہینے میں کتنا نقصان پہنچایا۔ سچ کہتے ہیں کہ "اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے" پاکستانیوں کو بس ایک تماشا چاہیے۔ پتا نہیں اس ملک کے عوام کو کب عقل آئے گی۔ ہم لوگ اپنی اپنی ذمہ داریوں کو اپنے حقوق و فرائض کو کب سمجھیں گے۔ ایسا کون سا مسئلہ ہے، جس کا حل قرآن و حدیث میں نہیں۔ ہمارے بزرگ جن کے طفیل گھروں میں خیر و برکت کی بارش ہوتی تھی لیکن نہ اب وہ ادب و آداب ہے نہ احترام۔ پہلے کوئی والدین کے سامنے اونچی آواز میں بات نہیں کر سکتے تھے لیکن آج کل تو میڈیا نے جیسے بچوں کو وقت سے پہلے جوان کر دیا ہے اور موبائل کی بات ہی مت کرنا، ماں باپ کے سامنے موبائل پر کہیں گے ڈارلنگ آئی لو یو۔ سعید احمد چاند صاحب اداریہ حکمرانوں کو کتنا بھی جھنجوڑ ڈالے ان کے کان پر جوں تک نہیں رینگ سکتی۔ لیکن ہم عوام ان سے کم نہیں ہیں ظلم سہنے میں۔ اور عوام خود کون سے ٹھیک ہیں؟ عید سے ایک دن پہلے گیس اور پیٹرول کی قیمت کم ہوگئی اور فیصلہ دیا کہ کرایہ 25 فیصد سے 30 فیصد کم کرو لیکن کیا اب تک رکشا والوں نے بس اور ٹیکسی والوں نے کرایہ کم کیا ہے بالکل نہیں۔ اور اب سی این جی والوں نے سی این جی بند کر دی ہے۔ نہ یہ حکمران سدھرنے والے ہیں اور نہ عوام نے سدھرنا ہے۔ سعید احمد چاند صاحب آپ کو میرا تبصرہ اچھا نہیں لگتا جو میرا ذکر ہی نہیں کیا۔ جاوید سرکانی صاحب اچھے دوست اور اچھے تبصرے سے جدائی برداشت نہیں ہوتی۔ میں نے اکتوبر کا ماہنامہ دوبارہ نکالا میں نے دیکھا میں نے صحیح لفظ مصالحہ لکھا ہے۔ شکریہ بشریٰ افضل کہ آپ نے میرے تبصرے کو پسند کیا۔ یہ آپ سے کس نے کہا کہ تفسیر عباس نے پانچ شادیاں کی ہیں۔ پانچ شادیوں کا میں نے عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کا کہا ہے۔ کم بخت سکون شادیوں میں ڈھونڈ رہا ہے۔ بشریٰ جی میں بالکل آپ سے دوستی کروں گی۔ رانا حبیب الرحمٰن صاحب ہم بے وفا ہرگز نہیں لیکن ہمیں تینوں ڈائجسٹ دیر سے ملتے ہیں۔ لگتا ہے میرا تبصرہ آپ کو پسند نہیں آیا۔ رانا محمد شاہد صاحب آپ سچ کہتے ہیں کہ ناکام مرد کے پیچھے بھی عورتیں ہوتی ہیں تو یہ کم بخت صرف ایک بیوی کے ساتھ کیوں وفا نہیں کر سکتے۔ شکر کرو کہ میں ان حالات میں بھی آپ مردوں کو انسان سمجھتی ہوں۔ آپ مرد حضرات تو بیوی کو انسان نہیں سمجھتے۔ میں نے 10 سال عدالت میں ایک مرد کا مقابلہ کیا ہے اور ایسے ایسے واقعات دیکھے کہ مردوں کی وجہ سے مجھے خدا سے گلہ کرنا پڑا کہ آپ صرف مردوں کے خدا ہیں۔ عورت کو سبز باغ دکھاتے ہو اس کی تعریف میں زمین آسمان ایک کر دیتے ہو لیکن جیسے ہی وہ بیوی بن جائے تو چاند میں گرہن آ جاتا ہے۔ پھر شداد اور فرعون سے بھی ظالم ہو جاتے ہو۔"

✉ احمد خان توحیدی کا خط کراچی سے "برادر معراج رسول اپنے ضمیر پر مجبور رہے، چینل آپریٹرز اور سی این جی والے سب ایک تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ روزانہ کارخانوں میں آگ قدرت کی طرف سے سزا ہے ڈاکو جو حکمران ہیں۔ علامہ جمیل مظہری اور نیاز فتح پوری کے بھی حالات لکھیں۔ انجم فاروق ساحلی کو شہر خیال کی کرسی صدارت مبارک۔ اعجاز سخار، ناصر رند کے طویل تبصرے تھے، میرا تبصرہ شہر خیال تک محدود ہے پھر کہانیوں پر تبصرہ نہ کرنے کا شکوہ کیوں؟ شاہد احمد، اسلم فضل، ورشہوار، تفسیر اوکاڑہ، ظفر احمد، سدرہ ناگوری، طاہر الدین بیگ، رانا شاہد کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ فلمی الف لیلہ میں غوطہ زن ہو کر لہری مرحوم اور عمر شریف سے تقاریب میں چند نجی ملاقات کی۔ واقعی وہ ایسے حاضر جواب تھے جیسے پہلے ہونے والی باتوں کا علم ہو۔ بے حس معاشرہ ہے کہ تیری یاد آئی تیرے جانے کے بعد۔ 32 سیکنڈ [illegible] قد تو کم ہوگیا۔ طویل القامت عالم چنا مرحوم کا قد بھی باعث کر آپریشن کم ہو گیا تھا۔ اختر اردو، گڈ ڈاکٹر ساجد صاحب سسپنس میں بھی ایسی کہانی لایا کریں۔ تعبیر خواب، محنت میں عظمت، انتھ باندھ کر گیا ڈرتا ہے، پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے، عکاس ورد گڈ اسٹوری، ابن کبیر و تنویر ریاض ایسی ہی کہانیاں لایا کریں۔ جان کا خطرہ، ایس امتیاز، ڈاکٹر مجنو کی گاڑی ٹائر پنکچر تو آپریشن کرنے والا دشمن جان بوجھ کر قینچی مار کر قتل کر گیا۔ سچ بیانیاں، خواب تھیں۔

✉ زہرہ گوہر کی کورنگی کراچی سے آمد "کافی طویل عرصے کے بعد آپ کی محفل میں شامل ہو رہی ہوں۔ معراج رسول صاحب جس تندہی سے آج کل کے حالات کا جائزہ اور اُن کی ترجمانی کا فریضہ انجام دے رہے ہیں قابل تعریف ہے۔ لیکن افسوس صد افسوس کہ ہمارے نااہل اور بے حس حکمران ان تمام باتوں سے یکسر عاری و بے فکر ہیں۔ خیر یہ تو ایک طویل موضوع ہے، اب میں آتی ہوں ماہ نومبر کے پرچے کی طرف حسب روایت تمام کہانیاں ہی زبردست رہیں۔ سراب کی تو کیا بات ہے، شدت کے ساتھ اگلی قسط کا انتظار رہتا ہے۔ عفان آزاد کی پراسرار گلاب بھی اچھی تھی مگر یہ بات آخر تک صیغہ راز میں رہی کہ وہ مدفن تھا کس کا کوئی جن یا کوئی اور مخلوق؟ فرحت خان کی روی والا پڑھ کر ایمان تازہ ہوا، واقعی ہم لوگ احادیث و آیت کا احترام بھولتے جا رہے ہیں۔ ویسے میں بھی ایک ایسے کردار کو بخوبی جانتی ہوں جن میں معاشرتی لحاظ سے تو کافی خامیاں تھیں مگر فرمان الٰہی اور احادیث کے اوراق کے بارے میں ان کا نظریہ بہت سخت تھا وہ ہر جگہ یہاں تک کہ کچرے کے ڈھیر میں سے بھی اخبار اٹھا کر تراشے الگ کر کے اپنے پاس حفاظت سے رکھ لیتے تھے۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے، اللہ ان کی مغفرت کرے، آمین۔ ان کا کہنا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اسی کام کے لیے دنیا میں بھیجا ہے۔ ڈاکٹر ممتاز عمر کی لغزش پڑھی اور اندازہ ہوا کہ ایک ذرا سی غلطی انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب بہت خوب لکھتے ہیں مگر کم کم ہی نظر آتے ہیں۔ ان کو ہمارا پیغام ہے کہ زیادہ سے زیادہ اپنی تحریریں بھیجا کریں۔ اب اجازت چاہوں گی پھر ان شاء اللہ اپنی محفل میں شریک ہوں گی۔"

✉ ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری کا مکتوب بھکر سے "مصروفیت سے کہ جان نہیں چھوڑتی۔ ادھر قلم کا منہ اٹھایا اور ادھر کوئی نہ کوئی کام یاد آ گیا۔ طرح طرح کی مصروفیت نئی نئی شکل میں سامنے آ جاتی ہے ہر بار خط لکھنے کو تیار ہوتی ہوں لیکن...... اس بار ایک سچ بیانی لکھ لی ہے۔ بلند حج وں گی۔ قارئین کو بھی پسند آئے گی۔ اس بار انجم فاروق ساحلی مسند صدارت پر نظر آئے۔ تبصرہ بھی عمدہ تھا۔ ورشہوار آف خانیوال آپ کو اس محفل میں خوش آمدید۔ اعجاز حسین سخار کا تجزیہ بھی پسند آیا۔ تفسیر عباس، احمد خان توحیدی، رانا محمد شاہد اور طاہر الدین بیگ و ناصر رند کے تبصرے بھی قابل تعریف تھے۔"

✉ ایس امتیاز احمد نے کراچی سے لکھا ہے "امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ ماہ دسمبر 2012ء کا خوب صورت شمارہ ہمارے سامنے ہے۔ دلفریب ٹائٹل کے ساتھ تمام تر سلسلے خوب رہے۔ اسٹوریز کا انتخاب لاجواب رہا۔ کافی عرصے بعد ہماری اسٹوری لگانے کا شکریہ۔ Next issue کے لیے آرٹیکلز ارسال کر رہا ہوں، پلیز قریبی اشاعت میں جگہ دیں۔ آپ کو اور دیگر اسٹاف اور سرگزشت کے تمام خوب صورت لکھنے والے رائٹرز اور پڑھنے والے تمام ریڈرز کو دعا سلام۔" (سرگزشت میں افسانے کہانیاں نہیں، روداد و واقعات شامل اشاعت کیے جاتے ہیں۔ دلچسپ واقعات ہی ارسال کیا کریں)

✉ افتخار عثمانی کا خلوص نامہ سرگودھا سے "نئے سال کی آمد آمد ہے سردیاں عروج پر ہیں۔ ایسے میں لحاف اوڑھ کر سرگزشت کا مطالعہ ایک خاص مزہ دیتا ہے۔ چائے کے ساتھ تو مزہ دوبالا ہو جاتا ہے۔ شہر خیال کی رونق دن بہ دن عروج پر پہنچ رہی ہے۔ انجم فاروق ساحلی کو مسند صدارت پر دیکھ کر خوشی ہوئی۔ ورشہوار آف خانیوال کو خوش آمدید۔ تاثیر حیدری سے گزارش ہے کہ ہر ماہ خط لکھا کریں۔ اعجاز حسین سخار کا تبصرہ پسند آیا۔ بہت عمدہ لکھتے ہیں۔ احمد خان توحیدی اور تفسیر بابر کا خط بہت الجھا ہوا ہوتا ہے۔ کم سے کم اردو تو درست لکھا کریں۔ محمد جاوید محمد خان سرکانی کا مطالعہ وسیع ہے۔ سرگزشت میں ایسے ہی لوگ تبصرہ لکھیں تو بہتر ہے۔ سدرہ بانو ناگوری کا خط بھی دلچسپ تھا۔ رانا محمد شاہد کی کیا بات ہے۔ بہت عمدہ لکھتے ہیں۔ طاہر الدین بیگ اور ناصر حسین رند بھی خوب لکھتے ہیں اس ماہ کے شمارے میں اختر اردو سرتاج تحریر تھی۔ الف لیلہ کے صفحات اب محدود کر دیں۔ ایک ہی واقعہ بار بار مزہ کرکرا کر دیتا ہے۔ سچ بیانیوں میں خواب ہو گئے، راستے کا پتھر، جعلی عامل، کالے میاں اور خواب عذاب پسند آئے۔"

✉ زریاب خان نے پارہ چنار سے لکھا ہے "مجھے سرگزشت میں خط لکھنا اچھا لگتا ہے لیکن آپ کا ڈائجسٹ دیر میں ملتا ہے اس لیے اب خط نہیں لکھ پا رہا ہوں۔ (اب تاریخ میں تبدیلی آ گئی ہے آپ 15 تاریخ تک خط بھیج سکتے ہیں)"

☆ نسرین فرحت نے سیالکوٹ سے لکھا ہے "شمارہ دسمبر نظر نواز ہوا۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی اختر اردو اور تنویر ریاض کا عکاس ورد لاجواب تحریر تھی۔ ساجد امجد تعریف کے اہل ہیں۔ کیسے کیسے گوہر تلاش کر کے سامنے لاتے ہیں۔ 32 سیکنڈ چھوٹی سی لیکن لاجواب تحریر تھی۔ اختر شہاب کو مبارک۔ باؤلی خزانہ بھی بہتر لگی۔ ایس امتیاز احمد نے نہایت اختصار سے ایک بڑے واقعہ کو بیان کیا ہے۔ یہ واقعہ ریڈرز ڈائجسٹ میں تفصیل کے ساتھ آ چکا ہے۔ سچ بیانیوں میں خواب ہو گئے اور خواب عذاب بہت پسند آئی۔ قصوروار اور جعلی عامل بھی اچھی لگی۔ کالے میاں سبق سے لبالب بھری آپ بیتی ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اصل انسان کو اس کے اندر تلاش کرے۔ کل ملا کر پورا شمارہ لاجواب ہے، جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔"

✉ عباس علی ریاض، سعودی عرب کا مکتوب "انیس سال ہو گئے لیکن سرگزشت سے دل بھرا نہیں۔ ہر شمارہ نئی اور دلچسپ و مفید معلومات سے اٹا ہوا ملتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس دیار غیر میں بھی میری لائبریری سجی ہوئی ہے کیونکہ ہر شمارے کو میں مجلد کرا کر محفوظ کر لیتا ہوں۔ اردو ادب کی جتنی خدمت سرگزشت کر رہا ہے اسے بھلایا نہیں جا سکتا۔ کیسے کیسے ادیب و شاعر جنہیں وقت کی گرد نے ڈھانپ لیا اسے آپ لوگ سامنے لا رہے ہیں۔ میری ایک فرمائش ہے کہ سعودیہ اور یو اے ای میں جو لوگ بھرپور انداز میں اردو کی ترویج کے لیے کام کر رہے ہیں ان کی روداد حیات بھی شائع کریں۔ خاص کر اردو منزل والے جعفری صاحب کا، بی بی سی والے رضا علی عابدی کے حالات زندگی بھی شائع کریں۔ اب آتے ہیں اس مہینے کے شمارے پر، اختر حسین رائے پوری کے حالات زندگی چیدہ چیدہ پہلے ہی پڑھ چکا تھا لیکن یکجا پڑھنے میں بہت مزہ آیا۔ تنویر ریاض نے عکاس ورد لکھا تو سہی لیکن اختصار کی وجہ سے زیادہ مزہ نہیں آیا۔ ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور اردو ادب کے دو بڑے نام ہیں۔ دونوں بہنوں کی شخصیت اتنی بڑی ہے کہ چند صفحات پر احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ شاہد خان کی آپ بیتی بھی اچھی لگی۔ ایسے بلند حوصلہ والوں کی روداد تواتر سے شائع کریں۔ 32 سیکنڈ بھی اچھی لگی۔ سچ بیانیوں میں جعلی عامل سب سے دلچسپ لگی۔ کالے میاں بھی اچھی تھی۔ خواب ہو گئے کا جواب نہیں۔"

تاخیر سے موصول خطوط:

زوار حسین زیدی (شجاع آباد) خلش منظر، ملک سرفراز گوندل، تنویر حسین، نازش علی شاہ، حیدر علی احمد (کراچی) رانا فتح یاب، سید محمد تقی، صفدر شیرازی (راولپنڈی) رام لال چوکھا مل اسرانی، محمد تابش (حیدر آباد) مہوش ملک (حاصل پور) اسرار صدیقی (بہاولپور) خضر حیات (جہانیاں) سدرہ شفیق (پاک پتن) زوبار فیق (جھنگ) ملک شفاعت (جہلم) عظمیٰ کمال نوانہ (سرگودھا) عثمان احمد (ساہیوال) نعمان شیخ (سکھر) نسیم فردوس (پشاور)

ڈاکٹر ساجد امجد

جذبوں کی آنچ تیز کرتے ہوئے فکر کے دریچے کھول دے۔ ان کہی کو زبان دے، اور آرزوئوں کو لفظ کا پیکر دے۔ درد سے لذتیں کشید کرکے دکھوں کو فریاد کی لے دے۔ بھٹکے ہوئے ذہنوں کو صحیح منزل کا پتا دے' اسے بلا شبہ وقت کا معلم کہا جاسکتا ہے۔ ان جناب کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے انگریزوں کے دورِ اقتدار میں جب مسلمانوں مین طبقاتی کشمکش عروج پر تھی، تعلیم سے بے رغبتی بڑھتی جارہی تھی ایسے وقت میں انھوں نے قلم کا سہارا لے کر آسان پیرایہ میں صحیح سمت کی نشاندہی کا بیڑا اٹھایا تھا۔ مرآۃ العروس جیسی لازوال تحریر سامنے لائی تھی۔ اکبری اصغری کے کردار واضح کرکے بتایا تھاکہ معاشرہ کیسے سدھرسکتا ہے۔ ابن الوقت کے ذریعہ اجتماعی کوتاہیوں کو عوام کے روبرو پیش کیاتھا۔

## اردو کے ایک مایہ ناز قلم کار کی روداد حیات

دونوں بچے گھر پر رہ کر قرآن ناظرہ ختم کر چکے تھے اور اب انہیں مکتب بھیجا جانے لگا تھا جہاں انہیں فارسی نوشت وخواند پر عبور حاصل کرنا تھا۔

دونوں بچے نہایت متین اور سنجیدہ تھے یا کم از کم مکتب میں سنجیدہ نظر آتے تھے۔ اس وقت بھی دونوں بچوں کی آنکھیں زمین پکڑے چل رہی تھیں کہ مولوی صاحب پر نظر پڑتے ہی علی احمد کو بے اختیار ہنسی آگئی۔ یہ ایسی بے ہودگی تھی جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ مولوی صاحب نے غضب ناک نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''علی احمد، یہ کیا بے ہودگی ہے۔ کوئی اس طرح بھی مکتب آتا ہے۔ اس سے پہلے تو یہ حرکت تم سے سرزد نہیں ہوئی۔ آج کیا شیطان ساتھ لگالائے ہو۔ وہ تو کہو ابھی دوسرے بچے نہیں آئے ورنہ تم نہیں میں تماشا بن چکا ہوتا۔''

''مولوی صاحب، بات ہی ایسی ہے کہ مجھے سوچتے ہی ہنسی آگئی۔''

''ایسی کیا بات ہوئی کہ تمہیں میری موجودگی کا بھی پاس نہیں ہوا۔''

''مولوی صاحب، یہ کل حجامت بنوانے گیا۔ ابھی آدھی حجامت بنی تھی کہ مچھلی کی طرح خلیفہ کے ہاتھوں سے پھسلا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ استرے نے سر بھی کاٹ دیا کہ خون بہنے لگا۔ لونڈے پیچھے لگے اور گھیر گھار کر پکڑ لیا۔ پھر لاکر بٹھایا گیا۔ تب جا کر حجامت پوری ہوئی۔ یہ کوئی آج کا قصہ نہیں۔ جب حجامت بنوانے جاتا ہے یہی کرتا ہے۔ یہ تازہ واقعہ تھا اس لیے مجھ کو ہنسی آگئی۔''

''بے شک! یہ ہنسی کی بات ہے لیکن بات سنجیدہ بھی ہے۔ یہ واقعہ نذیر احمد کی ذہانت پر دلالت کرتا ہے۔ بعض بچے اپنی ذہانت کی وجہ سے برق وش ہوتے ہیں۔ انہیں ایک جگہ نچلا بیٹھنا گوارا نہیں ہوتا۔ طبیعت کا چلبلا پن اور جوش عمل کی فراوانی انہیں ہمہ وقت متحرک رکھتی ہے۔''

''پھر تو مولوی صاحب، یہ مکتب میں چند ہی دن ٹھہرے گا۔ یہاں سے بھی بھاگ کھڑا ہوگا۔''

''تم نے ٹھیک کہا۔ ایسے بچوں کی صحیح تربیت نہایت دشوار ہوتی ہے۔ بننے بگڑنے کے دونوں امکانات موجود ہوتے ہیں۔ میں تمہارے والد کو بلا کر سمجھاؤں گا۔''

جس وقت یہ گفتگو ہورہی تھی، مولوی صاحب کے ایک شناسا بھی آئے بیٹھے تھے۔ انہوں نے انہیں پوچھ لیا۔

''یہ بچے کون ہیں۔ لگتے تو بھلے گھر کے ہیں۔''

"ارے آپ نہیں جانتے؟ ان کا خاندان شیخ عبدالغفور اعظم پوری کا خانوادہ ہے۔"

"وہی اعظم پوری جو حضرت شیخ گنگوہی کے جانشین تھے؟"

"جی ہاں وہی۔ شیخ عبدالغفور کے بعد ان کے بیٹے شیخ ابواسحٰق خلیفہ ہوئے پھر ان کے فرزند شیخ حاتم نے مسند سنبھالی۔ ان کا کوئی بیٹا نہیں تھا لہٰذا انہوں نے اپنے نواسے شیخ ابوالفضل کو اپنا جانشین قرار دیا، شیخ ابوالفضل نے بجنور کو اپنا وطن بنایا۔ ان کی اولاد یہاں متوطن رہی۔ یہ جس محلے میں تھے وہ پیرزادوں کا محلّہ کہلانے لگا۔ بعد میں ان کے ایک بیٹے موضع ریہڑ، تحصیل نگینہ میں آباد ہو گئے۔ ان کی نسل سے قاضی غلام علی شاہ تھے۔ انہوں نے اپنے ہی خاندان کے ایک شخص مولوی سعادت علی کو اپنا خانہ داماد بنالیا۔ غلام علی کی وفات کے بعد جائداد کے جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مولوی سعادت علی ان جھگڑوں میں الجھنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے بجنور آگئے اور پیرزادوں کے محلے میں آباد ہو گئے۔ چھوٹی موٹی زمینداری ہے وہ کرتے ہیں۔ معلمی بھی کرتے ہیں۔ یہ دونوں بچے علی احمد اور نذیر احمد ریہڑ میں پیدا ہوئے اور اب بجنور میں ہیں۔"

"جب بچے ایسے خاندان کے ہیں تو انہیں ذہین تو ہونا ہی تھا۔"

یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ دوسرے بچے آنا شروع ہو گئے اور گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ نذیر احمد کی چلبلی طبیعت اسے پڑھنے کی طرف راغب نہیں ہونے دیتی تھی لیکن بڑے بھائی علی احمد کا شوقِ تعلیم اور گھر کا علمی ماحول دیکھ کر اس کا شوق برقرار رہا اور وہ مکتب جاتا رہا۔

اس مرتبہ جلد بازی نذیر احمد نے نہیں والد نے دکھلائی۔ اس کی ذہانت کو دیکھتے ہوئے انہوں نے نذیر احمد کو مکتب سے اٹھالیا اور فارسی کی مروجہ کتابیں خود گھر پر پڑھانے لگے۔ ان کے پڑھانے کی خوبی تھی یا نذیر احمد کے کسبِ کمال کی صلاحیت کہ آٹھ نو سال کی عمر میں اس نے فارسی میں اچھی خاصی استعداد پیدا کر لی۔

یہ تعلیم جاری تھی کہ مولوی نصر اللہ خورجوی بہ حیثیت ڈپٹی کلکٹر مین پوری سے تبدیل ہو کر بجنور آئے۔ یہ کوئی عام سرکاری افسر نہیں تھے بلکہ ایک جید عالم، مصنف، شاعر اور عارف باللہ تھے۔ مولوی سعادت کے خاندان سے دلی عقیدت رکھتے تھے۔ ان سے برادرانہ مراسم تھے۔ ان کے گھر کا علمی ماحول دکھانے مولوی سعادت کبھی کبھی دونوں بچوں نذیر احمد اور علی احمد کو بھی ساتھ لے جاتے تھے۔ مولوی نصر اللہ خورجوی بچوں کی ذہانت سے اتنے متاثر ہوئے کہ دامنِ دعوت خود پھیلا دیا۔

"مکتب بھیج کر دونوں کی ذہانت کیوں ضائع کرتے ہو۔ بجنور میں کوئی مشنری اسکول نہیں ہے ورنہ میں انہیں انگریزی پڑھنے کا مشورہ دیتا۔"

"آپ کا مشورہ سر آنکھوں پر لیکن میں ان بچوں کا گلا گھونٹ دوں گا، انہیں انگریزی نہیں پڑھنے دوں گا۔"

"مولوی صاحب، اب زمانہ بدل رہا ہے۔ کچھ دن جاتے ہیں انگریزی کے بغیر گزارہ نہیں ہوگا۔"

"کچھ بھی ہو جائے میں انہیں انگریزی نہیں پڑھنے دوں گا۔"

"پھر آپ ایسا کریں انہیں میرے حلقۂ درس میں بھیجیں۔ مکتب میں رہ کر کیا پڑھ لیں گے۔"

مولوی صاحب کے لیے یہ پیش کش جاذبِ نظر تھی۔ وہ خود مکتب کی تعلیم سے مطمئن نہیں تھے اسی لیے خود پڑھا رہے تھے۔ مولوی نصر اللہ نے خود پیش کش کی تو انہوں نے اسے سنہری موقع سمجھا اور دونوں بھائیوں کو ان کے پاس پڑھنے کے لیے بٹھا دیا۔

نذیر احمد اب تک اپنے والد سے فارسی پڑھتا تھا۔ کچھ عربی بھی شروع کر رکھی تھی۔ مولوی نصر اللہ نے صرف و نحو اور فلسفہ پڑھانا شروع کر دیا۔

نذیر احمد کی ذہانت اور خداداد حافظے کو دیکھ کر انہوں نے اس بچے سے بہت سی امیدیں باندھ لیں۔ ان کے پڑھانے کا طریقہ بھی ایسا تھا کہ نذیر احمد کا دل لگ گیا۔ اس کی شوخ طبعی کبھی کبھی گستاخی کا رنگ دکھانے لگتی لیکن مولوی نصر اللہ کے ماتھے پر کبھی شکن تک نہ آتی۔ ان کا کہنا بھی یہی تھا کہ ذہین بچے ایسی شوخیاں دکھایا ہی کرتے ہیں۔

ایک روز وہ نذیر احمد کی ایک شوخی پر متعجب بھی ہوئے اور خوش بھی۔ ایک جگہ نذیر احمد نے اپنے دستخط بنائے تھے اور نیچے لکھا تھا۔ "ڈپٹی کلکٹر۔"

اس کے استاد ڈپٹی کلکٹر تھے لہٰذا وہ بھی یہی خواب دیکھنے لگا تھا۔ اس کی بھی آرزو تھی کہ وہ اپنے باوقار استاد کی طرح ڈپٹی کلکٹر بنے گا۔

"خدا کرے یہ محض خواب نہ ہو۔ تم بھی میری طرح ڈپٹی کلکٹر بن جاؤ۔" استاد نے دعا دی۔ نہ صرف دعا دی بلکہ





اس دن کے بعد سے یہ تلقین بھی کرنے لگے کہ خوب جی لگا کر پڑھو۔ تمہیں ڈپٹی کلکٹر بننا ہے۔

نذیر احمد کو پڑھتے ہوئے تین سال ہو گئے تھے کہ مولوی نصر اللہ کا تبادلہ مظفر نگر ہو گیا۔ انہیں ان شاگردوں سے ایسی محبت ہو گئی تھی کہ جدائی گوارا نہیں تھی۔ انہوں نے مولوی سعادت علی کو خط لکھ کر دونوں بچوں کو اپنے پاس بلا لیا۔

"اگر بچوں کی اچھی تعلیم کی خاطر ان کی جدائی آپ برداشت کر سکیں تو دونوں کو میرے پاس بھیج دیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے بجنور سے چلے آنے کے بعد ان کی تعلیم ادھوری رہ جائے۔"

مولوی سعادت علی نے یہ جدائی قبول کر لی۔ نذیر احمد اور علی احمد کو مظفر نگر بھیج دیا۔

نذیر احمد بجنور میں رہ کر بخوبی عربی استعداد میں اضافہ کر چکے تھے۔ اب تعلیم کی وہ منزل آ گئی تھی جہاں شاگردوں کو پڑھانے کے لیے خود استاد کو مطالعے کی ضرورت پڑنے لگتی ہے۔ خاص طور پر نذیر احمد کی ذہانت، استاد کا امتحان لے رہی تھی۔ ادھر مولوی نصر اللہ کی سرکاری مصروفیات اتنی بڑھ گئی تھیں کہ مطالعہ کا وقت نہیں مل رہا تھا لہٰذا انہوں نے مولوی سعادت علی کو بلا کر صورتِ حال سے آگاہ کیا اور مشورہ دیا کہ ان بچوں کو دہلی لے جا کر کسی مدرسے میں داخل کروا دو۔ مولوی صاحب نے نظر دوڑائی تو اپنے استاد کا خیال آیا۔ مولوی عبدالخالق پنجابی کٹڑے کی اورنگ آبادی مسجد میں درس دیا کرتے تھے۔ مولوی عبدالخالق دہلی کے ممتاز مولویوں میں تھے۔ ان کا خیال آتے ہی مولوی سعادت نے دونوں بچوں کو ساتھ لیا اور دہلی پہنچ گئے۔ اورنگ آبادی مسجد کا ڈھونڈنا یا مولوی عبدالخالق کا پتا دریافت کرنا کون سا مشکل تھا۔ اورنگ آبادی مسجد میں پہنچ کر عبدالخالق پر نظر پڑی۔ ایک مٹھی ہڈیاں تھیں جو اکڑوں بیٹھی تھیں۔ ایک تپائی سامنے تھی جس پر کچھ کتابیں رکھی تھیں۔

"حضرت، یہ دونوں میرے بیٹے ہیں۔ میں چاہتا ہوں یہ چار لفظ آپ سے پڑھ لیں۔"

"جہاں تک مجھے یاد آتا ہے، آپ تو بجنور میں رہتے ہیں۔" مولوی عبدالخالق نے کہا۔

"آپ کی معلومات درست ہیں۔"

"میرے پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ اگر یہ یہاں رہیں گے تو مسجد میں رہنا ہوگا اور یہاں کے طور طریقوں پر چلنا ہوگا۔ ہر تکلیف اٹھانی ہوگی۔"

"مجھے کوئی عار نہیں ہوگی۔ ویسے بھی میں نے انہیں عیش و عشرت میں پال پوس کر بڑا نہیں کیا ہے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ انہیں چھوڑ جاؤ، میں انہیں کندن بنا دوں گا۔"

باپ کے چلے جانے کے بعد دونوں بچے حیران پریشان تھے کہ دن تو گزر جائے گا رات کیسے کٹے گی۔ نہ بستر ہے نہ لحاف نہ کوئی مہمان خانہ نظر آ رہا ہے۔ یہ حیرانی اس وقت پریشانی میں بدل گئی جب ایک ہم مکتب نے بتایا کہ رات کو فرش پر سونا پڑتا ہے اور دن کو گھر گھر جا کر روٹی مانگنی پڑتی ہے۔

نماز کا وقت ہوا اور امام صاحب تشریف لائے تو اسی ہم مکتب نے بتایا، یہ حافظ عبدالقادر ہیں مولوی عبدالخالق کے فرزند۔ اسی دن شاہ محمد اسحٰق سے تعارف ہو گیا جو مدرسے کے دوسرے معلم تھے۔

رات آئی تو عشا کی نماز کے بعد وہ سبق یاد کرنے کا مرحلہ آیا جو دوسرے دن سنانا تھا۔ نذیر احمد بیٹھ کر سبق یاد کرنے لگا۔ تھک گیا تو فرش پر دونوں کہنیاں رکھ کر کتاب سامنے رکھ لی۔ مسجد کا فرش ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ سردی بھی بڑھنے لگی تھی، آنکھوں میں نیند بھی تھی، بستر کہاں تھا کہ سوتا۔

"بھائی کیا ٹھنڈے فرش پر سونا ہوگا۔" اس نے بڑے بھائی علی احمد سے پوچھا۔

جو بچے مسجد میں ہی ٹھہرنے پر مجبور تھے، ٹاٹ کی صفیں لیے سو رہے تھے۔ ان دونوں نے بھی ایک صف میں خود کو لپیٹ لیا۔ نئی جگہ، ایسی بے چینی کی رات بڑی دیر تک نیند نہیں آئی۔ نذیر احمد کی عمر بارہ سال ہو گی۔ نیند کا کچا بھی تھا۔ کروٹیں بدلتے بدلتے بالآخر نیند آ گئی۔ نہ جانے کب رات گزر گئی۔ اچانک لگا جیسے کسی نے زوردار لات ماری ہے۔ وہ صف کے ساتھ دور تک لڑھکتے چلے گئے۔ صف بھی بچھ گئی اور وہ بیدار بھی ہو گئے۔ یہ شاید مسجد کا موزن تھا۔

"منحوسوں کی طرح کب تک سوتے رہو گے۔ وضو کر کے آؤ، نماز کا وقت قریب ہے۔" انہوں نے دیکھا کہ دوسرے لڑکے صفیں بچھا رہے تھے۔ انہی کو اٹھنے میں دیر ہو گئی تھی۔ جلدی جلدی صف کو درست کیا اور وضو کرنے چلے گئے۔

نماز کے فوراً بعد درس کا آغاز ہو گیا۔ درس کے بعد

اس نے ایک عجیب وغریب اعلان سنا ''اب تمام لڑکے اپنی اپنی ڈیوٹی پر جائیں گے۔''

یا اللہ! یہ ڈیوٹی کیا ہے۔

بہت جلد معلوم ہوگیا۔ لڑکوں کو محلے کے گھروں سے روٹی مانگ کر لانی پڑتی تھی۔ اسی کو ڈیوٹی کہا جارہا تھا۔ دن اور گھر بندھے ہوئے تھے۔ طالب علم جاتے تھے اور اپنے لیے کھانا مانگ کر لاتے تھے۔ نذیر احمد کو بھی ڈیوٹی پر جانا پڑا۔ ان کے حصے میں مولوی عبدالقادر کا گھر آیا۔ نذیر احمد کے لیے یہ بالکل نیا تجربہ تھا۔ اس کی غیرت نے کچھ دیر شور مچایا لیکن انکار بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ انکار کرتا تو شاید بھوکا بھی رہنا پڑتا۔ وہ دوسرے لڑکوں کے ساتھ مسجد سے باہر آگیا۔ مولوی عبدالقادر کا گھر قریب ہی تھا۔ وہ دروازے پر پہنچ گیا۔ گھر والوں کو معلوم تھا کہ آج ان کے گھر کی باری ہے۔ دستک دیتے ہی ایک نازک سا ہاتھ باہر آیا جس میں چند روٹیاں اور روٹیوں پر رکھا ہوا سالن تھا۔

دو چار مرتبہ جب وہ کھانا لینے اس دروازے پر گیا اور گھر کی عورتوں نے دیکھا کہ آنے والا بارہ تیرہ سال کا بچہ ہے تو اسے گھر میں بلایا جانے لگا۔ اس سے اوپر کے کام بھی لیے جانے لگے مثلاً سودا سلف لانا، مسالا پیسنا، گھر کی جھاڑو نکالنا وغیرہ۔ نذیر احمد اپنی ذہانت اور شگفتہ مزاجی کی بدولت بہت جلد گھر کی عورتوں میں گھل مل گیا۔ خصوصاً اسی کی ہم عمر اس گھر کی ایک لڑکی صفیۃ النسا بیگم سخت گیر ہونے کے باوجود اس سے لگاؤ کی باتیں کرتی تھی اور وہ اس کے حکم پر بھاگ بھاگ کر کام کیا کرتا تھا۔ اسی گھر میں رہ کر اس کے کان اس ٹکسالی زبان کی مٹھاس سے آشنا ہوئے جو دہلی کے شریف گھرانوں میں بولی جاتی تھی۔ اس کا بے پناہ حافظہ عورتوں کی زبان سے ادا ہونے والے محاوروں کو محفوظ کرتا گیا۔ یہ وہ سرمایہ تھا جو بعد میں اس کی تصنیفات کے ذریعے ظاہر ہونے والا تھا۔

☆☆☆

ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے قدم شمالی ہند میں جم چکے تھے۔ انگریزوں نے سب سے پہلے تعلیم پر توجہ دی تاکہ اپنی مرضی کی قوم تیار کی جاسکے۔ عیسائی مشنریوں کو بہت سی مراعات دی گئیں۔ انہوں نے ہر اہم شہر میں تعلیمی ادارے قائم کیے۔ سرکاری اسکول بھی جابہ جا قائم ہوئے۔ اسکیم یہ تھی کہ ایک ایسا طبقہ پیدا کیا جائے جو نسل اور رنگ کے لحاظ سے ہندوستانی مگر اپنے رجحانات کے لحاظ سے انگریز ہو۔

نواب غازی الدین خان بہادر فیروز جنگ نے بہادر شاہ اول کے عہد میں دلی کے اجمیری دروازے کے باہر اپنے لیے ایک مقبرہ اور اس کے ساتھ مسجد اور مدرسہ بنوایا تھا۔ 1825ء میں اس مدرسہ غازی الدین میں ایک سرکاری درس گاہ کا افتتاح کیا گیا۔ انگریزی جماعت بھی کھول دی گئی۔ طلبہ کے لیے وظائف جاری کیے تاکہ لوگوں کو رغبت ہو۔ ایک سال بعد اسے ''دہلی کالج'' کا نام دے دیا گیا۔ دو شعبے بنائے گئے مشرقی اور مغربی۔ مشرقی شعبے میں قدیم فلسفہ و منطق اور فارسی و عربی کی تدریس کا پرانا نظام بھی قائم رکھا اور اس کے ساتھ ساتھ مغربی اصولوں کے مطابق سائنس، ریاضی، تاریخ اور جدید علوم کی تعلیم بھی دی جاتی رہی۔ مشرقی شعبے کے طالب علموں کے لیے مفید علمی کتابوں کے ترجمے کا کام بھی منظم طور پر ہونے لگا۔ میکالے کی تعلیمی پالیسی کے مطابق سرکاری اداروں میں انگریزی ذریعۂ تعلیم ہوگئی تھی۔ دہلی کالج ایسا واحد ادارہ تھا جہاں مغربی علوم، ریاضیات، نیچرل سائنس وغیرہ کی تعلیم بھی اردو میں دی جاتی تھی۔

1845ء کے لگ بھگ یہ کالج کشمیری دروازے میں دارا شکوہ لائبریری کی عمارت میں منتقل ہوگیا۔ اس وقت تک کالج کی شہرت اتنی ہوگئی تھی کہ شرفا نے اپنے بچوں کو اس کالج میں بھیجنا شروع کردیا۔ طلبہ کو وظیفہ ملتا تھا اس لیے بھی لوگ راغب ہورہے تھے۔ اس کالج کی شہرت نذیر احمد کے کانوں تک بھی پہنچی۔ دونوں بھائی رات کے اندھیرے میں مسجد کے فرش پر لیٹ کر اس کالج کی باتیں کیا کرتے تھے۔

''بھائی جان، میں تو اس مسجد کی گدایانہ زندگی سے تنگ آچکا ہوں۔''

''یہاں تو سب یہی کررہے ہیں۔'' علی احمد نے کہا۔

''سچ بتایئے کیا آپ کو یہ پسند ہے کہ دروازوں پر جاکر روٹی مانگی جائے۔''

''پسند تو نہیں لیکن ابا جان ہمیں یہاں چھوڑ کر گئے ہیں۔''

''اس مدرسے سے ہمیں جتنا فائدہ اٹھانا تھا اٹھا چکے۔ اب ہم میں اتنی قابلیت ضرور آگئی ہے کہ اس کالج میں داخلے کے لیے امتحان دے سکتے ہیں۔''

''شکایت فوراً گھر پہنچ جائے گی۔''

''ہم تعلیم حاصل کرنے کے لیے اس کالج میں جارہے ہیں۔ یقین ہے ابا جان خوش ہوں گے۔''



''شاید خوش نہ ہوں کیونکہ یہ انگریزوں کا ادارہ ہے۔ پرنسپل تک تو انگریز ہے۔''

''میں نے سب معلوم کرلیا ہے۔ تمام مضامین کی تعلیم اردو میں دی جاتی ہے۔ انگریزی جماعت میں داخلہ لینا اپنی صوابدید پر ہے۔ وہاں وظیفہ بھی ملتا ہے جس سے ہم اپنی گزر بسر کرسکتے ہیں۔ چار روپے مجھے ملیں گے چار روپے آپ کو۔''

''یہاں مسجد میں رہنے کا ٹھکانا ملا ہوا ہے۔''

''ہم کوئی جگہ کرائے پر لے کر رہ لیں گے۔''

''پہلے ابا جان سے خط لکھ کر دریافت کرلیتے ہیں۔''

''اگر انہوں نے منع کردیا تو ہمیں ان کی بات ماننی پڑے گی لیکن جب داخلہ ہو ہی جائے گا تو پھر وہ کچھ نہیں کرسکیں گے۔''

''بات معقول ہے لیکن میں خود میں ہمت نہیں پاتا۔''

''آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں سب سنبھال لوں گا۔'' نذیر احمد نے کہا اور کروٹ بدل لی۔

مسجد میں رات آہستہ آہستہ گزر رہی تھی لیکن نذیر احمد کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ اب وہ صفیۃ النسا بیگم کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اگر میں نے یہ مدرسہ چھوڑ دیا تو مولوی عبدالقادر کا گھر بھی مجھ سے چھوٹ جائے گا۔ اسے صفیۃ النسا یاد آرہی تھی۔ وہ کس دلچسپی سے میری باتیں سنتی ہے۔ کس اپنائیت سے مجھے سودا سلف لانے کو کہتی ہے۔ بعض اوقات مجھے جھڑکتی بھی ہے لیکن اس میں بھی ایک اپنائیت ہوتی ہے۔ میں مختلف حیلے بہانوں سے وہاں جاتا رہا ہوں لیکن اب کیسے جاؤں گا۔ کیا وہ مجھے یاد نہیں کرے گی۔ کیا میں اسے بھول سکوں گا۔ ہرگز نہیں۔ پھر کیا کروں؟ میں کب تک اس مدرسے میں رہوں گا۔ تین سال تو ہوگئے ہیں۔ اس مدرسے سے تو جانا ہی ہوگا۔ صفیۃ النسا سے جدائی تو اس وقت بھی ہوگی۔ پھر یہ بھاری پتھر ابھی کیوں نہ اٹھالوں۔ ہوسکتا ہے میں کسی قابل ہوجاؤں اور صفیۃ النسا کا ہاتھ مانگ لوں۔ یہی سوچتے سوچتے اسے نیند آگئی۔

دوسرے دن جمعہ تھا۔ مدرسے کی تعطیل تھی۔ کچھ دل پر وحشت بھی زیادہ تھی۔ مولوی عبدالقادر کے گھر جانے کے بجائے وہ بازار کی طرف نکل گیا۔ یونہی بے مقصد گھوم رہا تھا کہ اتفاقاً دہلی کالج کی طرف گزر ہوا تو دیکھا سالانہ جلسے کی وجہ سے وہاں بڑی رونق تھی۔ لوگ جمع تھے۔ وہ ہجوم میں گھستا ہوا کالج ہال تک پہنچ گیا۔ اچانک شور ہوا کہ پرنسپل صاحب آرہے ہیں۔ انگریز پرنسپل ڈاکٹر اسپرنگر جونہی نظر آئے چپراسیوں نے لوگوں کو ہٹانا شروع کردیا۔ نذیر احمد ڈٹ کر کھڑا ہوگیا اس وقت اس کی عمر پندرہ سولہ سال تھی۔ ہاتھ پیروں کا بھی مضبوط تھا۔ چپراسیوں نے اسے ہٹانا چاہا لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ پرنسپل دور کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس نے اشارے سے نذیر احمد کو اپنے پاس بلایا۔

''کیا بات ہے تم بات کیوں نہیں مان رہے ہو؟''

''میں آپ سے ملنا چاہتا تھا اور یہ لوگ روک رہے ہیں۔''

''کیوں ملنا چاہتے تھے؟''

''میں مدرسے کا طالب علم ہوں۔ تین سال وہاں پڑھ چکا ہوں۔ اب چاہتا ہوں آپ کے کالج میں داخلہ لوں۔''

''اس کے لیے تو تمہیں امتحان دینا ہوگا۔ اگر پاس ہوگئے تو یقیناً داخل ہوجاؤ گے۔''

''میں تیار ہوں۔''

پرنسپل نے اسے مفتی صدرالدین کے حوالے کردیا کہ وہ امتحان لے کر داخلے کا فیصلہ کریں۔ مفتی صاحب اپنے وقت کے فاضل تھے۔ عربی زبان میں تو کوئی ان کا ثانی ہی نہیں تھا۔ انہوں نے نذیر احمد پر ایک نظر ڈالی اور پے در پے کئی سوال کیے۔ نذیر احمد مولوی نصر اللہ کی آنکھیں دیکھے ہوئے اور مولوی عبدالخالق جیسے فاضلِ وقت کا تربیت یافتہ تھا۔ ہر سوال کا ایسا جواب دیا کہ مفتی صاحب متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

''میاں، کس گھر کے چراغ ہو؟''

''میں بجنور سے آکر کٹڑے والی مسجد میں مقیم ہوں

### سوانحی خاکہ

نام...... نذیر احمد

والد...... مولوی سعادت علی

خسر...... مولوی عبدالقادر

زوجہ...... صفیۃ النسا بیگم

بیٹا...... مولوی بشیر الدین

پیدائش...... 1830ء

وفات...... 3 مئی 1912ء

تدفین...... گورستان حضرت خواجہ باقی باللہ، دہلی

اور مولوی عبدالخالق مجھے درس دیتے ہیں۔"
"جبھی تو یہ لیاقت ہے۔ تمہارا داخلہ ہو جائے گا اور چار روپے ماہانہ وظیفہ بھی ملے گا۔"
"مفتی صاحب، ایک بات کہوں۔"
"کہو۔"
"میرے بڑے بھائی علی احمد بھی اس مسجد میں مقیم ہیں۔ اگر انہیں بھی داخلہ مل جائے تو ہم دونوں بھائی ساتھ پڑھ سکیں گے۔"
"شرط وہی ہے کہ انہیں بھی امتحان سے گزرنا ہوگا۔"
"انہیں تو پڑھائی میں مجھ سے بھی زیادہ شغف ہے۔ وہ یقیناً کامیاب ہو جائیں گے۔"
"اس وقت تو وقت تنگ ہو گیا ہے۔ تم کل انہیں لے کر آجاؤ۔"
وہ مسجد آیا اور بھائی کو خوش خبری سنائی۔ دوسرے دن جا کر علی احمد کو بھی داخل کرا دیا۔ اس کے نام بھی وظیفہ ہو گیا۔ اب اتنے پیسوں کا آسرا ہو گیا تھا کہ کوئی جگہ کرائے پر لی جاسکتی تھی لیکن اس سے پہلے اپنے استاد مولوی عبدالخالق کو آگاہ کرنا بھی لازمی تھا۔ علی احمد نے نذیر احمد کو آگے کر دیا۔ اس میں جھجک نام کو نہیں تھی۔ ہر ایک سے ہر بات کر لیا کرتا تھا۔ مولوی عبدالخالق نے نہ صرف اس کی بات سنی بلکہ دونوں بھائیوں کے رہنے کا بندوبست بھی کر دیا۔ ان کے کوئی عزیز تھے جن کا کارچوب کا کارخانہ تھا۔ اس کارخانے میں انہیں رہنے کے لیے جگہ مل گئی۔
کالج میں داخلے کے بعد نذیر احمد کا شوقِ علمی دیدنی تھا۔ پرنسپل اور اس کے مشفق اساتذہ نے اس کی ذہانت کو دیکھتے ہوئے اسے مشورہ دیا کہ وہ شعبہ انگریزی میں داخلہ لے۔ خود نذیر احمد کا بھی خیال تھا کہ آگے چل کر انگریزی بہت کام آئے گی۔ لیکن اسے معلوم تھا کہ والد کبھی اجازت نہیں دیں گے۔ ایک ہی ترکیب ہو سکتی تھی کہ پرنسپل سے والد کے نام خط لکھوا کر سفارش کروائی جائے۔ پرنسپل نے خط لکھ دیا جس میں نذیر احمد کی ذہانت کی تعریف کی گئی تھی اور انگریزی پڑھنے کا مشورہ دیا گیا تھا لیکن والد کے انکار نے سب کو مایوس کر دیا۔ انہوں نے لکھا تھا۔
"مجھے اس (نذیر احمد) کا مر جانا منظور، اس کا بھیک مانگنا قبول مگر انگریزی پڑھانا گوارا نہیں۔"
اس انکار کے بعد اس نے انگریزی کا خیال دل سے نکال دیا اور بدستور عربی کی تعلیم حاصل کرتا رہا۔ دہلی کالج میں سلسلۂ نظامیہ کے عام مدارس کے برخلاف عربی ادب کی تدریس پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ اس شعبے کو مولانا مملوک علی جیسا برگزیدہ معلم اور مفتی صدرالدین جیسا ممتحن میسر آگیا تھا۔ نذیر احمد کی طبیعت میں خدا نے عربی زبان کا خاص مذاق رکھا تھا۔ مدرسے میں رہ کر محنت کی عادت پڑ گئی تھی۔ دوسرے طالب علموں کے مقابلے میں گھنٹوں مطالعہ کر سکتے تھے۔ قوت حافظہ بھی خداداد تھی چنانچہ دیوان متنبی، سبعہ معلقہ، تاریخ یمینی کے اکثر حصے اور مقامات حریری کے متعدد مقام اور دیوان حماسہ کے بیش تر مقامات اور قرآن کی بہت سی سورتیں یاد تھیں۔ بہت جلد وہ اپنے شعبے کے دوسرے ساتھیوں کے مقابلے میں ممتاز مقام حاصل کر گیا۔ اس کی قابلیت پر اس کے اساتذہ کو بھی رشک آتا تھا۔
ان دونوں بھائیوں کی وظیفے کی رقم میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ دونوں کو بارہ بارہ روپے وظیفہ مل رہا تھا۔
وہ تعلیمی منازل بڑی تیزی سے طے کر رہا تھا کہ مولوی سعادت (نذیر کے والد) کا انتقال ہو گیا۔ دونوں بھائی دہلی میں تھے اور بجنور میں صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی۔ یہ دونوں والد کی تدفین کے لیے بجنور گئے۔ باپ کا چہرہ دیکھا، ماں کے آنسو اور گھر کی حالت دیکھی۔ گھر کی کفالت اب ان دونوں پر تھی۔ اور دونوں ابھی طالب علم تھے۔
"نذیر احمد، ہمیں چاہیے تعلیم کو خیرباد کہہ کر کہیں ملازمت کر لیں۔" علی احمد نے کہا۔
"نذیر احمد ہم تکمیلِ علم کی آخری منزل میں ہیں۔ تعلیم ادھوری نہیں چھوٹنی چاہیے۔" نذیر احمد نے بھائی سے اختلاف کیا۔
"دیکھتے نہیں ہو گھر کی کفالت کا بوجھ ہمارے کندھوں پر آگیا ہے۔"
"ہم خود فاقے کر لیں گے اور وظیفے کی رقم گھر پر بھیج دیا کریں گے لیکن تعلیم نہیں چھوڑیں گے۔"
علی احمد چھوٹے بھائی کی ہمت کو بڑی دیر تک دیکھتا رہا اور پھر آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔
دو ڈھائی برس کی بڑائی چھوٹائی سے دو نوعمر لڑکوں کے وظیفے پر آٹھ دس آدمیوں کی خانہ داری کا بوجھ پڑ جانا حقیقت میں مصیبت کے پہاڑ کا ٹوٹ پڑنا تھا۔
وہ بجنور سے لوٹ کر آیا تو احساسِ ذمہ داری کے بوجھ سے دبا ہوا تھا۔ کارچوب کے کارخانے میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرنا ہے۔ پھر اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ اسے تعلیم مکمل کرنی ہے اور بے پناہ دولت کمانی ہے میں محض مولوی بن کر تکڑ گدائی نہیں کر سکتا۔ مجھے معاشرے کا اہم فرد بننا ہے اور دنیا کو بتانا ہے کہ علم سے دنیا کو تسخیر کیا جاسکتا ہے۔
وہ دل شکستہ ہونے کے بجائے اپنی تعلیم میں زیادہ مستعد ہو گیا۔ اب تک قدم بہ قدم چل رہا تھا اب سرپٹ دوڑنے لگا۔ کالج کے مضامین کا انبار ہی بہت تھا، قابلیت بڑھانے کے لیے دو سبق اور شروع کر دیے جو علومِ عربیہ ہی سے متعلق تھے۔
ان اسباق میں مشکل پیش آئی تو اس نے کالج کے بڑے مولانا مملوک علی پر اپنی مشکلات ظاہر کیں اور گزارش کی کہ وہ اسے سبق پڑھا دیا کریں۔ کالج کے اوقات کے علاوہ مولانا مملوک علی سے استفادے کا موقع نکالنا مشکل تھا۔ اب نوبت یہ تھی کہ مولانا مسلسل انکار کر رہے تھے اور وہ مسلسل اصرار کیے جا رہا تھا آخر مولانا مجبور ہو گئے۔
"اچھا جس وقت ہم مدرسے جایا کرتے ہیں آجایا کرو۔ راستے میں چلتے چلتے جو پڑھ سکو گے پڑھا دیا کریں گے۔"
نذیر احمد نے اسی کو غنیمت جانا۔
دوسرے دن دہلی کی سڑکوں پر لوگوں نے عجیب تماشا دیکھا۔ مولانا مملوک بینس میں سوار کالج کی طرف جا رہے ہیں اور ایک طالب علم کتاب ہاتھ میں لیے بینس کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا ہے۔ کئی جگہ تو ایسا ہوا کہ ٹھوکر لگی اور وہ گر گیا، بینس آگے بڑھ گئی۔ وہ اٹھا اور پھر دوڑنے لگا۔ پھر یہ تماشا روز دیکھنے کو ملنے لگا۔ لوگ بھی اس طالب علم کو پہچاننے لگے۔ یہ نذیر احمد تھا جو تحصیلِ علم کے لیے یہ سختیاں جھیل رہا تھا۔
اسے یہ محنت بھی کم لگنے لگی تھی۔ اس نے ایک چوکیدار کو چند پیسے مہینے پر نوکر رکھ لیا کہ وہ رات کے دو بجے کتاب بینی کے لیے اسے جگا دے۔ اس وقت سے لے کر کالج جانے تک مسلسل مطالعہ کرتا رہتا۔ سردیاں ہوتیں تو کھلی جگہ پر بیٹھ جاتا تاکہ نیند اڑی رہے۔ گرمیوں میں کوٹھری میں بند ہو جاتا کہ آرام نہیں ملے گا تو خود بخود نیند اڑتی رہے گی۔ گھنٹوں کتاب پر سر جھکائے گردن شل ہو جاتی۔ زحمت سخت تھی لیکن ویسے ہی اس کے فائدے بھی ہو رہے تھے۔
اس کی ساری توجہ عربی ادب پر تھی۔ دوسرے مضامین برائے نام دیکھ لیتا لیکن چونکہ امتحان میں کامیابی مجموعی نمبروں پر منحصر اس لیے دیگر مضامین کی کمی عربی سے پوری ہو جاتی۔

**تصانیف و تراجم**

ابن الوقت، الحقوق والفرائض، امہات الامہ، ریاضی، نبات النعش، تاریخ دربار تاج پوشی، ترجمۃ القرآن، توبۃ النصوح، چند پند رویائے صادقہ، صرف صغیر، فسانہ مبتلا، جہاد الحکمت، مطالب القرآن، مرآۃ العروس، مصائب غدر، منتخب الحکایات، نصاب خسرو، ادعیۃ القرآن، اجتہاد، نظم بے نظیر، رسم الخط، موعظہ حسنہ۔

کثرتِ مطالعہ سے جب وہ خستہ ہو جاتا تو اکثر پرانے روابط کو مدِنظر رکھتے ہوئے مولوی عبدالقادر کے گھر بھی چلا جاتا۔ اب وہ بیس بائیس سالہ نوجوان تھا اور گھروں میں پردے کا دستور تھا لہٰذا صفیۃ النسا اس سے پردہ کرنے لگی تھی لیکن وہ شروع سے اس گھر میں آتا جاتا رہا تھا اس لیے "کانا پردہ" تھا یعنی صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں والا معاملہ تھا۔ صفیۃ النسا کی جھلک دیکھنے کو مل ہی جاتی تھی۔ کبھی کبھی بات کرنے کا موقع بھی مل جاتا تھا۔ نذیر احمد کی جوانی اب کبھی کبھی کی ملاقاتوں سے بہلنے والی نہیں تھی۔ اس نے ایک ایسی جرأت کا مظاہرہ کرنے کی ٹھانی جو اس وقت کے قدیم ماحول میں انہونی بات تھی۔
کالج کی تعلیم اور وہاں کے ماحول کا ایک لازمی اثر یہ تھا کہ نوجوان طلبہ میں آزاد خیالی کی ایک رو چل پڑی تھی۔ نذیر احمد کی خودسری اور دلیری میں اس ماحول کا بھی اثر تھا۔ اس کا اظہار اس وقت ہوا جب نذیر احمد نے صفیۃ النسا کا ہاتھ تھامنے کا ارادہ کر لیا۔ گھر سے تو وہ دور تھا لیکن بھائی اس کی نگرانی کے لیے موجود تھا۔ اس سے کیسے چھپایا جاتا۔ اس نے علی احمد سے بات کی۔ علی احمد کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔
"تمہیں معلوم ہے تم کیا کہہ رہے ہو؟"
"یہ آپ کو بھی معلوم ہے کہ ذہن پر زور ڈالے بغیر کوئی بات نہیں کہتا۔"
"یہ عقل کا فتور ہے۔ اماں تمہاری نسبت بجنور میں کرنا چاہتی ہیں۔"
"میں صفیۃ النسا بیگم کو پسند کرنے لگا ہوں اور وہیں

شادی کروں گا۔"

"نذیر احمد اماں کے دل پر کیا گزر جائے گی۔"

"میرا ارادہ نافرمانی کا نہیں لیکن شادی اپنی پسند اور تجویز سے کروں گا۔ مجھے صفیۃ النسا سے محبت ہے۔"

"تمہیں یقین ہے کہ مولوی عبدالقادر تم جیسے بے روزگار کو اپنی بیٹی دے دیں گے۔"

"میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر انہوں نے انکار کر دیا تو میں اسے ان کا حق سمجھوں گا۔ کوئی شکایت نہیں کروں گا۔ چپ ہو کر بیٹھ جاؤں گا۔ پھر اماں جہاں کہیں گی شادی کرلوں گا۔"

علی احمد نے چھوٹے بھائی کے جذبات کو دیکھتے ہوئے چپ سادھ لی۔ خاموشی نیم رضامندی کے مصداق اسے بھائی کی رضا گردانا اور پہلے سے طے شدہ منصوبے کے تحت مولوی عبدالخالق کے پاس چلا گیا کہ وہ مولوی عبدالقادر سے اس کی سفارش کر دیں۔ مولوی عبدالخالق اس کے روشن مستقبل کی قسم کھا سکتے تھے۔ انہوں نے اس سے وعدہ کرلیا کہ وہ مولوی عبدالقادر (صفیہ کے والد) سے بات کرلیں گے۔

اس وقت کا ماحول یہ تھا کہ دہلی کالج سے فارغ التحصیل طلبہ کو کالج سے نکلتے ہی نوکری مل جاتی تھی۔ نذیر احمد کی تو ایک لائق طالب علم کی حیثیت سے شہر میں شہرت ہو چکی تھی چنانچہ جب نذیر احمد کا رشتہ پہنچا تو مولوی عبدالقادر نے بھی ان باتوں پر غور کیا۔ اب وہ پہلے والا نذیر احمد نہیں تھا جو اُن کے گھر کا سودا سلف لا کر دیتا تھا۔ اب صاف نظر آرہا تھا کہ نذیر احمد سورج بن کر چمکے گا۔ ان کے سامنے اب انکار کی کوئی صورت نہیں تھی۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ وہ بجنور کے پیرزادوں کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ بس ایک رکاوٹ سامنے تھی کہ وہ ماں باپ کی مرضی کے خلاف شادی کر رہا تھا لیکن عاقل و بالغ تھا۔ اس کا بڑا بھائی اس کی مرضی سے اتفاق کرتا تھا۔ مولوی عبدالقادر نے اس شرط پر.....

"ہاں" کر دی کہ جب تک کسی باعزت نوکری کا بندوبست نہیں ہو جاتا اور نذیر احمد کسی اچھی رہائش کا بندوبست نہیں کرلیتا اسے خانہ داماد کی حیثیت سے ان کے ساتھ رہنا ہوگا۔ نذیر احمد کو اس شرط سے اتفاق تھا۔ وہ اگر نہ بھی کہتے تو نذیر احمد ان سے یہی درخواست کرتا۔ بیوی کو لے کر کارچوب کے کارخانے میں تو نہیں رہ سکتا تھا۔

شادی کی تاریخ طے ہوگئی۔ نذیر احمد کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا تھا کہ مفتی صدر الدین نہ صرف اس کی شادی میں شریک ہوئے بلکہ اس کا نکاح مفتی صاحب ہی نے پڑھایا۔

کچھ دن تو یہ خبر چھپی رہی لیکن جونہی بجنور والوں کو خبر ہوئی خاندان میں کہرام مچ گیا۔ اس وقت پسند کی شادی کرنا ایسا ہی تھا جیسے کوئی مذہب تبدیل کرلے۔ ماں نے سنا تو کھڑے سے گرنے لگیں۔ فوراً کسی عزیز کو ساتھ لیا اور دہلی آدھمکیں۔ ایک امید یہ بھی تھی کہ شاید یہ خبر غلط ہو لیکن علی احمد سے ملیں تو چودہ طبق روشن ہوگئے۔ خبر سو آنے درست تھی۔ نذیر احمد کو بلوایا گیا۔ بڑی لے دے کی لیکن نکاح ہو چکا تھا اب کیا ہوسکتا تھا۔ بجنور لوٹ گئیں لیکن اس حکم کے ساتھ کہ وہ اس کا منہ نہیں دیکھیں گی۔

ماں کا غصہ ہی کیا۔ پانی کے جھاگ کی طرح ختم ہو جائے گا۔ نذیر احمد نے سوچا اور وقت گزرنے کا انتظار کرنے لگا۔

اس کی جیب میں تھوڑا ہی وقت تھا۔ کالج کی تعلیم کا آخری سال تھا۔ عربی جماعت اول کا آخری امتحان بھی پاس کرلیا۔

اسے دہلی میں رہتے ہوئے بارہ سال ہوگئے تھے۔ اس طویل دورانیے میں اس نے دہلی کی رنگا رنگ محفلیں بھی دیکھیں۔ قابلِ قدر ہستیوں سے ملاقاتیں بھی رہیں۔ شعر و ادب کی محفلوں کی طرف بھی جانا ہوا۔ مولوی حضرات کی خانگی زندگی سے بھی واقفیت ہوئی۔ ٹکسالی زبان سے بھی واقفیت ہوئی۔ ان سب باتوں نے اس کی شخصیت پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ وہ "بجنوری" سے "دہلوی" بن گیا۔

کالج سے نکلنے کے بعد وہ مستقل ملازمت کی فکر میں لگا رہا کیونکہ حصولِ تعلیم کے بعد دہلی کالج سے ملنے والا وظیفہ بھی بند ہو گیا تھا۔

بریلی کے مدرسے میں مدرّس کی جگہ نکلی تو کالج کی انتظامیہ نے نذیر احمد کو پیش کش کی۔ یہ سنہری موقع تھا کہ وہ یہ مستقل ملازمت قبول کرلے لیکن اندیشوں نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔ دہلی میں شادی کرنے کے بعد وہ بجنور جانے سے گریز کر رہا تھا۔ بریلی چونکہ بجنور سے قریب تھا۔ اس لیے اس نے بریلی جانا مناسب نہ سمجھا اور اپنی جگہ اپنے بھائی علی احمد کو بھیج دیا۔

وہ پھر دھوپ میں کھڑا تھا۔ دھوپ پھر اس کے نزدیک سے ہٹ گئی۔ گجرات کے ڈپٹی کمشنر سر رچرڈ ٹمپل نے اپنے علاقے (گجرات) میں سررشتہ تعلیم جاری کرنے کا فیصلہ کیا اور دہلی کالج سے چھ مولوی طلب کیے۔ اتفاق سے پانچ مولوی آئے۔ انتظامیہ نے نذیر احمد کو طلب کرلیا۔

گجرات دور دراز مقام تھا۔ سفر بھی آسان نہیں تھا لیکن نذیر احمد نے اس پیش کش کو ضائع نہیں ہونے دیا۔

وہ دہلی سے نکل کھڑا ہوا۔ بھری برسات تھی۔ ندی نالے دریا بنے ہوئے تھے۔ شاہراہیں سمندر بنی ہوئی تھیں اور پل ندارد۔ اوپر سے راستوں سے ناواقفیت اور ناتجربہ کاری۔ 23 دن میں بہ مشکل دہلی سے گجرات پہنچا۔

گجرات پہنچ کر مدرسے کی بنیاد ڈالی اور بہت خوشامد سے چند ابجدخواں لڑکے جمع کیے۔ اکیلے ہی اپنی قسمت کو روتا تھا کہ الٰہی! اتنا پڑھ لکھ کر یہی میری قسمت میں تھا کہ ان حرف شناس لڑکوں سے سر پھوڑتا رہوں۔ پڑھانے کا لطف تو اس وقت ہوتا ہے جب پڑھنے والے لائق ہوں۔ یہاں تو ابتدائی تعلیم ہی بڑی مشکل سے دی جا رہی تھی۔ آنے سے پہلے اسے سیکڑوں اشعار زبانی یاد تھے۔ یہاں پڑھانے کا موقع نہ ملا تو درجن بھر شعر حافظے میں محفوظ رہ گئے۔

لائق طالب علم نہ ملے تو اس نے علم کی پیاس بجھانے کے لیے کئی کنویں تلاش کرلیے۔ ضلع گجرات کے بعض علم دوست گھرانوں سے تعلقات استوار کرلیے جن کے پاس بیٹھ کر علمی استفادہ کر سکے۔ کچھ دنوں کے لیے وہ جیسے بہل سا گیا لیکن جلد ہی اس محدود دنیا سے اکتا بھی گیا۔ اس نے عروس البلاد دہلی میں بارہ سال گزارے تھے اب گجرات کی بے کیف زندگی کا سامنا تھا۔ اسے کسی وسیع تر جولان گاہ کی تلاش تھی۔ بہ مشکل چھ ماہ گزارنے کے بعد اس نے سررشتہ تعلیم کے حکام کو عرضیاں دوڑانی شروع کر دیں تاکہ گجرات سے اسے کہیں اور بھیجا جائے۔ ان عرضیوں کے جواب میں اس کے نام دو اسامیاں آگئیں۔ اجمیر کالج کی سو روپے کی مدرّسی اور کان پور کی اسّی روپے کی ڈپٹی انسپکٹری۔ اجمیر کالج کی عربی مدرّسی اس کی صلاحیتوں کے عین مطابق تھی۔ تنخواہ بھی سو روپے ماہانہ۔ اس کے مقابلے میں ڈپٹی انسپکٹر کی افسرانہ حیثیت اس کے لیے زیادہ پُرکشش تھی حالانکہ تنخواہ اسّی روپے تھی۔ اسے یاد آیا کہ وہ بچپن میں جب ڈپٹی کلکٹر مولوی نصر اللہ کے پاس پڑھنے جاتا تھا تو اپنے نام کے ساتھ ڈپٹی کلکٹر لکھا کرتا تھا۔ ڈپٹی کلکٹر نہ سہی ڈپٹی انسپکٹر سہی۔

"بہت سے نقاد نذیر احمد کو ناول نگار نہیں مانتے لیکن یہ محض اصطلاح کا چکر ہے۔ میں ان کی سماجی بصیرت اور تاریخی شعور پر نظر رکھ کر انہیں ار...و کا پہلا اور بہت اہم ناول نگار تسلیم کرتا ہوں۔ مرآۃ العروس، توبۃ النصوح، فسانہ مبتلا، ایامیٰ اور ابن الوقت ہر ایک میں گہرے سماجی حقائق پیش کیے گئے ہیں۔ ہر ایک میں انیسویں صدی کے وسطی دور کا کوئی اہم مسئلہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ ہر ایک میں چند کردار بعض مسائل کے نمائندے بن کر زندہ اور متحرک شکل میں سامنے آتے ہیں۔ ان کے ناولوں میں دلّی کے گلی کوچے، پیشہ ور اور عمارتیں، انیسویں صدی کی بدلتی ہوئی فضا کے ساتھ موجود ہیں۔ پھر کس میں جرأت ہے کہ نذیر کے ناولوں کی ادبی اہمیت کا منکر ہو۔" (پروفیسر احتشام حسین)

نام کے ساتھ ڈپٹی تو لکھا جائے گا۔ دیرینہ آرزو مچل اٹھی۔ اس نے ڈپٹی انسپکٹری کے حق میں فیصلہ کرلیا۔ جاہ طلبی ابتدا ہی سے اس کے مزاج کا حصہ تھی جو اس وقت کھل کر سامنے آگئی۔ اس نے سوچا میں اگر مدرّس بن گیا تو زندگی بھر مدرّس ہی رہوں گا جبکہ ڈپٹی انسپکٹر بننے کے بعد ترقی کے بہت میدان ہیں۔

وہ ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو کر کان پور آگیا۔

اس دربدری سے بھی وہ خوش نہیں تھا۔ مدارس میں جاؤ اور طلبہ سے پہاڑے سنتے پھرو لیکن پھر بھی وہ جما ہوا تھا۔ پھر چند گولیاں چلیں۔ دھماکا ہوا اور سب کچھ جل کر راکھ ہوگیا۔ 1857ء کا غدر آپہنچا۔ مسلمانوں نے اسے جنگ آزادی کا جبکہ انگریزوں نے غدر کا نام دیا تھا۔ کس کی نوکری کیسا پڑھنا کہاں کا پڑھانا۔ جان کے لالے پڑ گئے۔ نذیر احمد کان پور سے دہلی چلا آیا۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ انسپکٹر مدارس جو ایک انگریز تھا، نذیر احمد کو پان کھاتے دیکھ کر ان پر برس پڑا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ استعفیٰ دیا اور دہلی آگیا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ دہلی آنے کے بعد ہنگامے پھوٹ پڑے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مارا کاٹی کے باوجود اسے بیوی کی محبت دہلی لے آئی ہو۔ دہلی آکر دیکھا تو واقعی غدر کا سماں تھا۔ باغیوں کا پلڑا بھاری تھا۔ انگریزوں کی جان پر بنی

ہوئی تھی۔ جان بچانا یا فرار ہونا مشکل تھا۔ نذیر احمد یہ سب دیکھ رہا تھا اور اسے مسلمانوں پر غصہ آرہا تھا جنہوں نے تشدد کا راستہ اختیار کیا تھا اور بے گناہ انگریزوں کو قتل کرتے پھر رہے تھے۔

دہلی کالج کے تربیت یافتہ نوجوان انسانی ہمدردی کے تقاضوں سے اپنی جانوں پر کھیل کر اپنے استادوں اور انگریز عورتوں، بچوں کو بچانے کی کوشش کررہے تھے۔ پرنسپل ٹیلر نے محمد حسین آزاد کے گھر پناہ لی۔ مولوی ذکاء اللہ رام چندر کی حفاظت کے لیے بھاگے بھاگے پھر رہے تھے کہ وہ ان کے استاد رہے تھے۔ مصیبت یہ تھی کہ انہوں نے عیسائیت قبول کرلی تھی۔ ان کے دشمن ہندو بھی تھے مسلمان بھی۔

نذیر احمد نے اپنی سسرال والوں کے تعاون سے ایک زخمی خاتون کی جان بچائی۔ وہ لاشوں کے ڈھیر میں زخمی پڑی تھی کہ اسے نکالا، علاج کیا۔ گھر کے قریب ہی اورنگ آبادی مسجد میں مجاہدوں کا مرکز تھا۔ ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کسی کے کانوں میں بھنک نہ پڑجائے۔ نذیر احمد کے خسر اورنگ آبادی مسجد میں امامت کرتے تھے اس لیے کسی کو شک نہ گزرا۔ تندرست ہوجانے کے بعد اس زخمی عورت کو گھر میں رکھنا خطرناک تھا۔ اسے صفیۃ النسا کے کپڑے پہننے کو دیے تاکہ وہ مسلمان معلوم ہو۔ اسے انگریزی کیمپ میں پہنچا دیا گیا۔

حالات نے پلٹا کھایا۔ انگریز فوج آگئی۔ باغیوں کو شکست ہوئی اور انگریزی فوج دہلی میں داخل ہوگئی۔ انہوں نے وہ قتلِ عام کیا۔ بربریت کا وہ مظاہرہ کیا کہ مسلمانوں کے خون سے دہلی کو سرخ کردیا۔

اس وقت تک یہ خیال تھا کہ انگریز فرشتہ ہیں لیکن تسخیرِ دہلی کے بعد سے مختصر سے مگر خوفناک ایام میں میری یہ رائے ہوگئی تھی کہ وہ مجسم شیطان ہیں۔

جن لوگوں نے جان پر کھیل کر انگریزوں کی جان بچائی تھی اب خود ان کی زندگی محفوظ نہیں تھی اور کوئی پناہ دینے والا نہیں تھا۔ نذیر احمد اور ان کی سسرال والے بھی گھر چھوڑ کر شہر سے باہر نکل گئے۔ کچھ دن اِدھر اُدھر چھپتے پھرے۔ نذیر احمد اپنے طور پر اپنی اور اپنے سسرال والوں کی خیر خواہی کا یقین دلاتا رہا۔ بالآخر راہ داری کا پروانہ ملا۔ دہلی میں دوبارہ داخل ہوا تو اکائی سی آگئی۔ لاشوں کا تعفن ابھی تک ہوا پر سوار تھا۔ گھر کے گھر اجڑ گئے تھے۔ جہاں قہقہے گونجتے تھے کوئی سسکیاں بھرنے والا بھی نہیں رہ گیا تھا۔

وہ پاؤں توڑے پڑا رہا لیکن حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے کمربستہ بھی ہوتا رہا۔ ہنگامہ سرد ہوتے ہی اسے سرکاری ملازمت مل گئی۔ اس مرتبہ اس کے مستقبل کی سواری الہ آباد سے وابستہ ہوئی۔ الہ آباد میں اس نے ایک واقف کار عبداللہ خان امین عدالت کے مکان پر سامانِ حیات اتارا۔ عبداللہ خان مشن اسکول کے تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود نہایت دین دار تھے۔ غدر کے الزام میں خود مصیبت زدہ مسلمانوں کی اپیلیں اور استغاثے راتوں کو بیٹھ بیٹھ کر مفت لکھا کرتے تھے۔ اس روز بھی چراغ کی مدھم روشنی میں بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے نذیر احمد بھی ان کے برابر آکر بیٹھ گیا۔ جو لکھا جارہا تھا وہ انگریزی میں تھا اور نذیر احمد انگریزی سے نابلد۔ اس نے کاغذ اٹھا کر اس پر ایک نظر ڈالی اور بے دلی سے ایک طرف رکھ دیا۔

عبداللہ خان نے اس کی اس کیفیت کو بھانپ لیا۔

''مولانا، آپ اگر انگریزی سے واقف ہوتے تو اس وقت میری کچھ مدد کرسکتے تھے۔''

''میں نے دہلی کالج میں کوشش تو کی تھی لیکن والد صاحب اس کے حق میں نہیں تھے۔''

''وہ زمانہ اور تھا۔ اب حالات کچھ سے کچھ ہوگئے۔ پہلے اگر انگریزی علوم کی کلید تھی تو اب رزق کا وسیلہ بن گئی ہے۔ زیادہ دن نہیں جاتے کہ انگریزی کے بغیر روٹی نہیں توڑی جاسکے گی۔ اب انگریزی سے بیر رکھنا دانش مندی نہیں۔ میری مانیے تو انگریزی سیکھنا شروع کردیجیے۔ آپ ذہین آدمی ہیں بہت جلد عبور حاصل کرلیں گے۔''

عبداللہ خان کی یہ نصیحت تازیانے کا کام کرگئی۔ اس کے بعد بھی عبداللہ خان اٹھتے بیٹھتے انگریزی سیکھنے پر زور دیتے رہے۔ ان نصیحتوں کا اس نے فائدہ اٹھایا۔ دل جمعی سے انگریزی سیکھنی شروع کردی۔ اپنی محنت اور جذبۂ صادق کی بدولت صرف چھ ماہ میں اتنی انگریزی سیکھ لی کہ ڈکشنری کی مدد سے انگریزی کتابیں پڑھنے لگا۔ مدرسے کی محنت ابھی تک کام آرہی تھی۔

سید ناصر علی ذوالقدر الہ آباد میں درجہ اول کے ڈپٹی کلکٹر تھے۔ نذیر احمد کا ان کے پاس آنا جانا تھا۔ ایک روز وہ ان کے پاس بیٹھا تھا کہ سر ولیم میور آگئے جو اس وقت مجلس مال کے ممبر تھے۔ گفتگو کے دوران نذیر احمد کی انگریزی دانی پر بات ہوئی۔ نذیر احمد کے کرم فرما میر ناصر علی نے یہ بھی بتادیا کہ انہوں نے یہ قابلیت صرف چھ ماہ میں حاصل کی



ہے۔ اتفاق یہ دیکھیے کہ سر ولیم میور کو قانونِ انکم ٹیکس کے اردو ترجمے کے لیے ایک موزوں آدمی کی تلاش تھی۔

''مجھے قانون انکم ٹیکس کے ترجمے کے لیے کسی موزوں آدمی کی تلاش ہے۔ کیا آپ یہ ترجمہ کرسکیں گے۔''

''میں نے اس سے پہلے کوئی ترجمہ نہیں کیا۔ پھر بھی کوشش کر کے دیکھوں گا۔''

''میں کچھ صفحات آپ کو بھیج دوں گا۔ آپ مجھے ترجمہ کر کے دکھائیے۔''

دوسرے دن وہ صفحات اسے مل گئے۔ وہ ڈکشنری سامنے رکھ کر بیٹھ گیا اور ان صفحات کا ترجمہ کر کے سر ولیم میور کو پیش کردیا۔ ترجمہ دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے اور مطمئن ہو کر یہ کام اس کے سپرد کردیا۔ انہوں نے انسپکٹر بابو شیو پرشاد کے نام ایک چٹ لکھ دی کہ انکم ٹیکس کے ترجمے کے لیے نذیر احمد کو فارغ کردیا جائے۔

وہ ملازمت کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد ترجمہ کرنے بیٹھ گیا۔ آدھے سے زیادہ ترجمہ کرچکا تھا کہ انسپکٹر مدارس بابو شیو پرشاد کو یہ گوارا نہ ہوا کہ ایک مسلمان اپنی قابلیت کا سکہ جمائے۔ انہوں نے کوئی ایسا چکر چلایا کہ ترجمہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ نذیر احمد ایک ماتحت کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ انہوں نے مجلس مال کے سیکریٹری لو صاحب کے کان بھر کر یہ ترجمہ اپنے ہاتھ میں لیا تھا۔

نذیر احمد اس حق تلفی پر مایوس نہیں ہوا بلکہ اسے اپنی ہی کمزوری سمجھا اور ترجمہ نگاری کی مشق جاری رکھی۔

انہی دنوں انڈین پینل کوڈ کے ترجمے کی مہم کا آغاز ہوا۔ ہنری اسٹوارٹ ریڈ، ناظم تعلیمات کی نگرانی میں کام کا آغاز ہوا۔ اس کام میں ان کے ماتحت دو مترجم تھے۔ ایک منشی عظمت اللہ اور دوسرے ریڈ صاحب کے میر منشی مولوی کریم بخش۔ اتفاق سے نذیر احمد کو ریڈ صاحب کے سامنے اپنی قابلیت جتانے کا موقع مل گیا۔ اسے بھی اس مہم میں شامل کرلیا گیا۔ اس کا منصب ''نکتہ چیں'' کا تھا۔ یعنی دوسرے لوگ جو ترجمہ کرتے تھے وہ اس کی اصلاح کرتا تھا۔ اس نے پورے ترجمے پر نظرثانی کی اور بھدی اصطلاحوں کی جگہ موزوں اصطلاحیں وضع کیں۔ ریڈ صاحب کی نظروں میں وہ اتنا معتبر ہوگیا کہ ترجمہ ختم ہونے پر اشاعت کا کام اس کے سپرد کردیا گیا۔ اشاعت نول کشور کے مطبع خانے میں ہونی تھی لہٰذا اسے لکھنؤ بھیج دیا گیا کہ وہ اشاعت کی نگرانی کرے۔

اردو ادب میں مولوی نذیر احمد کا نام ان کے ناولوں سے زندہ رہے گا اور نقاد تعجب کیا کریں گے کہ کس طرح ایک عربی فارسی کا عالم، مولوی قسم کا آدمی انگریزی ناولوں سے بے خبر ہوتے ہوئے بھی ایسے ناول لکھ گیا جو گفتگو، کردار اور سماج کی حالت بیان کرنے میں اس قدر کامیاب ہیں کہ شاید ان سے بہتر کوئی ناول نہیں۔''

(ڈاکٹر تاثیر)

اس خدمت کے صلے میں اسے سونے کی گھڑی انعام میں ملی اور ڈپٹی کلکٹری کے لیے نامزد کردیا گیا۔ اس کا ایک اور خواب اپنی تعبیر تک پہنچا۔ اسے پھر اپنے استاد ڈپٹی کلکٹر نصر اللہ خورجوی یاد آگئے جنہیں دیکھ دیکھ کر وہ بھی ڈپٹی کلکٹر بننا چاہتا تھا۔

اسے ڈپٹی کلکٹری کے لیے نامزد تو کردیا گیا تھا لیکن اس وقت کوئی جگہ خالی نہیں تھی۔ اس نے مسٹر لو کے مشورے پر تحصیل سلیم پور (ضلع کان پور) کی تحصیل داری قبول کرلی۔

تحصیل داری میں عیش ہی عیش تھے۔ دن بھر گاؤ تکیہ لگائے حقے کے کش لیتا رہتا۔ دوست جمع ہوتے تو اس کا ہنسوڑپن جاگ اٹھتا۔ بات بات پر لطیفے ہوتے، قہقہے گونجتے۔ ہر طرف تحصیل دار صاحب کی ''جے جے'' پکاری جاتی۔ فرصت ہی فرصت تھی۔

اس فرصت کا اس نے فائدہ بھی خوب اٹھایا۔ ترجمے سے شغف بھی تھا اور شہرت بھی ہوگئی تھی لہٰذا ترجمے کا کام آنے لگا مطبع نول کشور نے اسے ایک انگریز افسر کی تحریر کردہ انگریزی تصنیف دی جس میں اس نے ''ایام غدر'' کے واقعات قلم بند کیے تھے۔ ایک طرح سے یہ اس کی سرگزشت تھی۔ نذیر احمد نے اس کا ترجمہ ''مصائب غدر'' کے عنوان سے کیا۔ یہ ترجمہ غالباً اس نے محض پیسوں کی خاطر کردیا تھا کیونکہ مصنف نے جن لوگوں کی خیر خواہی کو سراہا تھا وہ سب ہندو تھے۔ مسلمانوں کو اچھے لفظوں سے یاد نہیں کیا تھا۔ اس لیے نذیر احمد نے ترجمہ کر تو دیا لیکن اپنے تراجم اور تصنیفات کا ذکر کرتے ہوئے کبھی اس کتاب کا ذکر نہیں کیا۔

حکایت لقمان میں سے کچھ حکایتوں کا ترجمہ بھی کیا۔

تحصیل داری کے دو سال پورے کرنے کے بعد اسے ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز کردیا گیا۔ وہ تبدیل ہو کر

گورکھ پور آگیا۔ مصروفیات بڑھ گئیں۔ یہاں مال اور فوج داری کی معمولی ذمہ داریوں کے ساتھ بندوبست کے کام کا بار بھی آپڑا۔

☆☆☆

جنگِ آزادی کے بعد کوئی انقلاب آیا ہو یا نہ آیا ہو۔ تعلیم اور ادب میں انقلاب ضرور آگیا تھا۔ ایک طرف سرسید تھے جو اصلاحی تحریک چلا رہے تھے۔ دوسری طرف انگریزوں نے مختلف صوبوں میں جدید نظامِ تعلیم کی طرف توجہ دی۔ اس شعبے کی مختلف اصلاحی کوششوں میں تعلیمِ نسواں کی ترویج و اشاعت کا پروگرام بھی شامل تھا۔ حکومت کی طرف سے اس کا بھی انتظام کیا گیا کہ تقاریر کے ذریعے تعلیمِ نسواں کی تحریک کو فروغ دیا جائے۔ عام نصابِ تعلیم میں تبدیلی پر بھی غور کیا جانے لگا۔ صوبہ شمال مغربی کے گورنر سر ولیم میور اس میں پیش پیش تھے۔ نذیر احمد سرسید کا بھی قدردان تھا اور سر ولیم میور کا بھی۔ وہ ان کی کوششوں کو تحسین آمیز آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ خود سر رشتہ تعلیم سے منسلک رہا تھا۔ تمام عمر پڑھا بھی تھا اور پڑھایا بھی تھا۔ طریقہ تعلیم کے خلل اور کتابوں کے نقائص اسے معلوم تھے۔ اس نے اپنے بچوں کو پڑھانے کے لیے ایک قصہ لکھنا شروع کیا جو اس وقت کی طلسماتی کہانیوں سے مختلف اصلاحی نوعیت کا تھا۔ اس نے اس قصے کا کچھ حصہ مکمل کیا تھا کہ ایک اخبار میں اس نے ایک اشتہار دیکھا۔

"سر ولیم میور نے اردو ہندی کی ادبیات کو فروغ دینے کے متعلق چند اصول و قواعد مرتب کیے ہیں چنانچہ موصوف کی جانب سے اعلان ہوا ہے کہ ہر سال بہترین مصنف، مولف یا مترجم کو ایک ایک ہزار کے پانچ انعام دیے جایا کریں گے۔ موضوع کی کوئی قید نہیں چاہے ادبی ہو یا سائنٹفک۔ مصنف یا مولف کے جملہ حقوق محفوظ رہیں گے اور حکومت اشاعت کی خاطر ان کتب کی اچھی خاصی تعداد خریدے گی۔"

اس اشتہار نے اسے مہمیز کیا۔ جو کچھ لکھا تھا اسے دوبارہ لے کر بیٹھ گیا۔ اسے نہ صرف مکمل کیا بلکہ اس خیال سے دوبارہ تحریر کیا کہ اسے انعامی مقابلے میں پیش کرنا ہے۔ اس قصے کا نام "مراۃ العروس" رکھا اور اپنے سر پر اردو کے پہلے ناول نگار کا تاج سجا لیا۔

اس ناول کا موضوع تعلیمِ نسواں تھا اور چونکہ یہ کتاب اسلوب و موضوع کے اعتبار سے زمانے کے جدید تقاضوں اور قدر شناس حکام کی منشا کے عین مطابق تھی لہٰذا انعام کا مستحق سمجھا گیا۔ گورنر سر ولیم میور نے آگرہ کے دربار میں انعام سے نوازا۔ مصنف کی عزت افزائی کے لیے اپنی جیب خاص سے ایک گھڑی مرحمت فرمائی۔ حکومت کی طرف سے کتاب کی دو ہزار جلدیں خریدی گئیں۔ سر ولیم میور اور مسٹر ایم کیمپسن نے اس کتاب پر نہایت حوصلہ افزا تبصرے شائع کرائے۔ اس طرح مراۃ العروس اور اس کا مصنف نذیر احمد دہلوی شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گیا۔

مراۃ العروس کے بعد اس نے اس ناول کا دوسرا حصہ "بنات النعش" لکھا۔ مسٹر کیمپسن کی سفارش پر حکومت کی طرف سے مصنف کو پانچ سو روپے کا انعام ملا۔

اب اس کی ادبی حیثیت مسلم ہوگئی تھی۔ صاف نظر آرہا تھا کہ قصہ نگاری کی صف میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوگیا ہے۔ اردو میں قصوں کے نام پر داستانیں لکھی جارہی تھیں۔ پریوں، جنوں، شہزادوں اور شہزادیوں کے قصے قلم بند کیے جارہے تھے۔ ناولوں میں زندگی کے حقائق تحریر کیے جاتے ہیں، ان حقائق کو بیان کرنے کا کوئی وسیلہ نہیں تھا۔ نذیر احمد نے ان ناولوں میں سماجی حقیقتوں کو بیان کیا تھا۔ جذبۂ اصلاح کے تحت لکھے گئے تھے اس لیے اصلاحی ماحول ضرورت سے زیادہ تھا۔ پند و وعظ کے انبار لگے ہوئے تھے جو فنی لحاظ سے درست نہیں تھے لیکن اس کمی کو "مکالمے" پورا کررہے تھے۔ دلی کی ٹکسالی زبان تھی جو دلچسپی برقرار رکھتے تھے۔ پڑھنے والے کو اردو سکھا رہے تھے۔ یہ وہی زبان تھی جو اس نے بچپن میں مولوی عبدالقادر کے گھر میں سنی تھی۔

گورکھپور سے تبدیل ہوکر وہ اعظم گڑھ آگیا۔ یہاں کے قیام کا زمانہ بھی تصنیف و تالیف کے لحاظ سے نہایت کامیاب رہا۔ یہیں اس نے اپنا تیسرا تصنیفی ناول "توبتہ النصوح" لکھا جس پر حکومت نے دوبارہ اول انعام (ایک ہزار) دیا۔

مراۃ العروس کی تصنیف سے توبتہ النصوح کی تصنیف تک پانچ سال کا عرصہ نہیں گزرا تھا لیکن اس قلیل مدت میں نذیر احمد کے ہاتھوں اردو ناول نے فنی ارتقا کی ایک بہتر شکل اختیار کرلی۔ قصہ گوئی پر بھی اسے قدرت حاصل ہوئی۔ مراۃ العروس خانہ داری تک محدود تھی لیکن توبتہ النصوح میں اس کا دائرہ سماجی خرابیوں تک پھیل گیا۔ کردار نگاری بھی بہتر ہوئی۔ مقصدیت اور فن میں توازن بھی موجود تھا۔

اسی زمانے میں نذیر احمد نے اپنے بیٹے کی عربی و فارسی کی تعلیم کے لیے چند رسائل تحریر کیے۔ سرکاری مدارس کے نصاب کے مطابق منطق پر ایک کتاب لکھی۔ یہ کتاب بھی حکومت کے ایک اشتہار کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ مقابلے کی گیارہ کتابوں میں سے کمیٹی نے اسے بہترین کتاب قرار دیا اور پانچ سو روپے کے انعام کا اعلان کیا۔

انہی دنوں اخبارات میں ایک اور اشتہار شائع ہوا۔ مسٹر لے پوئرون نے علم ہیئت پر ایک فرانسیسی کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ اب وہ اس کا اردو ترجمہ کرانا چاہتے تھے۔ انہوں نے اس اشتہار میں اپنی جیب سے ایک ہزار روپے کے انعام کا اعلان بھی کیا تھا۔ یہ بھی اعلان کیا گیا تھا کہ سرسید احمد خان کی صدارت میں ایک کمیٹی بھی تشکیل دے دی گئی ہے جو اس بات کا تصفیہ کرے گی کہ انعام کا کون مستحق ہے۔

لے پوئرون جو حکومت کے محکمہ امور خارجہ میں مددگار رو معاون تھے، چاہتے تھے کہ نذیر احمد بھی اس مقابلے میں حصہ لے کیونکہ وہ اس سے "قانونِ شہادت" کا ترجمہ کروا چکے تھے اور دل سے چاہتے تھے کہ اس کتاب کا ترجمہ بھی وہ کرے۔ انہوں نے نذیر احمد سے خط لکھ کر فرمائش کی۔ نذیر احمد کی خودداری نے تقاضا کیا کہ اگر اسی سے ترجمہ کروانا تھا تو مقابلے کے اعلان کی کیا ضرورت تھی۔ اگر کمیٹی نے کسی اور مترجم کی کتاب کو منتخب کرلیا تو اس کی سبکی ہوگی۔ اس نے یہ سب باتیں لے پوئرون سے تو نہیں کیں البتہ خط لکھ کر عدیم الفرصتی کا بہانہ کرکے معذرت کرلی۔

کچھ دن نہیں گزرے تھے کہ سر ولیم میور کا خط آیا۔ یہ دراصل سفارشی خط تھا۔ سر ولیم میور نے نذیر احمد پر دباؤ ڈالا کہ وہ لے پوئرون کی فرمائش پر وقت نکالیں اور ترجمہ مکمل کرکے مقابلے میں شامل ہوجائیں۔ ولیم میور سے اس کے ایسے تعلقات تھے کہ وہ ان کی بات نہ ٹال سکا۔ اس نے اصل کتاب کا انگریزی میں مطالعہ شروع کیا۔

انیسویں صدی میں کسی سائنسی تصنیف کا ترجمہ آسان کام نہیں تھا جبکہ اردو میں اصطلاحات کی عدم موجودگی سے یہ کام اور بھی مشکل ہوجاتا تھا۔ ان مشکلات کے باوجود وہ ترجمہ کرنے بیٹھ گیا۔ اس نے انگریزی اصلاحات کے تراجم کرتے وقت سخت محنت کی اور ایسی اصطلاحات وضع کیں جن میں آج ایک صدی بعد بھی ترمیم کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

ناقد کمیٹی نے نذیر احمد کے ترجمے "سماوات" کو سب سے بہتر قرار دیا لیکن ساتھ ہی یہ نوٹ بھی لگا دیا کہ ترجمے میں ترمیم و تبدیلی کی ضرورت ہے۔ انعام میں تخفیف کی بھی سفارش کی۔ ہزار کے بجائے چار سو ملے۔ لے پوئرون نے اس ترجمے کو حیدرآباد شمس الامرا امیر کبیر ثانی کی خدمت میں بہ غرض نظرِ ثانی بھیجا۔ امیر کبیر ثانی حیدرآباد میں شریک وزارت اور علمِ ہیئت کے بہت بڑے ماہر تھے۔ ان کے ذریعے سے عماد الملک مولوی سید حسن بلگرامی کے ہاتھ میں پہنچی۔ حسن بلگرامی نے ترجمے کی تعریف کی اور رائے دی کہ خود مترجم ہی اسے بہتر بنا سکتا ہے۔ اسی دوران لے پوئرون کا انتقال ہوگیا اور یہ اہم ترین موضوع پر اہم ترین کتاب اشاعت کا منہ نہ دیکھ سکی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی اہمیت بھی ختم ہوگئی کیونکہ سائنس میں نئے نئے انکشافات سامنے آتے گئے۔

انعام و اکرام سے زیادہ اس ترجمے کا فائدہ اسے یہ ہوا کہ حیدرآباد (دکن) کے طبقۂ امراء سے اس کا تعارف ہوگیا۔

جدید علمِ ہیئت جیسے اچھوتے لیکن غیر ادبی موضوع پر شگفتہ زبان میں ترجمہ کارنامہ ہی تو تھا۔

☆☆☆

وزیراعظم حیدرآباد سر سالار جنگ اول نے حیدرآباد میں ملکی اصلاحات کی ایک ہمہ گیر تحریک جاری کی تھی۔ اس تحریک کو جاری رکھنے کے لیے سر سالار جنگ اول کو ایسے قابل افراد کی خدمات درکار تھیں جو نہ صرف انتظامی امور چلا سکیں بلکہ مقامی اثرات سے آزاد بھی ہوں۔ انہوں نے

> نذیر احمد وہ شخص ہیں کہ سرسید تک ان کے کانفرنس میں آنے کی تمنا کیا کرتے تھے اور سال بھر پہلے سے بلاوے بھیجتے تھے۔ آنے کو یہ آپ سے آتے ہیں لیکن جس طرح آتے تھے یا آتے ہیں اس کی حقیقت کوئی ہمارے دل سے پوچھے اور اس پر بھی بس نہیں بلکہ منہ پھٹ ایسے کہ جب تقریر کرنے کھڑے ہوتے تو لگی لپٹی رکھتے نہیں۔ بات آئے پیچھے سرسید تک کو کہنے سننے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے تھے۔ مولانا کی مسلمہ علمی قابلیت ان کی سحر بیانی، بیان کا انداز، ذرا بھی مبالغے کی بات نہیں، ہمارے لیے مایہ ناز ہے۔
> (محسن الملک)

سرسید سے رابطہ کیا۔ محسن الملک اور وقار الملک پہلے ہی سرسید کی سفارش پر حیدر آباد روانہ ہوچکے تھے۔ اس مرتبہ انہوں نے نذیر احمد کا نام پیش کیا۔ اس کے ترجے ''سماوات'' کی بدولت اس کا نامِ نامی سر سالار جنگ اول تک پہنچ چکا تھا۔ ممکن ہے اس کے ناول بھی نظر سے گزرے ہوں۔

محسن الملک نے سالار جنگ اول کی ہدایت پر نذیر احمد کے نام خط تحریر کیا جس میں اس کو ناظم بندوبست کی پیش کش کی گئی تھی۔ آٹھ سو تنخواہ دینے کا وعدہ لیا گیا تھا جو بعد میں ایک ہزار ماہوار ہوجاتی تھی۔ اس نے اس خط کو پڑھنے کے بعد سوچا تو یہ سوچا کہ سرکار انگریزی میں تمام عمر بھی وہ اس تنخواہ تک نہیں پہنچ سکے گا لیکن وہ اپنی قدر و قیمت سے بھی واقف ہوچکا تھا۔ اس نے لکھ بھیجا کہ

''اگر تنخواہ بارہ سو روپے دیں گے اور بڑھاپے کے لیے پنشن جاری کریں گے تو میں آجاؤں گا۔''

اس سلسلے میں خط کتابت چلتی رہی بالآخر سالار جنگ کی دریا دلی نے اس مطالبے کو تسلیم کرلیا اور درخواست کی کہ وہ حیدر آباد پہنچ جائے۔

وہ تو تیار ہی بیٹھا تھا خط ملتے ہی روانہ ہوگیا۔ یہاں پہنچتے ہی اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس نے دہلی اور لکھنؤ میں تزک واحتشام کے بہت سے مناظر دیکھے تھے۔ اہل ثروت سے ملاقاتیں کی تھیں۔ ان کے محلات دیکھے تھے لیکن سالار جنگ کے محل کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ یہاں کے ساز و سامان کو دیکھ کر خدا یاد آگیا۔ ریاست کی خوش حالی ظاہر ہورہی تھی۔ دیگر محلات دیکھ کر بھی اس کا یہی حال ہوا۔

وہ خدمتِ سرکار سے طویل رخصت پر آیا تھا لیکن اب اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ اعظم گڑھ کی ملازمت سے استعفیٰ دے دے گا۔ بعد میں استعفیٰ دیا نہیں بلکہ چھٹی بڑھوالی۔

یہاں پہنچتے ہی اس نے اپنی قابلیت کا لوہا منوالیا۔ یہاں کی دفتری زبان فارسی تھی۔ اسے فارسی انشا میں کوئی تجربہ نہیں تھا لیکن اب فارسی میں لکھے بغیر چارہ نہیں تھا۔ روزنامچے، رپورٹیں، فیصلے اور تجویزیں سب فارسی میں لکھنے پڑتے تھے لیکن اس نے ایسی خوبی دکھائی کہ ہر طرف شور مچ گیا۔ اس کی تحریریں اس طرح پڑھی جانے لگیں جیسے مشاعرے میں غزل۔

وہ ناظم بندوبست تھا لیکن اس کی اہلیت کو دیکھتے ہوئے سالار جنگ نے اس کے لیے صدر تعلقہ داری کا عہدہ تجویز کیا۔

وہ خود یہ چاہتا تھا کہ بندوبست کے مشکل کام سے پیچھا چھڑالے لیکن اب جو سالار جنگ نے خود پیش کش کی تو اس نے محض اپنا بھاؤ بڑھانے کے لیے اس عہدے کو اختیار کرنے میں تامل کیا۔ اس نے سالار جنگ کے نام رقعہ لکھا۔

صدر تعلقہ داری میں بڑی جواب دہی اور ذمے داری ہے۔ اگر میں اس کو اختیار کرلوں تو علاوہ محنت کے چار مدار المہاموں کی ماتحتی ایک عذاب ہے۔ مجھے اس خدمت سے معاف رکھا جائے۔ میں اسی خدمت (ناظم بندوبست) کو پسند کرتا ہوں جس کے لیے بلایا گیا ہوں۔''

اس کی یہ مصلحت کامیاب رہی۔ سالار جنگ نے اس کا عذر دیکھ کر تنخواہ میں دو سو کا اضافہ کردیا لیکن ان کی بھی کچھ مجبوریاں تھیں۔ انہوں (سالار جنگ) نے لکھا۔

''بارہ سو سے زیادہ کا ہمارے یہاں دستور نہیں۔ اگر تمہیں دیا تو دوسرے تعلقہ دار شور مچائیں گے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ میں تمہاری خاطر صدر مددگار مال کا ایک نیا عہدہ چار سو کا منظور کروں۔ اس پر تم اپنے کسی عزیز کو رکھ لو۔''

اب زیادہ اصرار کرنا مناسب نہیں تھا لیکن چلتے چلتے ایک شرط اور منوالی۔

''میرا اصلی عہدہ نظام بندوبست باقی رہے اور میں ناظم بندوبست اور منصرم صدر تعلقہ دار، لکھا جاؤں۔''

اس میں یہ مصلحت تھی کہ ناظم بندوبست سابق کے طور پر کم از کم دو سو روپے اسے اور ملتے رہیں۔ صدر مددگار مال کے عہدے پر اپنے داماد کو مقرر کرادیا۔

اسے تعلقہ دار بنا کر حیدر آباد سے نو کوس کے فاصلے پر ''ٹپن چرو'' بھیج دیا گیا۔ یہ مقام وسیع کوہستانی علاقے پر مشتمل تھا۔

سال کا بیشتر حصہ دورے میں گزرتا تھا۔ وہ اس مقام اور اس کام سے بہت خوش تھا لیکن یہ بھول گیا تھا کہ ان ریاستوں کی اپنی سیاستیں ہوتی ہیں۔ یہ راز اس وقت آشکار ہوا جب امیر کبیر ثانی کا انتقال ہوگیا۔ مدار المہام کی تبدیلی نے بہت سے منظر واضح کردیے۔ سالار جنگ کی مخالفت کی جانے لگی۔ ان پر طرح طرح کے الزام لگ رہے تھے۔ ایک موقع تو وہ بھی آیا کہ سالار جنگ کے مستعفی ہونے کی خبریں گردش کرنے لگیں۔ اسے اپنی فکر ہونے لگی۔ سالار جنگ جیسے کرم فرما کی غیر موجودگی میں اس کا نوکری کرنا مشکل ہوجاتا۔

اس نے محسن الملک کی وساطت سے ایک مرتبہ پھر سالار جنگ کی سخاوت کو کھنکھایا۔ اس نے پیغام بھجوادیا کہ اس کی رخصت ختم ہوگئی ہے۔ وہ حیدر آباد سے جانا چاہتا ہے۔

سالار جنگ اسے کسی قیمت پر چھوڑنے کو تیار نہیں تھے۔ انہوں نے سبب دریافت کیا۔ ''حیدر آباد سے آپ کو کیا شکایت ہے جو آپ یہاں سے جانا چاہتے ہیں۔''

''اس شہر نے تو میرے بہت ناز اٹھائے ہیں لیکن ایک مجبوری آن پڑی ہے جس کی وجہ سے جانا چاہوں گا۔ جن کو میں اپنے پیچھے چھوڑ آیا ہوں مجھے ان کی فکر ہے۔ وہاں کے حکام سے میری شناسائی ہے۔ ان سے کہہ سن کر ان لوگوں کی ملازمت کا بندوبست کروں گا۔''

''مجھے اپنے عزیزوں کی فہرست فراہم کیجیے۔ آپ کو کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ ان کی ملازمت کا بندوبست ہوجائے گا۔''

یہ تیر نشانے پر لگا۔ اس کے بیٹے بشیر الدین احمد، چھوٹے داماد، برادر نسبتی وغیرہ کی ملازمت کا بندوبست کردیا گیا۔

اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد اس نے بکھیڑوں کے چھتے میں رہنا قبول کرلیا۔ اہل وعیال کو حیدر آباد طلب کرلیا اور انگریزی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔

صفیۃ النسا بیگم بھی کب کی بچھڑی حیدر آباد آگئیں۔ بیوی کبھی بیٹھی تھیں کہ میاں نے ہزاروں کمائے اور ہزاروں لٹائے ہوں گے۔ شاندار مکان میں قیمتی سامان ہوگا لیکن ٹپن چرو پہنچیں تو نذیر احمد کے کمرہ خاص کا منظر یہ تھا۔

''چاندنی کا فرش جس پر قالین بچھا تھا۔ ایک گاؤ تکیہ، لکھنے پڑھنے کے لیے ایک چھوٹی سی میز، پہلو میں حقہ، ایک طرف پلنگ، دیوار پر ایک کلاک، اِدھر اُدھر کچھ کتابیں۔

ایک طرف ذاتی زندگی کا یہ عالم دوسری جانب مالی ایثار کی یہ حالت، مدرستہ العلوم علی گڑھ میں بورڈنگ ہاؤس بنوایا۔ کنویں کھدوانے کے لیے چندہ دیا۔ اپنے سارے خاندان کے نام کی جالیاں احاطۂ مدرسہ میں نصب کرائیں۔ ہزار دو ہزار کی رقمیں موقع بہ موقع عنایت کیں۔

جب بیوی بچے ٹپن چرو پہنچ گئے اور قدرے فراغت ملی تو اسے حفظِ قرآن کا شوق ہوا۔ عربی زبان پر عبور رکھنے کی وجہ سے وہ اسلوبِ قرآن کا عاشق تھا۔ زندگی کی تنگ دو نے یہ شوق پورا نہیں ہونے دیا تھا۔ حیدر آباد آنے کے بعد اس کی تصانیف کا سلسلہ بھی رک گیا تھا۔ حیدر آباد میں اپنی جگہ بنانے کے لیے اسے سخت محنت کرنی پڑ رہی تھی۔ ٹپن چرو کے اطمینان اور فراغت نے اس کے شوق کو ابھارا۔ ذہانت اور حافظے کا یہ عالم تھا کہ صرف چھ مہینے کی قلیل مدت میں قرآن پاک حفظ کرلیا۔

سر سالار جنگ کی طرف سے عنایات کی بارش جاری

### مناجات

اور کچھ چارۂ گناہ نہیں
آپ کے در سوا پناہ نہیں
یہی ماویٰ ہے اور یہی مامن
میرے دو ہاتھ آپ کا دامن
کون پرساں ہے، مجھ سے ناکس کا
کس کو طوفاں میں پاس ہو خس کا
غبار آبائے اولیں ہوں میں
داغ پیشانی زمیں ہوں میں
دل ہے یا معصیت کا پشتارہ
ایک پونجی ہے وہ بھی ناکارہ
گر تری مہر کی نظر ہوجائے
یہ خذف روکشِ گہر ہوجائے
کب تلک حب جاہ و مال و منال
کب تلک پائے بست اہل وعیال
میں سدا فکر میں ہوں ان سب کے
اور یہ سب اپنے اپنے مطلب کے
رخ دل ہر طرف سے موڑوں میں
رشتۂ الفت کا سب سے توڑوں میں
اپنی ہستی سے میں گزر جاؤں
یعنی مرنے سے پہلے مرجاؤں
..............(ڈپٹی نذیر احمد)

حکومت ہے سچی حکومت قلم کی
نہ بندوق وسیف وسنان وعلم کی
..............(نذیر احمد)

تھی۔ انہوں نے نذیر احمد کو مجلس مال گزاری مقرر کر دیا۔ اب اس کی تنخواہ سترہ سو روپے ماہانہ مقرر ہوئی۔ یہ اس وقت کے اعتبار سے اتنی بڑی تنخواہ تھی کہ نذیر احمد نوابوں کی طرح بسر کر سکتا تھا لیکن اس کی ذاتی زندگی اسی طرح سادہ رہی البتہ وہ عزیز و اقارب کی امداد کرتا رہا اور تعلیمی اداروں کو چندے میں بھاری رقمیں دیتا رہا۔

یہ خواب ابھی ٹوٹا نہیں تھا کہ سالار جنگ کی زندگی کی ڈور ٹوٹ گئی۔ ان کا اچانک انتقال ہو گیا۔ امرائے سلطنت ایک مرتبہ پھر سرگرم عمل ہو گئے۔ انہیں کھل کھیلنے کا موقع مل گیا۔ ہر طرف سازشوں کے جال بچھ گئے۔

ایسے حالات میں ہوتا یہ ہے کہ خواہش مندانِ اقتدار دھڑوں میں بٹ جاتے ہیں۔ اپنا وجود باقی رکھنے کے لیے کسی نہ کسی مضبوط پارٹی سے وابستگی ضروری ہوتی ہے۔ نذیر احمد کی ایک بری یا بھلی عادت یہ تھی کہ منہ پھٹ بھی تھا اور مزاج کا گرم بھی۔ اس کے اندر ایک ادیب بھی چھپا ہوا تھا جو اسے خودداری سکھاتا رہتا تھا۔ وہ نہ تو کوئی مضبوط دھڑا بنا سکا اور نہ کسی کے ساتھ شامل ہو سکا۔ اس کا ادبی غرور اتنا بڑھا ہوا تھا کہ مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر صاف گوئی سے کام لیتا تھا۔ اس کی یہ صاف گوئی کبھی کبھی تضحیک کا پیرایہ اختیار کر لیتی تھی۔ سر سالار جنگ اس کے ناز اٹھاتے رہتے تھے۔ ان کی وجہ سے دوسرے بھی خاموش رہتے تھے لیکن اب وہ نہیں رہے تھے۔ نذیر احمد کو محتاط ہو جانا چاہیے تھا لیکن وہ اپنے مزاج سے مجبور تھا۔

سر سالار جنگ کے نوعمر صاحب زادے اپنے والد کی جگہ منصبِ وزارت پر فائز ہوئے۔ انہوں نے نذیر احمد کو حکم دیا کہ وہ ہفتے میں دو مرتبہ انہیں پڑھانے آ جایا کریں۔ نذیر احمد اس سے پہلے بھی انہیں پڑھاتے رہے تھے اور اس زعم میں تھے کہ ان کے استاد رہ چکے ہیں۔ بڑے اہتمام سے انہیں پڑھانے کے لیے جانے لگے۔ یہ بھول گئے کہ جب میں اور اب میں فرق آ گیا ہے۔ پہلے اس کے شاگرد کا باپ ریاست کا مدار المہام تھا اب وہ خود مدار المہام ہے۔ اکثر یہ ہوتا کہ دیر تک انتظار کرنا پڑتا۔ میر لائق علی سرکاری کاموں میں مشغول رہتے اور یہ باہر بیٹھے انتظار کرتے رہتے۔ کبھی یہ بھی ہوتا کہ پڑھنے پڑھانے کے بجائے گپ شپ میں وقت گزر جاتا۔ کوئی اور ہوتا تو اس کی پروا بھی نہ کرتا۔ اپنا اُلّو سیدھا کرتا رہتا۔ اس میں یہ سیاست تھی ہی نہیں۔ وہ تو ہر طالب علم سے وہی محنت چاہتا تھا جس محنت سے اس نے پڑھا تھا۔ وہ میر لائق علی کی بے دلی سے تنگ آ گیا۔ اس کی بے باکی نے میر لائق علی کو بھی نہیں چھوڑا۔

"سرکار، آپ تو اب مدار المہام ہو گئے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا مرتبہ ہو سکتا ہے۔ پھر اب پڑھنے پڑھانے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ کو ضرورت نہیں مجھے فرصت نہیں۔ میں معافی کا خواست گار ہوں۔"

نشے میں چور مدار المہام میر لائق علی کو یہ طرزِ خطاب کیسے پسند آ سکتا تھا۔ محسن الملک (مولوی مہندی علی خان) ان کے مشیر خاص تھے۔ اتفاق سے اسی وقت آ گئے۔ نذیر احمد نے گھر کی راہ لی۔ میر لائق علی اس وقت غصے میں تو تھے ہی، سارا ماجرا محسن الملک کے گوش گزار کر دیا۔ محسن الملک اس وقت تو خاموش رہے لیکن ایک موقع تھا جو اُن کے ہاتھ آ گیا۔

محسن الملک، نذیر احمد کے محسن رہے تھے۔ نذیر احمد کو حیدر آباد بلانے میں بھی ان کا ہاتھ تھا۔ سالار جنگ سے مراعات دلانے میں بھی ان کا کردار رہا تھا لیکن اب جو مدار المہام کی آنکھ بدلی دیکھی تو خوشنودی کے لیے مدار المہام کے کان بھرنے شروع کر دیے۔ ریاستوں میں یہی ہوتا تھا۔ اقتدار کی قوت جس کے ہاتھ میں ہوتی تھی، سب اسی کو خوش رکھنے کے درپے رہتے تھے۔

اس کان بھرائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدار المہام نے نذیر احمد کو رکن مالگواری سے الگ کر دیا۔ محسن الملک نے مولوی مشتاق حسین (وقار الملک) کا نام تجویز کیا اور وہ رکن مالگواری مقرر ہو گئے۔

محسن الملک کی مہرہ بازی کامیاب ہوئی۔ نذیر احمد کو مات ہو گئی۔

نذیر احمد کی ذہانت نے کروٹ لی تو یہ دیکھا کہ محسن الملک تو مدار المہام کی ناک کا بال بنے ہوئے ہیں جو وہ کہتے ہی میر لائق علی وہی کرتے ہیں۔ اسے یہ گوارا نہ ہوا کہ محسن الملک اسے بے جان مہرے کی طرح استعمال کرتے رہیں۔

اس نے استعفیٰ دے دیا اور اس طرح نکل کھڑا ہوا کہ گھر کا سامان، گھوڑا گاڑی سب یونہی چھوڑ گیا جو بعد میں کوڑیوں کے مول نیلام ہوا۔

☆☆☆

ملازمت سے سبک دوش ہونے کے بعد ایسا دل کھٹا ہو گیا کہ دہلی پہنچتے ہی خانہ نشیں ہو کر بیٹھ گیا۔ حیدر آباد کے

قیام اور دوسری ملازمتوں کے بعد اس نے اتنی جائداد پیدا کرلی تھی کہ آرام سے بیٹھ کر کھا سکتے تھے۔ فراغت کے وہ لمحات میسر آگئے تھے کہ وہ تصنیف و تالیف کی طرف راغب ہوسکتا تھا۔

اس مرتبہ اس کی اصلاحی کوششوں نے شاعری کا روپ دھارا۔ مسدس کی مقبولیت اس کے سامنے تھی۔ خود اس کا عالم یہ تھا کہ سیکڑوں اشعار یاد تھے۔ اس کی فطرت میں شاعرانہ مزاج کے بہت سے عناصر موجود تھے۔ زبان و بیان پر جیسی قدرت اسے حاصل تھی کسی کو نہ ہوگی۔ قومی مسائل پر وہ ایک مدت سے غور کررہا تھا۔ اب جو فرصت ملی تو غور و فکر کے نتائج نے اشعار کی شکل اختیار کرلی۔

دنیا کا کاروبار کر اور دین دار رہ
امیدوار رحمت پروردگار رہ
کس نے کہا ہے تجھ سے کہ دنیا کو چھوڑ بیٹھ
بس ایسی باتیں اپنی طرف سے نہ جوڑ بیٹھ

کیا حال تھا رسول علیہ السلام کا
اصحاب کا ائمہ عالی مقام کا
سرکردہ ہائے امت خیرالانام کا
سکہ بٹھا گئے جو محمدؐ کے نام کا
ان میں سے ایک بھی کہو راہب ہوا کبھی
دنیا کو کھو کے دین کا طالب ہوا کبھی

دنیا نہ ہو تو دین کی رونق کہاں سے ہو
اعلائے شانِ قادر مطلق کہاں سے ہو
ایثار و بذل وجود محقق کہاں سے ہو
مصدر ہی جب نہیں ہے تو عشق کہاں سے ہو
دنیا کو جب کسی نے عموماً برا کہا
میں اس کے منہ کو دیکھنے لگتا ہوں کیا کہا

یہی وہ وقت تھا جب وہ علی گڑھ تحریک کے مبلغ و مبصر کی حیثیت سے سامنے آیا اور آتے ہی علم برداروں کی اگلی صف میں شامل ہوگیا۔

وہ سرسید کے رفقا کے حلقے میں سب کے بعد آیا لیکن سرسید اور علی گڑھ سے اس کا تعلق بہت پرانا تھا۔ وہ سرسید سے اپنی طالب علمی کے زمانے ہی میں متعارف ہوچکا تھا۔ علی گڑھ تحریک جن مسائل کا احاطہ کررہی تھی نذیر احمد کی سوچ اس سے ہم آہنگ تھی۔ مسلمانوں کی تعلیمی ترقی اور مالی خوش حالی، سرسید کی فکر کے دو بڑے محور تھے۔ نذیر احمد اس سے متفق تھا لہٰذا جب ملازمت کے بکھیڑوں سے فرصت ملی تو وہ تحریک کے مقاصد کے لیے بے قرار ہوگیا۔ سرسید نے اسے محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کے اسٹیج پر پہلی مرتبہ مدعو کیا تو اس کے اندر چھپا ہوا خطیب باہر آگیا۔ سویا ہوا شاعر بھی انگڑائیاں لینے لگا۔ زبان دانی پر عبور، گرج دار آواز، عالمانہ نکات، بذلہ سنجی اور بات بات پر برموقع اشعار نے حاضرین کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ اپنی لکھی ہوئی نظم بھی سنائی۔

ہال میں سناٹا تھا اور نذیر احمد کی آواز گونج رہی تھی۔
قومی ہمدردی کے پیکر سرسید کو ایسے ہی خطیب کی ضرورت تھی جو جب چاہے ہنسا دے جب چاہے رلا دے۔
اب تو یہ حال ہوگیا کہ سرسید اسے ہر جلسے میں بلانے لگے۔ ان کی تمنا رہتی تھی کہ نذیر احمد آئیں اور لیکچر دیں۔
ایجوکیشنل کانفرنس، مدرسہ طبیہ دہلی اور انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں لیکچر سے پہلے یا بعد میں نظم سنانے کا معمول بن گیا۔
اس کی قومی نظمیں دہلی اور دہلی سے باہر گونجنے لگیں۔

آتے دکھائی دیتے ہیں اپنے بھی دن بھلے
یعنی کہ اب مسلماں کچھ کچھ سنبھل چلے ہیں
گر علم کی طلب ہو صادق انہیں تو جانیں
ورنہ نمائشی یہ سب جوش اور ولولے ہیں
یورپ نے خشک و تر کو دنیا کے کھوند مارا
ان کی ہی ہمتیں ہیں ان ہی کے حوصلے ہیں
حقا کہ درد سر ہے دنیا میں ملک داری
کیا سلطنت کریں گے بھنوروں میں جو پلے ہیں
کیا پیش لائے دیکھیں تقلید وضع یورپ
کوے ہیں چال ساری ہم ہنس کہہ چلے ہیں
کل آدمی ہیں کندن گر علم و معرفت ہے
اور یہ نہیں تو یارو مٹی کے سب ڈلے ہیں

اکبر الہ آبادی کی طنزیہ شاعری کا ڈنکا بج رہا تھا۔ حالی نے بھی اخلاقی مضامین کی گرانی کو دور کرنے طنز و مزاح کا سہارا لیا تھا۔ نذیر احمد تو یوں بھی شوخ مزاج اور طناز تھا۔ اس نے اکبر کی طرح مستقل طنزیہ نظمیں تو نہیں لکھیں لیکن طنز کے تیر ادھر اُدھر بکھرے ہوئے ضرور نظر آتے ہیں۔

لیے جاتے ہیں ہم سب کو گھسیٹے قعرِ نکبت میں
اب ایسے رہ گئے ہیں مولوی اور پیشوا باقی
پڑھاتے ہیں سبق تحصیل حاصل زہد کا جب یاں
ہزاروں سے نہیں ہے ایک میں کُسر و غنا باقی

....................

نہ ملاّ ہوں کہ مسجد ہے مرا کاسہ گدائی کا
مجھے دعوت میں جانا فرض ہو اوروں کو سنت ہو
تباہی جو نہ آئی ہے مسلمانوں پہ آجائے
مجھے کیا چاہیے ہے میں ہوں مسجد کی امامت میں

....................

اس کو ہم بڑی دولت بڑی حشمت سمجھتے ہیں
کہ مسجد میں ابھی ہے بوریا ٹوٹا پھٹا باقی
جما رکھا ہے آزادی نے وہ سکہ کہ لوگوں میں
نہ قانونِ ادب نافذ نہ آئینِ حیا باقی

....................

گر کسی کو شاذ و نادر ہے بھی انگریزی کا شوق
فرسٹ ریڈر پڑھ کے بننا چاہتا ہے کوتوال
یا بنا کر۔۔ اوپری باتوں میں انگریزوں کی نقل
وہ مثل ہے ہو کے کوا ہنس کی سیکھا ہے چال
اینٹھنے لگتے ہیں احمق ماش کے آٹے کی طرح
گر کہیں سے مل گئی کھانے کو دال

....................

حالی کے سوا اور کسی نے قومی مسائل پر اتنی بڑی تعداد میں نظمیں نہیں کہیں لیکن زمانہ ایسا ظالم ہے کہ اس کا کہا ہوا ایک شعر بھی کسی کی زبان پر نہیں بلکہ بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ ڈپٹی نذیر احمد شاعر بھی تھے۔

☆☆☆

وہ قومی کاموں میں مشغول تھا یا دکانوں اور مکانوں کے کرائے کی وصول یابی کے لیے گھر سے نکل جاتا تھا۔ اس کے معیار کا کوئی آدمی گھوڑے والی بگھی کے بغیر گھر سے باہر قدم نہیں نکالتا تھا لیکن اس کی ''جزرسی'' کا یہ عالم تھا کہ اس عمر میں بھی کسی سواری کا قائل نہیں تھا۔ میلوں پیدل چلتا تھا۔
اس دن جو تھکا ہارا گھر پہنچا تو گھر میں ماں کو بیٹھے دیکھا اس نے اپنی پسند کی شادی کی تھی۔ اس وقت سے ناراض چلی آرہی تھی۔ ماں کو دیکھا تو قدموں میں سر رکھ دیا صفیۃ النسا تو ویسے ہی نرم دل اور متحمل مزاج تھیں۔ ساس کے آگے بچھے جارہی تھیں۔

نذیر احمد کے گھر دعوتِ شیراز کا سماں ہوتا تھا۔ اسراف سے بچنے کی ایک صورت اس نے یہ نکالی تھی کہ احباب کی دعوتوں سے گریز کیا جائے۔ کوئی بھولا بھٹکا آ بھی گیا تو جو کچھ گھر میں پکا ہوتا لا کر رکھ دیتے۔ دراصل وہ ہر مضبوط آدمی کی طرح نمود و نمائش کا قائل نہیں تھا۔ بیٹیوں کی شادیاں ہوئیں تو جہیز کی بجائے نقد رقم دی۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔

ماں آئیں تو دعوتِ شیراز کے اصول کو بالائے طاق رکھ کر اس نے وسیع و عریض دسترخوان بچھایا۔ نمائش کے لیے نہیں ماں کی محبت میں۔

دوپہر کو قیلولے کے لیے ماں بیٹے پلنگ پر گئے تو پنکھا جھلنے والی چمارن آگئی۔

''نذیر احمد تیرے پاس اتنا پیسا ہے۔ تو نے خس کی ٹٹیاں بھی نہیں لگوائیں۔''

''اماں، یہ پیسا میں نے اپنے لیے نہیں کمایا ہے۔ جن کے پاس نہیں ہے ان کے لیے کمایا ہے۔ جو بھی اپنی ضرورت لے کر آتا ہے اس کی مدد کردیتا ہوں۔''

''تو یہ مدد کیوں کرتا ہے۔''

''لو اماں، یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ اس سے خدا خوش ہوتا ہے۔''

''تجھے خدا کی خوشی عزیز ہے۔ ماں کی خوشی کا خیال نہیں؟''

''مجھے معلوم ہے آپ کو میری ذات سے تکلیف پہنچی ہے۔ میں اپنی کوتاہی پر شرمندہ ہوں اور آپ سے معافی مانگتا ہوں۔''

''میں تو ایک ہی صورت میں تجھے معاف کرسکتی ہوں۔''

''آپ فرمائیے۔ آپ جو کہیں گی آپ کی خوشی کے لیے کروں گا۔''

''ایسے نہیں پہلے وعدہ کر۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں۔''

''میں اپنے دل میں ایک ہی ارمان لیے بیٹھی ہوں کہ تیرا دوسرا بیاہ رچا کر بجنور کا گھر بساؤں۔ ایک شادی تو نے اپنی مرضی سے کی دوسری میری مرضی سے کرلے تاکہ

میں آرام سے مرسکوں۔“

”اماں، اب میں شادی کرتا کیا اچھا لگوں گا۔ میرے بچے جوان ہوگئے۔ اور پھر صفیہ النسا سے مجھے کوئی شکایت بھی نہیں۔“

”بجنور کا گھر سُونا پڑا ہے۔ صفیہ کو یہاں رکھنا، دوسری بیوی بجنور میں رہے گی۔ دہلی سے بجنور ہے ہی کتنی دور۔“

یہ تقاضا ہی ایسا تھا کہ نذیر احمد اپنی خطابت بھول گیا۔ اس نے اس وقت تو ماں کو کسی نہ کسی طرح ٹال دیا لیکن وہ سمجھ رہا تھا کہ ماں کو ابھی کئی دن رہنا ہے۔ وہ پھر اصرار کریں گی۔ وہی ہوا۔ وہ دوپہر تو کٹ گئی۔ رات ہوئی تو ماں نے موقع دیکھ کر پھر وہی ذکر چھیڑ دیا۔ یہ احساسِ جرم بھی اس کے دل میں پل رہا تھا۔ اس مرتبہ ماں کی دل شکنی اس سے گوارا نہ ہوئی اور اس نے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔

اب مسئلہ صفیۃ النسا کو سمجھانے کا تھا۔ کوئی عورت کتنی ہی روشن خیال ہو سوکن کے آنے پر چراغ پا تو ہوتی ہے لیکن صفیہ نے کمال کر دیا۔ اس نے الٹا نذیر احمد کو سمجھایا کہ ماں کی دل شکنی مناسب نہیں۔ اگر وہ نکاح کے لیے کہتی ہیں تو نکاح کر لیجیے۔

ماں کے کہنے پر مجبوراً اسے خاندان کی ایک خاتون سے عقدِ ثانی کرنا پڑا۔ دوسری بیوی بجنور میں رہی۔

بے پڑھی لکھی، گھریلو سی عورت اس کے مزاج اور اس کی قدر و قیمت کو کیا سمجھ سکتی تھی جبکہ وہ بجنور کبھی کبھار ہی چلا جاتا تھا۔ ایسی کب تک نبھتی۔ جلد ہی طلاق دے کر جان چھڑالی۔

اس صدمے سے دوچار ہونے کے بعد وہ پوری طرح تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اس کے کم از کم تین ناول مقبولیت کی حدوں کو چھونے والے تھے۔ اپنی اس انفرادیت کا علم بھی تھا کہ اس نے اردو میں ایک نئی صنف کو متعارف کرایا جو مروجہ داستانوں سے الگ اور انگریزی کی ناول نگاری سے قریب ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس نے اپنے قصوں میں زندگی کے حقیقی مسائل کو پیش کیا ہے۔ اس نے ایک اور قصے کی داغ بیل ڈالی۔ اس ناول کا نام ہی بتا رہا تھا کہ وہ کیا بیان کرنا چاہتا ہے۔ اس کا یہ ناول ”ابن الوقت“ کے نام سے سامنے آیا۔ بہت سے لوگوں نے کہا اس نے سرسید کو ”ابن الوقت“ کہا ہے۔ لیکن وہ سرسید کا اس طرح کا مخالف نہیں تھا جیسی مخالفت تنگ نظر علما کر رہے تھے۔ اس کی اصلاحی تحریریں تو ایک طرح سے سرسید تحریک کی معاون ثابت ہو رہی تھیں۔ اسے اگر اختلاف تھا تو سرسید کے مذہبی خیالات سے تھا۔ ان کی عقلیت پسندی سے تھا۔ وہ اس کا برملا اظہار بھی کرتا رہتا تھا۔

”بے شک میں نے سرسید احمد خان کی مخالفت کی ہے اور مخالفت بھی بری طرح تو کیا مجھے اس مخالفت پر معذرت کرنی چاہیے۔ اگر میں سمجھوں کہ سید احمد خان مجھ سے معذرت کے متوقع ہوں گے تو پہلا آدمی جو منصب رفارمری سے ان کے معزول کیے جانے کی رائے دے میں ہوں۔“

سرسید اور اس کا اختلاف یہی تھا کہ سرسید قوم کی قلبِ ماہیت کے خواہاں تھے اور اسے انگریز بنا دینے کے درپے تھے۔ نذیر احمد قومی خودداری کو برقرار رکھتے ہوئے ایک جائز حد کے اندر اصلاح چاہتے تھے۔ وہ انگریزی اور انگریزوں کے پیچھے بے تحاشا دوڑنے کے خلاف تھا۔ اپنے انہی خیالات کے فروغ کے لیے پند و موعظت کا سہارا لینے کے بجائے قصے کہانی کا سہارا لیا اور ”ابن الوقت“ تحریر کر دیا۔

یہ ناول اس کے سیاسی، معاشرتی، اور تعلیمی نظریات کا نچوڑ تھا۔ علی گڑھ تحریک کے جو خوش گوار و ناخوش گوار نتائج سامنے آرہے تھے۔ ابن الوقت میں وہ سب بیان کیے گئے۔ نذیر احمد نے اس دور کی ذہنی و معاشرتی کشمکش کی تصویر کھینچ کر رکھ دی۔

نذیر احمد نے ابن الوقت میں انگریزی تمدن کے نتائج دکھائے اور یہ ثابت کیا کہ انگریزوں کے مقلد عام معاشرے سے کٹ کر الگ ہوگئے۔ گھروں کو چھوڑ کر بنگلوں میں رہنے لگے۔ نمود و نمائش کے شائق ہوئے اور اسراف کے مرتکب ہوئے۔ بہ کثرت مصارف نے بہتوں کو دیوالیا کر دیا۔

یہ وہ معاشرتی امراض تھے جنہیں ”ابن الوقت“ کے ذریعے بیان کیا۔ اس حقیقت کا بھی انکشاف کیا کہ اس نقالی کے باوجود انگریز انہیں حقارت سے دیکھتے ہیں۔

اگر دیکھا جائے تو اکبر کی شاعری نذیر احمد کے انہی خیالات پر مشتمل تھی۔

”ابن الوقت کے پلاٹ میں ناول نگار کے ذاتی تجربات کا جتنا دخل ہے تخیل کا عمل اتنا ہی کم ہے۔ قصہ نہایت مختصر اور سادہ ہے۔ واقعات کی رفتار میں کوئی مصنوعی پیچ و خم پیدا نہیں کیا گیا۔ الجھنیں اور گرہیں بہت کم ہیں جہاں کوئی الجھن پیش آتی ہے بہت آسانی سے سلجھ گئی ہے۔ ناول نگار کی توجہ قصہ گوئی سے ہٹ کر بار بار مسائل کی تنقیح و تشریح یا کرداروں کی نفسیاتی تحلیل کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی نگاہ میں واقعات سے زیادہ کرداروں اور کردار سے زیادہ اجتماعی مسائل کو اہمیت حاصل ہے۔

”ان کے دیگر ناولوں کی طرح ابن الوقت میں بھی خارجی اور داخلی کیفیات کے محاکاتی بیان کی بہت اچھی مثالیں جابجا ملتی ہیں لیکن ان کی مرقع نگاری کا مقصد داستان طرازی یا ہیجان آفرینی نہیں۔ نذیر احمد کا مطمحِ نظر انسانی سیرت اور معاشرتی زندگی کی تصویر کشی ہے۔“

نذیر احمد کی آزاد خیالی کا دور گزر چکا تھا۔ بے پناہ مطالعے نے اس کے سامنے بہت سے مذہبی مسائل کو لا کھڑا کیا تھا۔ وہ ان مسائل پر غور کرتا رہا تھا اور اپنے نتائجِ فکر کو ایک مستقل تصنیف کی صورت میں مرتب کرنا چاہتا تھا۔ ابن الوقت میں ایک کردار کے ذریعے اس نے اپنے ان خیالات کا اظہار کر بھی دیا تھا۔

”میں نے مذہب کے بارے میں برسوں غور کیا ہے اور اب بھی اکثر غور کرتا رہتا ہوں۔“ ابن الوقت کی تکمیل و اشاعت کے بعد یہ خلش اور بڑھ گئی۔ وہ کوئی قدیمی اسکالر نہیں تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر ناول کا سہارا لیا۔

ناول کے لیے چند فرضی کرداروں کا وجود ضروری ہوتا ہے۔ صادقہ کا کردار پیش کیا جو نہایت نیک سیرت اور ہمیشہ سچے خواب دیکھتی ہے۔ ان خوابوں کی وجہ سے اسے آسیب زدہ سمجھ لیا گیا ہے۔ علی گڑھ کالج کے ایک طالب علم سید صادق سے اس کی شادی ہو جاتی ہے۔ یہ طالب علم ذہین ضرور ہے لیکن دوسرے نوجوانوں کی طرح آزاد خیال ہے۔ بالآخر شادی کے بعد صادقہ کا طویل مذہبی خواب اس کے تمام مذہبی شکوک رفع کر دیتا ہے۔

اس نے دو ناول فسانہ مبتلا اور ایامیٰ بھی لکھے۔ دونوں ناول معاشرتی زندگی کے دو اہم مسائل یعنی تعدادِ ازواج اور عقد بیوگان سے متعلق تھے۔ اس طرح بالواسطہ طور پر یہ بھی مذہب ہی سے متعلق تھے۔

نذیر احمد نے ان ناولوں کے ذریعے وہ خدمت انجام دی کہ اس کے قلم اٹھانے کے بعد اردو میں باقاعدہ ناول نگاری کا آغاز ہوگیا۔

عمر آگے بڑھتی گئی۔ قصہ نگاری سے دل اکتایا تو مذہبی تصانیف کی طرف قدم بڑھایا۔ اسے عربی زبان و ادب پر جو قدرت حاصل تھی اس کا تقاضا تھا کہ وہ قرآن کے ترجمے کی طرف متوجہ ہو۔ اس سے بہتر کوئی اور یہ کام انجام بھی نہیں دے سکتا تھا۔

وہ ابتدا میں ترجمہ قرآن کا مخالف تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ میرے مذہب میں قرآن کا ترجمہ گناہ ہے کیونکہ ترجمے میں معجز بیانی نہیں آسکتی۔“

”فہم مطالب کے ساتھ متن قرآن کا براہِ راست مطالعہ مسلمان بننے کی اولین شرط ہے۔“

اس کا یہی عقیدہ تھا جو اسے تعلیمی نصاب میں عربی کو شامل کرنے پر زور دیتا تھا لیکن یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ روز بروز عربی کا رواج ختم ہوتا جا رہا تھا۔ قرآن کو اصلی متن کے ساتھ پڑھنے والے کتنے رہ گئے تھے۔ وقت نے ترجمے کی ضرورت ثابت کر دی تھی جبکہ جو تراجم رائج تھے وہ ایک صدی پرانے تھے اور قرآن فہمی کے مقصد کو پورا نہیں کرتے تھے۔ ایک بامحاورہ ترجمے کی اشد ضرورت تھی۔ وہ حافظ بھی تھا، عربی کا عالم بھی اور اردو کا ادیب بھی۔ وہ بامحاورہ ترجمے کا سب سے زیادہ اہل تھا۔

یہ کام اتنا بڑا تھا یا وہ اسے اتنی اہمیت دیتا تھا کہ اپنی کوتاہی کو محسوس کرتے ہوئے ایسے معاونوں کی خدمات حاصل کیں جو جید عالم تھے۔ ایک مولوی محمد عبدالرحمٰن اور دوسرے ایک نابینا عالم حافظ عبدالوہاب۔ کام... کا آغاز ہوگیا۔ مولوی محمد اور وہ آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ بیچ میں ایک میز حائل تھی۔ نذیر احمد کے ہاتھ میں قرآن مجید، گرداگرد تراجم و تفاسیر اور کتبِ لغت، نذیر احمد ایک آیت کا ترجمہ بولتا اور مولوی محمد اسے قلم بند کر لیتے۔ ایک جگہ وہ رک گئے۔ انہیں اس ترجمے سے اختلاف تھا جو نذیر احمد نے کیا تھا۔ دونوں میں بحث چھڑ گئی۔ جب دونوں کسی نتیجے پر نہیں پہنچے تو لغت اور کتبِ تفاسیر سے رجوع کیا گیا۔ نذیر احمد کا ترجمہ درست تھا۔ مولوی محمد نے اسے درست تسلیم کر لیا۔

معمول اسی طرح جاری رہا۔ دو سال کے عرصے میں ترجمہ مکمل ہوگیا۔ اس پر نظرِ ثانی بھی ہوگئی۔ اس کے ایک عقیدت مند مولوی فتح محمد خان جالندھری کا خط آیا۔ ترجمے کو بہ اصرار منگوایا تھا کہ اشاعت تک کا انتظار کرنا گوارا نہیں ہو رہا تھا۔ آدمی لائق تھے اس لیے نذیر احمد نے مسودہ روانہ کر دیا کہ اچھا ہے اگر کوئی کوتاہی ہوئی تو سامنے آجائے گی۔

مولوی فتح محمد نے اس ترجمے پر تنقیدی نظر ڈالی اور ایک کوتاہی کی طرف توجہ دلائی۔

”آپ نے ترتیب الفاظ اور خود الفاظ کا خیال نہیں رکھا۔ اس سے اصل مطلب میں تو فرق نہیں آیا لیکن ترجمے کی خوبی میں فرق پڑتا ہے۔“

”نذیر احمد نے اس تنقید کو اپنی کم علمی قرار دیا اور اس کوتاہی کو دور کرنے کے لیے پورے ترجمے کو پھر تیسری بار دیکھا۔

جب کتابت کا مرحلہ آیا اور کاتب کے لیے مسودہ نقل کیا جانے لگا تو چوتھی مرتبہ پھر نظر ثانی کی گئی۔ پانچویں مرتبہ اور پھر چھٹی مرتبہ پروف ریڈنگ کے وقت آخری بار ترمیم و اصلاح ہوئی۔

نذیر احمد کا خاص اسلوب بامحاورہ اور شگفتہ زبان اس ترجمے میں بھی نظر آتی تھی۔ اس کے باوجود بعض حلقوں میں اس کی شدید مخالفت ہوئی۔ ان مخالفوں میں علمائے قدیم شامل تھے جو نذیر احمد کی روشن خیالی اور سرسید کی ہم نوائی کی وجہ سے پہلے ہی چراغ پا تھے۔

بعض خامیاں یقیناً ایسی تھیں جو واقعی لائقِ تنقید تھیں۔ یہ تھا ان کا محاورے استعمال کرنے کا شوق اور کرخنداری زبان اور عوامی بول چال کے الفاظ کا استعمال۔ یہ الفاظ ناولوں میں تو لطف دے جاتے تھے لیکن قرآن کے ترجمے میں بے محل معلوم ہوتے تھے۔

اس کے ناولوں کی طرح اس ترجمے کے ساتھ بھی یہ ہوا کہ اس کی تقلید میں بہت سے مترجم پیدا ہوگئے۔ اس کے ناولوں کے بعد کئی اصلاحی ناول نگار سامنے آگئے تھے۔ اس کے ترجمے کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ مرزا حیرت دہلوی، فتح محمد جالندھری، مولوی عبدالحق (مفسر تفسیر حقانی) اور مولوی عاشق الٰہی میرٹھی کے ترجمے یکے بعد دیگرے شائع ہوئے۔ نذیر احمد کے چراغ سے کئی چراغ جلے۔

”جب مولوی نذیر احمد صاحب کے ترجمے کی اشاعت شروع ہوئی۔ اس وقت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے فرزند حضرت شاہ رفیع الدین کے ترجمے کو ایک سو نو برس گزر چکے تھے۔ اس عرصے میں اہلِ سنت میں سے بظاہر کسی عالم کو نیا ترجمہ کرنے کا خیال پیدا نہیں ہوا تھا مگر جب ترجمہ نذیریہ کی اشاعت روز بہ روز بڑھنے لگی تو دفعتاً بہت سے اصحاب قرآن مجید کی خدمت کے لیے مولوی نذیر احمد کی تقلید پر کمربستہ ہوگئے اور چند سال کی مدت میں متعدد ترجمے چھپ کر تیار ہوگئے لیکن ان ترجموں نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا کہ کہیں کہیں سے ترجمہ نذیریہ کے الفاظ بدل دیے تاکہ چند الفاظ کی تبدیلی سے ایک مستقل مترجم قرآن کہلانے کا ممتاز درجہ حاصل کرسکیں...... مختصر یہ کہ شاہ صاحب (شاہ ولی اللہ) کے خاندان کے بعد ہندوستان کے عام مسلمانوں کے لیے قرآن کریم کی جو خدمت اس بزرگ سے بن آئی ہمارے نزدیک کسی سے بن نہیں آئی۔“ (مولانا حالی)

1906ء میں اس نے ”الحقوق والفرائض“ شائع کی۔ اور اسی سال اس کی دو جلدیں مزید شائع کردیں، یہ ضخیم کتاب ایک ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل تھی ان صفحات میں حقوق و فرائض کی تین قسمیں بیان کی گئی تھیں۔ حقوق اللہ، حقوق العباد، حقوق النفس۔

یہ کتاب دراصل ترجمہ القرآن کی کاوشوں کا ثمر تھا۔ اس ترجمے کے سلسلے میں انہیں احادیث کی کتب بھی پڑھنی پڑی تھیں۔ غرض اسی کتاب سے متعلق بہت سا مواد ان کے پاس جمع ہوگیا تھا لیکن ایک مدت تک وہ اس کی تدوین کی طرف راغب نہ ہوسکے تھے۔

اس کی جامعیت کا عالم یہ تھا کہ تینوں جلدیں اسلامی زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی تھیں۔ ہر پہلو پر دینی احکام اس تفصیل سے بیان کیے گئے تھے کہ کوئی معمولی سا مسئلہ بھی ایسا نہیں تھا جو زیرِ بحث نہ آیا ہو۔

یہ کتاب دراصل ترجمہ القرآن کی تفسیر تھی جو یہ بتاتی تھی کہ زندگی کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں جس کا حل قرآن میں تلاش نہ کیا جاسکے۔ یہ کتاب اسلامی فقہ کی تشکیلِ جدید کی اولین کوشش تھی۔ یہ کتاب ادبی اعتبار سے بھی شہرت اختیار کرگئی۔ علم فقہ ایک خشک مضمون ہے لیکن نذیر احمد کے سحر آفریں قلم نے ہر طرف لفظوں کے پھول کھلا دیے حتیٰ کہ اپنی عادت و اسلوب کے مطابق مزاح و ظرافت کے پہلو بھی نکال لیے۔ ایک جگہ لکھا۔

”حج تو اپنے اوپر فرض نہیں۔ لاٹھی کندھے پر دھری اور حج کو نکل کھڑے ہوئے۔ مانگتے کھاتے پہنچے، وہاں کسی گانٹھ کے پورے عقل کے ادھورے موٹے مالدار کے ساتھ ہولیے۔ اسی نے جہاز کا کرایہ بھرا ہلدی لگی نہ پھٹکری، مفت میں حج ہوگیا۔ مدینے گئے، لوٹ کر بمبئی میں سمندر کے کھارے پانی سے زم زمیاں بھریں، دو چار مسقط کی کھجوریں خریدیں۔“

جا بہ جا چٹکلے اور لطیفے بھی بیان کرتے جاتے ہیں۔

ان کی بے محابا تقاریر نے ہمیشہ مخالفتوں کا طوفان کھڑا کیے رکھا۔ 1905ء تک تو ان کے اعصاب اتنے مضبوط تھے کہ وہ ان طوفانوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے لیکن پھر کانفرنسوں اور جلسوں سے کنارہ کش ہوگئے۔ ترجمۃ القرآن کے بعد تو وہ بالکل ہی مذہبی تصنیفات میں مشغول ہوگئے۔ ترجمہ کیا پھر الحقوق لکھی۔ ”اجتہاد“ تحریر کی۔ ان کتابوں کو سراہا بھی گیا اور ان کے خلاف آوازیں بھی آئیں لیکن یہ آوازیں بے جان سی تھیں لیکن ایک کتاب ایسی ان کے قلم سے نکل گئی کہ چاروں طرف سے تکفیر کی آوازیں آنے لگیں۔ بے جان آوازوں میں جان پڑ گئی۔ علماء نے فتویٰ دے دیا کہ عام مسلمان مصنف سے معاشرتی تعلقات منقطع کرلیں۔

ایک پادری نے ”امہات مومنین“ کے نام سے کتاب لکھی تھی جس میں رسول کریم اور ازواج مطہرات کی شان میں جا بہ جا گستاخانہ کلمات ادا کیے گئے تھے۔ مسلمانوں نے اس پر احتجاج کیا اور کتاب ضبط ہوگئی۔

اس کتاب کو ضبط ہوئے دس سال گزر گئے تھے۔ لوگوں کو یاد بھی نہیں رہا تھا کہ یہ کتاب بوسیدہ نسخے کی صورت میں نذیر احمد کے ہاتھ لگ گئی۔ تجسس کے عالم میں وہ اسے پڑھنے بیٹھ گیا۔ ایک جگہ آکر اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ مصنف نے اپنے دعوے کے جواب میں خود اس کا نام لے دیا تھا۔ عبارت اس کے سامنے تھی۔

”اردو خواں“ ”قصہ مبتلا“ حافظ نذیر احمد (ڈپٹی نظیر احمد) سے درس لے چکے ہیں اور کثرتِ ازواجی خرابیوں کو دیکھ چکے ہیں۔“

نذیر احمد نے اپنے ناول ”فسانہ مبتلا“ میں ہیرو کی دو شادیاں دکھائی تھیں جن کی وجہ سے گھر کا نظام تلپٹ ہوگیا تھا لیکن اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ ایک بیوی سلیقہ مند تھی۔ اس نے آتے ہی نظام درست کردیا۔ یہی بتانا نذیر احمد کا مقصد تھا کہ اگر گھر کی عورت میں سلیقہ ہو تو کم آمدنی میں بھی گھر چندن بن سکتا ہے۔

پادری مصنف نے اس مقصد کو بالائے طاق رکھ دیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ جس طرح نذیر احمد کثرت ازواج کے مخالف ہیں اسی طرح وہ بھی کثرتِ ازواج کا مخالف ہے اور اسی لیے حضور اکرمؐ کے ایک سے زیادہ نکاحوں پر قلم اٹھا رہا ہے۔ یہاں تک بھی درست تھا لیکن اس نے تو ازواج مطہرات کی شان میں اتنے نازیبا کلمات ادا کیے کہ کوئی مسلمان برداشت نہیں کرسکتا۔

وہ جھنجلا کر پادری کی اس کتاب کا جواب لکھنے بیٹھ گیا۔ کچھ غصہ کچھ جھنجلاہٹ کچھ عمر کا تقاضا کچھ مسخرا اڑانے کی عادت۔ وہ یہ بھول گئے کہ یہ ایک علمی تصنیف ہے۔ انہوں نے تحقیقی کاوش میں جائے بغیر پیش یا افتادہ دلائل کی بنیاد پر اپنی لفاظی سے ایک بے ڈول عمارت کھڑی کردی۔ بے محل شوخی اور بد مزاقی ہر سطر میں نظر آتی تھی۔ غیر متعلق واقعات بھی کثرت سے نظر آتے تھے۔ متبدل محاورات استعمال اس کثرت سے ہوا تھا جسے کوئی مسلمان روا نہیں رکھ سکتا۔

نقل کفر کفر نہ باشد کے تحت نذیر احمد کی چند گستاخیاں یہ ہیں۔

”پیغمبر صاحب کو اس عبداللہ سے کجی مار کی طرح بڑی سخت تکلیفیں پہنچی تھیں۔

”ہم کو امہات المومنین کے لحاظ سے بھی پیغمبر صاحب کے نکاحوں پر نظر کرنی چاہیے کہ کہیں یہاں پانی نہ مرتا ہو۔“

”اسلام کے حق میں یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ پیغمبر صاحب کی اولاد ذکور ان کے بعد زندہ نہ رہی۔ بیٹیوں میں ایک بیٹی زندہ رہیں تو ان کی نسل کی بدولت اسلام میں یہ تفرقہ پڑا کہ مسلمان سنی اور شیعہ دو فریق ہوگئے جن میں ہمیشہ جوتیوں میں دال بٹتی رہی۔ بیٹا زندہ رہتا تو شاید پسر نوح ثابت ہوتا۔“

اس سے زیادہ نمونے نقل کرنے کی ہم میں ہمت نہیں۔

چند عقیدت مندوں نے یہ کہہ کر نذیر احمد کا دفاع کرنے کی کوشش کی کہ نذیر احمد نے ایسی زبان شعوری طور پر اختیار نہیں کی بلکہ ”ناول“ لکھتے لکھتے جس شوخی کی عادت پڑ گئی تھی وہ یہاں بھی اختیار ہوگئی۔

یہ کہنے سے طوفان دب نہیں سکتا تھا۔ انہوں نے تو پادری کی کتاب سے بڑا جرم کیا تھا۔

مولویوں کا طبقہ پہلے ہی ان کے خلاف تھا۔ یہ خوب اور درست موقع ملا۔ ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا کفر کے فتوے جاری ہوئے۔ جو طلبہ ان کے پاس پڑھنے آتے تھے انہوں نے آنا چھوڑ دیا۔ ان کا گھر سے باہر نکلنا محال ہوگیا۔ ان کا مقصد تحریر خواہ کتنا ہی نیک ہو زبان کچھ اور کہتی تھی لہٰذا اپنا

دفاع کرنا مشکل تھا۔ جو پُرخلوص دوست تھے وہ چھپ چھپ کر اس کے پاس آتے تھے اور سمجھاتے تھے کہ عام مسلمانوں کی جو دل شکنی ہوئی ہے اس کا کچھ ازالہ کیا جائے۔ آخر کئی دن کی کوششوں کے بعد نذیر احمد کو اپنی غلطی کا کچھ احساس ہوا۔ انہوں نے آنے والے صاحب کے سامنے اعتراف کیا۔

’’میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھ سے غلطی ہوگئی لیکن اب اس کا ازالہ کیسے ہو۔ تیر تو کمان سے نکل گیا۔‘‘

’’وہی تو میں پوچھ رہا ہوں۔ کس طرح ازالہ کروں۔‘‘

’’رفع شر کے لیے یہی مناسب ہے کتاب کی تمام جلدیں آپ علما کے حوالے کردیں اور یہ ان پر چھوڑ دیں کہ وہ کیا کرتے ہیں۔‘‘

’’میں تیار ہوں لیکن اس شرط کے ساتھ کہ جمعہ کے دن جامع مسجد میں یہ اعلان کیا جائے کہ مصنف نے اپنی غلطی کا اعتراف کرلیا ہے۔‘‘

ان صاحب نے اس شرط کو قبول کرلیا۔ نذیر احمد نے تمام کتابیں ان صاحب کے حوالے کردیں۔ یہ بھی اجازت دے دی کہ دکانداروں سے کتابیں واپس لے لیں۔ جس کسی کے پاس کتاب ہو وہ بھی واپس لے لی جائے۔

ابھی علمائے دہلی یہ فیصلہ نہیں کرپائے تھے کہ کتاب کی جلدوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے کہ ندوۃ العلما کا سالانہ اجلاس شہر دہلی میں ہونا قرار پایا۔ علماء کو ایک راستہ مل گیا۔ یہ طے ہوا کہ اس اجلاس میں جو علمائے کرام تشریف لائیں یہ معاملہ ان کے سامنے رکھا جائے۔

وہ گھر میں بیٹھا تمام حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔ شہر دہلی میں علما کی آمد شروع ہوچکی تھی۔ کوئی اس سے ملنے نہیں آیا تھا۔ اسے اپنی بے عزتی کا شدت سے احساس ہورہا تھا۔ اسے کسی اجلاس میں بھی طلب نہیں کیا گیا تھا۔

شہر کی جامع مسجد میں اعلان کردیا گیا کہ مصنف مذکور نے توبہ کرلی ہے اور کتابیں علما کے حوالے کردی گئی ہیں۔ لوگوں نے خوشی کا اظہار کیا کہ کوئی مسلمان اگر توبہ کرلے تو اسے معاف کردینا چاہیے۔

علما نے طے کیا کہ ندوۃ العلما کا جو اجلاس ہونے والا ہے اس میں یہ معاملہ رکھا جائے کہ کتابوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔

یہ معاملہ اجلاس میں پیش ہوا۔ اس پر بحث ہوئی۔

علما اور تمام شرکا نے یہ تحریر کیا ’’چونکہ مصنف نے اپنی غلطی کا اعتراف کرلیا ہے اور کتابیں علما کے حوالے کردی ہیں لہٰذا اب ان پر کوئی الزام نہیں۔‘‘

یہ خبر جونہی نذیر احمد تک پہنچی انہوں نے اصرار کے ساتھ کہا کہ ان کتابوں کو جلا دیا جائے۔ علما کو اب بھی اس رائے سے اتفاق نہیں تھا لہٰذا ایک جلسہ پھر منعقد کیا گیا اور یہ طے ہوا کہ جب مصنف کا اصرار ہے تو اس کی تائید ہونی چاہیے۔

رات کے دو بج رہے تھے کہ کتابوں کو ڈھیر کی صورت دے کر مٹی کا تیل چھڑکا گیا اور آگ لگادی گئی.... صبح نہیں ہوئی تھی کہ تیز آندھی چلی۔ کتابوں کی جلی ہوئی راکھ اڑ گئی۔ پھر تیز بارش ہوئی جگہ صاف ہوگئی۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ رہے نام اللہ کا۔

☆☆☆

جب وہ حیدرآباد کی ملازمت سے سبک دوش ہونے کے بعد گھر بیٹھے تھے تو ان کے پاس لاکھوں کا سرمایہ تھا۔ مختصر سی عیال داری تھی اور اس کا بوجھ بھی ان پر نہیں تھا۔ ایک بیٹا تھا جو حیدرآباد میں تعلقہ دار تھا۔ دونوں بیٹیوں کی شادی ہوچکی تھی گھر میں تھا کون۔ دکانوں اور مکانوں کے کرائے کے علاوہ حیدرآباد سے چھ سو روپے پنشن ملتی تھی۔ مسلمانوں کو تجارت کی ترغیب دینے کے لیے انہیں سرمایہ فراہم کرتے تھے اور اس پر منافع لیتے تھے۔ اس پر بود و باش کا عالم یہ تھا کہ نہ کرتہ نہ ٹوپی نہ پاجامہ، ایک چھوٹی سی تہمد کمر سے باندھی رہتی تھی۔ باہر کے لباس میں البتہ وضع داری برتتے۔ سفید اچکن بدن پر ڈال لیتے۔ سر پر ترکی ٹوپی یا سفید صافہ۔ پیروں میں ترکی کا سلیم شاہی۔ رعبِ علم سے راستہ طے کرتے پیدل چلتے رہتے۔

ان کی حیثیت کا کوئی آدمی پیدل چلتا دکھائی نہیں دیتا تھا لیکن ان کے پاس نہ گھوڑا تھا نہ گاڑی۔ شام کی تفریح کے لیے جانا ہوتا تو پیدل، دکانوں کا کرایہ وصول کرنے کے لیے نکلتے تو پیدل۔

اس کنجوسی کے باوجود اہل و عیال کے لیے دریا دل تھے۔ ان کی ضروریات کا خیال رکھتے تھے۔ اعزہ کے علاوہ غریب ضرورت مندوں کی مدد کرتے رہتے تھے۔ اکثر یہ بھی ہوتا تھا کہ لوگ ان سے بڑی بڑی توقعات وابستہ کرلیتے تھے اور جب اتنا نہیں ملتا تھا تو باہر نکل کر ان کی کنجوسی کی داستانیں بیان کرتا۔ جو واقف حال نہیں تھے انہیں بخیل کے سوا کیا کہہ سکتے تھے ورنہ حقیقت تو یہ تھی کہ جہاں خرچ کرنا



ہوتا تھا خوب خرچ کرتے تھے۔ تعلیمی اداروں کو جھولیاں بھر بھر کے چندے دیا کرتے تھے کیونکہ قوم کی تعلیمی اصلاح و ترقی ان کے پیشِ نظر تھی۔

محسن الملک جن سے حیدرآباد کے قیام کے دوران شکررنجی ہوگئی تھی، نذیر احمد کے بارے میں یہ کہے بغیر نہ رہتے تھے۔

’’آپ کو معلوم ہے کہ مولوی نذیر احمد صاحب سے زیادہ مدرستہ العلوم میں نہ کسی چندہ دینے والے کی رقم ہے اور نہ کسی دوسرے طریقے سے امداد دینے والے کی مدد ان سے زیادہ ہے۔ انہوں نے بارہا دو دو اور تین تین ہزار روپیا مدرسے کی امداد کے لیے اپنی جیبِ خاص سے دیا۔‘‘

انجمن حمایت اسلام کی عمارت میں جو کمرے بنوائے اس کی لاگت پینتیس ہزار بتائی جاتی ہے جو اس وقت بہت بڑی رقم تھی۔ طلبہ کی بھی حصولِ علم کے شوق کی ترغیب کے لیے مالی امداد کرتے رہتے تھے۔

ان کی بخیلی پر لوگوں کو اتنا یقین آچکا تھا کہ ایک اچھے بھلے معقول آدمی نے سرسید سے شکایت کی کہ اس قدر مقدرت ہونے کے باوجود نذیر احمد نے قومی تعلیم میں کچھ مدد نہیں کی۔ سرسید کو ان صاحب کی یہ بات ناگوار ہوئی۔ انہوں نے ان چندوں کی تفصیل بیان کی جو وہ ابتدا سے مدرسے میں دیتے رہے تھے۔

’’یہ شخص ہماری قوم کے لیے باعثِ فخر ہے۔ اس کی نسبت پھر ایسا لفظ زبان سے نہ نکالنا۔‘‘

بخیل لوگوں کی زندگی میں دیکھا گیا ہے کہ ان کی خانگی زندگی خوش گوار نہیں ہوتی۔ بیوی اور اولادیں بدظن ہی رہتی ہیں لیکن ان کی گھریلو زندگی خوشگوار تھی۔ وہ اس لیے کہ انہوں نے اولاد کی ضرورتوں کو بخیلی کی بھینٹ نہیں چڑھایا۔ بیوی ایثار پسندی اور کنبہ پروری میں مشہور تھیں۔ وہ دل کھول کر خرچ کرتی تھیں۔ نذیر احمد نے سمجھانے اور اسراف سے روکنے کی نصیحتیں کرنے کے سوا کبھی سختی سے کام نہیں لیا۔

گھر کے ملازموں کے ساتھ بھی رویہ انسان دوستی کا تھا۔ کئی غریب لڑکوں کو اپنے پاس رکھا اور انہیں زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا۔ ان کے شادی بیاہ کیے۔

☆☆☆

نذیر احمد کی جسمانی صحت ہمیشہ سے اچھی رہی تھی۔ وقت کی پابندی اور پیدل چلنے کی عادت نے انہیں کبھی بیمار نہیں ہونے دیا تھا۔ آخری عمر میں تو ندضرورت سے زیادہ نکل آئی تھی لیکن مرتے دم تک پیدل چلنے کی عادت نہیں چھوڑی۔ شام کے وقت ٹاؤن ہال کی لائبریری میں بلاناغہ اخبار پڑھنے جاتے تھے۔ یہ لائبریری بھی انہی کی کوششوں سے قائم ہوئی تھی۔ اس لائبریری میں مولوی ذکا اللہ اور دوسرے دوست بھی جمع ہوجاتے تھے۔ خوش گپیاں ہوتی تھیں، ادبی مباحثے ہوتے تھے۔ واپسی میں ایک دکان پر ٹھہر کر اس کے بیٹے کو پڑھاتے تھے۔

اس جاہ و ثروت کے باوجود کتب بینی اور درس و تدریس کا شوق کم نہیں ہوا تھا۔ مسجد فتح پوری کے مولویوں کی جماعت اور مختلف کالجوں کے طالب علم عربی کا درس لینے آتے تھے۔ ابھی ایک جماعت رخصت ہوئی تھی کہ دوسری جماعت آگئی۔ مسجد کے ملا گئے تھے کہ کشمیری طلبہ آگئے۔

عمرِ عزیز آرام چاہتی تھی لیکن عمر بھر محنت کی تھی، آرام کیسے کرتے۔ دوپہر کا وقت ہے۔ دہلی کی گرمیاں ہیں اور درس دینے میں مشغول ہیں۔

یہ بہار اس وقت جاتی رہی جب ’’امہات الامہ‘‘ قضیہ کھڑا ہوا۔ تکفیر کے فتوے جاری ہوئے تو طلبہ نے ان کے پاس آنا چھوڑ دیا۔ زندگی بھر کا مشغلہ ہاتھ سے جاتا رہا۔ شام کی سیر بھی جاتی رہی۔ لائبریری جانا بھی چھوٹ گیا۔ بے توقیری کے احساس نے لکھنے پڑھنے سے بھی جی اچاٹ کردیا۔ قلم ایسا ہاتھ سے رکھا کہ پھر نہ اٹھایا۔

جس وقت یہ ہنگامہ کھڑا ہوا اور کسی نے آکر بتایا کہ ’’امہات الامہ‘‘ کی جلدیں جلادی گئی ہیں تو وہ ’’مطالب القرآن‘‘ کی تصنیف میں مشغول تھے۔

اس کتاب کا خاکہ بھی ان کے ذہن میں ’’ترجمہ القرآن‘‘ کے زمانے میں ہی آگیا تھا۔

’’ترجمے پر ہماری کوشش کا خاتمہ نہیں ہوگیا۔ اگر خدا کو منظور ہے اور حیات مستعار باقی ہے تو ہم نے کلامِ الٰہی کے اور مفید پیرائے بھی سوچ رکھے ہیں۔‘‘

یہ اسی کتاب ’’مطالب القرآن‘‘ کی طرف اشارہ تھا۔

امہات الامہ کے ہنگاموں کے بعد کچھ ایسے دل برداشتہ ہوئے کہ پہلا حصہ بھی ادھورا چھوڑ دیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ضعفِ بصارت نے تنگ کرنا شروع کردیا تھا اور ہاتھوں میں رعشہ آگیا تھا۔

اب عالم یہ تھا کہ مکمل گوشہ نشینی تھی۔ کتابیں سرہانے دھری ہیں۔ پڑھنے کا یارا نہیں لیکن یہ ڈھارس تو ہے کہ کتابیں قریب ہیں۔

خلوت نشینی کا یہ موسم میسر آیا تو اپنی کوتاہیاں یاد آئیں۔ نفس کا احتساب کرنا شروع کیا۔ تزکیہ باطن کی طرف متوجہ ہوئے۔ کفر کے فتووں سے نہ ڈرنے والا آخرت میں پوچھ گچھ سے ڈرنے پر مجبور ہوگیا۔ بذلہ سنجی رخصت ہوگئی۔ اب تو آخرت کا خیال تھا اور آنسوؤں کی برسات تھی۔ پہلے پیری مریدی کے قائل نہیں تھے لیکن جب دل کی آنکھیں روشن ہوئیں تو اسلامی تصوف کی حقیقت کھل گئی۔

ایک دن جو جلال آیا تو خواجہ حسن نظامی کے خلوت کدے میں پہنچ گئے۔ حال یہ تھا کہ قرآنی آیات زبان پر تھیں اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

''آپ تصوف کو کیا سمجھتے ہیں۔ میرے سامنے تقریر کیجیے۔''

''ڈپٹی صاحب، آپ کے سامنے میں کیا تقریر کروں گا۔''

''میری ساری زندگی تو اندھیرے میں گزری ہے۔ چند ناول لکھنے کے سوا میں نے کیا کیا ہے۔ آپ تصوف کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں۔ مجھے اس روشنی سے آگاہ کیجیے۔ دیکھوں تو سہی کہ جو میں نے سمجھا ہے کیا وہی صحیح ہے۔''

جو شخص ''انا'' کے خول میں بند تھا۔ عالمانہ غرور اس کی آواز کی گرج سے ظاہر ہوتا تھا آج وہ اس انداز میں مخاطب ہو رہا تھا۔ حسن نظامی کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں تھی کہ صنم کدہ پندار میں ٹوٹ پھوٹ شروع ہو چکی ہے۔

خواجہ حسن نظامی نے تصوف کے نکات بیان کرنے شروع کیے۔ کئی گھنٹوں کی نشست کے بعد نذیر احمد اٹھ کھڑا ہوا۔

''بھائی اب اجازت دیجیے۔ ذرا دکانوں کا ایک چکر لگالوں۔ ترجمۃ القرآن کی خبر لوں۔ کتنا فروخت ہوا کتنا رہ گیا۔''

''سواری کا بندوبست کردوں۔''

''یہ کھڑاگ تو کبھی پالا ہی نہیں۔ اسّی سے متجاوز ہوگیا ہوں اب بھی میری ٹانگیں میری سواری ہیں۔''

''یہی آپ کی جسمانی صحت کا راز ہے۔''

''ہاں ہے تو مگر کبھی نہ کبھی حکیم صاحب کے قابو میں آئیں گے ضرور۔''

وہ اس صحبت کو خیر باد کہہ کر اٹھ گیا۔

چند روز نہیں گزرے تھے کہ وہ خواجہ حسن نظامی کی خدمت میں ایک مرتبہ پھر پہنچ گیا۔ خدا والوں کی باتیں پھر چھڑ گئیں۔ ان کی آنکھیں پھر بھیگ گئیں۔

یہ صحبتیں جاری رہیں۔ نہ جانے کب تک جاری رہتیں کہ ''حکیم صاحب'' کی ضرورت پڑ ہی گئی۔ بیماری نے رستہ کیا دیکھا کہ بستر پر لٹادیا۔

انہیں یقین تھا کہ اس بیماری اور حکیم صاحب سے جو نجات مل جائے گی لیکن افاقہ ہوتا نظر نہیں آرہا تھا۔ گھبرا کر حکیم بدل لیا لیکن اب بھی ڈھاک کے تین پات تھے۔ لیٹنے کی عادت نہیں تھی لیکن لیٹے تھے۔ کبھی کبھی وہ رجسٹر منگوا لیتے تھے جس پر جائداد کا اندراج تھا۔ کرایوں کی رقوم درج تھیں لیکن دلچسپی ختم ہوگئی تھی۔ ایک نظر دیکھ کر ایک طرف رکھ دیتے تھے۔ کہیں کوئی کمی نظر آتی تو سراج احمد کو بلوا لیتے جو ان کی طرف سے حساب کتاب کا اندراج کرنے لگا تھا۔

وہ کبھی بیمار نہیں پڑے تھے اس لیے عزیز واقارب کو بھی تشویش تھی۔ بشیر احمد بھی باپ کی تیمارداری کے لیے آگئے تھے۔ داماد اور بیٹی بھی قریب تھے۔

بشیر الدین احمد نے بیماری کو طول کھینچتے دیکھ کر تجارتی کاروبار اپنے ہاتھ میں لے لیا لیکن یہ وقتی طور پر تھا کیونکہ سب کو یقین تھا کہ وہ جلد صحت یاب ہو جائیں گے۔

حالت اتنی مخدوش نہیں تھی کہ کوئی فکر مند ہوتا لیکن 27 اپریل 1912ء کو اچانک فالج کا حملہ ہوگیا۔ اب بات فکر کی تھی۔

وہ معذوری کی یہ زندگی صرف ایک ہفتہ جھیل سکے۔ 3 مئی کو جمعہ کے دن اپنے رب کے حضور پہنچ گئے۔ یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ شہر تھا کہ امڈا چلا آتا تھا۔ اسی ہجوم میں ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی اور جسدِ خاکی کو گورستان حضرت خواجہ باقی باللہ میں دفن کردیا گیا۔

انہوں نے پوری زندگی میں بہت کچھ لکھا لیکن قدرت نے انہیں ناول نگاری کے لیے پیدا کیا تھا۔ ان کے تخلیقی جوہر اس میدان میں کھلے۔ دنیا نے انہیں یاد رکھا تو اردو کے پہلے ناول نگار کی حیثیت سے یاد رکھا۔ (یہ الگ بات ہے کہ کچھ لوگ ان کے ناولوں کو طویل کہانی قرار دے کر مرزا ہادی رسوا کو اولین ناول نگار قرار دیتے ہیں) انہوں نے قدیم داستانوں کی مصنوعی اور تخیلی فضا کی جگہ حقیقی اور واقعاتی فضا پیدا کی۔ یہی ان کی عظمت ہے جسے کوئی نہیں جھٹلا سکتا۔

ماخذات: اس مضمون میں بیان کردہ تمام واقعات ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کی کتاب مولوی نذیر احمد دہلوی سے ماخوذ ہیں۔
نذیر احمد کی کہانی ـــ مرزا فرحت اللہ بیگ



# سینڈی

ابن کبیر

سائنس وٹکنالوجی کتنی ہی ترقی کرلے، ستاروں پر کمند بھی ڈال لے، پاتال کی کتنی ہی خبر لے آئے مگر قدرت کے آگے سینہ سپر نہیں ہوسکتا۔ اس کی تازہ مثال امریکا میں آیا طوفان ہے۔ اتنی سرعت اور ایسے ایسے پینترے بدلتا ہوا آیا کہ کسی طور پر سوفیصد اندازہ لگایا نہیں جاسکا اور امریکا کے کئی شہر عبرت کا نمونہ نظر آنے لگے۔

اسی تباہی کی کوکھ سے ابھری دلچسپ داستان، روداد [illegible]

20 اکتوبر 2012ء، کنگسٹن، جمیکا:

بوڑھے نے انگڑائی لی اور جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ وہ چھاؤں تلے بیٹھا تھا۔ سامنے ساحل تھا، جس کی ریت پر سنہری دھوپ چمک رہی تھی۔ سمندر پُرسکون تھا۔ دُور، گہرے پانیوں پر تیرتی کشتیاں انگلیوں پر گنی جاسکتی تھیں۔ بیشتر کشتیاں کنارے سے لگی سمندری لہروں کو حسرت سے تک رہی تھیں۔

''اِن کشتیوں کے ملاح بھی میری طرح اس پل اونگھ

رہے ہوں گے۔" بوڑھے نے جمائی لیتے ہوئے سوچا۔ آج چہل پہل معمول سے کم تھی۔ سیاحوں نے ساحل کا رخ نہیں کیا تھا۔ فقط چند ہی جوڑے چھتری تلے بیٹھے تھے اور تفریح کے لیے اِس حبس زدہ دن کے چناؤ پر خود کو کوس رہے تھے۔

منظر کی یکسانیت سے بیزار ہو کر بوڑھا ایک گیت گنگنانے لگا۔ پھر اس نے میز پر بچھے پتّوں کی جانب دیکھا جو ٹھیک اُس کے مانند کسی ایسے شخص کے منتظر تھے جو ستّر سالہ ٹیرو کارڈ ریڈر کو اپنے مستقبل میں جھانکنے کے عوض کچھ کڑک نوٹ ادا کر سکے۔

"لگتا ہے کہ آج کوئی اپنا مستقبل جاننے میں دلچسپی نہیں رکھتا۔" وہ بڑبڑایا۔ "صبح سے صرف تین گاہک...... حیرت ہے!"

اُس نے اپنی جیب ٹٹولی۔ اِس عمل نے اکتاہٹ بڑھا دی...... جیب میں چند ہی نوٹ تھے۔ اگلے چند منٹوں تک وہ یونہی بیٹھا اونگھتا رہا۔ میز پر ترتیب سے سجے پتّوں نے بھی اپنی خاموشی برقرار رکھی۔

یکدم اُس کے ذہن میں ایک خیال کوندا جس کے ساتھ بیزاری گھٹنے لگی اور چہرے پر کچھ انوکھا کرنے کی مسرت دمکنے لگی۔

"کیوں نہ اِس ساحل کا مستقبل جانا جائے!" بوڑھے نے خود سے کہا۔

اگلے ہی لمحے تجربہ کار مستقبل بین آنکھیں بند کر چکا تھا۔ اس نے طریق کے مطابق توجہ ایک نقطے پر مرکوز کر لی۔ خود سے سوال کیا۔ "آنے والے کل اِس ساحل کے لیے کیا پیغام لائے گا؟"

اُس نے آنکھیں کھولیں۔ میز سے ایک پتّا اٹھایا۔ اُسے الٹا۔

دوسرے ہی لمحے وہ سکتے میں تھا۔ پتّے پر ایک مکروہ چہرہ بنا تھا جس کی غلیظ آنکھیں تباہی کی سیاہی اگل رہی تھیں۔ وحشت ناک دنوں کی پیش گوئی کر رہی تھیں۔

اُس نے ہڑبڑا کر پتّا واپس رکھ دیا۔ "یہ...... نہیں ہوسکتا۔" خود کو سمجھانے کی کوشش کی۔

اُس کی مضطرب نظریں ساحل پر ٹکی تھیں جہاں سکون تھا، خاموشی تھی۔ سمندر بھی شانت تھا۔ کسی طوفان کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔

"پیش گوئی غلط بھی تو ہو سکتی ہے۔" اُس نے خود کو مطمئن کرنے کی کوشش کی لیکن دل نے مطمئن ہونے سے انکار کر دیا۔

آج سے قبل کبھی پتّوں نے اُسے دھوکا نہیں دیا تھا۔

چند ساعت وہ یونہی متذبذب بیٹھا رہا۔ پھر کچھ سوچ کر آنکھیں بند کر لیں۔ ذہن یکسو کیا۔ سوال دہرایا۔ پتّا پلٹنے سے قبل اُس کے ذہن میں اندیشے رینگ رہے تھے۔

اندیشے درست ثابت ہوئے۔ وہی پتّا...... اس بار بھی ایک مکروہ چہرہ اسے گھور رہا تھا جس کی آنکھیں تباہی کے عفریت کے نزول کی پیش گوئی کر رہی تھیں۔

ستّر سالہ لارا گیل پر لرزہ طاری ہو گیا، جسم کانپنے لگا۔

اُس نے نظر اٹھا کر سمندر کی جانب دیکھا۔ بحیرہ کیریبین سے آنے والا پانی بالکل خاموش تھا۔ وہاں یا اُس سے پرے، بحر اوقیانوس میں کسی عفریت کی موجودگی غیرامکانی معلوم ہوتی تھی...... لیکن وہاں ایک عفریت تھا جس کے جاگنے کا وقت آن پہنچا تھا!

☆☆☆

21 اکتوبر 2012ء، کیوبا کا جنوب مشرقی ساحل:

کانسٹیبل بیتستا کے کاندھے کی ٹکر نے دروازہ توڑ دیا۔

وہ تیزی سے اندر داخل ہوا اور اگلے ہی پل تاریکی کے پھندے میں آگیا جس میں ٹھنڈ تیر رہی تھی۔

یہ پروفیسر گودرج نامی ایک مخبوط الحواس شخص کا فلیٹ تھا جو گزشتہ دو روز سے فلیٹ سے باہر نہیں آیا تھا جس کی وجہ سے ساحلِ سمندر سے چند فرلانگ کے فاصلے پر واقع اِس عمارت کے مکین اندیشوں کا شکار ہو گئے تھے۔ انہوں نے متعدد بار فلیٹ کا دروازہ بجایا لیکن اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ بالآخر انہوں نے پولیس کو مطلع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اُنہیں یقین تھا کہ پروفیسر کسی حادثے کا شکار ہو گیا ہے۔

کانسٹیبل بیتستا کا بھی یہی خیال تھا۔

"کیا ماضی میں کبھی ایسا ہوا کہ پروفیسر گودرج نے خود کو فلیٹ میں مقید کر لیا ہو؟" اُس نے بلڈنگ کے ایک مکین سے سوال کیا۔

"وہ......" اس شخص کے چہرے پر تذبذب تھا۔ "پروفیسر بہت ہی عجیب و غریب آدمی تھا۔ اس کی سرگرمیاں پُراسرار تھیں، مگر...... ایسا کبھی نہیں ہوا کہ وہ تین دن تک گھر سے باہر نہ آیا ہو۔"

"شاید اب وہ باہر آنے کے قابل نہیں رہا ہو۔" یہ کہہ کر کانسٹیبل فلیٹ کے دروازے کی جانب مڑا۔ انتظار کی اذیت برداشت کرنے کی بجائے وہ دروازہ توڑنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔



کاندھے کی ایک ہی ٹکر نے مسئلہ حل کر دیا۔ اب وہ فلیٹ کے اندر تھا جہاں ٹھنڈ اور تاریکی کے ساتھ عجیب سی بُو بسی تھی۔ اُس کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ وہ اِس بُو کو پہچانتا تھا۔

کانسٹیبل نے جیب سے ٹارچ نکالی۔ سامنے روشنی چھینکی۔ وہاں سناٹا تھا۔ کسی افراتفری کے آثار نہیں تھے۔ وہ ایک بیڈ روم، کچن اور چھوٹے سے ڈرائنگ روم پر مشتمل فلیٹ تھا۔

وہ بیڈ روم کی جانب بڑھا جس کا دروازہ بند تھا۔

اُس نے دھیرے سے ہینڈل کا لٹو گھمایا۔ دروازے کے کھلنے کی چرچراہٹ سے خاموش ماحول میں تلاطم پیدا ہوا۔ اچانک بدبو تیز ہو گئی۔

کانسٹیبل نے ٹارچ کا رخ سامنے کی جانب کیا۔ اگلے ہی لمحے اُس کے منہ سے سسکی نکلی۔ پروفیسر گودرج کی لاش پنکھے سے لٹکی ہوئی تھی۔

آدھے گھنٹے بعد سات پولیس اہل کار اُس چھوٹے سے فلیٹ میں موجود تھے جو ٹیلی پیتھی اور علوم النجوم سے متعلق لکھی جانے والی قدیم کتابوں سے بھرا ہوا تھا۔

ڈیڑھ گھنٹے میں پولیس نے اپنی کارروائی مکمل کر لی۔ یہ واضح تھا کہ پروفیسر نے خودکشی کی تھی۔ مگر سوال یہ تھا کہ کیوں؟

پروفیسر کی جانب سے چھوڑی جانے والی تحریر اِس سوال کو مزید پیچیدہ بنا رہی تھی جس پر صرف ایک سطر درج تھی۔

"وہ آرہا ہے!"

اگلے سات گھنٹے تک چھان بین اور خودکشی کے امکانات و محرکات پر غور کرنے کے بعد پولیس چیف نے یہ ریمارکس دیتے ہوئے فائل آگے بڑھا دی "پروفیسر گودرج کسی نامعلوم شخص کی آمد سے خوف زدہ تھا۔ اسی خوف نے اُس کی جان لے لی۔"

مگر یہ صحیح اندازہ نہ تھا، پولیس چیف غلط تھا!

☆☆☆

22 اکتوبر 2012ء، بحیرہ کیریبین کا مغربی حصہ:

آسمان کی نظریں سمندر پر چھائی دھند پر ٹکی تھیں۔ اوپری سطح پر پُراسرار خاموشی کا راج تھا مگر نیچے گہرائیوں میں...... وقت کروٹ لے رہا تھا۔

اچانک ہوا کا دباؤ کم ہو گیا۔ حبس بڑھنے لگا۔ عمیق گہرائیوں میں حدت کی حرکت تیز ہو گئی...... اور تب پاتال میں خوابیدہ تباہی کے عفریت نے آنکھ کھولی۔ انگڑائی لی اور سمندر کے اوپری حصے میں اضطراب جنم لینے لگا۔

وقت کروٹ لے رہا تھا۔ جمیکا سے میلوں دور بحیرہ کیریبین کی گہرائیوں میں برسوں سے جاری ماحول دشمن موسمی تبدیلیوں کا نتیجہ ظاہر ہونے لگا تھا۔ گرم لہروں کی پیدائش کا لمحہ آن پہنچا تھا، جن کے ارادے تباہ کن تھے۔

چند لمحوں بعد موت کا عفریت اوپر، سطح سمندر کی جانب بڑھنے لگا جہاں تلاطم برپا تھا۔ ایسا تلاطم جو اگلے چند گھنٹوں میں ایک حقیقی طوفان کا روپ دھارنے والا تھا۔

آسمان کی نظریں سمندر پر ٹکی تھیں جو ابل پڑنے کو تھا۔

ٹھیک ان لمحات میں شمال کی جانب سے جہاں کنگسٹن کا ساحل تھا، روشنی نمودار ہوئی۔ وہ ایک چھوٹی سی لانچ تھی جس کا کپتان اپنی محبوبہ کے ساتھ نشے میں دھت پڑا تھا اور لانچ کا کیبن ایک ناتجربہ کار ملاح نے سنبھال رکھا تھا جس غریب کو قطعی اندازہ نہیں تھا کہ وہ موت کی وادی میں داخل ہو چکا ہے۔

آسمان کی نظریں سمندر پر ٹکی تھیں...... لانچ قریب آتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

22 اکتوبر 2012ء، نیویارک شہر۔

اُنہوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ آنکھوں کے سامنے مجسمۂ آزادی تھا جو سورج کی سنہری کرنوں کا لبادہ اوڑھے دمک رہا تھا۔

اسٹیٹ آئس لینڈ فیری نامی لانچ نیویارک ہاربر کے پانیوں کو چیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ ایک جانب مین ہٹن کا علاقہ تھا، دوسری جانب اسٹیٹن جزیرہ۔

نیویارک ہاربر کو بالائی خلیج نیویارک کہہ کر بھی پکارا جاتا ہے۔ وہیں سبک روی سے بہتے پانیوں پر ایک چھوٹا سا غیرآباد ٹکڑا ہے جو جزیرۂ آزادی کہلاتا ہے۔ نیویارک کی پہچان تصور کیا جانے والا مجسمہ اسی جزیرے پر ایستادہ ہے جسے دیکھنے کے لیے سیاح میلوں دُور سے کھنچے چلے آتے ہیں۔

"میں یہ منظر سیکڑوں بار دیکھ چکا ہوں لیکن ہر بار اِسے دیکھ کر تجسّس سے بھر جاتا ہوں۔" عرشے پر کھڑے بیکر مولر کے لہجے سے مسرت چھلکتی تھی۔

کیٹ ٹیلر مسکرائی۔ وہ بخوبی جانتی تھی کہ انگریزی ادب کا دلدادہ، اکتیس سالہ خوبرو بیکر بچپن ہی سے اِس منظر کا

دیوانہ ہے جس سے حظ اٹھانے کے لیے وہ مہینے دو مہینے بعد مجسمۂ آزادی کو قریب سے دیکھنے کے لیے اسٹیٹ آئس لینڈ فیری میں سوار ہو جاتا ہے۔

"یہ منظر واقعی خوبصورت ہے جان۔" کیٹ نے گہرا سانس لیا۔ "اور مجھے خوشی ہے کہ تم نے اپنی خوشیوں میں مجھے شریک کیا۔"

بیکر کی آنکھوں میں محبت سمٹ آئی۔ اُس نے چھبیس سالہ کیٹ کی جانب دیکھا جس کی نیلی آنکھیں، سنہری زلفیں، کھلکھلاتی ہنسی اُس پر جادو کر دیتی تھی۔

بیکر مشہور زمانہ کولمبیا یونیورسٹی کے ڈیپارٹمنٹ آف انگلش سے منسلک تھا۔ اُس کی رہائش مین ہٹن کے مشرقی علاقے میں تھی، جو ڈاؤن ٹاؤن کہلاتا تھا۔

کیٹ کا تعلق کینیڈا سے تھا۔ سوشل ورک میں ماسٹرز کرنے کے بعد وہ چار برس قبل اچھے مستقبل کی تلاش میں نیویارک آ گئی تھی جہاں اُسے یتیم بچوں کے لیے کام کرنے والی ایک فلاحی تنظیم "ہیلپ" میں ملازمت مل گئی جس کا دفتر مین ہٹن کے جنوبی علاقے "اپ ٹاؤن" میں تھا۔ وہ اپنی ایک سہیلی جینفر کے ساتھ گزشتہ دو برس سے ایک فلیٹ میں مقیم تھی۔ جینفر بھی سماجی کارکن تھی اور اِن دنوں غرب الہند کی ریاست ہیٹی میں تعینات تھی۔

خوبرو کیٹ سوشل ورک کے علاوہ بلاگنگ میں بھی دلچسپی رکھتی تھی۔ اُس نے اپنا بلاگ بنا رکھا تھا اور اسی کے طفیل اُن دونوں کی ملاقات ہوئی۔

ایک روز بیکر انٹرنیٹ پر اگاتھا کرسٹی کے بارے میں کچھ "سرچ" کر رہا تھا کہ اس کی نظر ایک بلاگ پر پڑی، جس کا عنوان "اگاتھا کرسٹی بمقابلہ شیکسپیئر" نے اُس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروالی۔

گو کہ وہ بلاگر، یعنی کیٹ ٹیلر کے خیالات سے قطعی متفق نہیں تھا لیکن اُسے تحریر میں پختگی نظر آئی۔ اُس نے "کومنٹ" کے حصے میں اپنی رائے دے دی۔

اگلے روز جب وہ اُس بلاگ پر گیا، وہاں کیٹ کا جواب موجود تھا۔ بیکر کی رائے پر چند سخت سوالات اٹھائے گئے تھے۔

بیکر عام طور سے انٹرنیٹ پر جاری بحث و مباحثے سے دامن بچانے کی کوشش کیا کرتا تھا لیکن اُس روز نہ جانے کیا سوچ کر اُس نے اپنا طویل جواب درج کروا دیا جس کے بعد ایک نہ رکنے والی بحث شروع ہوگئی۔ اُس بحث کو منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے بیکر نے کیٹ سے ملنے کا فیصلہ کیا اور اِس فیصلے نے اس کی زندگی بدل دی۔

ایک خوش گوار دوپہر دریائے ہڈسن کے کنارے، ایک تھائی ریسٹورنٹ میں اُن کی ملاقات ہوئی۔ چالیس منٹ پر محیط گفتگو کے اختتام تک وہ ایک دوسرے کے دوست بن چکے تھے۔ فقط پانچ ماہ بعد اُن کی دوستی میں محبت کی آمیزش ہوگئی اور اس ملاقات کے ٹھیک ایک سال بعد بیکر نے اُسے شادی کی پیشکش کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اس عمل کے لیے اس نے اسٹیٹ آئس لینڈ فیری کے عرشے کا انتخاب کیا۔

"میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں ڈیئر۔" بیکر کی آواز میں ٹھہراؤ تھا۔ اس نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ہاتھ باہر آیا تو اس میں ایک چھوٹا سا سرخ رنگ کا بکس تھا جسے دیکھ کر کیٹ کو اپنا سانس رکتا محسوس ہوا۔

"کیا وہ لمحہ آن پہنچا ہے؟" اس نے خود سے سوال کیا۔

بیکر نے اپنی محبوبہ کا ہاتھ تھام لیا۔ "میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" وہ گھٹنے کے بل بیٹھ گیا تھا۔ "کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟"

"ہاں!" کیٹ کی آواز میں مسرت رقصاں تھی۔

وہیں، عرشے پر اُنھوں نے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائیں۔ خشک زمین پر پہنچنے سے قبل وہ تمام تفصیلات طے کر چکے تھے۔

23 اکتوبر کی دوپہر بیکر ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن روانہ ہونے والا تھا۔ وہاں اُسے اگلے چھ روز قیام کرنا تھا۔ منصوبے کے مطابق لندن سے واپسی پر وہ دونوں اپنے رشتے داروں اور دوستوں کو آگاہ کرتے اور نیو ایئر والے روز شادی کے بندھن میں بندھ جاتے۔

"یوں ہر نیا سال ہمارے لیے دہری خوشیاں لائے گا۔" بیکر کے لہجے سے مسرت چھلک رہی تھی۔

"ہاں جان، ایسا ہی ہوگا!" کیٹ نے اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ "مجھے جینفر کو مطلع کرنا ہوگا تاکہ وہ چھٹیاں لے کر تقریب میں شرکت کر سکے۔"

ٹھیک اس لمحے جب چاہت سے تھرکتے دو دل، آنکھوں میں حسین مستقبل کے سپنے سجائے خوشیوں کے پیمان باندھ رہے تھے، بحیرہ کیریبین کے مغربی حصے میں تباہی کا عفریت اپنی قوت مجتمع کر چکا تھا۔ صف بندی مکمل تھی اور قاتل لہروں... پر مشتمل اس کی فوج کنگسٹن کی جانب بڑھ رہی تھی۔

☆☆☆

23 اکتوبر 2012ء، نیویارک ائیرپورٹ۔

بیکر ڈیپارچر لاؤنج میں بیٹھا تھا۔ ہاتھ میں "دی نیویارک ٹائمز" کی کاپی تھی۔ وہ سرخیوں پر نظر ڈال رہا تھا۔ اچانک اُس کا موبائل تھرتھرایا۔ اسکرین پر کیٹ کا نمبر دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"کیسی ہو ڈیئر؟" آواز میں محبت تھی۔

"ٹھیک نہیں ہوں۔" کیٹ چہکی۔ "تمھیں بہت مس کر رہی ہوں۔"

"میں بھی!" بیکر نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ دوپہر کے ڈیڑھ بج رہے تھے۔ "اچھا ہوا تم نے ابھی کال کر لی۔ جہاز میں سوار ہونے کے بعد رابطہ منقطع ہو جاتا۔"

ٹھیک اُسی لمحے لاؤڈ اسپیکر سے اناؤنسر کی آواز گونجی۔ "لندن جانے والی پرواز روانگی کے لیے تیار ہے۔ مسافروں سے درخواست ہے کہ وہ جہاز میں سوار ہو جائیں۔"

"چلو، تمہارا بلاوا آ گیا۔" کیٹ نے کہا۔ "پھر ملتے ہیں جان، گڈ بائے۔"

"گڈ بائے ڈیئر!" یہ کہتے ہوئے بیکر کھڑا ہو گیا۔ بیگ کاندھے پر ڈالا اور ڈیپارچر لاؤنج کے دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔

اخبار کی کاپی اس کی بغل میں تھی جس میں بحیرۂ کیریبین میں آنے والی ہلچل کے بارے میں ایک کالمی خبر شائع ہوئی تھی۔

جلد بازی میں بیکر اس خبر پر توجہ نہیں دے سکا۔

☆☆☆

23 اکتوبر، جمیکا۔

محکمۂ موسمیات کے دفتر میں گرم دوپہر رینگ رہی تھی۔

حبس زدہ میٹنگ روم میں بیٹھا ڈائریکٹر ایک فائل پر جھکا تھا۔ چہرے پر تشویش تھی۔

ڈائریکٹر کی دائیں جانب ڈپٹی ڈائریکٹر بیٹھا رعونت سے سگار کا دھواں چھوڑ رہا تھا۔ سامنے نوجوان افسر کھڑا تھا جس کے چہرے پر اعتماد تھا۔

بالآخر ڈائریکٹر نے سر اٹھایا۔ اس کے ماتھے پر شکنیں تھیں۔ "یہ فائل آپ تک کب پہنچی تھی مسٹر ایڈمز؟"

"کل شام چھ بجے مسٹر پاول!" ڈپٹی ڈائریکٹر نے سگار کا کش لیا۔

"اور آپ نے مجھے مطلع کرنا ضرور نہیں سمجھا؟" ڈائریکٹر نے اپنا غصہ دباتے ہوئے کہا۔

"سر، مجھے یہ رپورٹ احمقانہ لگی۔ کسی تباہ کن سمندری طوفان کے جمیکا سے ٹکرانے کا مجھے تو کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے نوجوان ساتھی نے نشے کی حالت میں اِسے مرتب کیا ہے۔" ڈپٹی ڈائریکٹر کے لہجے میں طنز تھا۔

"اور آپ یہ اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہیں؟"

"آپ جانتے ہیں سر، گزشتہ 24 برس میں کوئی طوفان براہِ راست جمیکا سے نہیں ٹکرایا۔ اس بار بھی امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔" اس نے سگار کی راکھ جھاڑی۔

"کیا تمھیں اپنی رپورٹ پر اعتبار ہے جارج؟" ڈائریکٹر نوجوان افسر سے مخاطب تھا۔

"سو فیصد مسٹر پاول۔" نوجوان کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔ "ہوا کے کم دباؤ اور گلوبل وارمنگ سے جنم لینے والا یہ طوفان تباہ کن حاری لہریں اور بگولے جنم دے چکا ہے اور اب تیزی سے جمیکا کی جانب بڑھ رہا ہے۔ ہوا کا رخ اور سمندری حدت اِسے قوت عطا کر رہی ہے۔ یہ کل کنگسٹن پر حملہ کر دے گا۔"

"تب تو ہمیں فوراً ایمرجنسی نافذ کرنی ہوگی۔" ڈائریکٹر نے گہرا سانس لیا۔

"یہ احمقانہ رپورٹ ہے جناب۔" ڈپٹی ڈائریکٹر بیچ میں کود پڑا۔ "آپ میرا یقین کریں، ہمارا نوجوان ساتھی نشہ......"

"شٹ اپ!" ڈائریکٹر زور سے دہاڑا۔

"میئر کے دفتر فون کرو!" اُس نے فائل نوجوان کی جانب بڑھائی۔ "ہمیں فوری انتظامات کرنے ہوں گے۔"

23 اکتوبر کی شام، جب میئر آفس سے ہنگامی حالات کے نفاذ کا اعلان ہوا، طوفان کنگسٹن سے فقط 105 کلومیٹر دور تھا۔

☆☆☆

24 اکتوبر، لندن۔

یونیورسٹی آف لندن کا سیمینار ہال حاضرین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

پانچ روز تک جاری رہنے والی اِس کانفرنس کا

موضوع ''انگریزی ادب اور عصری تقاضے'' تھا۔ آج پہلا سیشن تھا۔

پروفیسر بیکر مولر دیگر مقررین کے ساتھ اسٹیج پر بیٹھا تھا۔ وہ یونیورسٹی آف لندن کی خصوصی دعوت پر یہاں آیا تھا۔ آج کے سیشن میں اُسے چارلس ڈکنز کے ادبی اثرات کے موضوع پر تقریر کرنی تھی۔ دو روز بعد جاسوسی ادب کے بڑھتے حلقۂ اثر پر مقالہ پڑھنا تھا جب کہ آخری دن شیکسپئر شناسی کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرنا تھا۔

بیکر نے اپنے نوٹس پر نظر ڈالی۔ چند نکات دہرائے۔ پھر ڈائس پر کھڑے جلسے کے میزبان ڈیوڈ جیمس کی جانب دیکھا۔

پُراعتماد ڈیوڈ اپنے بے ساختہ اور شگفتہ انداز میں حاضرین کو ایک لطیفہ سنانے کے بعد اب شریر مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے اُس کی جانب دیکھ رہا تھا۔

''خواتین و حضرات، اب میں ایک ایسے نوجوان نقاد کو دعوت دینا چاہوں گا جو شیکسپئر سے عقیدت مندی کے باعث مجھے امریکی سے زیادہ برطانوی معلوم ہوتا ہے۔'' ڈیوڈ کے لہجے میں شوخی تھی۔ ''برائے مہربانی ان کی عمر پر نہ جائیں۔ یہ علم کے میدان میں بہت گہری جڑیں رکھتے ہیں۔ آپ سب کی تالیوں میں، کولمبیا یونیورسٹی سے منسلک محترم پروفیسر بیکر مولر!''

تالیوں کے شور میں بیکر کھڑا ہوا اور ڈائس کی جانب بڑھنے لگا۔

بیکر کے پاس سے گزرتے ہوئے ڈیوڈ نے دھیرے سے کہا۔ ''آپ سے پہلے والے صاحب نے خاصا بور کیا تھا۔ امید ہے کہ آپ کی تقریر ہمیں اونگھنے نہیں دے گی!''

جواباً بیکر مسکرا دیا۔

ڈیڑھ گھنٹے بعد بیکر اور ڈیوڈ کیفے ٹیریا میں بیٹھے تھے۔

''مبارک باد قبول کیجیے مسٹر بیکر! آپ کی تقریر نے مجھے اونگھنے نہیں دیا۔''

''یہ میری خوش نصیبی ہے۔'' بیکر مسکرایا۔

ملاقات کے اختتام تک ان کی دوستی ہو چکی تھی۔

ڈیوڈ کے اجداد کا تعلق کیوبا سے تھا۔ برسوں قبل اس کے باپ نے روشن مستقبل کے لیے برطانیہ کا رخ کیا اور پھر یہیں ڈیرا ڈال لیا۔

''میں یہیں پلا بڑھا ہوں۔'' ڈیوڈ نے کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے کئی رشتے دار کیوبا میں مقیم ہیں، جن سے ملنے میں ہر سال وہاں جاتا ہوں۔ ماں باپ کے انتقال کے بعد اب وہی میرا سب کچھ ہیں۔''

کانفرنس کے بعد ڈیوڈ ہی اسے اپنی کار میں ہوٹل چھوڑنے آیا۔

جب بیکر کار سے اترنے لگا، ڈیوڈ نے کہا۔ ''اگر آرام کا ارادہ نہ ہو تو ہم ساتھ ڈنر کر سکتے ہیں، بشرطے کہ بل تم دو۔''

''بل کی ادائیگی پر تو کوئی اعتراض نہیں۔'' بیکر نے کہا۔ ''لیکن یہ پروگرام ہم کل پر رکھتے ہیں، اگلے سیشن کے لیے کچھ تیاری کرنی ہوگی۔''

''جیسے تمہاری مرضی۔'' ڈیوڈ نے کاندھے اچکائے۔ ''کل ملتے ہیں۔''

اپنے کمرے میں پہنچ کر بیکر لباس تبدیل کیے بغیر بستر میں گھس گیا اور ٹی وی آن کر دیا۔

کچھ دیر تک چینل بدلنے کے بعد اُس کی نظریں ایک نیوز چینل پر ٹھہر گئیں، جس سے ایک سمندری طوفان سے متعلق رپورٹ نشر ہو رہی تھی۔ رپورٹر برساتی پہنے کھڑا تھا۔ اس کی پشت پر، چند میل دور بپھرا ہوا سمندر نظر آرہا تھا۔

''طوفان 130 کلومیٹر فی گھنٹے کی رفتار سے آج دوپہر تین بجے کنگسٹن سے ٹکرایا...... تیز ہواؤں اور طوفانی بارشوں سے سیکڑوں گھر تباہ ہو گئے ہیں......''

اس سے قبل کہ وہ اسکرین پر موجود سیاہ فام رپورٹر کے الفاظ پوری طرح سمجھ پاتا، اُس کا موبائل فون تھر کنے لگا۔ اسکرین پر کیٹ کا نمبر تھا۔

''ہیلو جان کیسے ہو؟'' کیٹ چہکی۔

''ہائے! کچھ لمحوں پہلے تک تو تھکن کا شکار تھا لیکن اب خود کو ہشاش بشاش محسوس کر رہا ہوں۔'' بیکر کے لہجے میں مسرت تھی۔ ''تمہاری آواز جو سن لی۔''

موبائل فون کان سے لگائے، وہ بستر سے نکل کر ٹیبل کی جانب بڑھنے لگا جہاں کافی بنانے کا سامان رکھا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ صوفے پر بیٹھا کافی کے گھونٹ بھر رہا تھا اور کیٹ کی آواز اس کی سماعتوں میں رس گھول رہی تھی۔ اس دوران وہ ٹی وی اسکرین کی جانب توجہ نہیں دے سکا جہاں ایک رپورٹر تباہی کی داستان سنا رہا تھا۔

''درخت جڑ سے اکھڑ گئے ہیں...... طوفان نے کئی کشتیوں کو نگل لیا ہے...... سو سے زائد ماہی گیر اور ملاح لاپتا ہیں...... کئی علاقوں میں پانچ سو ملی میٹر تک بارش کا اندیشہ ہے...... پہاڑی علاقوں کے مکانات لینڈ سلائیڈنگ کی زد

میں آگئے ہیں...... درجنوں افراد زخمی ہو گئے ہیں...... ایک بوڑھے شخص کی ہلاکت کی خبر بھی آئی ہے جس کا نام لارا گیل بتایا جارہا ہے...... 70 فیصد جمیکا بجلی سے محروم ہو گیا ہے...... ایک ہزار سے زائد افراد اپنے مکانات چھوڑ کر شیلٹر ہومز میں منتقل ہو گئے ہیں...... جمیکا کا ہوائی اڈا بند......"

جب تک بیکر اپنی محبوبہ کو الوادع کہتا رپورٹ ختم ہو چکی تھی۔

اگلا ایک گھنٹا بیکر نے اپنی تقریر کی نوک پلک سنوارنے پر صرف کیا۔ ڈنر کے بعد وہ واک کے لیے نکل گیا۔ جب لوٹا، گھڑی کی سوئیاں گیارے کی ہندسے کو چھو رہی تھیں۔

سونے سے قبل عادتاً اس نے چند منٹ انٹرنیٹ پر گزارے۔ بی بی سی کی ویب سائٹ دیکھتے ہوئے اُس کی نظر ایک خبر پر پڑی، جو کیریبین میں آنے والی تباہ کن تبدیلیوں کی کہانی سنا رہی تھی۔

تب اُسے علم ہوا کہ جمیکا کے باسیوں کو آج کس عذاب سے گزرنا پڑا۔ خبر میں بتایا گیا تھا کہ کنگسٹن کا مشرقی حصہ طوفان سے بری طرح متاثر ہوا ہے مکانات کی چھتیں اڑ گئی ہیں۔ لاکھوں ڈالر کا نقصان ہو چکا ہے۔ اور کئی لوگ لاپتا ہیں۔

یہ خبر پڑھ کر بیکر افسردہ ہو گیا۔ اُس نے خبر کا "لنک" ایک سماجی رابطے کی ویب سائٹ پر شیئر کر دیا۔ جلد ہی ویب سائٹ کے صارفین کے تبصرے آنے لگے جس میں اِس سانحے پر گہرے دکھ کا اظہار کیا گیا تھا۔

اُس وقت بیکر کو قطعی اندازہ نہیں تھا کہ وہ خود بھی اِس سانحے کا شکار ہونے والا ہے!

☆☆☆

جس وقت لندن میں بیٹھا بیکر مولر اپنی محبوبہ سے محو گفتگو تھا، تباہی کے شکار کنگسٹن پر رقص کرتی ہواؤں نے صف بندی شروع کر دی۔ غصیل بادل خود کو مجتمع کرنے لگے اور سمندر میں پھیلا اضطراب رخ بدلنے لگا۔

اب ہتھیاروں کا رخ شمال کی جانب تھا جہاں کیوبا تھا...... جہاں وحشت کے نئے باب رقم کرنے کے بعد اُسے خوابوں کی سرزمین کی جانب بڑھنا تھا۔

طوفان کے راستے میں جزائر غرب الہند کی ایک چھوٹی سی ریاست ہیٹی بھی پڑتی تھی جس کے بدنصیب باسیوں نے فقط دو برس قبل ایک تباہ کن زلزلے کا کرب سہا تھا اور اب...... انہیں ایک ایسے عفریت کا سامنا کرنا تھا جو پانی سے بربادی کی کہانی لکھنے والا تھا۔

جمیکا میں ایمرجنسی نافذ ہونے کے چند ہی گھنٹوں بعد ہیٹی کی انتظامیہ بھی حرکت میں آگئی تھی۔ حفاظتی اقدامات شروع ہو گئے تھے۔ مگر چند ہی گھنٹوں بعد یہ انتظامات بے معنی ثابت ہونے والے تھے۔

کنگسٹن جس تباہی سے محفوظ رہا تھا...... وہ اب ہیٹی کے نصیب میں لکھ دی گئی تھی!

☆☆☆

وہ دھند میں گھری تھی جس میں ٹھنڈ تیر رہی تھی۔

اچانک ایک سرگوشی ہوئی۔ "کیٹ......"

اس نے ہڑبڑا کر چاروں طرف دیکھا۔ وہاں فقط دبیز دھند تھی جو اس کے خوف کو مہمیز کر رہی تھی۔

"کیٹ......" ایک بار پھر کسی نے اسے پکارا۔ اِس بار اس نے پہچان لیا۔ یہ جینفر کی آواز تھی۔ "مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

کیٹ نے سمت کا اندازہ لگایا۔ وہ دھند کو چیرتی ہوئی آگے بڑھی۔ ابھی چند ہی قدم اٹھائے تھے کہ اُسے عجیب سا شور سنائی دینے لگا۔ یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے کوئی عفریت مضطرب ہو، پھنکار رہا ہو۔

اچانک اُس کے بائیں جانب ایک کھٹکا ہوا۔ وہ پلٹی۔ سامنے ایک ہیولا تھا۔ "کیٹ...... مجھے تمہاری مدد......" اگلے ہی پل دھند نے اُس کی آنکھوں کے سامنے پردہ تان دیا۔

"جینفر......" کیٹ تیزی سے آگے بڑھی۔

جوں جوں وہ آگے بڑھتی گئی، دھند چھٹنے لگی اور شور بڑھتا گیا۔ منظر صاف ہوا تو وہ بحری جہاز کے عرشے پر کھڑی تھی، جس سے سمندر کی غصیل لہریں ٹکرا رہی تھیں۔

اور وہاں...... ریلنگ کے پاس جینفر کھڑی تھی۔ وہ پوری طرح بھیگی ہوئی تھی۔ اُس کی سیاہ آنکھوں میں یاسیت رقصاں تھی۔

"کیٹ!" اُس نے دھیرے سے کہا۔ اچانک جہاز ڈگمگایا۔ جینفر کا توازن بگڑ گیا۔ کیٹ بھی گرتے گرتے بچی۔ یکدم ایک لہر آئی۔ دونوں کے درمیان پانی کی دیوار کھڑی ہو گئی۔

اور جب وہ دیوار گری...... جینفر وہاں نہیں تھی۔ سمندر اسے ساتھ لے گیا تھا۔



"جینفر......" کیٹ پوری قوت سے چلائی۔

اُس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اپنے بستر پر تھی۔ پسینے سے شرابور۔ خوف زدہ۔ خواب کی تلچھٹ اُس کے ذہن میں اضطراب کی لہریں پیدا کر رہی تھی۔

اُس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھے جگ سے گلاس میں پانی انڈیلا اور ایک ہی سانس میں حلق میں اتار لیا۔ پھر گھڑی دیکھی۔ سوئیاں چار کا ہندسہ چھونے کو تھیں، نیویارک شہر میں ڈیڑھ گھنٹے بعد 25 اکتوبر کا سورج طلوع ہونے والا ہے۔

چند ساعت کیٹ یونہی بیٹھی رہی۔ پھر کچھ سوچ کر اٹھی۔ اپنے موبائل فون سے ہیٹی میں مقیم اپنی دوست جینفر کا نمبر ڈائل کیا، مگر نیٹ ورک کی ناکامی راہ میں دیوار بن گئی۔ اس نے ایک اور کوشش کی۔ کوئی نتیجہ سامنے نہیں آیا۔

چند ساعت وہ یونہی متذبذب کھڑی رہی۔ پھر جینفر کے دفتر کا نمبر ملایا۔ کافی دیر تک بیل جاتی رہی لیکن کسی نے فون نہیں اٹھایا۔ اندیشے قوی ہونے لگی۔

اگلے ہی پل وہ لیپ ٹاپ کے سامنے بیٹھی انٹرنیٹ پر ہیٹی کی تازہ ترین خبریں "سرچ" کر رہی تھی۔ چند سیکنڈ بعد لیپ ٹاپ کی اسکرین ایک المیے کی کہانی سنانے لگی۔

پہلی خبر کے مطابق ریاست ہیٹی گزشتہ کئی گھنٹوں سے موسلا دھار بارش کی زد میں تھی جس کی وجہ سے نشیبی علاقے زیرآب آگئے تھے۔ دریاؤں کا پانی ساحلی علاقوں میں داخل ہو گیا تھا اور بجلی کا نظام بیٹھ گیا تھا۔

ایک خبر سیلابی ریلے سے متعلق تھی جو کئی افراد کے لاپتا ہونے کا نوحہ بیان کر رہی تھی۔ ہلاکتوں کا بھی اندیشہ ظاہر کیا گیا تھا۔

"کیا جینفر بھی اس ریلے کی زد میں آگئی ہوگی؟" کیٹ کے دل میں اندیشے نے جنم لیا۔

وہ کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ نیویارک کے آسمان پر سورج کی مدھم کرنیں نمودار ہو رہی تھیں جن میں یاسیت بسی تھی۔

☆☆☆

25 اکتوبر، لندن۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔

یونیورسٹی آف لندن کے پارکنگ ایریا سے برآمد ہونے والی کار تیزی سے رائل ہوٹل کی جانب بڑھ رہی تھی۔

بیکر نے ڈیوڈ کی جانب دیکھا جو خلافِ توقع خاصا خاموش تھا۔ اُس کے ہاتھ اسٹیرنگ پر تھے۔ نظریں سڑک پر ٹکی تھیں۔

"کیا ہوا دوست آج تم چہک نہیں رہے۔ شاید آج کے مقررین نے تمہیں خاصا بور کیا؟" بیکر نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

"اوہ......" ڈیوڈ چونکا۔ "نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔"

"تو پھر کیا معاملہ ہے؟"

"کیوبا۔" ڈیوڈ نے دھیرے سے کہا۔ "میں نے تمہیں بتایا تھا ناں کہ میرے رشتے دار کیوبا کے جنوب مشرقی حصے میں مقیم ہیں۔ دراصل میں اُن کے بارے میں پریشان ہوں۔"

"خیریت؟" بیکر کے لہجے میں الجھن تھی۔

"نہیں، خیریت نہیں۔" اس نے گہرا سانس لیا۔ "کیوبا ایک بڑے سمندری طوفان کی لپیٹ میں آگیا ہے۔ جنوب مشرقی ساحل میں حالات بگڑ گئے ہیں۔ کئی افراد اپنے گھروں میں پھنس گئے ہیں۔"

"اور تمہارے رشتے دار؟" ٹیلر نے محتاط لہجے میں سوال کیا۔

"میں آج دوپہر سے ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ بدقسمتی سے تمام ٹیلی فون لائنز ڈیڈ ہو چکی ہیں۔ بجلی کا نظام بھی تباہ ہو گیا ہے۔ مجھے خدشہ ہے کہ......" اُس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ کار میں ایک اداس لمحہ در آیا۔

چند لحات تک خاموشی چھائی رہی جسے بالآخر ڈیوڈ نے توڑا۔ "ویسے تم درست ہو۔ آج کے مقررین نے مجھے واقعی بہت بور کیا!"

جس وقت لندن میں سورج غروب ہو رہا تھا، غصیل ہواؤں اور برستے آسمان نے ہیٹی میں کہرام مچا رکھا تھا۔ ہلاکتوں کی تعداد 25 ہو چکی تھی۔

کیوبا میں بھی اِسی قسم کے حالات تھے۔ ساحلی علاقہ نو میٹر بلند لہروں کی زد میں تھا۔ موسلا دھار بارش نے نظامِ زندگی مفلوج کر دیا تھا۔ قاتل جھکڑوں نے ہزاروں مکانات کو اکھاڑ پھینکا تھا۔

ڈیوڈ سے ہونے والی گفتگو کے بعد بیکر کو اداسی نے گھیر لیا۔ ہوٹل پہنچنے کے بعد اُس نے شاور لیا لیکن طبیعت بحال نہیں ہوئی۔ ڈنر کرنے کے بعد وہ چہل قدمی کے لیے نکل گیا لیکن یاسیت نے ساتھ نہیں چھوڑا۔

لوٹنے کے بعد جب اُس نے کیٹ کو فون کیا تو اداسی اور بڑھ گئی۔

"میں جینفر کے لیے بہت پریشان ہوں بیکر۔" کیٹ

کے لہجے میں دکھ تھا۔
وہ خاموش رہا۔
"طوفان نے ہیٹی میں تباہی مچا دی ہے۔ چالیس سے زائد لوگ ہلاک ہو گئے ہیں۔ ہزاروں بے گھر ہو گئے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں جیفر بھی......" کیٹ نے ہچکی لی۔
"خود کو سنبھالو جان۔" بیکر نے اُس کی ہمت بڑھائی۔
"میں کوشش کر رہی ہوں۔" کیٹ نے دھیرے سے کہا۔
گفتگو جلد ہی تمام ہو گئی۔ لباس تبدیل کرنے کے بعد جب بیکر بستر پر لیٹا، نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔
کافی دیر تک کروٹیں بدلنے کے بعد بھی جب نیند نہیں آئی، اس نے اکتا کر ٹی وی آن کر دیا جہاں نیوز چینلز ہیٹی اور کیوبا میں آنے والی تباہی کی خبروں سے اٹے پڑے تھے۔
ایک نیوز کاسٹر تفصیلات بیان کر رہا تھا۔
"کیوبا میں گیارہ افراد کے ہلاک ہونے کی اطلاع ہے...... اندازاً 2 بلین ڈالر کا نقصان ہوا ہے...... اس سانحے سے سنبھلنے میں کیوبا کے باسیوں کو کئی ماہ لگ سکتے ہیں۔"
دوسرے چینل نے خبر دی۔
"ہیٹی میں دو لاکھ افراد بے گھر ہو گئے ہیں...... دریاؤں کے بند ٹوٹ گئے...... سینکڑوں عمارتیں ڈھے گئیں...... سیلابی ریلے نے 54 زندگیاں نگل لی ہیں...... ابتدائی اندازوں کے مطابق ریاست کو 74 ملین ڈالر کا نقصان برداشت کرنا پڑا ہے۔"
بیکر نے اکتا کر ٹی وی بند کر دیا اور آنکھیں موند لیں۔ وہ سونے کی کوشش کر رہا تھا۔
ٹھیک اُسی لمحے ٹی وی چینلز نے بریکنگ نیوز دی۔
"جمیکا، ہیٹی اور کیوبا میں تباہی مچانے کے بعد سینڈی نامی طوفان شمال کی جانب بڑھ رہا ہے۔"
شمال میں امریکا تھا!

☆☆☆

26 اکتوبر، محکمہ موسمیات کا مرکزی دفتر، نیویارک۔
گورنر نیویارک اینڈریو کومو کی زیرِ صدارت ایک انتہائی اہم اجلاس جاری تھا۔
ہال میں کئی اعلیٰ عہدے دار اور ماہرینِ موسمیات موجود تھے۔ نیوجرسی اور فلوریڈا کے گورنر بھی ویڈیو کانفرنسنگ ڈیوائس کے ذریعے اجلاس میں شرکت کر رہے تھے۔
"معزز حاضرین، ہم انتہائی اہم مسئلے پر گفتگو کرنے کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں۔" ڈائریکٹر نے اجلاس کا باقاعدہ آغاز کرتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کو کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔"
اُس نے ایک بٹن دبایا۔ دیوار پر نصب اسکرین پر سیٹلائٹ سے لی ہوئی تصاویر کی سلائیڈ چلنے لگی جس میں سمندر میں جنم لینے والے اضطراب اور موسمی تبدیلیوں کی عکاسی کی گئی تھی۔
ڈائریکٹر نے حاضرین کی جانب دیکھا جن کے چہروں پر سنجیدگی ڈیرے ڈالے بیٹھی تھی۔ اُس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ "میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ایک سمندری طوفان امریکا کے مشرقی ساحلوں کی جانب تیزی سے بڑھ رہا ہے جو تیز ہواؤں اور غضیل بادلوں جیسے مہلک ہتھیاروں سے لیس ہے۔"
ہال میں سناٹا تھا۔ ڈائریکٹر نے بات جاری رکھی۔
"گو کہ سینڈی نامی یہ طوفان پہلے ہی جزائر غرب الہند میں کافی تباہی مچا چکا ہے لیکن اس کی شدت میں کمی واقع ہونے کی بجائے ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس کا دائرۂ اثر بڑھتا جا رہا ہے۔ ماہرین نے خدشہ ظاہر کیا ہے کہ جونہی یہ امریکا کے قریب آئے گا، بحرِ اوقیانوس میں جنم لینے والے دو چھوٹے طوفان بھی اس میں شامل ہو جائیں گے جس سے سینڈی ایک طاقت ور طوفان کی شکل اختیار کر لے گا اور یوں تباہی و نقصانات کے امکانات بڑھ جائیں گے۔"
"کیا آپ اپنے خدشات سے ہمیں آگاہ کرنا پسند کریں گے؟" نیویارک کے گورنر نے سوال کیا۔
"بالکل!" ڈائریکٹر نے کہا۔ "یہ طوفان اپنے ساتھ تیز ہواؤں کے جھکڑ اور شدید بارشیں لا رہا ہے جس سے سیلاب آ سکتے ہیں، پہاڑوں پر برف پڑ سکتی ہے۔ بجلی کی فراہمی معطل ہونے کے بھی خدشات ہیں۔"
"آپ کے خیال میں یہ پہلے کن ریاستوں کو نشانہ بنائے گا؟" سیکریٹری دفاع نے سوال کیا۔
"ہمارے اندازے کے مطابق ابتدائی اثرات فلوریڈا میں ظاہر ہوں گے، وہاں کے ساحل تیز جھکڑوں کی لپیٹ میں آ سکتے ہیں۔ سب سے پہلے ریاست نیوجرسی کا جنوبی حصہ سمندری غیظ و غضب کا نشانہ بنے گا، جہاں لہروں، بارشوں اور ہوا کے بگولوں کی وجہ سے لینڈ سلائیڈنگ کے خطرات موجود ہیں۔"
"ہمارے پاس کتنا وقت ہے؟" ہال میں نیوجرسی کے گورنر کرس کرسٹی کی آواز گونجی۔



"بدقسمتی سے سر......" ڈائریکٹر کے لہجے میں تاسف تھا۔ "ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں۔ یہ خصوصی اجلاس اسی لیے بلایا گیا ہے۔ دراصل ہم اس طوفان کو گزشتہ تین روز سے مانیٹر کر رہے ہیں۔ ابتدا میں ہمارا اندازہ تھا کہ یہ امریکا کے نزدیک پہنچتے پہنچتے دم توڑ دے گا لیکن حیرت انگیز طور پر اس کی قوت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ شاید میری بات آپ کو غیر سنجیدہ لگے لیکن...... ایسا لگتا ہے، جیسے اِس نے امریکا سے ٹکرانے ہی کے لیے جنم لیا تھا۔"
ہال میں خاموشی چھا گئی۔ ڈائریکٹر کی پشت پر سلائیڈ چل رہی تھی جس سے سمندری اضطراب جھلک رہا تھا۔
"اور یہ سانحہ کب رونما ہو گا؟" بالآخر نیویارک کے گورنر نے خاموشی توڑی۔
ڈائریکٹر نے آہ بھری۔ "ماہرین کا کہنا ہے کہ سینڈی پیر کی شام امریکا کے مشرقی ساحلوں سے ٹکرا جائے گا۔"
"یعنی الیکشن میں سب جل تھل ہونے والا ہے۔" نیوجرسی کے گورنر کی آواز ہال میں گونجی۔ "چلو دوستو، کام پر لگ جاؤ۔ ایک مشکل ہمارے سامنے ہے۔"
اجلاس کے ٹھیک ایک گھنٹے بعد فلوریڈا، نیوجرسی اور نیویارک میں ایمرجنسی نافذ کرنے کی درخواست وائٹ ہاؤس بھجوائی جا چکی تھی۔
شام تک سینڈی کی زد میں آنے والی ممکنہ ریاست میں ریڈ الرٹ جاری کر دیا گیا۔

☆☆☆

کیٹ ٹیلر کا بلاگ۔
"کسی اپنے کے لاپتا ہونے کا دُکھ، کسی اپنے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو دینے کے کرب سے زیادہ قوی ہوتا ہے، یہ میں نے آج جانا...... میری پیاری دوست جینفر گزشتہ 48 گھنٹے سے لاپتا ہے، اور اندیشوں نے مجھے ہلکان کر رکھا ہے...... نہ جانے وہ کس حال میں ہو...... ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ ہیٹی میں تباہی مچانے کے بعد اب سمندری طوفان امریکا کی جانب بڑھ رہا ہے...... کیا ہم پر ایک افتاد ٹوٹنے والی ہے؟ ہزاروں امریکی بے گھر ہونے والے ہیں؟ اپنے پیاروں سے محروم ہونے والے ہیں؟ اِن سوالوں نے میرے ذہن میں کھلبلی مچا دی ہے...... کاش اِس لمحے میرا دوست، بیکر مولر یہاں ہوتا!"
یہ بلاگ 26 اکتوبر کی شام "اپ لوڈ" ہوا۔ لندن کے رائل ہوٹل میں بیٹھے بیکر نے اسے پڑھنے کے فوراً بعد کومنٹ کیا۔ "میں تمہارے ساتھ ہوں کیٹ!"
وہ کیٹ کی حوصلہ افزائی کرنے کے لیے، دکھ بانٹنے کے لیے اسے فون کرنا چاہتا تھا لیکن غم سے نڈھال ڈیوڈ کی وجہ سے وہ ایسا نہیں کر سکا جس کے انکل اور آنٹی کیوبا پر حملہ کرنے والے عفریت کا شکار ہو گئے تھے۔

☆☆☆

28 اکتوبر، لندن۔
یونیورسٹی آف لندن کے سیمینار ہال میں بیٹھے بیکر کے چہرے سے پریشانی عیاں تھی۔ وہ مقررین کے الفاظ پر توجہ مرکوز کرنے کی کوشش کرتا لیکن اندیشوں کی تیز رو اُسے اپنے ساتھ بہا کر نیویارک لے جاتی جس کے ساحل پر خوف جنبش کر رہا تھا۔
کھانے کے وقفے کے دوران اُس نے ایک ویب سائٹ پر یہ خبر پڑھی تھی کہ جزائر غرب الہند میں تباہی مچانے کے بعد سینڈی اب امریکا کی مشرقی ریاستوں کے قریب پہنچ گیا ہے، جس کے پیشِ نظر لاکھوں افراد اپنے گھر چھوڑ کر محفوظ مقامات کی طرف چلے گئے ہیں۔
خبر میں اندیشہ ظاہر کیا گیا تھا کہ چھ کروڑ امریکی شہری اس طوفان سے متاثر ہو سکتے ہیں۔ ماہرین کو خدشہ تھا کہ تیز ہوائیں، بارشیں اور سخت موسم انتخابی مہم کے علاوہ چھ نومبر کے الیکشن کو بھی سبوتاژ کر سکتے ہیں۔ صدر اوباما نے بھی شہریوں کو خبردار کیا تھا کہ وہ سمندری طوفان کو بہت سنجیدگی سے لیں۔
بگڑتے حالات اور ماہرین کے اندیشوں سے لبریز پیش گوئیوں نے بیکر کی پریشانی بڑھا دی تھی۔ وہ کیٹ کے لیے فکرمند تھا جو مشکل کے اس لمحے شدت سے اس کی کمی محسوس کر رہی تھی۔
"اِس وقت مجھے کیٹ کے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔" اُس نے خود سے کہا۔
شیڈول کے مطابق کل کانفرنس کے اختتام کے بعد بیکر کو رات کی فلائٹ سے نیویارک روانہ ہونا تھا لیکن اب وہ سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ آج رات ہی لندن چھوڑ دے۔
کچھ دیر متذبذب رہنے کے بعد بالآخر وہ فیصلے پر پہنچ گیا۔
چائے کے وقفے میں اُس نے ائرپورٹ فون کیا۔
چند لمحوں بعد وہ متعلقہ افسر، رونی پارکر سے بات کر رہا تھا۔
بیکر کا مدعا سننے کے بعد اس نے کہا۔
"یہ ایک مشکل صورتِ حال ہے جناب۔ مجھے دیکھنا

بڑے گا کہ آج رات کی فلائٹ میں کوئی سیٹ خالی ہے یا نہیں۔ آپ کچھ دیر ہولڈ کریں۔"

بیکر کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ کچھ دیر بعد رونی کی آواز سنائی دی۔ "میں معذرت چاہتا ہوں، نیویارک جانے والی کسی فلائٹ میں جگہ نہیں۔"

بیکر کی امید دم توڑنے لگی۔

"...... لیکن ایک امکان ہے......" رونی نے فوراً کہا۔ "آج رات گیارہ بجے ریاست پنسلوانیا جانے والی فلائٹ میں ایک نشست خالی ہے...... اگر آپ......"

بیکر نے چند لحات توقف کیا۔ پھر کہا۔ "ٹھیک ہے، آپ ٹکٹ تیار رکھیں۔ میں ٹھیک نو بجے ائرپورٹ پہنچ جاؤں گا۔"

سیشن ختم ہوتے ہی اُس نے کانفرنس کے منتظم اعلیٰ پروفیسر جیکسن کو اپنی مشکل سے آگاہ کردیا۔

"میں معذرت چاہتا ہوں جناب، لیکن میں کل کے اختتامی سیشن میں شرکت نہیں کرسکتا۔"

"مجھے آپ کی پریشانی کا پورا احساس ہے مسٹر بیکر۔ مجھے یقین ہے کہ شیکسپئر کی بابت تحریر کردہ آپ کا مقالہ فکر انگیز ہوگا۔ کاش ہم کل آپ کو سن پاتے۔" ضعیف العمر پروفیسر نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "صورتِ حال کی نزاکت کے پیشِ نظر میں آپ کو روکوں گا نہیں۔ آپ سے مل کر اچھا لگا مسٹر بیکر مولر۔ زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی۔"

ہوٹل پہنچتے ہی بیکر اپنا سامان سمیٹنے لگا۔ پیکنگ کے بعد اس نے کیٹ کا نمبر ڈائل کیا۔ اس کا فون بند تھا۔

"ای میل!" بیکر کو خیال آگیا۔ اگلے ہی لمحے وہ لیپ ٹاپ کے سامنے بیٹھا تھا۔

"جان، میں آج رات پنسلوانیا جانے والی فلائٹ میں سوار ہوجاؤں گا جہاں سے بذریعہ کار میں چند گھنٹوں بعد نیویارک پہنچ جاؤں گا۔ امید ہے کل دوپہر ہم ساتھ ہوں گے!"

کیٹ کو میل بھیجنے کے بعد وہ صوفے میں دھنس گیا۔

"کل کا دن طویل اور تھکن سے بھرپور ہوگا۔" اُس نے خود سے کہا۔

جس وقت وہ لندن سے پنسلوانیا جانے والی پرواز میں سوار ہورہا تھا، کیٹ نیویارک میں بیٹھی اپنی لیپ ٹاپ پر بیکر کی ارسال کردہ ای میل پڑھ رہی تھی جس نے یکدم اُس کی پریشانی میں اضافہ کردیا تھا۔

اُس نے فوراً بیکر کا نمبر ڈائل کیا۔ اُس کا موبائل بند تھا۔

"وہ جہاز میں سوار ہوچکا ہوگا۔" کیٹ نے سرد آہ بھری اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔ "تم یہاں پہنچو گے کیسے بیکر؟ یہاں تو زندگی معطل ہوچکی ہے۔"

چند لمحے تو وہ یونہی متذبذب بیٹھی رہی۔ آخر اس نے فیصلہ کیا۔ "مجھے بیکر کو شہر کے بگڑتے حالات سے مطلع کرنا ہوگا۔"

ای میل سروس رابطے کا اکلوتا ذریعہ تھی اور کیٹ کی انگلیاں کی بورڈ پر تیزی سے حرکت کرتے ہوئے ایک پیغام ٹائپ کررہی تھیں۔

"مجھے خوشی ہے جان کہ تم لوٹ رہے ہو...... مگر جو نیویارک تم چھوڑ کر گئے تھے، وہ بدل چکا ہے۔ کبھی یہاں رات بھر زندگی رواں دواں رہتی ہے، مگر آج شہر کی سڑکوں پر ویرانی اور وحشت رقصاں ہے...... سب وے نظام بند کردیا گیا ہے۔ گورنر کے احکامات پر نیویارک میٹروپولیٹن ٹرانسپورٹیشن اتھارٹی نے تمام کارروائی روک دی ہے۔ اب اس شہر میں سفر ممکن نہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہم دنیا سے کٹ گئے ہیں...... تمہیں یہاں پہنچنے کے لیے دشوار گزار گھاٹیاں عبور کرنی پڑیں گی۔ میرا مشورہ ہے کہ تم پنسلوانیا ہی میں قیام کرو۔ کیونکہ یہاں...... تباہی کی آمد یقینی ہے۔ تمہاری کیٹ!"

ای میل روانہ کرنے کے بعد اُس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ آسمان پر دبیز سیاہ بادل تیر رہے تھے۔ ہوا کی رفتار معمول سے تیز تھی، جنہوں نے درختوں میں اضطراب پیدا کردیا تھا۔ یہی ہوائیں اگلے چند گھنٹوں بعد طوفان کی شدت کو مہمیز کرنے والی تھیں۔

اُس نے کھڑکی سے نیچے جھانکا۔ باہر سڑک پر گہرا سناٹا تھا۔ بیشتر دکانیں بند ہوچکی تھیں۔ جو اکا دکا لوگ سڑکوں پر تھے، ان کی چال اُس پریشانی کا پتا دیتی تھی جس نے اُن کے ذہنوں پر قبضہ کرلیا تھا۔

اچانک اس کا فون بجا۔ اسکرین پر اس کی ڈائریکٹر میری برگس کا نمبر چمک رہا تھا۔

"ہیلو کیٹ...... میں جانتی ہوں کہ یہ صحیح وقت نہیں...... شہر میں ایمرجنسی نافذ ہے...... مگر ہمیں رضا کاروں کی ضرورت ہے، یتیم بچوں کی دیکھ ریکھ کے لیے۔ اگر ممکن ہو تو کیا تم......؟" میری نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

کیٹ نے ایک نظر غصیل بادلوں کی جانب دیکھا۔



اُن میں بجلیاں چھپی ہوئی تھیں۔ سرد ہوائیں کھڑکی پر دستک دے رہی تھیں۔ تذبذب کی لہر اس کے چہرے سے ٹکرائی۔ خوف دل میں سر اٹھانے لگا۔

"وہ......" حرفِ انکار زبان کی نوک پر تھا کہ یکدم اس کی آنکھوں کے سامنے ایک شفیق چہرہ ابھرا۔ ایک پرانے فائر فائٹر کا چہرہ، جس نے اپنی زندگی دوسروں کے لیے وقف کردی تھی، جو ہمیشہ اپنی بیٹی سے کہا کرتا تھا۔ "دوسروں کے لیے جینا ہی تو اصل زندگی ہے۔"

وہ شخص کیٹ ٹیلر کا باپ تھا۔

"ہیلو کیٹ...... کیا تم مجھے سن رہی ہو۔ اگر کوئی پریشانی ہے تو......" میری کی آواز اسے لمحۂ حال میں لے آئی۔

"میں تیار ہوں!" وہ فیصلہ کرچکی تھی۔ "کیونکہ دوسروں کے لیے جینا ہی تو اصل زندگی ہے۔"

"گڈ......!" میری چہکی۔ "میں گاڑی بھیج رہی ہوں... اور سنو، ضروری سامان ساتھ رکھ لینا۔ ہوسکتا ہے ہمیں چند روز شیلٹر ہوم ہی میں ٹھہرنا پڑے۔"

☆☆☆

9 2 اکتوبر، پنسلوانیا۔

ٹیکسی تیزی سے ریاست نیویارک کی جانب بڑھ رہی تھی۔

پچھلی نشست پر بیٹھے بیکر کو اپنے شہر کے حالات کا پوری طرح ادراک تھا۔ گوکہ اس نے کیٹ کی ای میل نہیں پڑھی تھی، لیکن وہ جانتا تھا کہ شہر کے زیریں علاقے سے چار لاکھ افراد کو محفوظ مقامات کی جانب منتقل ہونے کا حکم دے دیا گیا ہے۔ بندرگاہ سیل کردی گئی ہے اور پروازوں کی منسوخی کے احکامات جاری ہوگئے ہیں۔ صدر اوباما اور ان کے مخالف مٹ رومنی نے بھی طوفان کے پیشِ نظر انتخابی مہم کی مصروفیات تبدیل کردی ہیں۔

یہ معلومات اُسے ٹیکسی ڈرائیور سمیر خان نے دی تھی جو ایک پاکستانی تھا۔ سمیر کے قریبی رشتے دار نیویارک میں آباد تھے۔ مین ہٹن اور بروکلن میں اُن کا کاروبار تھا۔ اور دونوں ہی علاقوں کے طوفان سے متاثر ہونے کا خدشہ ہے۔ اسی اندیشے کی بنا پر سمیر نیویارک کے بارے میں آنے والی خبروں سے بہت زیادہ باخبر رہنے کی کوشش کرتا تھا۔

"ویسے سر، کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ ان حالات میں آپ نیویارک کیوں جارہے ہیں؟" سمیر نے بیک ویو مرر سے دیکھتے ہوئے کہا۔

بیکر نے اگلی نشست پر بیٹھے نوجوان پر نظر ڈالی جس کا رویہ دوستانہ تھا۔ دل نے کہا۔ "تم اسے بتا سکتے ہو!"

سچ تو یہ ہے کہ بیکر کو ائرپورٹ پر ٹیکسی کے لیے خاصا انتظار کرنا پڑا تھا۔ کوئی کیب سروس اُسے نیویارک لے جانے کے لیے تیار نہیں تھی۔ ایسے میں گندمی رنگت والا ایک نوجوان اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ "میں آپ کو آپ کی منزل پر پہنچا سکتا ہوں۔" وہ سمیر تھا۔

"دراصل......" چند پلوں تک بیکر تذبذب کا شکار رہا۔ "میری گرل فرینڈ وہاں ہے...... اور اسے میری ضرورت ہے.. اس لیے!"

"مجھے اندازہ تھا۔" سمیر چہکا۔ "آپ کو دیکھتے ہی میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ یہ محبت کا معاملہ ہے سر۔"

"میں تمہارا شکر گزار ہوں دوست۔" بیکر نے اس کا کاندھا تھپتھپایا۔ "امید ہے کہ میں کسی پڑوسی شہر سے برونکس میں داخل ہوجاؤں گا اور وہاں سے مین ہٹن کا راستہ تلاش کرلوں گا۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔" سمیر نے کہا۔ "بے فکر رہیں، میں برونکس تک آپ کا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔ وہاں میرا ایک دوست رہتا ہے، جارج نام ہے اُس کا۔ تھوڑا بدتمیز ہے مگر میری درخواست رد نہیں کرے گا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کو مین ہٹن تک لے جائے گا۔"

"مگر...... تم یہ سب کیوں کررہے ہو دوست؟" بیکر کے لہجے میں خوش گوار حیرت تھی۔ "ہم تو پنسلوانیا کی سرحد تک......"

"آپ کے جذبۂ محبت کے لیے جناب۔" سمیر مسکرایا۔ "میری درخواست ہے کہ جب آپ اپنی محبوبہ کو ڈھونڈ لیں تو مجھے فون کرکے ضرور مطلع کیجیے گا۔ میں اُس خوشی میں شریک ہونا چاہوں گا۔"

"ضرور۔" بیکر کے لہجے میں احساسِ تشکر تھا۔

☆☆☆

بحرِ اوقیانوس کے سینے میں حرکت کرتے اضطراب کا نشانہ دریائے ہڈسن تھا۔ دریائے ہڈسن...... جس کی گزرگاہوں نے نیویارک شہر کا احاطہ کررکھا تھا۔

غصیل، دبیز بادلوں نے سورج کو ڈھانپ رکھا تھا۔ شام ہوتے ہی سمندر پر سیاہی مسلط ہوگئی۔ بجلی کڑکنے لگی۔ آسمان میں نیلی اور سفید آگ کی لپٹیں ابھریں۔ ہوا کی قوت

نے سمندر کو جھاگ چھوڑنے پر مجبور کردیا۔ گہرا اندھیرا چھا گیا۔

جونہی یہ اضطراب دریائے ہڈسن پر تیرتی سرد دھند سے ٹکرایا، اس کی شدت بڑھنے لگی۔ دو چھوٹے چھوٹے، مگر مہلک طوفان خاموشی سے سینڈی کی آغوش میں آگئے۔ قاتل موجوں نے انگڑائی لی۔ ہواؤں نے خنجر تیز کیے۔ آگے کی طرف زور مارا۔

اضطراب کی منزل نیویارک تھی...... جس کے راستے میں نیوجرسی پڑتا تھا، جس کی رگوں میں خوف سرایت کرچکا تھا۔

☆☆☆

29 اکتوبر کی شام، نیویارک۔

سورج کے کمزور پڑتے ہی دھند شہر پر غالب آگئی۔ ہوا کے جھکڑ چلنے لگے۔ سردی یکدم بڑھ گئی۔

زیریں علاقے خالی کرنے کے احکامات جاری ہوچکے تھے۔ ٹرین سروس معطل تھی اور پریشان حال شہری تیزی سے پناہ گاہوں کی جانب بھاگ رہے تھے۔

کیٹ اپنے دفتر کے مرکزی دروازے پر کھڑی وین کا انتظار کررہی تھی جس میں سوار ہوکر اُسے دیگر رضا کاروں کے ساتھ اُس شیلٹر ہوم کا رخ کرنا تھا جہاں یتیم بچوں کو رکھا گیا تھا۔

کیٹ کی آنکھوں کے سامنے جو شہر تھا، وہ بیابان معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے سرد آہ بھری۔ وہ جانتی تھی کہ اِن حالات میں بیکر کا یہاں پہنچنا تقریباً ناممکن ہے۔ اس نے آسمان کی جانب دیکھا جہاں بادلوں میں زرد رنگ کی پُراسرار روشنیاں رقص کررہی تھیں۔ اُس نے بچپن میں ایسی روشنیاں دیکھی تھیں جس کے بعد ٹورنٹو کو آندھیوں نے آلیا تھا۔ جگہ جگہ آگ بھڑک اٹھی تھی، جسے بجھاتے بجھاتے اُس کا باپ اپنی زندگی ہار گیا۔

بادلوں میں پُراسرار روشنیاں تھیں اور اُس کے دل میں اندیشے۔

''کیٹ......!'' کان میں سرگوشی ہوئی۔ ریڑھ کی ہڈی میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔

''بیکر؟'' وہ مڑی۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔

ٹھیک اُسی لمحے بیکر، سمیر کے اکتائے ہوئے دوست جارج کی جیپ میں سوار برونکس میں داخل ہوا۔ اس نے موسم میں ایک خاص قسم کی بوجھل پن محسوس کی جو ماضی میں کبھی اُس کے تجربے میں نہیں آئی تھی۔

جیپ میں لگے ریڈیو سے تازہ ترین خبریں نشر ہورہی تھیں۔

''سینڈی طوفان نیوجرسی کے قریب پہنچ گیا......''

''مسٹر بیکر!'' اکتائے ہوئے ڈرائیور نے جمائی لی۔ ''میں دریا کے قریب نہیں جانے والا۔ اگر حالات بگڑ گئے، تو شاید میں آپ کو مین ہٹن سے پہلے ہی اتار دوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' بیکر نے دھیرے سے کہا۔

باہر سیاہی گہری ہورہی تھی۔

☆☆☆

29 اکتوبر کی شام، نیوجرسی۔

شہر پر سکتہ طاری تھا۔

تیز ہوائیں دہاڑ رہی تھیں۔ آسمان اپنے بند کھولنے کو تھا اور دیو قامت لہریں کنارے کی جانب بڑھ رہی تھیں۔

تباہی کے خوف نے ساحلی پٹی پہلے ہی خالی کروادی تھی۔ مگر طوفان کی شدت دیکھتے ہوئے اب بالائی علاقوں میں بھی اندیشے دہک رہے تھے۔

بالآخر ایک زوردار دھماکا ہوا۔ طوفان نیوجرسی سے ٹکرا گیا۔ بادل زور سے گرجے۔ بجلی کڑکی۔ آسمان برس پڑا۔ ہواؤں نے بھی زور مارا۔

یہ لمحوں کا معاملہ تھا۔ درخت اور چھتیں اکھڑ گئیں۔ دریاؤں میں طغیانی آگئی۔ زیریں علاقوں میں پانی بھرنے لگا۔

نیوجرسی پر سکتہ طاری تھا۔ شیلٹر ہوم کے باسی خوف سے لرز رہے تھے۔ پناہ گاہوں کے مضبوط دروازوں پر دہاڑتی ہوا اور بے تھکان برسات نے اُنھیں قنوطیت میں دھکیل دیا تھا۔ لیکن نیویارک کے بالائی علاقے میں واقع محکمۂ موسمیات کے مانیٹرنگ روم میں بیٹھے ماہرین خوف کے نہیں...... حیرت کے زیراثر تھے۔

''اِس کی رفتار...... توقع سے زیادہ تیز ہے......'' ایک آفیسر ہکلایا۔

''یہ تیزی سے نیوجرسی سے گزرے گا...... شاید وہاں کے باسی محفوظ رہیں، مگر......'' اُس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''نیویارک......'' پہلے آفیسر نے آہ بھری۔ ''یہ وقت سے پہلے یہاں پہنچ جائے گا۔''

☆☆☆

کیٹ ٹی وی اسکرین کے سامنے بیٹھی تھی جہاں نیوجرسی کے المیے کی تفصیلات نشر ہورہی تھیں۔

''سینڈی نیوجرسی سے ٹکرا گیا...... اس کی رفتار 80



میل فی گھنٹے تھی...... حیرت انگیز طور پر اس کی شدت اور رفتار دونوں ہی میں تیزی سے اضافہ ہورہا ہے۔ شہر کی سڑکوں پر گھٹنوں گھٹنوں پانی کھڑا ہے...... واضح رہے کہ اس سے قبل نارتھ کیرولینا کے خطے میں موسلا دھار بارشیں ہوئی تھیں...... ہواؤں کے تیز جھکڑ چلے تھے...... اب تک 11 ریاستوں کی ڈھائی لاکھ سے زائد آبادی کو بجلی کی ترسیل منقطع ہوگئی ہے جس میں ڈسٹرکٹ آف کولمبیا بھی شامل ہے......''

''کیٹ!'' کسی نے اُسے پکارا۔ وہ مڑی۔ سامنے میری کھڑی تھی۔

''قریبی اسپتال میں بچوں کے وارڈ کے لیے ایک رضا کار کی ضرورت ہے۔ میں جانتی ہوں کہ طوفان کسی بھی وقت نیویارک سے ٹکرا سکتا ہے۔'' اُس نے گہرا سانس لیا۔ ''میں تم پر زور نہیں ڈالوں گی، مگر......''

کیٹ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بیکر کی فکر نے اسے ہلکان کررکھا تھا۔ ٹی وی اسکرین پر موجود رپورٹر کہہ رہا تھا۔

''اندیشہ ہے کہ سینڈی کا نیویارک پر حملہ توقع سے زیادہ خطرناک ہوگا...... شاید حکومتی اقدامات ناکافی ثابت ہوں...... شہریوں کو ایک دوسرے کی مدد کے لیے آگے آنا ہوگا۔''

''دوسروں کے لیے جینا ہی تو اصل زندگی ہے۔'' کیٹ کے دل نے سرگوشی کی۔

''کون سے اسپتال جانا ہے؟'' کیٹ نے گہرا سانس لیا۔

☆☆☆

گاڑیوں کی قطار شیطان کی آنت کے مانند طویل تھی۔ سوار چہروں پر اندیشے لیے آسمان کی جانب دیکھ رہے تھے، جہاں پُراسرار روشنیاں رقصاں تھیں۔

اسی قطار میں پھنسی ایک ویگن میں بیکر بیٹھا بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ اس کا اضطراب بڑھتا جارہا۔ کیٹ سے دوری نے اسے اندیشوں میں مبتلا کردیا تھا اور ویگن کے ریڈیو سے منحوس خبریں نشر ہورہی تھیں۔

''کہاوت مشہور ہے کہ نیویارک کبھی نہیں سوتا...... مگر آج بیشتر علاقے ویرانی کا منظر پیش کررہے ہیں...... شہر کے بعض علاقوں میں نیشنل گارڈز کو متعین کردیا گیا ہے...... ذرائع کے مطابق وفاقی حکومت نے مشرقی ساحل پر موجود نیوکلیر پلانٹس پر انسپکٹرز روانہ کردیے ہیں...... سوال یہ ہے کیا طوفان پلانٹس کو نقصان پہنچا کر تابکاری پھیلنے کا سبب بن سکتا ہے؟ اگر ایسا ہوا، تو پورا امریکا ایک عظیم المیے کا شکار ہوجائے گا......''

بیکر نے سسکی لی۔ ''اور کتنی دیر لگے گی؟''

''سڑک میں نے بلاک نہیں کی۔'' جارج کے لہجے میں تلخی تھی۔

بیکر کو سبکی محسوس ہوئی۔ چند ساعت جیپ میں خاموشی چھائی رہی۔ بالآخر جارج نے کہا۔ ''مسٹر بیکر... میں اپنے رویے پر معذرت چاہتا ہوں۔ دیکھیں، ٹرانسپورٹ کا نظام فیل ہوچکا ہے۔ مین ہٹن پہنچنا مشکل ہے۔ میرے خیال میں یہاں سے آگے کا سفر آپ کو خود طے کرنا پڑے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' بیکر نے گہرا سانس لیا۔ وہ جیپ سے اتر گیا۔ باہر ہوا میں عجیب سے خنکی تھی۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پیسے نکالے۔

''اس کی ضرورت نہیں۔'' جارج نے فوراً کہا۔ ''سمیر نے آپ کی مدد کرنے کے لیے کہا تھا۔ وہ میرا دوست ہے۔ یہ میں نے اُسی کے لیے کیا ہے۔''

''مگر......'' بیکر نے کچھ کہنا چاہا، مگر جارج نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''یہ سڑک اوپر پہاڑ کی طرف جاتی ہے۔ آپ کو اِس کے ساتھ چلنا ہوگا۔ جہاں سے ڈھلوان شروع ہوگی، وہیں دائیں جانب ایک قصبہ ہے۔ جس کی پشت پر جھاڑیوں کا طویل سلسلہ ہے، جسے عبور کرکے آپ کچے راستے پر پہنچ جائیں گے۔ وہاں سے آپ مین ہٹن میں داخل ہوسکتے ہیں۔ اگر آپ مسلسل چلتے رہے، تو ڈیڑھ گھنٹے بعد مین ہٹن میں ہوں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' بیکر نے مفلر گلے میں لپیٹا۔ ''شکریہ!''

جس لمحے بیکر سڑک کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا پہاڑ پر چڑھ رہا تھا، کیٹ بروکلن اسپتال کے بچوں کے وارڈ میں کھڑی تھی۔ اس کے ساتھ چار رضا کار اور تھے جن کا تعلق اُسی ادارے سے تھا، جس کے لیے کیٹ کام کرتی تھی۔ اسپتال میں اور بھی کئی رضا کار تھے جو مریضوں کی دیکھ ریکھ میں لگے ہوئے تھے۔

گوکہ کیٹ مصروف تھی لیکن بیکر کا خیال ذہن سے نہیں اتر رہا تھا۔ وہ خود کو یکسو رکھنے کی کوشش کرتی لیکن دل اندیشوں کی راہ پر چل نکلتا۔ وہ دل کا تعاقب کرتی تو اندیشے کانٹے بن کر پیروں میں چبھنے لگتے۔

وہ خواب ناک کیفیت تھی۔ ''نہ جانے بیکر کیسا ہو؟ اُسے کسی مشکل نے نہ آلیا ہو؟ کہیں وہ کسی حادثے کا شکار نہ

ہو گیا ہو؟" رہ رہ کر اُسے یہی خیال ستاتا۔ وہ کئی بار بیکر کا موبائل نمبر ڈائل کر چکی تھی لیکن کمزور سگنل کے باعث ہر کوشش ناکام ہو گئی۔

وہ مایوسی کی چادر اوڑھے وارڈ کی کھڑکی کے پاس کھڑی تھی۔ باہر اندھیرے کا راج تھا۔ اُس کی آنکھوں میں نمی تھی، جس نے ہر منظر دھندلا دیا تھا اور یہ دھندلاہٹ ایک واہمہ جنم دینے کو تھی۔

"کیٹ......" کسی نے اُسے پکارا۔ اُس کا سانس رک گیا۔ وہ پلٹی۔ دور، وارڈ کے دروازے پر کوئی کھڑا تھا۔

"کیٹ......" پھر سرگوشی ہوئی۔ ہیولا غائب ہو گیا۔

"میں...... ابھی آئی۔" اُس نے ساتھی رضا کار سے کہا اور وارڈ کا دروازہ عبور کر کے راہداری میں آ گئی جہاں خلافِ توقع سناٹا اور تاریکی تھی۔

کیٹ کو سردی محسوس ہوئی۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ بغل میں دبا لیے۔ آنکھیں اندھیرے سے ہم آہنگ ہوئیں تو اُسے ایک بینچ پر ضعیف العمر عورت بیٹھی دکھائی دی۔ عورت کے بال بھیگے ہوئے تھے۔ کپڑوں سے بھی پانی ٹپک رہا تھا۔ اُس کی حالت فوری مدد کا تقاضا کرتی تھی۔ کیٹ اس کے قریب پہنچ گئی۔ اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "کیا میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں؟"

عورت نے سر اٹھایا۔ کیٹ کا سینہ جکڑ گیا۔ سانس رکنے لگا۔

عورت کے چہرے پر جھریاں تھیں، بڑھاپے کا عکس تھا لیکن کیٹ لکیروں کے پیچھے سے جھانکتا چہرہ بہ آسانی پہچان سکتی تھی۔ وہ جینفر تھی۔

"جینفر......" وہ ہکلائی۔

"وہ آجائے گا۔" عورت نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ دیا۔ کیٹ لرز گئی۔ وہ ہاتھ برف سے زیادہ سرد تھا۔ "وہ آجائے گا......"

"جینفر......" کیٹ کی آواز رندھ گئی۔

"الوداع!" عورت نے دھیرے سے کہا۔

ایک زوردار دھماکا ہوا اور اسپتال اندھیرے میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

جو لہر نیویارک کے ساحل سے ٹکرائی، وہ اُس لہر سے زیادہ پُرقوت تھی جس نے چند روز قبل کنگسٹن کے ساحل پر حملہ کیا تھا۔ جن ہواؤں نے شہر پر چڑھائی کی، وہ ان ہواؤں سے زیادہ غضیل تھیں، جنہوں نے چند گھنٹوں قبل نیوجرسی کو نشانہ بنایا تھا۔

وہ آسیب جو بحیرۂ کیریبین کے پاتال سے برآمد ہوا تھا جس نے جمیکا پر حملہ کرنے کے بعد بحرِ اوقیانوس کے راستے شمال کا سفر کیا تھا جہاں وہ دریائے ہڈسن میں سرایت کر گیا تھا...... اب پوری قوت سے دہاڑ رہا تھا۔

اور اُس کی ظالم دہاڑ نہ صرف ساحلی علاقوں میں سنی جا سکتی تھی، بلکہ شیلٹر ہومز میں بیٹھے ہزاروں افراد بھی اُسے سن سکتے تھے۔ وہ لرز رہے تھے کیونکہ آسمان اور ہوائیں اُن کی مخالف تھیں۔

پہلی لہر نیویارک کے ساحل سے ٹکرائی، تو ایک دھماکا ہوا۔ اگلے ہی لمحے دوسری لہر کنارے پر اتری۔ بادل گرجے۔ پھر تیسری لہر، پھر چوتھی...... کنارہ پلوں میں زیرِ آب آ گیا۔ ساحلی پٹی میں پانی داخل ہو گیا۔ اور یہ سب اتنی قوت سے ہوا کہ دیکھنے والے حواس کھو بیٹھے۔

ہواؤں میں چھپے حملہ آوروں نے مکانات کی چھتوں پر حملہ کر دیا۔ انہیں اپنے نوکیلے پنجوں سے ادھیڑ ڈالا۔ موجیں پھنکارتی ہوئی رہائشی علاقے میں داخل ہوئیں۔ مکانات ڈھنے لگے۔ کثیر المنزلہ عمارتیں لرزنے لگیں۔

وہ بدقسمت، جو حکومتی احکامات کے باوجود تا حال اپنے گھروں میں مقیم تھے، اب موت کو اپنے سامنے دیکھ کر ہمت ہار بیٹھے۔

کنارے کو روند کر ساحلی علاقے میں داخل ہونے والی پہلی ہی لہر نے سولہ افراد کی جان لے لی۔

انسانی زندگیوں کی قربانی قبول کرنے کے بعد سمندری عفریت نے وحشت ناک قہقہہ لگایا، جس کی بازگشت بالائی علاقے میں موجود کیٹ کے کانوں سے بھی ٹکرائی۔ برساتے پانی کے ساتھ وہ وحشت بیکر کے وجود میں بھی اتری، جو محبت کی قوت کے سہارے ایک مشکل سفر طے کر کے بالآخر مین ہٹن میں داخل ہو گیا اور اب بھیگتا ہوا، کپکپاتا ہوا کیٹ کے فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔

☆☆☆

29 اکتوبر کی شب، نیویارک۔

اس سے قبل کہ امریکی صدر کی جانب سے نیویارک کو "آفت زدہ علاقہ" قرار دیا جاتا، بیس افراد زندگی سے محروم ہو چکے تھے۔ سیلابی ریلے نے تباہی مچا دی تھی۔ زیرِ زمین ریلوے، سرنگیں زیرِ آب آ گئی تھیں۔ پورا علاقہ موسلا دھار



بارش، تیز ہواؤں اور سیلاب کی زد میں تھا۔

یہ جل کی صورت آسمان سے نازل ہوتے والی اجل ہی کی قوت تھی کہ نیویارک کے کئی علاقے جہاں ابھی سیلابی لہریں نہیں پہنچی تھیں، وہاں بھی پُراسرار انداز میں پانی داخل ہو گیا اور راہ میں آنے والی ہر شے کو روندتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ اچانک ہی اوہائیو میں شدید برف باری شروع ہو گئی۔

ماہرین کی پانچ کروڑ افراد کے متاثر ہونے کی پیش گوئی حقیقت کا روپ دھار رہی تھی۔ کئی ریاستیں تو پہلے ہی بجلی سے محروم ہو گئیں، مگر طوفان کی آمد نے نیویارک کو بھی تاریکی کی گہری کھائی میں دھکیل دیا۔ فوراً ہی اسپتالوں میں ایمرجنسی نافذ کر دی گئی۔ متبادل نظام اختیار کیے گئے، لیکن 29 اکتوبر کی اُس منحوس رات...... قسمت نیویارک سے روٹھی ہوئی تھی۔

ایک ایک کر کے، بڑے ہی عجیب ڈھنگ سے اسپتالوں میں نصب جنریٹرز بند ہونے لگے۔ مریضوں کو شیلٹر ہومز اور قریبی شہروں کی جانب منتقل کرنے کی کوششوں کا آغاز ہو گیا۔

کیٹ جس اسپتال میں تھی آخر کار اُس کا جنریٹر بھی جواب دے گیا اور انتظامیہ نے مریضوں کو قریبی پناہ گاہ منتقل کرنے کا اعلان کر دیا۔

گو کہ گرجتے برستے آسمان، تیز رفتار ہواؤں نے اس عمل میں رکاوٹ کھڑی کرنے کی بھرپور کوشش کی لیکن انتظامیہ کی مربوط اور منظم کوششوں اور باہمت رضا کاروں کی کوششوں سے یہ عمل شروع ہو گیا۔

کچھ ہی دیر بعد بارہ مریض اسپتال کے باہر کھڑی وین میں منتقل ہو چکے تھے۔ وین کی منزل اسٹریٹ ون پر واقع وہی شیلٹر ہوم تھا، جہاں کیٹ کی ٹیم بچوں کی دیکھ ریکھ کا فریضہ انجام دے رہی تھی۔

وین کی روانگی سے کچھ دیر قبل، نہ جانے کیا سوچ کر کیٹ بھی اُس میں سوار ہو گئی۔

ہواؤں کی سنسناہٹ وحشت ناک تھی۔ سڑکوں پر سیاہ پانی کھڑا تھا، جس میں بارش کا پانی تیزی سے شامل ہو رہا تھا اور ایسے میں وین دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھی۔

یکدم بادل پوری قوت سے گرجے اور وین میں سراسیمگی پھیل گئی۔

کیٹ نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ دور، آسمان میں پُراسرار زرد روشنیاں حرکت کر رہی تھیں۔ خوف نے اُس کے وجود کو ڈسا۔

تیرہ برس قبل اُس نے ٹورنٹو کے آسمان میں یہ پُراسرار روشنی دیکھی تھی اور اسی رات اسے اپنے باپ سے محروم ہونا پڑا تھا۔ اور آج...... ایک بار پھر منحوس روشنیاں اس کی آنکھوں کے سامنے تھیں۔

"بیکر......!" اُس نے دھیرے سے کہا۔ آنکھ سے ایک آنسو برآمد ہوا اور لڑھکتا ہوا ہونٹوں تک آ گیا، جہاں ایک دعا تھی۔ "اے خدا، اس کی حفاظت کرنا!"

نیویارک شہر سے میلوں دور پنسلوانیا میں، ایک نوجوان ٹیکسی ڈرائیور، چہرے پر پریشانی لیے ریڈیو سے نشر ہونے والی خبریں سن رہا تھا۔

"نیویارک کے علاقے کوئنز میں آگ لگنے سے کم از کم پچاس گھر تباہ...... نیوجرسی میں واقع امریکا کے سب سے پرانے ایٹمی بجلی گھر کو چڑھتے ہوئے پانی کی وجہ سے ہائی الرٹ پر کر دیا گیا ہے، اندیشہ ہے کہ تابکاری مواد پانی میں شامل ہو کر نیویارک میں داخل......"

سمیر خان نے ریڈیو بند کر دیا۔ اس نے سرد آہ بھری۔ آسمان کی طرف دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اپنے رب سے دعا کر رہا تھا، ایک دوست کی حفاظت کی دعا!

☆☆☆

اچانک حملہ آور ہونے والی تاریکی نے اس کی دھڑکن تیز کر دی۔ سردی میں بھی یکدم اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ ٹھٹھرنے لگا۔ دور کسی جانور کے رونے کی آواز سنائی دی۔

بیکر نے جیب سے ٹارچ نکال کر روشن کی۔ وہ اس وقت کیٹ کے فلیٹ میں تھا۔

گو کہ بارش کھڑکیوں پر شور مچا رہی تھی، مگر فلیٹ مکمل طور پر تاریکی اور سناٹے میں ڈوبا تھا۔ وہ ماضی میں بھی چار پانچ بار یہاں آ چکا تھا، لیکن آج سے قبل اسے کبھی یہ عمارت اتنی وحشت ناک نہیں محسوس ہوئی۔ پوری بلڈنگ پر اداسی طاری تھی۔

اُس کی مایوسی بڑھنے لگی۔ "کہیں وہ سیلابی ریلے کی زد میں نہ آ گئی ہو؟" دل میں اندیشے نے سر اٹھایا۔ اُس نے فوراً ہی یہ خیال جھٹک دیا اور تاریک سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگا۔ اُس کا ارادہ کیٹ کے دفتر جانے کا تھا۔

سیڑھیاں اترتے وقت ایک پل کے لیے اُسے محسوس ہوا، جیسے کوئی اُسے گھور رہا ہے۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ بس پُراسرار چپ تھی۔

آخری زینہ عبور کر کے جونہی بیکر نے بیسمنٹ میں قدم رکھا، اُس نے خود کو کمر تک سرد پانی میں گھرا پایا۔

تحیر نے اُسے ڈسا۔ ابھی آٹھ منٹ قبل جب وہ بیسمنٹ میں داخل ہوا تھا، اُس وقت پانی فقط اس کے ٹخنوں تک تھا، لیکن کچھ ہی لمحوں میں اِس کی سطح تین فٹ بلند ہوگئی تھی۔۔اور یہ اس جانب اشارہ تھا کہ بیکر ایک بڑی مشکل میں پھنس چکا ہے۔

اُسے ایک شیطانی قہقہہ سنائی دی۔ اُس نے ٹارچ کی روشنی سامنے پھینکی۔ بیسمنٹ کے داخلی حصے سے پانی کا شور مچاتا ہوا ریلا اندر آرہا تھا۔ ہر گزرے لمحے کے ساتھ پانی کی سطح بڑھ رہی تھی۔

"مجھے یہاں سے نکلنا ہوگا۔" اس نے خود سے کہا۔ اچانک اس کی نظر.... لکڑی کے ایک ٹکڑے پر پڑی۔ وہ اُس کی جانب بڑھنے لگا۔

دو، شعلے سی سرخ آنکھیں اس پر ٹکی تھیں۔

☆☆☆

"ہم مزید آگے نہیں جاسکتے۔" وین کا ڈرائیور چلایا۔ "سڑک نشیب کی طرف جارہی ہے، وہاں کئی فٹ پانی کھڑا ہے۔"

"ہمیں مریضوں کو فوراً کسی محفوظ مقام پر پہنچانا ہوگا۔" وین میں موجود ایک ڈاکٹر نے کہا۔

"مگر یہ راستہ سیدھا موت کے منہ میں جاتا ہے۔" ڈرائیور کے لہجے میں اضطراب تھا۔

"وین دائیں جانب موڑلو۔ ایک سروس روڈ ہے، ہم اس سے ہوکر اسٹریٹ ون پہنچ سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" ڈرائیور نے وین موڑلی اور وہ پانی کو چیرتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔ کیٹ نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ تیز بارش نے دھند کی چادر تان رکھی تھی۔ ہوائیں چیخ رہی تھیں۔

"یہاں بھی راستہ بند ہے۔" ڈرائیور کی کرب ناک آواز گونجی۔

"کیا ہم یہاں انتظار نہیں کرسکتے؟" ایک نرس نے کہا۔

"پانی کی سطح تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ کہیں یہ وین ہی ہمارا تابوت نہ بن جائے۔" ڈرائیور کی آواز میں کرب تھا۔

کیٹ کھڑکی میں بیٹھی تھی۔ دُھند کی چادر کے پیچھے اُسے ایک بلند ستون دکھائی دیا۔ اُس نے غور سے دیکھا، وہ ایک مینار تھا۔

"وہاں...... ایک گرجا ہے۔" کیٹ نے دھیرے سے کہا۔

"کیا کہا گرجا؟" ڈرائیور نے باہر جھانکا۔ "یہ بارش کی وجہ سے کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔"

مگر کیٹ دیکھ سکتی تھی۔ "وہاں بائیں جانب۔" اس کی نظریں مینار پر ٹکی تھیں۔ "روشنی نظر آرہی ہے۔ شاید وہاں بجلی ہے۔"

"مگر...... اس سڑک پر تو کوئی گرجا نہیں۔" یہ جملہ ایک نرس کی زبان سے ادا ہوا تھا، جس کے لہجے میں تذبذب تھا۔

"میں نے دیکھ لیا۔" ڈرائیور چلایا۔ "تھوڑی چڑھائی ہے۔ شاید ہم وہاں کچھ دیر قیام کرسکیں۔"

وین نے ایک بار پھر رخ بدلا اور روشن مینار کی جانب بڑھنا شروع کردیا۔ کیٹ شیشے سے لگی کھڑی تھی۔ گرجا قریب آتا جارہا تھا۔ دھند چھٹ رہی تھی!

☆☆☆

بیکر کا سینہ تھرتھرانے لگا۔

وہ عمارت کے بیسمنٹ سے نکل آیا تھا اور اب برستے آسمان، دہاڑتی ہواؤں سے برسرِپیکار تھا۔ شیطانی قہقہوں سے بھی مقابلہ کرتا تھا جو اُس کی سماعتوں میں چبھ رہے تھے۔

سڑکوں پر گرے ہوئے درخت، ملبے اور تیزی سے بہتے پانی سے راستہ بناتا ہوا وہ دھیرے دھیرے کیٹ کے دفتر کی جانب بڑھ رہا تھا۔ راہ میں کئی رکاوٹیں تھیں۔ آگ اگلتی آنکھیں اس پر ٹکی تھیں۔ کئی بار وہ لڑکھڑایا۔ گرتے گرتے بچا۔ جب چلتے چلتے تھک گیا تو دم لینے کے لیے ایک انتظار گاہ کی چھت تلے آگیا اور ٹھیک اسی لمحے جیب میں پڑا موبائل فون تھرکنے لگا۔

اس نے گھڑی دیکھی۔ رات کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔ طلوعِ آفتاب میں ابھی ڈیڑھ گھنٹا باقی تھا۔

"ہیلو مسٹر بیکر مولر؟" ایک نسوانی آواز اُس سے مخاطب تھی۔

"جی۔ آپ کون؟" اُس نے جواب دیا۔

"میں میری برگس بول رہی ہوں۔ میں ایک فلاحی تنظیم ہیلپ کی ڈائریکٹر ہوں۔ کیا آپ کیٹ ٹیلر کو جانتے ہیں؟"

بیکر کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ "کیا ہوا اُسے؟"

میری نے ایک لمحے کے لیے توقف کیا۔ "میں چاہوں گی کہ آپ میرے کہے ہوئے ہر لفظ کو غور سے سنیں مسٹر بیکر۔ آج شام ہم اپنا دفتر چھوڑ کر اسٹریٹ ون کے ایک شیلٹر ہوم منتقل ہوگئے تھے۔ کیٹ ہمارے ساتھ تھی...... پھر ایک قریبی اسپتال سے ایمرجنسی کال آئی...... وہ چند رضا کاروں کے ساتھ وہاں روانہ ہوگئی۔ اس نے جاتے ہوئے مجھے آپ کا نمبر دیا تھا کہ اگر اُسے کچھ ہوجائے تو......"

"کیا ہوا ہے اُسے؟" بیکر چلایا۔

"خود پر قابو رکھیں مسٹر بیکر۔" میری نے کہا۔ "بہ مشکل آپ سے رابطہ ہوا ہے۔ میں چاہتی ہوں، آپ میری پوری بات سن لیں۔"

"میں سن رہا ہوں۔" بیکر نے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"اب سے ڈھائی گھنٹے قبل اسپتال کا جنریٹر فیل ہونے کے بعد مریضوں کو شیلٹر ہوم منتقل کرنے کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ کیٹ پیرامیڈیکل اسٹاف، بارہ مریضوں اور دیگر رضا کاروں کے ساتھ اسپتال سے روانہ ہونے والی پہلی وین میں سوار تھی۔" وہ سانس لینے کے لیے رکی۔ "اسپتال سے روانہ ہونے والی چار وینیں تو یہاں پہنچ چکی ہیں لیکن پہلی وین تاحال یہاں نہیں پہنچی۔ میں گزشتہ دو گھنٹے سے اُن سے رابطہ کرنے کی کوشش کررہی ہوں...... مگر آپ جانتے ہیں طوفان نے......"

"آپ مجھے اپنا ایڈریس بتائیں۔" بیکر نے بات کاٹی۔

میری نے اُسے پتا سمجھایا۔ "اور کیٹ کس اسپتال میں تھی؟"

"بروکلن اسپتال۔ یہ نیم سرکاری ادارہ ہے، جو سٹی میوزیم کی دائیں جانب، نسبتاً اونچائی پر ہے۔"

"شکریہ مس میری۔" بیکر نے کہا۔ "میں اسپتال جارہا ہوں۔ اس دوران اگر آپ کو کوئی اطلاع ملے، تو مجھے فون کرنا مت بھولے گا۔"

"یقینی طور پر مسٹر بیکر۔" میری نے کہا۔ "مگر...... ان حالات میں آپ کا یوں سڑک پر نکلنا خطرناک ہوسکتا ہے۔"

"میں گزشتہ کئی گھنٹوں سے سڑکوں ہی پر ہوں مس میری۔" اُس نے کہا۔ "میرے اور اس طوفان کے درمیان مقابلہ ہے۔ دیکھتے ہیں کون جیتتا ہے۔"

"مگر مسٹر بیکر......" میری کے لہجے میں فکرمندی تھی۔

"آپ بے فکر رہیں، میں اپنا خیال رکھوں گا۔"

"ٹھیک ہے...... اپنا خیال رکھیے گا۔" کال منقطع ہوگئی۔

بیکر نے فون بند کر کے جونہی سر اٹھایا...... حیرت اُس سے ٹکرائی۔

اب نہ تو کوئی انتظار گاہ تھی، نہ ہی کوئی طوفان۔ وہ تو دبیز دھند میں گھرا ہوا تھا جس میں راکھ تیر رہی تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔

"میں کہاں ہوں؟" اُس نے خود سے سوال کیا۔ اُن ہواؤں کی آوازیں سننے کی کوشش کی جو گزشتہ کئی گھنٹوں سے اُس کی سماعتوں میں چھریاں چلا رہی تھیں مگر اب...... مکمل خاموشی تھی۔ ہوا چپ تھی۔

اُس نے تحیر کے زیرِ اثر نظر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ دبیز دھند نے پردہ سا تان رکھا تھا۔ آسمان چھپا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ آگے بڑھایا، یہ دیکھنے کے لیے بارش ختم چکی ہے یا نہیں۔ جب ہاتھ دھند سے لوٹا، وہ خشک تھا۔

"یہ ناممکن ہے......" وہ بڑبڑایا۔ "ابھی چند لمحات قبل تو طوفان......" اس نے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ وہ تاحال گیلے تھے۔ لباس بھی بھیگا ہوا تھا۔ "یہ سب......" وہ متحیر نظر آتا تھا۔

دل میں کیٹ کی یاد ایک لہر کی صورت ٹکرائی۔ وہ مضطرب ہوگیا۔ گوکہ آنکھوں کے سامنے دھند چھائی تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ سمت سے لاعلم تھا۔ دُرست راستہ نہیں جانتا تھا لیکن وہ ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ کیٹ کی محبت اسے چلنے کا، مسلسل چلتے رہنے کا پیغام دے رہی تھی۔

اس نے ایک قدم آگے بڑھایا پھر دوسرا قدم، پھر تیسرا۔ اور پھر وہ دھند کو چیرتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ کہاں جارہا ہے...... نہیں جانتا تھا کہ کیا کررہا ہے...... بس کیٹ کی محبت میں وہ آگے بڑھ رہا تھا۔ اپنی محبوبہ کو زندہ دیکھنے کی خواہش اُسے توانائی فراہم کررہی تھی...... حوصلہ دے رہی تھی، جس کے سہارے وہ دھند کو دھکیل رہا تھا۔ اور کوئی اسے گھور رہا تھا۔

وہ تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ پھر دوڑنا شروع کردیا۔ وہ دھند کے درمیان دوڑ رہا تھا جہاں ہر شے پوشیدہ تھی۔

دوڑتے دوڑتے اچانک اُس کے کانوں سے بادلوں کی گرج ٹکرائی لیکن وہ رکا نہیں۔

پھر تیز ہواؤں کی پھنکار نے سماعتوں میں زہر گھولا لیکن وہ ٹھہرا نہیں۔

پھر سمندر کا شور سنائی دیا۔ وہ منجمد نہیں ہوا۔ آگے بڑھتا رہا۔

وہ دوڑتا گیا، دوڑتا گیا، یہاں تک کہ توانائی جواب دینے لگی۔ وہ تھکنے لگا لیکن اس نے دھند کو چیرنے کا عمل

جاری رکھا، لیکن پھر...... ایک خاص لمحے ہمت جواب دے گئی۔ وہ زمین پر بیٹھ گیا۔ غنودگی میں اتر گیا۔ اپنے حواس کھونے لگا۔ اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔

پُرقوت سمندر ساحل سے ٹکرا رہا تھا۔ تیز ہواؤں کی دہاڑ نے ماحول کا احاطہ کر لیا تھا۔ غصیل آسمان پانی کے تیر چلا رہا تھا۔ تباہی، موت کے ہمراہ رقص کناں تھی کہ اچانک کچھ عجیب رونما ہوا۔ سکون کا قوی احساس آسمان سے اترنے لگا۔

"ٹن...ٹن...ٹن۔" حواس جاگنے سے قبل بیکر کی سماعت بیدار ہوئی۔ پھر جسم نے جھرجھری لی۔ "ٹن...ٹن...ٹن۔"

وہ نقاہت محسوس کر رہا تھا۔ سر گھوم رہا تھا لیکن دھیرے دھیرے آنکھیں کھولنے لگا۔

اس نے خود کو سمیٹا اور اٹھا۔ پیچھے ایک درخت تھا۔ اس کے تنے سے ٹیک لگائی۔ گو کہ بارش تھمی نہیں تھی لیکن اب...... کچھ ایسا تھا جو مضطرب دل کو سکون فراہم کر رہا تھا۔

اس نے سر اٹھایا۔ دھند چھٹ چکی تھی۔ مشرق کی سمت سے ہلکی ہلکی روشنی نمودار ہو رہی تھی۔ نیا دن جنم لینے کو تھا۔

"ٹن...ٹن...ٹن۔" اس نے گردن موڑی۔ سامنے گرجا گھر تھا جس کا مینار بلند اور روشن تھا۔

☆☆☆

وین ڈرائیور گرجے کا گھنٹا بجا رہا تھا۔ اُس کے لبوں پر دعائیں تھیں۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔

گرجا گھر میں موجود پیرامیڈیکل اسٹاف، رضا کار اور مریض مراقباتی کیفیت میں تھے۔ وہ وقت سے ماورا، گہرے استغراق میں دعا کر رہے تھے۔ امن کی، سکون کی دعا۔ اپنے پیاروں کی حفاظت، اُن کی زندگی کی دعا۔

"ٹھک ٹھک......" کیٹ کے کانوں سے ایک آواز ٹکرائی۔ اُس نے گردن موڑی۔ سامنے گرجا کا دروازہ تھا جہاں سکتہ طاری تھا۔

"کیا یہ میرا واہمہ تھا؟" اُس نے خود سے سوال کیا۔ گزشتہ چند گھنٹوں میں تغیرات اُسے کئی محیر العقول مناظر دکھا چکے تھے۔ اب کسی بھی منظر پر یقین کرنا مشکل تھا۔

"ٹھک ٹھک......" آواز پھر سنائی دی۔ اس نے دیگر لوگوں کی جانب دیکھا۔ ان کی آنکھیں بند تھیں۔ سر جھکے ہوئے تھے۔ اُنہیں کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

"ٹھک ٹھک......"

وہ آگے بڑھی۔ دروازے تک آئی۔ ہینڈل پر رکھا۔ دھیرے سے دروازے کا ایک پٹ کھلا۔ نم ہوا چہرے سے ٹکرائی۔ نظر آسمان پر پڑی۔ سپیدہ نمودار ہو رہا تھا۔ ... نے گہرا سانس لیا۔ پھر دوسرا پٹ کھول دیا۔

ایک معجزہ اس کا منتظر تھا...... بیکر سامنے کھڑا تھا۔

کیٹ فرطِ جذبات سے چلانا چاہتی تھی، لیکن آواز کہیں اندر ہی، دل کے کسی کونے میں ٹھہر گئی۔ وہ ... بانہوں میں بھرنا چاہتی تھی، لیکن لرزتا وجود ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ وہ رقص کرنا چاہتی تھی مگر......

"کیٹ۔" بیکر نے دھیرے سے کہا۔ اور تب ... کے جذبات کا بندھن ٹوٹ گیا۔ اُس کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو چھلک پڑے۔

"ٹن...ٹن...ٹن۔" گرجے کے گھنٹے بجے۔

"اوہ بیکر......" وہ خوشی سے چلائی اور اُس کے سینے سے لگ گئی۔ "اوہ، تم آگئے!" وہ مسلسل ایک ہی جملہ دہرا رہی تھی۔

"ہاں، میں آگیا میری جان۔" بیکر نے جواب دیا۔

شاید وہ دونوں گھنٹوں یونہی کھڑے رہتے کہ تالیوں کے خوش کن شور نے انہیں چونکا دیا۔

دونوں نے سامنے دیکھا۔ گرجے میں موجود لوگوں کے چہرے پر شفیق مسکراہٹ تھی۔ وہ دعائیں پڑھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے محبت کے وسیلے وقوع پذیر ہونے والا معجزہ تھا، جو اُنہیں برتر قوت پر بھروسا کرنے کا پیغام دے رہا تھا۔

گو کہ آسمان برس رہا تھا، ہوائیں چل رہی تھیں، سمندر بپھرا ہوا تھا اور المیہ جاری تھا، لیکن ایک معجزہ جنم لے چکا تھا۔

کیٹ، بیکر کی بانہوں میں تھی۔

"ٹن...ٹن...ٹن۔" نیا دن طلوع ہو چکا تھا!

☆☆☆

30 اکتوبر کی صبح، نیویارک۔

بحرِ اوقیانوس کے راستے دریائے ہڈسن میں سرایت کرنے والے اضطراب نے مختصر وقت میں تباہی کی ایک طویل اور غمگین کہانی لکھی۔

سڑکیں اُدھڑ گئی تھیں۔ نشیبی علاقے پوری طرح زیرِ آب آگئے تھے۔ پورا شہر بجلی سے محروم تھا۔ نیویارک اسٹاک ایکس چینج میں بھی سناٹا رینگ رہا تھا۔ 1886 کے بعد یہ پہلا موقع تھا، جب اسٹاک ایکس چینج بگڑتے موسم کی وجہ سے مسلسل دو دن تک بند رہا۔

اگرچہ ساحل سے ٹکرانے کے بعد سینڈی کی شدت میں کچھ کمی واقع ہوئی تھی، تاہم ہواؤں کی رفتار اب بھی طوفان جیسی ہے۔

صدر اوباما نے اپنی انتخابی مہم منسوخ کر دی۔ یہ خدشہ بھی ظاہر کیا جا رہا تھا کہ سرد موسم اور تیز ہواؤں سے چھ نومبر کو ہونے والا الیکشن بھی متاثر ہو سکتا ہے۔ ساتھ ہی سخت موسم کو بے گھر ہونے والے ہزاروں افراد کا بھی قاتل قرار دیا جا رہا تھا۔

☆☆☆

گرجا گھر میں روشنی تھی۔

وہاں موجود لوگوں کے چہروں پر نقاہت ضرور تھی، تھکن بھی تھی، لیکن مایوسی نہیں۔ وہ پُر امید تھے۔ مسکرا رہے تھے۔ پُرسکون تھے۔

شیلٹر ہوم سے رابطہ ہو گیا تھا، میئر کے دفتر بھی یہ پیغام پہنچا دیا گیا تھا کہ ایک چرچ میں چند مریض پھنسے ہوئے ہیں، فوری امداد بھیجی جائے۔

کیٹ کا سر بیکر کے سینے پر تھا۔ دونوں کی آنکھیں بند تھیں۔ دونوں ہی تھک چکے تھے، لیکن وہ مسرور تھے۔

اچانک بیکر کی اوپری جیب تھرتھرانے لگی۔ اس کا موبائل فون بج رہا تھا۔ کیٹ مسکراتے ہوئے اس سے الگ ہوئی۔

"ہیلو! بیکر مولر بول رہا ہوں۔"

"بیکر میرے دوست! تم یقین نہیں کرو گے، تمہاری آواز سن کر مجھے کتنی خوشی ہوئی۔"

چند ساعت بیکر پُرخلوص آواز شناخت کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ "سمیر خان؟"

"صحیح پہچانا دوست۔" وہ چہکا۔ "نیویارک سے آنے والی خبروں نے رات بھر مجھے اذیت میں مبتلا رکھا۔ میں نے دو تین بار تمہارا فون ٹرائی کیا، لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ اب تمہاری خیریت ملی ہے تو سکون آیا ہے۔" وہ سانس لینے کے لیے رکا۔ "وہ تمہاری گرل فرینڈ؟" لہجہ محتاط تھا۔

"ہاں، وہ خیریت سے ہے۔" بیکر نے کیٹ کی روشن آنکھوں کی جانب دیکھا۔ "اور میرے ساتھ ہے۔"

"زندہ باد!" سمیر نے نعرہ لگایا۔ "چلو دوست، زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی۔ میری نیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں۔"

"نیک تمناؤں ہی کی مجھے ضرورت ہے دوست۔" بیکر نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ "لیکن ملاقات کے لیے کسی اتفاق کی ضرورت نہیں۔ نیو ایئر والے روز میری نئی زندگی کا آغاز ہوگا۔ میں اور کیٹ شادی کرنے والے ہیں۔ اور میں چاہتا ہوں کہ تم اس دن میرے ساتھ ہو۔"

"واقعی؟" سمیر کی آواز میں خوشی تھی۔ "ضرور... میں تمہارے ساتھ ہوں گا۔"

"اور سنو۔" بیکر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ "اپنے دوست جارج کو بھی ساتھ لیتے آنا۔ وہ منہ پھٹ ضرور ہے لیکن دل کا بہت اچھا ہے۔"

"ایسا ہی ہوگا برادر!" سمیر نے جواب دیا۔

☆☆☆

طوفان تو گزر گیا تھا، لیکن اپنے نشانات چھوڑ گیا۔ زندگی معمول پر آنے میں کئی دن لگے۔

نیویارک کے بڑے حصے کی بجلی معطل تھی، جس کی وجہ سے شہری عجیب و غریب اذیت میں مبتلا تھے۔ وہ روشنیوں کے، چمک دمک کے عادی تھے اور اب ان کے سامنے فقط تاریکی تھی۔ موبائل فون بے کار ہو گئے تھے۔ انٹرنیٹ کی دنیا تک رسائی مشکل ہو گئی تھی۔ بجلی نہ ہونے کی وجہ سے ٹی وی بھی خاموش بیٹھے تھے۔ وہ چند خوش نصیب جن کے پاس بیٹری سے چلنے والے ریڈیو تھے، وہی حالات سے باخبر تھے۔ باقی افراد دنیا سے کٹے ہوئے تھے۔

چند روز تک دفاتر، درس گاہیں بالکل چپ رہے۔ ٹرانسپورٹ سڑکوں سے غائب رہی۔ لیکن پھر انتظامیہ کی مسلسل کوششوں اور باہمت شہریوں کے ارادوں نے معمولاتِ زندگی کی بحالی کا آغاز کیا۔

ٹرانسپورٹ سروسز کی بحالی دقت طلب کام تھا، سو شہریوں نے دیگر ذرائع استعمال کیے۔ آہستہ آہستہ دفاتر کی رونقیں بحال ہونے لگیں۔ درس گاہیں کھولنے کے عمل میں رضا کار طلبا نے انتظامیہ کی بھرپور مدد کی۔ اس دوران بے گھر ہونے والوں کی ہر ممکن مدد کی گئی۔

مرنے والوں کے لواحقین کی دل جوئی کے لیے پورا نیویارک کھڑا ہو گیا۔ ان کا دکھ بانٹا۔ ان کے غم کو اپنے غم کے طور پر منایا۔ زخمیوں کو بھی بھرپور توجہ دی گئی۔

اس عمل میں بیکر اور کیٹ بھی شامل تھے۔ بیکر نے اگلے چند روز یتیم بچوں کی دیکھ ریکھ میں صرف کیے۔ پھر اس

کا کولمبیا یونیورسٹی کے چند طلبا سے رابطہ ہوگیا جن کے ساتھ اس نے سڑکوں پر امدادی کاموں میں حصہ لیا۔

نیویارک نے وہ منظر بھی دیکھا، جب کئی افراد نے سڑکوں پر اسٹال لگا کر ایمرجنسی لائٹس فروخت کیں، جنہیں دھڑا دھڑ خریدا گیا۔ بیٹری سے چلنے والے ریڈیو اور چھوٹے ٹی وی بھی خاصے فروخت ہوئے۔

''ہم بچوں کو بتائیں گے کہ ایک وقت ایسا بھی آیا تھا، جب ہم بجلی سے محروم ہوگئے تھے۔'' بیکر نے مسکراتے ہوئے کیٹ کو ٹہوکا دیا، جس کے گال شرم سے گلابی ہوگئے تھے۔

حالات معمول پر آنے کے بعد نقصان کا اندازہ لگایا گیا۔ اس خوفناک طوفان نے فقط امریکا میں 131 افراد کی جان لے لی تھی۔ مجموعی طور پر اس نے 253 زندگیاں نگلیں۔ امریکی حکومت کو 63 بلین ڈالر جیسا بھاری نقصان برداشت کرنا پڑا۔ کُل 8 کروڑ افراد اس سے متاثر ہوئے۔ 24 ریاستوں میں ہنگامی حالت نافذ کرنا پڑی۔ لاکھوں لوگ بجلی سے محروم رہے۔ اشیائے خورونوش کا بھی بحران پیدا ہوگیا۔ پندرہ ہزار پروازیں منسوخ کی گئیں۔ شاید اسی باعث کچھ حلقوں کی جانب سے سینڈی کو ''طوفانِ عظیم'' بھی کہا گیا۔

ماہرینِ موسمیات نے طوفان کا تجزیہ کرنے کے بعد اعداد و شمار بھی جاری کیے، جن کے مطابق اس عفریت کی جسامت ایک ہزار میل یا 1600 کلومیٹر تھی۔ بلند ترین سمندری لہریں نیویارک کے قریب ریکارڈ کی گئیں، جو تقریباً 13.88 فٹ اونچی تھیں۔ جھکڑ کی انتہائی رفتار ماؤنٹ واشنگٹن اور نیو ہمپشائر پر ریکارڈ کی گئی، جو لگ بھگ 140 میل فی گھنٹا تھی۔ سب سے زیادہ بارش ایسٹون، میری لینڈ میں ریکارڈ کی گئی، جب کہ انتہائی برف باری ریڈ ہاؤس، میری لینڈ میں ہوئی۔

طوفان تو گزر گیا، مگر پیچھے کرب ناک نشانات چھوڑ گیا۔

☆☆☆

20 نومبر، کنگسٹن، جمیکا۔

ساحل کی ریت پر دھوپ چمک رہی تھی۔ کشتیاں پُرسکون سمندر کی نرم لہروں پر تیر رہی تھیں۔ چہل پہل معمول کے مطابق تھی۔ کچھ لوگ جسم سینک رہے تھے، کچھ چھتری تلے بیٹھے تھے۔

بحالی کا کام شروع ہوئے تین ہفتے گزر چکے تھے اور کنگسٹن کا ساحل دھیرے دھیرے پرانی حالت کی جانب لوٹ رہا تھا۔ بس اس منظر میں ایک کمی تھا...... درخت کی چھاؤں تلے ویرانی تھی۔ وہاں بیٹھنے والا بوڑھا مستقبل بین کہیں دُور جا چکا تھا۔

☆☆☆

21 نومبر، کیوبا کا جنوب مشرقی ساحل۔

کانسٹیبل بیتستا قبرستان میں کھڑا تھا۔ اُس کے سامنے ایک قبر تھی، جس کے کتبے پر پروفیسر گودرج گویرا کا نام درج تھا۔

کانسٹیبل نے ایک گل دستہ قبر پر رکھا۔ کچھ کہنے کے لیے لب کھولے۔ پھر خاموش ہوگیا۔

☆☆☆

☆ 22 نومبر، نیویارک شہر۔

لانچ نیویارک ہاربر کے پانیوں کو چیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ ایک جانب مین ہٹن تھا، دوسری جانب اسٹیٹن جزیرہ۔

بیکر اور کیٹ عرشے پر کھڑے تھے۔ اُنہوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ آنکھوں کے سامنے مجسمۂ آزادی تھا، جو سورج کی سنہری کرنوں کا لبادہ اوڑھے دمک رہا تھا۔

اُن کی شادی کی تیاریاں زور شور سے جاری تھیں اور وہ دونوں انتہائی مسرور تھے۔

☆☆☆

23 نومبر، بحیرۂ کیریبین کا مغربی حصہ۔

آسمان کی نظریں سمندر پر ٹکی تھیں۔

اوپری سطح کے مانند آج نیچے گہرائیوں میں بھی خاموشی چھائی تھی۔ پاتال میں رینگتا عفریت کمزور پڑ گیا تھا۔ اُسے مزید حدت کی ضرورت تھی۔ اپنا تباہ کن ارادہ ظاہر کرنے کے لیے ماحول دشمن موسمی تبدیلیاں درکار تھیں۔

مگر اُسے جلدی نہیں تھی۔ وہ انتظار کر سکتا تھا۔ نظریں امریکی نیوکلیئر پلانٹس پر ٹکی تھیں جن سے جنم لینے والی آلودگی چند برس بعد اُسے بے پناہ قوت بخشنے والی تھی...... بھرپور قوت۔ جس کے زور پر وہ خوابوں کی سرزمین پر ایک اور حملہ کرنے کا ارادہ کیے بیٹھا تھا۔ سینڈی سے بڑا اور تباہ کن حملہ۔

اُسے جلدی نہیں تھی...... وہ انتظار کر سکتا تھا۔



قسط: 211

# فلمی الف لیلہ

علی سفیان آفاقی کی یادداشتیں

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

ایسے نادر روزگار خال خال ہی نظر آتے ہیں جو نصف صدی سے علم و ادب، صحافت و فلم کے میدان میں سرگرم عمل ہوں اور اپنے روز اول کی طرح تازہ دم بھی۔ اُن کے ذہن رسا کی پرواز میں کوئی کمی واقع ہو، نہ اُن کا قلم کبھی تھکن کا شکار نظر آئے۔ آفاقی صاحب ہمارے ایسے ہی جواں فکر و بلند حوصلہ بزرگ ہیں۔ وہ جس شعبے سے بھی وابستہ رہے، اپنی نمایاں حیثیت کے نشان اُس کی پیشانی پر ثبت کردیے۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستگی کے دوران میں انہیں اپنے عہد کی ہر قابل ذکر شخصیت سے ملنے اور اس کے بارے میں آگاہی کا موقع بھی ملا۔ دید شنید اور میل ملاقات کا یہ سلسلہ خاصا طولانی اور بہت زیادہ قابل رشک ہے۔ آیئے ہم بھی اُن کے وسیلے سے اپنے زمانے کی نامور شخصیات سے ملاقات کریں اور اُس عہد کا نظارہ کریں جو آج خواب معلوم ہوتا ہے۔

ادب و صحافت سے فلمی دنیا تک دراز ایک داستان درد داستاں سرگزشت

وقت کیسے گزرتا ہے جیسے اسے پَر لگ گئے ہوں۔ دیکھتے ہی دیکھتے 23 سال گزر گئے۔ نومبر کا مہینا اور 23 تاریخ وحید مراد کی وفات کی تاریخ ہے۔ ایک وقت تھا جب انہیں پاکستان کا سب سے عظیم رومانی ہیرو کہا جاتا تھا۔ انہیں Living Legend اور ایک غیرفانی ہیرو کہا جاتا تھا۔ لیکن غیرفانی ذات تو صرف اللہ کی ہے۔ انسان خواہ کتنا ہی عظیم، بااختیار اور معروف کیوں نہ ہو جائے، کتنا ہی مقبول ہو، کتنا ہی دولت مند ہو، کتنا ہی بااثر ہو۔ آخر ایک فانی

انسان ہے ایک دن اسے اپنے انجام تک پہنچنا اور آخری منزل کی طرف کوچ کرنا ہوتا ہے۔ اللہ سے صرف یہ دعا کرنی چاہیے کہ وہ کسی کو عروج دے کر زوال سے آشنا نہ کرے۔ زندگی میں اسے نیک ہدایت اور وفات کے بعد آخرت میں اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

وحید مراد کو اللہ تعالیٰ نے ایک دولت مند گھرانے میں پیدا کیا تھا۔ وہ سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوئے تھے۔ والدین کے اکلوتے اور لاڈلے بیٹے تھے۔ بہت ذہین اور محنتی تھے۔ تعلیم میں ہمیشہ اچھے نمبروں سے پاس ہوتے تھے حالانکہ امیروں کے اکلوتے اور لاڈلے بیٹے عموماً گمراہ ہو جاتے ہیں۔ گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ شاندار کوٹھی۔ کاریں، نوکر چاکر ہر طرح کا عیش و آرام۔ ماں کا بس نہ چلتا تھا کہ بیٹے کو پھولوں کی پتیوں میں رکھے۔ باپ کی نگاہیں بیٹے کے ہر قدم پر بچھی جاتی تھیں۔ جب بھی "ویدو" (وحید مراد کا گھریلو پیار کا نام) کا ذکر کرتے تھے تو آنکھوں میں دنیا بھر کی خوشیاں اور فخر و انبساط سمٹ آتی تھیں۔ بیٹا خوبصورت اور طرحدار ہو، تابعدار ہو، پڑھنے لکھنے میں ممتاز ہو، دوستوں کے حلقے میں مقبول ہو، کالج اور یونیورسٹی میں نمایاں طالب علموں میں شمار ہوتا ہو تو ماں باپ کو اور کیا چاہیے۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے ماں باپ کی آنکھوں کے تارے کو دیکھا ہے۔ اماں ہیں تو ہر قدم پر واری صدقے جا رہی ہیں۔ ہر فقرہ "ویدو" سے شروع ہو کر "ویدو" پر ختم ہوتا ہے۔ ابا ہیں تو بیٹے کا نام آتے ہی آنکھیں روشن اور چہرے پر ایک فخریہ مسکراہٹ پھیل جاتی ہے۔

وحید مراد کے والد نثار مراد کراچی کے ایک بڑے فلم تقسیم کار تھے جن کے تقسیم کار ادارے کا نام پاکستان فلمز تھا۔ بعد میں جب وحید مراد نے فلم سازی شروع کی تو اسی ادارے کے تحت شروع کی تھی۔

انگریزی میں امتیاز کے ساتھ ایم، اے کرنے کے بعد خیال تھا کہ وہ بھی اپنے والد کا کاروبار سنبھالیں گے مگر وحید مراد کا رجحان فلم سازی اور اداکاری کی طرف تھا۔ انہوں نے والد کا بزنس سنبھالنے کی بجائے فلم سازی کے میدان میں قسمت آزمائی کرنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے "فلم آرٹس" کے ادارے کے نام سے فلم سازی کا آغاز کیا تھا۔ وہ دو فلمیں بنا چکے تھے، ان کی پہلی فلم کا نام "انسان بدلتا ہے" اور دوسری فلم کا نام "جب سے دیکھا ہے تمہیں" تھا۔ یہ فلمیں کراچی میں بنائی گئی تھیں کیونکہ اس زمانے میں لاہور ہی فلمی مرکز تھا۔ کراچی میں بنائی جانے والی فلموں کے نمایاں اداکار، ہدایت کار، گلوکار اور دوسرے ہنر مند لاہور ہی سے بلائے جاتے تھے۔ فلم سازی کے دوران میں انہیں تجربہ ہوا کہ بڑے اداکار خصوصاً ہیروز کے نخرے اٹھانے پڑتے ہیں اور بعض اوقات نقصان بھی اٹھانا پڑتا ہے۔ ان تلخ تجربوں سے گزرنے کے بعد ہی انہوں نے اداکاری کے میدان میں قسمت آزمائی کرنے کا فیصلہ کیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب فلمی اداکاروں میں سنتوش کمار، درپن، حبیب، کمال، سدھیر جیسے اداکاروں کا طوطی بولتا تھا۔ یہ سب مقبول اداکار تھے لیکن یہ نوجوانی کی حد سے گزر چکے تھے۔ ان کی مقبولیت میں کوئی شک نہ تھا مگر نوجوان نئی نسل کو نئے اور کسی نوجوان ہیرو کی تلاش تھی۔ اس زمانے کے مقبول ہیروز کو وہ پسند تو کرتے تھے لیکن نوجوان ہیرو کی کمی محسوس کرتے تھے۔

وحید مراد نے پہلی بار اداکار کی حیثیت سے ایس ایم یوسف کی فلم اولاد میں ایک معاون کردار ادا کیا تھا۔ یہ ایک رومانی کردار تھا۔ اس فلم کے ہیرو اور ہیروئن کے فرائض درپن، شمیم آرا اور نیر سلطانہ ادا کر رہے تھے، وحید مراد کی جوڑی ابھرتی ہوئی اداکارہ نیلو کے ساتھ بنائی گئی تھی جو اس وقت تک ہیروئنوں کی پہلی صف میں شمار نہیں کی جاتی تھیں۔

"اولاد" ایک کامیاب فلم تھی لیکن وحید مراد کو ہیرو کی حیثیت حاصل نہ تھی۔ "اولاد" کے کامیاب تجربے کے بعد وحید مراد نے سنتوش کمار کی فلم "دامن" میں سائیڈ رول ادا کیا۔ سنتوش کمار کی فیملی سے ان کے اور ان کے والد کے بہت گہرے مراسم تھے، یہاں تک کہ درپن جب فلم کی شوٹنگ کے لیے کراچی جاتے تو نثار مراد کے گھر میں ہی قیام کرتے تھے۔ اس فلم میں بھی انہوں نے نیلو کے ساتھ کام کیا تھا سنتوش کمار اور صبیحہ خانم جیسے فن کاروں کے ساتھ کام کر کے انہیں اعتماد حاصل ہوا تھا، "دامن" بھی ایک سپرہٹ فلم تھی جس کی موسیقی خلیل احمد نے بہت دلکش بنائی تھی۔ اس فلم میں ملکہ ترنم نور جہاں کے گائے ہوئے نغمات بہت زیادہ مقبول ہوئے تھے۔

وحید مراد جیسے ذہین نوجوان نے ان دونوں فلموں میں کام کرنے کے بعد تجربے کے ساتھ آگے بڑھنے کا جذبہ اور اعتماد بھی حاصل کیا تھا، ان کے اندر خود اعتمادی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی لیکن ان تجربات نے ان کی خود اعتمادی میں بہت زیادہ اضافہ کیا تھا۔



وحید مراد نے کراچی واپس پہنچ کر اپنی ذاتی فلم "ہیرا اور پتھر" کا آغاز کیا۔ انہوں نے اپنے ذہین اور حوصلہ مند دوستوں کو اکٹھا کر کے ایک نیا فلمی یونٹ بنایا جس میں ہدایت کار پرویز ملک، موسیقار سہیل رعنا، مصنف اور نغمہ نویس سرور انور شامل تھے۔ پرویز ملک امریکا سے فلم کی تربیت اور سند لے کر آئے تھے۔ سہیل رعنا اور سرور انور کو ریڈیو کے ذریعے شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ اس فلم میں وحید مراد پر فلمائے ہوئے نغمات احمد رشدی نے گائے تھے۔ یہ تجربہ اتنا کامیاب ثابت ہوا کہ وحید مراد کا یہ فلم یونٹ 1983ء تک یکجا رہا۔ انہوں نے بہت کامیاب اور یادگار فلمیں بنائیں۔ احمد رشدی کی آواز وحید مراد کی آواز بن گئی۔ جب تک وحید مراد فلموں میں کام کرتے رہے ان کے پسِ پردہ گلوکار کے طور پر احمد رشدی ہی ان پر فلمائے ہوئے گانے گاتے رہے۔ یہ ایک نوجوانوں پر مشتمل فلم یونٹ تھا۔ نئے خیالات، نئی امنگوں نئی ترنگوں اور جذبات سے بھرپور۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے پے در پے کامیابیاں حاصل کیں۔

یہ ذہین اور باصلاحیت نوجوانوں کا ایسا گروپ تھا جس نے پاکستانی فلمی صنعت میں دیکھتے ہی دیکھتے ہلچل پیدا کر دی تھی اور لوگوں کی تمنا تھی کہ نہ صرف یہ تخلیق کار ہمیشہ اکٹھے رہیں بلکہ ایسے اور بھی نئے نئے گروپ فلمی صنعت میں نیا خون پیدا کرنے کے لیے سامنے آئیں لیکن بدقسمتی سے یہ گروپ 1983ء میں بکھر گیا۔ جب انفرادی طور پر دریافت کیا جاتا تو کوئی بھی یہ ذمہ داری قبول کرنے پر تیار نہ ہوتا لیکن کسی دوسرے کو بھی الزام نہ دیتا۔ ہمارے ان سب سے الگ الگ بھی بہت اچھے اور بے تکلفانہ تعلقات تھے، ہم نے مختلف واقعات سن کر اپنی ایک ذاتی رائے قائم کر لی۔ وہ یہ تھی کہ مسلسل کامیابیوں نے فلم ساز اور اداکار کی حیثیت سے جو نمایاں حیثیت حاصل کر لی تھی اس کی وجہ سے انہیں اپنے اندر بہت زیادہ اعتماد محسوس ہونے لگا تھا۔ ایک بات یہ بھی تھی کہ "ارمان" کے بعد اس یونٹ کی کوئی فلم اتنی زیادہ کامیاب نہیں ہوئی۔ "ارمان" نے پورے ملک میں کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے تھے۔ "ارمان" ہی وہ فلم تھی جس نے وحید مراد کو رومانی دیوتا کی حیثیت دے دی تھی۔ وہ نوجوانوں کے محبوب ترین ہیرو بن چکے تھے۔ بڑی عمر کی خواتین انہیں اپنے گھر کے آنگن میں کھیلنے والا کھلنڈرا بچہ سمجھتی تھیں۔ وہ نوجوان لڑکیوں کے دلوں کی دھڑکن اور

وحید مراد

نوجوان لڑکوں کے آئیڈیل بن چکے تھے۔ ان کی اپنی ذاتی فلموں کو دوبارہ "ارمان" جیسی کامیابی اور مقبولیت حاصل نہیں ہوئی تھی لیکن دوسرے فلم سازوں کی فلموں میں انہیں بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہو رہی تھی۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ انہیں ذاتی فلم سازی کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

وحید مراد کا یونٹ ٹوٹنے کے بعد ان کے گروپ کے دوسرے ارکان کو بھی زیادہ فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ اپنے اپنے شعبوں میں ممتاز مقام حاصل کر چکے تھے۔ سہیل رعنا ایک نامور موسیقار بن چکے تھے۔ مسرور انور نے نغمہ نگاروں میں ایک امتیازی مقام حاصل کر لیا تھا۔ احمد رشدی نے ایک منفرد گلوکار کی حیثیت سے اپنی اہمیت منوالی تھی۔ پرویز ملک ایک کامیاب اور مقبول فلم ساز اور ہدایت کار بن چکے تھے۔ غرضیکہ علیحدہ ہو کر بکھر جانے کے بعد بھی اس یونٹ کے ارا کین کو فرق نہیں پڑا تھا۔ ان کی حیثیت مسلم ہو چکی تھی۔ دلوں میں پہلے جیسی گرمجوشی تو باقی نہیں رہی تھی لیکن باہمی احترام اور دوستی کے رشتے باقی تھے۔

وحید مراد کے فلمی اسکرین پر نمودار ہوتے ہی مقبولیت حاصل کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت پاکستان کی فلمی صنعت میں نامور اور مقبول ہیرو جوانی کی عمر سے گزر چکے تھے۔ ہیروز کی فہرست میں سب سے زیادہ تازہ

وارد کمال تھے۔ وہ 1958ء میں پہلی مرتبہ فلم ''ٹھنڈی سڑک'' میں نمودار ہوئے تھے۔ گویا انہیں ہیرو بنے ہوئے سات آٹھ سال گزر چکے تھے۔ کمال ایک ایسے ہیرو تھے جو رومانی اور ہلکے پھلکے مزاحیہ کردار بہت کامیابی سے ادا کرتے تھے اور انہیں مقبولیت بھی حاصل ہوتی تھی۔ نمایاں ہیروز کی فہرست میں وحید مراد ایک نوعمر اور بہت اچھے اداکار بن کر ابھرے تھے، ان کے ساتھ ہی (قریب قریب) محمد علی اسکرین کی زینت بنے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں کو انفرادیت اور مقبولیت بھی فوراً حاصل ہوگئی تھی۔ وحید مراد نے ہیرو کا کردار ادا کرنے سے پہلے ''اولاد'' اور ''دامن'' میں معاون ہیرو کے طور پر کام کیا تھا جس کے بعد ''ہیرا اور پتھر'' اور پھر ارمان اور کنیز میں وہ رومانی ہیرو بن کر سامنے آئے۔

ان ہی کی طرح محمد علی نے اپنی پہلی فلم ''چراغ جلتا رہا'' میں معاون کردار ادا کیا تھا۔ فلم سازوں نے انہیں دیکھتے ہی فیصلہ کرلیا تھا کہ فلمی دنیا کو ایک بہت اچھا اور خوبرو ولن مل گیا ہے۔ لیکن دو تین ابتدائی فلموں کے بعد ہیرو کے کردار میں اپنا دوسرا رخ پیش کیا تو سب نے سوچا کہ ارے یہ تو بنا بنایا ہیرو ہے اور اپنے انداز کا بالکل مختلف ہیرو۔ محمد علی نے جلد ہی سب کو محسوس کرادیا کہ وہ ایک خوبرو، بلند قامت، تیکھے نقش ونگار کے ساتھ ساتھ ایک بھرپور ڈرامائی آواز کے مالک بھی ہیں۔ ہماری فلم ''کنیز'' میں وحید اور محمد علی دونوں مرکزی کرداروں میں آئے تھے اور جب ہیرو کے طور پر نگار ایوارڈ دینے کا مرحلہ آیا تو نقادوں اور جج صاحبان کے علاوہ رائے دینے والوں نے بھی ان دونوں کو ہیرو قرار دیا تھا لیکن فلم کے ابتدائی حصے میں چونکہ محمد علی نے ہیرو کے طور پر آغاز کرنے کے بعد کچھ فلم کے حصے میں ولن کا انداز بھی اختیار کیا تھا اس لیے انہیں وحید مراد کے مقابلے میں ولن قرار دیا جارہا تھا لیکن فلم ''کنیز'' کے آخری حصے میں صبیحہ خانم اور محمد علی ساری ہمدردیاں اور تعریفیں سمیٹ کرلے گئے تھے۔

وحید مراد اور محمد علی کے بعد ندیم فلمی افق پر نمودار ہوئے اور پہلی ہی فلم کے بعد راتوں رات سپر اسٹار بن گئے۔ اس کے بعد انڈیا کے دلیپ کمار، دیو آنند اور راج کپور کی طرح یہ تینوں بھی پاکستانی فلموں کے تین نامور اور مقبول ترین اداکار بن گئے۔

ان تینوں میں انفرادیت اور اپنا اپنا مخصوص انداز تھا۔ محمد علی نے ڈرامائی، المناک، رومانی، مزاحیہ ہر قسم کے کرداروں میں کامیابی حاصل کی۔ ندیم نے بھی ابت فلموں کے بعد ہر طرح کے مختلف کردار کیے اور ورسٹائل اداکار کہلائے لیکن وحید مراد کی وجہ شہرت ان رومانی کردار ہی رہے۔ انہوں نے سالہا سال گزرنے بعد بھی اپنا اندازِ اداکاری نہیں بدلا۔ یہاں تک کہ وہ مخت گیٹ اپ کرنے کے لیے بھی تیار نہیں تھے۔ گیٹ اپ وہ اپنے بالوں کا انداز، چال ڈھال بدلنے پر بھی آمادہ تھے۔ یہاں تک کہ ایک فلم کے سوا انہوں نے کسی فلم مونچھیں لگانے پر بھی آمادگی ظاہر نہیں کی تھی۔ اس کے بر محمد علی جوانی ہی میں بوڑھے کردار کرچکے تھے۔ کسی فلم میں ان پڑھ دیہاتی نظر آتے تھے تو کسی فلم میں غضبناک غصیلے ہیرو۔ اسی طرح ندیم نے بھی اپنے انداز میں تبد کی تھی۔ ہمارے خیال میں وحید مراد کی مقبولیت میں واقع ہونے کی یہ اہم وجوہات تھیں۔ ایسی مثالیں ہندوستا اور پاکستان میں اور بھی کئی موجود ہیں۔ مثلاً اسلم پر انتہائی مقبول اور معروف ہیرو تھے لیکن جب ان کی مقبولیت کم ہوگئی یہاں تک کہ فلم بین سنیما گھروں میں ان کی تصاو تک دیکھنے کے روادار نہ تھے۔ شاہد کے ساتھ بھی کم وبیش ایسا ہی معاملہ پیش آیا تھا۔ اس سے پہلے درپن جیسے مقبو اور خوبرو ہیرو کو بھی فلم بینوں نے اسی طرح مسترد کردیا تھا۔ جب وحید مراد کے ساتھ مقبولیت میں کمی کا واقعہ پیش آیا انہوں نے بھی اسے قبول نہیں کیا۔ وہ بدستور فلموں میں رومانی ہیرو کے کردار کے طلب گار تھے لیکن فلمی دنیا میں ایسا نہیں ہوتا۔ یہاں تو پبلک کی مانگ پر اداکاروں کی مقبولیت اور مانگ کا دارومدار ہوتا ہے۔ انڈیا میں راجیش کھنہ جیسے ہیرو جنہوں نے یکے بعد دیگرے مسلسل پندرہ سپرہٹ فلموں میں کام کیا تھا جب ان کی مقبولیت میں کمی ہوئی تو انہوں نے باپ کے کردار ادا کرنے شروع کردیے اور پھر اداکاری ترک کردی۔ بدقسمتی سے وحید مراد ایسا نہ کرسکے۔ وہ اپنی عدم مقبولیت کی سچائی کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھے اور آخر دم تک اپنی ہٹ پر اڑے رہے۔

''ارمان'' کے بعد وحید مراد اور پرویز ملک نے دوراہا، احسان، اسے دیکھا اسے چاہا، جیسی فلمیں بنائیں۔ یہ کامیاب فلمیں تھیں مگر ''ارمان'' جیسی مقبولیت اور کامیابی ان فلموں کو حاصل نہیں ہوسکی۔

وحید مراد نے پاکستان کی فلمی دنیا میں صحیح معنوں میں ہلچل مچادی تھی۔ ان کی صورت میں فلم بینوں نے ایک ایسے



ہیرو کو دیکھا جیسا اس سے پہلے انہوں نے نہیں دیکھا تھا۔ وہ خوش شکل، خوش قامت، خوش لباس تھے۔ بہت اسمارٹ اور طرح دار تھے۔ ان کے مکالموں کی ادائیگی کا انداز منفرد تھا۔ انہوں نے پہلی بار پاکستانی فلموں میں ایک رقص کرنے والا ہیرو پیش کیا تھا۔ رقص انہوں نے کسی سے سیکھا نہیں تھا۔ دراصل یہ ایک خداداد صلاحیت تھی۔ ان کے رقص کا انداز نرالا اور بہت دلکش تھا۔ اللہ نے ان کے جسم میں ردھم کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا۔ گانے کے ردھم کے ساتھ ان کے پیر، ہاتھ اور جسم حرکت میں آجاتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انڈیا میں شمی کپور نے ہالی وڈ کے مقبول گلوکار ایلوس پریسلے کے انداز میں رقص کر کے فلم بینوں کا دل موہ لیا تھا۔ پاکستان میں وحید مراد پہلے ہیرو تھے جس نے 1965ء میں فلم ''ارمان'' میں پہلی بار احمد رشدی کے گائے ہوئے نغمے ''کوکو کورینا'' پر بہت خوبصورت رقص پیش کیا تھا۔ یہ ایک بے ساختہ اور والہانہ رقص تھا جس نے فلم بینوں کے دل جیت لیے۔

وحید مراد کی اداکاری میں ایک بے ساختگی اور بے تکلفی تھی جس کو انگریزی میں Mannerism کہتے ہیں وہ گانوں کی فلم بندی کرانے میں ایک مخصوص خصوصیت کے حامل تھے۔ ان کا مکالموں کی ادائیگی کا انداز دوسروں سے مختلف تھا۔ وحید مراد ایسے اداکار تھے جن کی اداکاری کے انداز نے انڈیا کے اداکاروں کو بھی متاثر کیا تھا۔ ان کی اداکاری کے انداز سے سب سے زیادہ متاثر راجیش کھنہ ہوئے تھے۔ جتندر نے بھی وحید مراد سے متاثر ہوکر اسی انداز کے رقص اور گانے پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔

وحید مراد نے آتے ہی پاکستانی فلموں کا انداز اور رخ بدل دیا تھا۔ انہوں نے مختلف قسم کے کردار بہت خوبصورتی سے نبھائے تھے مگر اپنے مخصوص انداز میں۔ جب جب پھول کھلے میں وہ ایکشن کرتے ہوئے نظر آئے۔ فلم ''ڈبل اسٹیشن'' میں انہوں نے ڈبل رول کیا تھا۔ نذر شباب کی فلم ''شبانہ'' میں وہ ایک شکی مزاج شوہر تھے۔ فلم ''شیشے کا گھر'' میں وہ ایک ولن نظر آئے لیکن انہوں نے ہر فلم میں اپنی اداکاری کا انداز ترک نہ کیا۔ ارمان، دوراہا، احسان، دیور بھابی، بے وفا، انسانیت، ماں باپ، رشتہ ہے پیار کا، عندلیب، بندگی ان کی مشہور اور کامیاب فلمیں تھیں۔ کردار مختلف تھے جن کے ساتھ انہوں نے انصاف بھی کیا تھا مگر اپنا انداز نہیں چھوڑا۔ ان سب فلموں میں انہیں بے حد پسند کیا

گیا تھا۔ حقیقتاً وہ ایک بہت اچھے اداکار تھے مگر جب فلم بینوں میں مقبولیت کم ہوئی تو وحید مراد کا دل ٹوٹ گیا۔

وحید مراد لاکھوں کروڑوں دلوں کی دھڑکن تھے اور ہر فلم میں ہیروئین کے ساتھ اس انداز میں نظر آتے تھے جیسے اسی کے ہوں۔ لیکن انہوں نے جب اچانک شادی کا فیصلہ کیا تو کراچی کے ایک صنعتی خاندان کی بیٹی سلمہ کا انتخاب کیا۔ ان کی شادی 17 ستمبر 1964ء میں ہوئی تھی۔ ان دونوں کا ایک بیٹا عادل اور ایک بیٹی عالیہ ہے۔ عالیہ کی انہوں نے اس کی نوعمری میں ہی شادی کردی تھی۔ عادل نے جوان ہونے کے بعد ایک فلم راجہ صاحب میں کام کیا تھا جس میں صاحبہ ان کی ہیروئن تھیں مگر یہ فلم کامیاب نہیں ہوئی جس کے بعد انہوں نے فلموں میں اداکاری چھوڑ دی اور ٹی وی پروگراموں کی طرف توجہ دینے لگے۔

وحید مراد نے اپنی زندگی میں بہت خوشیاں، کامیابیاں اور کامرانیاں سمیٹیں۔ انہوں نے ایک قابلِ رشک زندگی گزاری، شہرت، دولت، عزت، مقبولیت ان پر مہربان تھی۔ قدرت نے انہیں ذہانت اور صلاحیتوں سے نوازا تھا لیکن وہ ان سب چیزوں پر اللہ کا شکر ادا کرنے کی بجائے مزید کامیابیوں کے متلاشی تھے۔ انہوں نے اچھے دنوں کو تو بہت انجوائے کیا لیکن جب معمولی سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تو ہمت ہار گئے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے لیے وقت تھم جائے۔ سب کچھ جوں کا توں رہے لیکن یہ قدرت

کے کارخانے میں ممکن نہیں ہوتا۔ وہ بدستور ایک مقبول ترین ہیرو رہنا چاہتے تھے جس کی پہلے کی طرح آؤ بھگت ہوتی رہے۔ انہیں مرکزی رومانی کردار ملتے رہیں اور وہ منہ مانگے معاوضے پر کام کرتے رہیں۔ وہ جہاں سے گزریں چلتے ہوئے قدم تھم جائیں اور سب "ارے، وحید مراد" کی آوازیں نکال کر انہیں رشک بھری نظروں سے دیکھتے رہیں۔ وہ کسی تقریب میں جائیں تو لوگ دوسرے فن کاروں کو چھوڑ کر ان کے آٹوگراف لینے کے لیے ٹوٹ پڑیں۔

لیکن ایسا نہیں ہوا۔ قدرت کے قانون کے مطابق کسی کے لیے نہ تو وقت کا بے رحم پہیہ رک سکتا ہے اور نہ ہی عروج کے بعد زوال کے نظام میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔

انہوں نے زندگی میں پہلا صدمہ اس وقت جھیلا جب ان کی بے انتہا پیار کرنے والی والدہ انتقال کر گئیں۔ وحید مراد کو ہوش سنبھالتے ہی بلکہ ان کے دنیا میں آتے ہی انہوں نے ماں کی محبت بھری آواز سنی تھی۔ "ویدو" انہیں ویدو کہنے والی آواز خاموش ہوئی تو یوں لگا جیسے ان کی زندگی کا ایک اہم حصہ ان سے جدا ہو گیا ہے۔ ماں کا سایہ سر سے اٹھا تو کچھ عرصے بعد ہی کامیابیوں کے سائے بھی ان کا ساتھ چھوڑنے لگے۔ ان کی مقبولیت اور مانگ میں رفتہ رفتہ کمی آنے لگی تو وحید مراد کے اعصاب ان کا ساتھ چھوڑنے لگے۔ حالانکہ اگر وہ حقیقت پسندی سے کام لیتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ قدرت کا یہی نظام ہے۔ ہر شے کو عروج کے بعد زوال ہوتا ہے۔ نوجوانی کے بعد بڑھاپے کی طرح۔ جب جوانی کی رعنائیاں ساتھ چھوڑ جاتی ہیں، حسین چہرے بگڑ جاتے ہیں۔ صحت مند تنومند اور طاقت ور لوگ چھڑی کا یا دوسروں کے کاندھوں کا سہارا لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہی زندگی کی حقیقت ہے جس کو تسلیم نہ کرنے والے ہمیشہ دکھ اٹھاتے اور غم کھاتے رہتے ہیں۔

دوسرا بڑا صدمہ انہیں اپنے والد نثار مراد کی وفات کے وقت ملا۔ ایک بہت پیار کرنے اور جان چھڑکنے والا باپ بھی انہیں چھوڑ گیا۔ اس طرح وہ ماں اور باپ دونوں کے شفیق سائے سے محروم ہو گئے۔ ایک طرف عدم مقبولیت نے پہلے ہی ان کا دل توڑ دیا تھا۔ دوسری طرف یہ صدمے بھی سہنے پڑ گئے تھے۔

وحید مراد یہ حقیقت بھول گئے تھے کہ اب بھی ان کے پاس بہت کچھ ہے۔ ایک باوفا بیوی، دو پیارے بچے، بینک بیلنس، جائیدادیں، صحت، اسمارٹنیس سبھی کچھ انہیں حاصل تھا۔ لگ بھگ چالیس سال کی عمر میں بھی وہ چاق وچوبند اور پھرتیلے تھے۔ ان کی صورت شکل اور قد وقامت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ چہرے پر تھوڑی پختگی ضرور آگئی تھی لیکن آج بھی وہ ایک دلکش شخصیت کے مالک تھے۔ کوئی ضروری تو نہ تھا کہ وہ ہمیشہ رومانی ہیرو ہی کے کرداروں میں آتے۔ وہ فلم سازی کر سکتے تھے۔ ہدایت کاری کر سکتے تھے۔ اپنی اور دوسرے فلم سازوں کی فلموں میں اچھے کیریکٹر کر سکتے تھے۔ لیکن ان کے دماغ کی سوئی ایک ہی جگہ اٹک کر رہ گئی تھی۔ وہ حوصلہ ہار گئے۔ صرف اپنے ہیرو کے امیج سے دل سے لگائے بیٹھے رہے۔ مایوسی نے ان کی اداسیوں میں مزید اضافہ کر دیا۔ انہوں نے غم غلط کرنے کے لیے نشہ آور چیزوں کا سہارا لیا یہاں تک کہ وہ اس میں ڈوب گئے۔

اس کے بعد ان کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اب وہ اصلی زندگی میں بھی ایک ناکام ہیرو بن چکے تھے۔ دوست احباب پہلے ہی بچھڑ چکے تھے، اب انہوں نے فلموں میں بھی دلچسپی لینی چھوڑ دی تھی۔ بیوی بچوں کو پوری توجہ نہیں دے رہے تھے۔ وہ اپنے آپ میں گم ہو کر رہ گئے تھے۔ سوچنے سمجھنے کا نہ ان کے پاس وقت تھا نہ وہ اس کی ضرورت سمجھتے تھے۔ وہ ہر چیز سے بے نیاز ہو چکے تھے۔ اس زمانے میں کچھ ایسے واقعات بھی پیش آئے جن کا کوئی تصور تک نہیں کر سکتا تھا۔ اب ان کا تذکرہ کر کے زخموں کو کریدنا مناسب نہیں لگتا۔

اسی زمانے میں ان کی بیگم بچوں کے ساتھ امریکا چلی گئیں۔ شاید اعصابی تناؤ کم کرنے کے لیے۔ وہ اپنی لاہور کی کوٹھی میں ملازموں کے ساتھ تنہا رہ گئے تھے مگر انہیں اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ جب چاہتے سوتے، جب چاہتے جاگتے، جب چاہتے گھر میں تنہا رہتے، جب چاہتے کار لے کر گھر سے باہر نکل جاتے، اسی حالت میں وہ ایک دن صبح سویرے کار لے کر گھر سے نکل گئے۔ نہر کے کنارے کار بے قابو ہو گئی یا وہ خود بے قابو ہو گئے۔ کار کی رفتار تیز تھی جسے وہ سنبھال نہ سکے۔ کار اونچی فٹ پاتھ کو عبور کر کے نہر میں جا گری علی الصباح زیادہ ٹریفک بھی نہ تھا لیکن ایک ہمدرد کار والے نے انہیں نہر سے نکالا۔ ان کا چہرہ خون آلود تھا اور وہ بے چارہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ پاکستان کا ایک عظیم فن کار اس کی مدد کا مستحق ہے۔ بہرحال اس نیک دل شخص نے بے ہوش وحید مراد کو اٹھا کر سروسز اسپتال پہنچا دیا۔ ایمرجنسی میں کوئی بڑا اور ذمے دار ڈاکٹر بھی موجود نہ تھا۔ بہرحال ابتدائی مرہم پٹی کے بعد انہیں جنرل وارڈ میں پہنچا دیا گیا۔ چہرے سے خون صاف کر دیا گیا تھا۔ پٹی بھی بندھ گئی تھی مگر وہ بدستور بے ہوش تھے۔

خوش قسمتی سے ایک شخص نے انہیں پہچان لیا۔ وہ ان کا پرستار بھی تھا لیکن غریب آدمی تھا۔ کسی مریض کے ساتھ جنرل وارڈ میں موجود تھا۔

اس شخص نے اپنے فلم کے جاننے والوں کو فون کیا۔ کچھ دیر بعد ہدایت کار محمد جاوید فاضل اسپتال پہنچ گئے۔ انہوں نے اس لاڈلے ہیرو کو جنرل وارڈ کے ایک بستر پر سرخ رنگ کے میلے کچیلے کمبل میں لپٹا ہوا پایا تو فوراً اسپتال کی انتظامیہ کو مطلع کیا کہ وحید مراد کو پرائیویٹ کمرے میں منتقل کیا جائے۔ اتنی دیر میں وہ شخص جس نے جاوید فاضل کو فون کیا تھا ادویات لے کر آ گیا اور اس طرح وحید مراد کا علاج شروع ہوا۔ فلمی صنعت میں جس جس کو خبر ملی وہ بھاگا بھاگا سروسز اسپتال پہنچ گیا۔

وحید مراد کو زیادہ چوٹیں نہیں آئی تھیں۔ یہ بھی قدرت کی مہربانی تھی۔ وہ جلد ہی اسپتال سے فارغ ہو کر اپنے گھر پہنچ گئے۔ ان کی بیگم سلمیٰ بھی لاہور پہنچ گئیں۔ بہت بڑا حادثہ رونما ہوتے ہوتے رہ گیا تھا مگر وحید مراد کی ذہنی کیفیت میں تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اسی زمانے میں انہیں ٹی وی سے انٹرویو کی دعوت ملی تو انہوں نے قبول کر لی۔ انٹرویو میں جلوہ گر ہوئے تو ان کے پرستار انہیں دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ان کی صحت بگڑ چکی تھی۔ چہرے پر زخم کے نشان تھے۔ یہ وہ وحید مراد تو نہیں تھے جسے وہ سینما کے پردے پر دیکھتے رہے تھے۔ ناظرین وحید مراد کو اس حالت میں دیکھ کر سکتے کے عالم میں رہ گئے۔ انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ان کا محبوب ہیرو، چاکلیٹی ہیرو، ناچتا گاتا اور شوخیاں کرتا ہوا ہیرو، اس حال میں؟ انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا مگر یہ حقیقت تھی۔ گزشتہ چند سالوں میں بہت کچھ بدل چکا تھا۔

وحید مراد لاہور سے تبدیلیٔ ہوا کے لیے کراچی چلے گئے جہاں وہ اپنی منہ بولی بہن کے گھر میں مقیم تھے کہ ایک دن ان کے دل نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ ہارٹ اٹیک سے وہ جاں بر نہ ہو سکے۔ ہم نے یہ خبر ڈھاکا میں سنی تھی جہاں ہم ایک مشترکہ فلم کے سلسلے میں گئے ہوئے تھے۔

دل کو ایک زبردست دھچکا لگا اور پرانی باتیں ایک ایک کر کے یاد آنے لگیں۔ ڈھاکا کے فلمی حلقوں نے بھی

مدھوبالا

وحید مراد کی وفات کا سوگ منایا۔ وفات کے وقت ان کی عمر صرف 45 سال تھی۔ لاہور آ کر معلوم ہوا کہ ایڈیٹر نگار ویکلی الیاس رشیدی اور چند دوسرے دوستوں کی مدد سے ان کے جسدِ خاکی کو لاہور لایا گیا اور گلبرگ کالونی لاہور کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ یہ قبرستان ان کی کوٹھی سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر ہوگا جہاں سے وہ شب و روز گزرتے رہے تھے۔ اسی قبرستان میں ان کے والد نثار مراد کی قبر بھی ہے۔ کراچی کے ان معروف باپ بیٹوں کی قبریں لاہور میں ہیں ..... یہ بھی قدرت نے ان کی تقدیر میں لکھ دیا تھا۔

اسی قبرستان میں علاؤ الدین، ان کے جواں مرگ بیٹے اور محمد علی کو بھی دو گز زمین ملی ہوئی ہے۔ کچھ عرصے بعد ان کی بیگم سلمیٰ لاہور کی دونوں کوٹھیاں فروخت کر کے کراچی چلی گئیں۔ لاہور میں تنہا رہ جانے کے باوجود وہ تنہا نہیں ہیں۔ ان کے پرستار باقاعدگی سے ان کا یومِ پیدائش اور برسی مناتے ہیں اور فاتحہ خوانی کرتے ہیں۔

اس طرح ایک رنگین سہانے دور کا اختتام ہوا۔

وحید مراد کی وفات سے ہالی وڈ کے مایہ ناز گلوکار ایلوس پریسلے کی مماثلت یہاں بھی کارفرما نظر آتی ہے۔ دونوں نے درمیانی عمر میں وفات پائی۔ دونوں آخری دنوں میں مقبولیت کھو چکے تھے لیکن وفات کے بعد بھی زندہ

ہیں اور کبھی بھلائے نہ جاسکیں گے۔

وحید مراد پر فلمایا ہوا گانا یاد آرہا ہے۔

بھولی ہوئی ہوں داستاں
گزرا ہوا خیال ہوں

یعنی نہ تو وہ بھولی ہوئی داستاں ہیں اور نہ ہی گزرا ہوا خیال، وحید مراد جیسے فن کار کبھی نہیں مرتے اور نہ بھلائے جاسکتے ہیں۔

☆☆☆

فلمی الف لیلا میں ہر شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والی ان شخصیات کا تذکرہ کیا جاتا رہا ہے جنہیں کسی اعتبار سے اپنے شعبے میں ممتاز مقام حاصل تھا۔ یہ ہماری سوانح عمری جو رفتہ رفتہ فلمی انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت اختیار کرگئی مستقبل کی تحقیق کرنے والوں کے لیے کافی مواد اور معلومات فراہم کرسکے گی۔ اس میں جن پاکستانی شخصیات کا تذکرہ کیا گیا ان سے ہمارا ذاتی طور پر بھی واسطہ پڑا۔ قریبی تعلقات رہے، اسی لیے یہ محض ایک تاریخ ہی نہیں ان کی ذاتی زندگیوں کے بارے میں بھی ایسی معلومات فراہم کرتی ہے جو اس سے پہلے پیش نہیں کی گئیں۔

پرانے فلمی جرائد دیکھتے ہوئے ایک نام پر نظر پڑی اور ہم شرمندہ ہوگئے کہ پاکستانی فلمی صنعت کی یہ اہم اور ممتاز شخصیت ایسی رہ گئی جس کے بارے میں سرسری تذکرہ تو ہوا لیکن تفصیل سے کچھ نہ لکھا جاسکا۔ یہ پاکستان کے ایک مایہ ناز کیمرامین نبی احمد ہیں جو کہ اب 2012ء میں مرحوم ہوچکے ہیں۔ چندسال قبل ان کا کسمپرسی کے عالم میں انتقال ہوا۔ وجہ یہ تھی کہ پاکستان میں معیاری اور اچھی فلمیں نہیں بن رہی تھیں جس کی وجہ سے اہلِ ہنر اور صاحب کمال تعلیم یافتہ لوگ ایک ایک کرکے فلمی صنعت سے کنارہ کش ہوگئے تھے اور یہاں پہلوانوں، بدمعاشوں، اسمگلروں اور ایسے ہی ان پڑھ یا نیم خواندہ افراد کی اجارہ داری ہوچکی تھی جن کے ہاتھوں پاکستان کی خوشحال اور قابلِ فخر فلمی صنعت ایک کوڑے دان بن کررہ گئی تھی۔ جب ایورنیو اسٹوڈیو جیسے اعلیٰ پیمانے کے فلم اسٹوڈیو میں پہلی بار بڑی دھوم دھام سے ایک پہلوان جی کی پنجابی فلم کا افتتاح ہوا اور ہم نے اس خوبصورت اسٹوڈیو میں ان عجیب غریب مہمانوں کو سیکڑوں کی تعداد میں گھومتے دیکھا تو حیرت زدہ رہ گئے۔ آغا جی اے گل کے دفتر میں گئے اوران سے پوچھا کہ آغا جی آپ نے فلمی صنعت پر بہت احسانات کیے ہیں تو پھر یہ دشمنی کس لیے؟ آپ تو ایسے لوگوں کے اس اسٹوڈیو میں داخلے کے مخالف تھے۔

جواب میں آغا صاحب نے کہا۔ ”یار، یہ لوگ پیسہ بہت دیتے ہیں اور نقد، پیشگی دیتے ہیں آخر اسٹوڈیو بھی تو چلانا ہے۔“

ہم جان گئے کہ یہ پاکستان کی فلمی صنعت کے لیے تیار ہونے والے تابوت میں پہلی کیل ٹھونکی گئی ہے۔ آغا صاحب کے دفتر سے چائے پی کر اور انگریزی بسکٹ کھا کر چلے آئے۔ ہم نے اپنے دوستوں اور معقول فلم سازوں اور ہدایت کاروں کو مشورہ دیا کہ بھائی اب ہم لوگوں کی اس فلمی صنعت میں گنجائش اور ضرورت باقی نہیں رہی۔ اپنا اپنا بستر بوریا سمیٹ لو۔ ان لوگوں نے جواب میں کہا کہ تم بلاوجہ اتنے جذباتی اور شکست خوردہ ہورہے ہو، یہ کوئی اہم بات نہیں ہے۔

یہ 1977ء کا ذکر ہے جب ہماری فلم ”عاشی“ کی نمائش ہوئی تھی۔ ہم نے اس کے بعد پاکستان میں فلم سازی کا ارادہ ترک کردیا اور بیرونِ ممالک میں جاکر فلمیں بنانے کا عزم کیا۔ ہماری پیش گوئی کے مطابق فلمی صنعت پر پہلوانوں کا قبضہ مکمل ہوگیا اور ہمارے جیسے لوگ بھی ایک ایک کرکے فلمی دنیا سے کنارہ کش ہوگئے۔ ان ہی میں پاکستان کے مایہ ناز کیمرامین نبی احمد بھی شامل تھے۔

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ قیام پاکستان سے پہلے لاہور کی پھلتی پھولتی فلمی صنعت پر غیر مسلموں کا قبضہ تھا۔ ان کے جانے کے بعد اے حمید پاکستان آگئے۔ انہوں نے کئی کیمرامینوں کی تربیت کی جن میں نبی احمد بھی شامل تھے۔ اسی طرح رضا میر جو کہ لاہور کی فلموں میں مینا شوری (اس وقت وہ غیر شادی شدہ تھیں) کے بالمقابل ہیرو کا کردار کرنے کے بعد ہمہ وقت عکاسی کی طرف مائل ہوچکے تھے۔ انہوں نے کئی ہونہار شاگرد پیدا کیے جن میں کامران مرزا، علی جان اور دوسرے ممتاز کیمرامین شامل ہیں۔ ایک لحاظ سے اے حمید پاکستانی عکاسوں کے بزرگ ترین کیمرامین تھے تو رضا میر اور نبی احمد نئے کیمرامینوں کی ایک نئی کھیپ تیار کرنے کے ذمّے دار تھے۔

نبی احمد کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے پاکستان کی پہلی فلم کے چند مناظر کی رنگین فلم بندی کی۔ یہ مکمل رنگین فلم نہ تھی یہ فلم ”عذرا“ تھی جس کے فلم ساز آغا جی اے گل تھے۔ آغا صاحب کی پہلی مکمل رنگین فلم ”نائیلہ“ کی عکاسی کے فرائض بھی نبی احمد نے ہی سرانجام دیے تھے۔

اس طرح نبی احمد ایک ایسی شخصیت اور ہنر مند تھے جن سے پاکستانی فلمی صنعت کی تاریخ وابستہ ہے۔

نبی احمد کرنال سے پاکستان آئے تھے۔ پاکستان کے پہلے وزیرِاعظم قائداعظم کے دستِ راست لیاقت علی خان کا تعلق بھی کرنال ہی سے تھا۔ قیام پاکستان کے وقت جب فسادات شروع ہوئے تو مسلمانوں نے پاکستان آنے کے لیے دہلی کا رخ کیا۔ نبی احمد بھی ان ہی مہاجرین میں شامل تھے۔ انہوں نے لٹے ہوئے مسلمانوں کو پاکستان پہنچانے کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور پھر خود بھی پاکستان آگئے۔

فوٹوگرافی کا شوق اور ہنر انہیں قدرت سے ملا تھا۔ پاکستان پہنچ کر انہوں نے لاہور میں اے حمید کی سرپرستی میں بہت کچھ سیکھا۔ اے حمید ایک فقیر منش درویش تھے جنہوں نے خود کو شباب کیرانوی تک محدود کرلیا تھا۔ شباب کیرانوی کو فلموں میں متعارف کرانے کا سہرا بھی ان ہی کے سر ہے۔ فلم صنعت میں انہیں پیار اور احترام سے ”بھائیا جی“ کہا جاتا تھا۔ اس سے پہلے وہ کلکتہ کی فلمی صنعت سے وابستہ رہے تھے اور اس زمانے کی دلچسپ اور رنگین کہانیاں سناتے رہتے تھے۔

ان کے ہونہار شاگرد نے اپنے شعبے میں تیزی سے ترقی کی۔ پاکستان کے نامور عکاسوں میں رضا میر، مسعود الرحمان کے ساتھ ان کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ انہوں نے پاکستان کی انتہائی معیاری اور یادگار فلموں کی عکاسی کی جن میں انتظار، کوئل، جھومر، گھونگھٹ، زہر عشق، ایاز، حسرت، حویلی، دیوانہ، باغی سردار، افسانہ، اور عشق پر زور نہیں، جیسی فلمیں شامل ہیں۔ ان فلموں کی کامیابی میں نبی احمد کی عکاسی کا بھی نمایاں ہاتھ تھا۔ وہ اپنی فوٹوگرافی سے ضرورت کے مطابق ماحول پیدا کرنے میں ماہر تھے۔

آغا جی اے گل کی فلم ”عذرا“ کے چند رنگین حصوں کی فلم بندی کے بعد انہوں نے پہلی رنگین فلم ”نائیلہ“ کی عکاسی کا اعزاز بھی حاصل کیا۔ یہ پاکستان میں رنگین فلم کا پہلا تجربہ تھا مگر ایک کامیاب تجربہ تھا۔ رنگین عکاسی کے لیے انہوں نے کسی غیر ملکی ماہر سے تربیت حاصل نہیں کی یہ ان کا خالص ذاتی تجربہ تھا جسے مشکلات کے باوجود انہوں نے قابلِ دید بنادیا تھا۔ دراصل نبی احمد کو عکاسی کے بارے میں جاننے کا دیوانگی کی حد تک شوق تھا۔ وہ قیمتی غیر ملکی جرائد منگاتے تھے اور لاہور میں بھی امریکی مرکزِ اطلاعات اور دیگر ذرائع سے عکاسی کے بارے میں معلومات حاصل کرتے رہتے تھے۔ پاکستان کے کیمرامینوں میں دیوانگی کی حد تک جدید فوٹوگرافی کے بارے میں جاننے کا شوق ہم نے صرف نبی احمد میں دیکھا۔ وہ ہمارے دور کے رشتے دار بھی تھے مگر ایسے کہ انہیں کبھی رشتے داروں سے میل جول کا موقع نہیں ملا۔

ہم پاکستان آئے تو فلموں کے شوق میں مبتلا تھے۔ انگریزی اور انڈین فلموں کے بارے میں ہماری دلچسپی بہت زیادہ تھی۔ ہر روز ماڈل ٹاؤن سے شہر (اس زمانے میں ماڈل ٹاؤن میں رہنے والے یہی اصطلاح استعمال کرتے تھے) جاتے ہوئے ہم ماڈل ٹاؤن بس میں کوشش کرکے کھڑکی کے نزدیک بیٹھتے تھے تاکہ اسکرین اینڈ ساؤنڈ اسٹوڈیو کی ایک جھلک دیکھ لیں۔ ماڈل ٹاؤن سے ہمارے ساتھ روزانہ سفر کرنے والوں میں گل نام کے ایک خوبرو نوجوان بھی شامل تھے۔ انہوں نے ہمیں اکسایا کہ فلم اسٹوڈیو ضرور دیکھیں۔ ہم اس وقت تک صحافی نہیں بنے تھے لیکن نبی احمد صاحب سے ہماری ملاقات ہوچکی تھی۔ کسی فلم اسٹوڈیو میں پہلا قدم رکھنے کا موقع ہمیں نبی احمد نے ہی فراہم کیا تھا اور ان ہی کی وساطت سے ہم نے اسٹوڈیو اور شوٹنگ کرنے والے چند فن کاروں کو دیکھا تھا۔ یہ فلم ”دو کنارے“ تھی۔ اس کا تذکرہ ہم تفصیل سے کرچکے ہیں۔

دریائے رائن
( River Rhine)

یورپ کا مشہور دریا، سوئٹزر لینڈ سے نکلتا ہے اور جھیل کانسٹینس (Constance) سے لے کر بیسل (Basel) تک سوئٹزر لینڈ اور جرمنی کی سرحد بناتا ہے۔ جرمنی اور فرانس کے درمیان حدِ فاصل کا کام دیتا ہے اور Barisure کے قریب جرمنی میں داخل ہوجاتا ہے۔ پرتگال کی سرحد پار کرکے یہ دو حصوں میں تقسیم ہوجاتا ہے اور آخر کار بحر شمالی میں جاگرتا ہے بیسل تک اس میں جہاز رانی ہوسکتی ہے۔ یہ 820 میل یا 1320 کلومیٹر لمبا ہے۔

مرسلہ: نعمان علی، سیالکوٹ

نبی احمد نے پاکستان میں سو کے لگ بھگ فلموں کی عکاسی کی جن میں مشہور اور یادگار فلموں کی تعداد زیادہ ہے۔ وہ 45 سال تک بطور عکاس فلمی صنعت سے وابستہ رہے۔ اس دوران میں انہوں نے نصف درجن سے زیادہ نگار ایوارڈز حاصل کیے جو اس زمانے میں بہت قابلِ قدر اعزاز سمجھے جاتے تھے۔ ان کی کئی فلمیں شاہکار کہلاتی ہیں۔ انہیں لائف ٹائم اچیومنٹ پر بھی نگار فلم ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔

2003ء میں نبی احمد نے ایک انٹرویو دیا تھا۔ اس انٹرویو میں انہوں نے اپنی زندگی اور فلمی مصروفیات کے بارے میں کافی معلومات فراہم کی تھیں۔ آیئے، اب ان کے بارے میں خود ان کی زبانی سنیے۔

''میں پنجاب کے ضلع کرنال میں پیدا ہوا تھا۔ وہیں میٹرک تک تعلیم حاصل کی اور مزید تعلیم کے لیے دہلی چلا گیا۔ ان دنوں قیام پاکستان کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ مجھے بھی سیاست سے دلچسپی پیدا ہوگئی اور میں نے سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ میں مسلم لیگ کا ایک کارکن تھا۔ پاکستان کا جو نقشہ مسلم لیگ نے تیار کیا تھا تقسیم کے وقت دھاندلی کی وجہ سے اس میں نمایاں تبدیلیاں کر دی گئیں اور 30 جون کو پاکستان کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔ پنجاب میں فسادات شروع ہوئے تو میں بھی اپنے خاندان کے ساتھ دہلی کے قلعے کے عقب میں قائم مہاجر کیمپ میں پہنچ گیا۔ میں نے مہاجرین کو پاکستان پہنچانے کے کاموں میں سرگرمی سے حصہ لیا پھر میں بھی اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان آگیا۔ لاہور ہی میرا پہلا پڑاؤ تھا اور یہی آخری پڑاؤ بھی ثابت ہوا۔ لاہور مجھے بہت پسند تھا شاید فلمی صنعت کا مرکز ہونے کی وجہ سے بھی مجھے لاہور اچھا لگا۔

فلم میں قسمت آزمائی کا مجھے ابتدا ہی سے شوق تھا۔ کیونکہ میرے چچا اور تایا قیام پاکستان سے پہلے بمبئی میں فلمی صنعت سے وابستہ تھے۔ ان کی باتیں سن کر مجھے بھی فلمی صنعت میں کام کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ فوٹو گرافی کا شوق بھی اسی زمانے میں پروان چڑھا۔ مجھے فوٹو گرافی سے شروع ہی سے دلچسپی رہی ہے۔

1946ء میں مجھے انڈین انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ میں نوکری مل گئی تھی۔ 1947ء میں پاکستان بنا تو میں نے پہلے تو انفارمیشن کے شعبے سے وابستہ ہونے کا سوچا مگر پھر فلمی دنیا کے نامساعد حالات کے باوجود فلمی صنعت سے وابستہ ہونے کا فیصلہ کیا۔

میں نے فلموں میں اسٹیل فوٹو گرافر کی حیثیت سے لاہور کے کیف سٹوڈیو میں کام کیا۔ کیف صاحب سے میں نے فوٹو گرافی کے بارے میں بہت کچھ سیکھا۔ سید امتیاز علی تاج کے ذریعے مجھے نامور عکاس بھائیا اے حمید نے اپنے سائے میں لے لیا۔ انہوں نے میری بہت رہنمائی کی، بعد میں جو بھی عزت اور شہرت میں نے حاصل کی وہ اے حمید بھائیا ہی کے طفیل مجھے ملی۔

عکاس کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے فلمی صنعت میں میری پہچان ہوگئی تھی۔ جب مسعود پرویز نے فلم ''انتظار'' شروع کی تو میں ان سے ملا۔ انٹرویو لینے کے بعد انہوں نے مجھے ''انتظار'' کی عکاسی کے لیے منتخب کر لیا۔ یہ ایک بہت نادر موقع تھا کہ مسعود پرویز جیسے ہدایت کار اور خواجہ خورشید انور جیسے موسیقار کے ساتھ مجھے کام کرنے کا موقع ملا۔ ان ہی دنوں مجھے ایک پنجابی فلم ''مورنی'' میں کام کرنے کی بھی پیشکش کی گئی۔ بہت غور و خوض کے بعد میں نے ''انتظار'' کو ترجیح دی اور ''مورنی'' کے فلم ساز سے معذرت کر لی۔ مسعود پرویز کے ساتھ کام کرنا بھی ایک ایسا تجربہ تھا جس سے مجھے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ مسعود پرویز ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ذہین ہدایت کار تھے۔ ان کی اور خواجہ خورشید انور کی رہنمائی میں کام کرنا میرے لیے ایک اعزاز اور یادگار تجربہ تھا۔ فلم ''انتظار'' کی کامیابی نے میرا حوصلہ بڑھا دیا۔ میری عکاسی کی بھی ہر ایک نے تعریف کی۔ عام فلم بینوں اور فلمی نقادوں نے اسے سراہا تو میرا حوصلہ اور بڑھ گیا۔

قسمت مجھ پر مہربان تھی اور میرے استادِ محترم اے حمید بھی۔ انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ اگر میں اس شعبے میں اپنی انفرادیت قائم رکھنا چاہتا ہوں تو مجھے ایسا کام کرنا چاہیے جو کسی اور نے نہیں کیا۔

میں نے کہا حکم کیجیے، مجھے کیا کرنا چاہیے؟

انہوں نے کہا۔ ''رنگین فلم کے لیے کام کرو۔''

ان کے حکم کی روشنی میں، میں نے رنگین فلموں کے بارے میں لٹریچر پڑھنا شروع کر دیا۔ اسی زمانے میں ہالی وڈ کی فلم ''بھوانی جنکشن'' کا یونٹ لاہور آیا اور مجھے بھی ایک پاکستانی معاون کی حیثیت سے یونٹ میں شامل کر لیا گیا۔ اس فلم کے ہدایت کار نامور ہدایت کار جارج کیوکر تھے۔ اس ہدایت کار کے ساتھ کام کر کے اور سوالات کر کے مجھے بہت کچھ حاصل ہوا، یہ یونٹ واپس جانے لگا تو جارج کیوکر نے مجھے ایک تعریفی سرٹیفکیٹ سے نوازا جو میرے لیے ایک اعزاز تھا۔

آغا جی اے گل اپنی فلم ''عذرا'' کے کچھ حصے رنگین فلمانا چاہتے تھے۔ انہوں نے فلم کے لیے 30 رنگین نیگیو کے ڈبے بھی درآمد کر لیے تھے مگر یہ فیصلہ نہیں کر سکے تھے کہ عکاسی کی ذمہ داری کسے سونپی جائے۔ وہ اپنے ہندوستانی دوستوں سے مشورے کے لیے بمبئی بھی گئے تھے۔ وہاں ان کے دوستوں نے مشورہ دیا کہ آپ کا ڈیڑھ سال قبل منگایا ہوا نیگیو تو خراب ہو چکا ہوگا۔ آپ نئی فلم منگائیں تو ہم آپ کو عکاس فراہم کر دیں گے۔ پرانا میٹریل آپ کو ضائع کر دینا چاہیے۔

آغا صاحب بمبئی سے واپس آئے تو ایک روز مجھے بلایا اور کہا کہ تم رنگین فلم کے لیے سیٹ لگوا کر چند مناظر فلماؤ۔ اس سے پتا چلے گا کہ میں نے جو خام فلم منگائی ہے اس کا ریزلٹ کیا آتا ہے۔

میں نے بہت محنت اور لگن سے رنگین مناظر کی عکاسی کی اور اپنے تجربے کو بروئے کار لایا۔ میرے فلمائے ہوئے یہ چند مناظر پراسیسنگ کے لیے لندن بھیجے گئے کیونکہ پاکستان میں یہ سہولت میسر نہیں تھی۔ ایک ہفتے بعد فلم ڈیولپ ہو کر واپس پہنچ گئی۔ جب ایورنیو اسٹوڈیو میں ان مناظر کو دیکھا گیا تو سب بے حد خوش اور حیران ہوئے۔

یہ مناظر بے حد خوبصورت تھے۔ آغا صاحب نے گلے لگا کر مجھے شاباش اور مبارک باد دی، انہوں نے کہا کہ تم نے تو انڈیا کے بڑے بڑے کیمرامینوں کی رائے کو غلط ثابت کر دیا ہے۔

اس کامیابی سے متاثر ہو کر آغا صاحب نے ''عذرا'' کے کچھ اور مناظر کے اضافے کے علاوہ دو تین گانے بھی رنگین فلمانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ رنگین تجربہ بہت کامیاب ثابت ہوا۔

''عذرا'' کے کامیاب تجربے کے بعد آغا صاحب نے اپنی فلم ''نائیلہ'' رنگین بنانے کا فیصلہ کیا۔ یہ رنگین فلم بہت پسند کی گئی۔ ہر ایک نے اسے سراہا۔ یہ لاہور میں بنائی جانے والی پہلی مکمل رنگین فلم تھی اور بہت کامیاب فلم تھی۔

''عذرا'' کے تجربے کے بعد ہی ہم کو خیال آیا کہ پاکستان میں بھی ایک کلر لیبارٹری قائم ہونی چاہیے کیونکہ مستقبل میں رنگین فلمیں بنانے کے رجحان میں اضافے کا امکان تھا۔ آغا جی اے گل کو بھی یہ خیال بہت پسند آیا۔

''کوڈک فلم'' والوں سے اس سلسلے میں بات کی تو انہوں نے کہا کہ ہم لاہور میں کلر لیبارٹری قائم کرنے میں

عمران ہاشمی

مدد دے سکتے ہیں لیکن اس کے لیے بھارت سے ماہرین بلانے پڑیں گے۔ میں نے جواب دیا کہ ہمیں ایسے منصوبے کی ضرورت نہیں ہے جس کے لیے ہم بھارتی ماہرین کے محتاج ہوں۔

انہوں نے کہا ''پھر آپ کلر لیبارٹری سے محروم ہی رہیں گے۔''

ان کا یہ چیلنج میرے لیے مزید کوشش کا سبب بن گیا۔ میں نے اگفا گیورٹ کے سربراہ مجید کریم سے اس سلسلے میں بات کی۔ (مجید کریم سے اداکارہ شمیم آرا نے شادی کی تھی، ان کا بیٹا سلمان اسی کا نتیجہ ہے)

مجید کریم ایک پکے پاکستانی تھے۔ انہوں نے ہمارے ساتھ پوری طرح تعاون کرنے کا وعدہ کیا۔ آغا صاحب سے ملاقات کے بعد انہوں نے یورپ سے ماہرین بلوائے اور ایورنیو اسٹوڈیو میں کلر لیبارٹری قائم ہوگئی۔ (نوٹ: اس کے لیے آغا صاحب نے کلر لیب کے سربراہ پیارے خان کو تربیت کے لیے باہر بھی بھیجا تھا)

آغا گل کی رنگین فلم کی ڈیولپمنٹ اور پرنٹنگ اسی لیبارٹری میں ہوئی تھی اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان کی پہلی کلر لیب لگوانے کا اعزاز مجھے حاصل ہوا اور اس طرح... میری اور پاکستان کی پہلی رنگین فلم کا تمام کام اسی

لیبارٹری میں کیا گیا۔ یہ بھی میرے لیے بہت خوشی اور اعزاز کی بات ہے۔ تاہم وہ فلم تھی جس کے بعد پاکستان میں رنگین فلموں کا آغاز ہوا اور ایک وقت ایسا بھی آیا جب بلیک اینڈ وہائٹ فلموں کی تیاری بالکل ختم ہوگئی اور پنجابی کے علاوہ پشتو فلمیں بھی رنگین بنائی جانے لگیں۔

لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ میں نے جب ایاز، البیلا، گھونگٹ، زہر عشق، باغی سردار جیسی فلموں کی عکاسی کی اس وقت پاکستان میں ضروری آلات اور سہولتیں موجود نہیں تھیں۔ پھر میں نے ان فلموں میں فوٹو گرافی کا بلند معیار کیسے قائم رکھا؟

ان کا یہ سوال درست اور بجا ہے کیونکہ ہم نے جن پرانے اور فرسودہ کیمروں سے ان فلموں کی عکاسی کی وہ... ہالی وڈ تو کیا بھارت میں بھی مسترد کردیے گئے تھے۔ ہمارے اسٹوڈیو کے مالکوں نے پیسہ تو بہت کمایا لیکن نئے کیمرے اور جدید آلات منگانا ضروری نہیں سمجھا لیکن ہم نے اپنی ذہانت اور محنت سے ان فلموں میں اتنا بلند معیار قائم کیا کہ ہندوستان والے بھی دیکھ کر حیران رہ گئے۔ دراصل اس وقت ہم لوگوں میں یہ جذبہ تھا کہ ہمیں بہرصورت بھارتی فلموں سے مقابلہ کرنا ہے بلکہ ان سے بہتر فلمیں بنانی ہیں۔

میں یہاں آپ کو فلم ''گھونگٹ'' کی مثال پیش کرتا ہوں۔ یہ فلم ہندو پس منظر میں اسی ماحول اور کرداروں کے ساتھ بنائی گئی تھی۔ فلم میں نیر سلطانہ کا کردار پُراسرار قسم کا تھا اور انہوں نے زیادہ تر ساڑیاں ہی زیب تن کی تھیں۔ میں نے نیر سلطانہ کے لیے ساڑیاں خود ڈیزائن کرائی تھیں۔ یہ ساڑیاں ایسے رنگ کی تھیں جن کا بلیک اینڈ وائٹ میں بھی بہت اچھا رزلٹ آیا۔ ہم آؤٹ ڈور شوٹنگ میں لائٹنگ کا ایسا بندوبست کرتے تھے کہ کیمرے میں یہ منظر موتیوں کی طرح نظر آتے تھے، اسی طرح زہرِ عشق میں ہم نے آؤٹ ڈور میں حیرت انگیز ریزلٹ دیے۔ دوسرے ملکوں کے کیمرامین جدید ترین کیمروں سے بھی ایسے نتائج نہیں دے سکتے۔ میں پاکستانی کیمرامینوں کی ذہانت اور محنت کی داد دیتا ہوں جنہوں نے ٹوٹے پھوٹے فرسودہ ہتھیاروں سے دوسروں کے جدید ترین ہتھیاروں کا مقابلہ کیا اور فتح حاصل کی۔ فلم ''زہرِ عشق'' کا وہ منظر میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں جس کے آخری منظر میں چائلڈ اسٹار یاسمین اور حبیب، مسرت نذیر کی قبر کے پاس بیٹھے ہیں اور پس منظر سے چاند ابھر رہا ہے۔ دیکھنے والوں کو یہ محسوس ہوا جیسے سچ مچ چاند افق نمودار ہورہا ہے۔ لیکن دراصل یہ منظر ہم نے ان ڈور یعنی فلم اسٹوڈیو میں فلمایا تھا۔ ہدایت کار نے ہماری رہنمائی کی اور ہم نے تکنیک میں تجربات کیے جو کامیاب ثابت ہوئے۔ یہ صرف تکنیک کے زور پر کیا گیا تھا جس کی ہم نے بہت داد حاصل کی تھی۔

فلم ''دیوانہ'' میں ہم نے کسی خاص سہولت اور جدید تکنیکی آلات کے بغیر اس فلم میں ایسے تجربات کیے کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے۔ یہ ایک ہارر Horror سسپنس فلم تھی۔ اس میں ایسے مناظر بھی تھے کہ ایک کار جارہی ہے لیکن چلانے والا نظر نہیں آرہا۔ ڈرائیور کے بغیر کار چل رہی ہے۔ کار چلانے والا سگریٹ پی رہا ہے۔ سگریٹ کا دھواں نظر آرہا ہے مگر سگریٹ پینے والا غائب ہے۔ کوئی شخص برتن اٹھا رہا ہے کپڑے اٹھا رہا ہے کرسیوں پر بیٹھ رہا ہے، سب کچھ ہورہا ہے مگر وہ شخص نظر نہیں آرہا۔ ہالی وڈ میں ایسی فلمیں بنائی گئی تھیں مگر ہالی وڈ والوں نے جدید ترین آلات میسر ہونے کے باوجود ایسی فلمیں نہیں بنائیں۔ ہالی وڈ کی فلم INVISIBLE MAN تو آپ کو یاد ہوگی۔ فلم ''دیوانہ'' میں ایسے ہی تجربات کیے گئے جو معیار کے اعتبار سے ان سے کمتر نہیں تھے۔ مجھے اس بات پر فخر ہے۔ اس کے لیے میرے استاد محترم اے حمید بھائیا نے مجھے بہت مشورے دیے۔ بلکہ میری کامیابیوں میں ان کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔''

کیمرامین نبی احمد ایک بہت بڑے اور صاحب کمال کیمرامین تھے۔

نبی احمد نہ صرف پاکستان میں رنگین فلموں کے خالق تھے بلکہ انہوں نے دوسروں کو بھی رنگین فلمیں بنانے پر اکسایا تھا۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ ریاض شاہد کی فلم ''زرقا'' پہلے بلیک اینڈ وہائٹ میں بنائی جارہی تھی مگر ریاض شاہد کو نبی احمد نے مشورہ دیا بلکہ اصرار کیا کہ وہ ''زرقا'' کو رنگین بنائیں۔ یہ مشورہ انہوں نے قبول کرلیا اور رنگین فلم ''زرقا'' نے ساری دنیا میں کامیابی اور مقبولیت حاصل کی۔

نبی احمد ایک کم گو اور کم آمیز آدمی تھے۔ وہ بلا ضرورت اسٹوڈیوز میں لوگوں سے ملتے ملاتے بھی نہیں تھے، ہمارے ساتھ ان کا مہربانی اور محبت کا تعلق تھا۔ ہم ان کے گھر جاتے تو بیرونی ممالک کے فلمی میگزین اور عکاسی کے بارے میں مضامین پڑھ کر ان سے تبادلہ خیال بھی کیا کرتے تھے۔ یہ بھی سچ ہے کہ جب ہم نے پہلی فلم ''آس'' کی ہدایت کاری کی تو اس میں جہاں سعادت حسن منٹو، ڈبلیو زیڈ احمد، شوکت حسین رضوی، لقمان احمد، ایس، ٹی زیدی جیسے لوگوں کے مشوروں اور ہمت افزائی کے ساتھ ساتھ ان کی بتائی ہوئی تکنیکی ہدایات بھی بہت کام آئیں۔ لوگ مذاق اڑاتے تھے کہ یہ تو بے استاد ہے، ہدایت کاری کیسے کرسکتا ہے۔ لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ ہم نے ان استادوں سے سیکھا تھا جو صحیح معنوں میں استاد تھے۔ جن پر سارا برصغیر فخر کرتا ہے۔''

نبی احمد اچانک فلم اسٹوڈیوز سے غائب ہوگئے۔ ہم نے بھی اسٹوڈیو کا رخ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اچانک ایک روز ان کی وفات کی خبر ملی تو ساکت رہ گئے۔ بہت سی باتیں یاد آئیں۔ دیر تک نبی احمد صاحب کو یاد کرتے رہے۔ مگر پھر خیال آیا کہ جسمانی طور پر تو آج دنیا سے رخصت ہوئے ہیں لیکن ذہنی اور نفسیاتی لحاظ سے تو وہ فلمی صنعت کے لیے بہت عرصہ پہلے مرحوم ہوچکے تھے۔

اداکار ساقی کا اصل نام عبداللطیف بلوچ تھا۔ ساقی ان کا فلمی نام ہے۔ اداکار ساقی کو ایکٹنگ کا دیوانگی کی حد تک شوق تھا بلکہ ہم نے انہیں تمام زندگی فلم اور اداکاری کے سوا کسی اور شوق اور مشغلے میں دلچسپی لیتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ان سے ہماری شناسائی بھی 30-35 سال کے طویل عرصے پر محیط ہے۔ ان سے ابتدائی ملاقاتیں اس وقت ہوئی تھیں جب وہ اداکار نہیں تھے اور میں صرف صحافی تھا۔ یہ 1950ء کی دہائی کے آخر کی بات ہے۔ مال روڈ پر شاہ دین بلڈنگ میں ''نوائے وقت'' کا دفتر تھا۔ اس کے برابر میں ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی کا دفتر تھا جس کے کرتا دھرتا شیخ رحمان تھے۔ شیخ رحمان صاحب کو بھی فلم اور اداکاری سے بے پناہ دلچسپی تھی۔ مگر ان کا پہلا شوق ہدایت کاری تھا اور مجھے خوشی ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں کم از کم ایک بار یہ شوق ضرور پورا کرلیا ورنہ ہزاروں لوگ اس آرزو کی تکمیل میں زندگیاں گزار دیتے ہیں۔ شیخ صاحب نے پنجابی فلم ''آبرو'' بنائی تھی جو بدقسمتی سے کامیاب نہیں ہوئی اور جب کسی کی پہلی فلم ناکام ہوجائے تو فلمی صنعت میں اس کا مستقبل تاریک ہوجاتا ہے۔ شیخ رحمان کا ذریعہ آمدنی دوسرا تھا اس لیے فلم کی ناکامی کے بعد بھی انہوں نے ہمت نہ ہاری اور دوسری فلم بنانے کے چکر میں رہے یہاں تک کہ یہی آرزو دل میں لیے اللہ کو پیارے ہوگئے۔ وہ بہت بااخلاق، مہمان نواز، ہنس مکھ اور شائستہ انسان تھے۔ انگریزی اور اردو کی کوئی اچھی اور مشہور فلم ایسی نہیں تھی جو انہوں نے نہ دیکھ رکھی ہو اور جس کی کہانی تمام جزئیات اور تفصیلات کے ساتھ انہیں یاد نہ ہو۔ پھر ساتھ ساتھ وہ اس فلم کی کہانی، ہدایت کاری اور موسیقی سے متعلق قابل ذکر پہلو بھی بیان کرتے جاتے تھے اور سننے والے ان کی باتوں میں کھو جایا کرتے تھے۔ وہ قیام پاکستان سے پہلے نیو تھیٹرز اور بمبئی ٹاکیز کی بنائی ہوئی فلموں اور کلاسیکی پرانی انگریزی فلموں کے بارے میں بھی سنایا کرتے تھے اور ان میں سے بیشتر فلمیں بہت سے حاضرین محفل کو دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ صرف ان کے بارے میں کتابوں رسالوں میں پڑھا تھا یا سن رکھا تھا۔ اس لیے شیخ صاحب کی داستان گوئی سے بھی مرعوب اور متاثر ہوا کرتے تھے۔ کہانی اور فلم کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے شیخ صاحب چہرے کے اتار چڑھاؤ اور آواز کے زیر و بم کی مدد سے بھی ایک مسحور کن ماحول پیدا کردیا کرتے تھے۔ ہم انہیں اکثر مشورہ دیا کرتے تھے کہ وہ اداکار بن جائیں مگر ان کا پہلا اور آخری شوق ہدایت کاری تھی۔ شیخ رحمان زندگی کے بیشتر حصہ کنوارے رہے۔ کافی عمر میں شادی کی مگر زیادہ عرصے زندہ نہیں رہے۔

ظاہر ہے کہ شیخ رحمان کے دفتر میں ایسے لوگوں کا جمگھٹا رہا کرتا تھا جو کسی نہ کسی طرح فلموں کا شوق رکھتے تھے۔ دفتر کے پچھلے کمرے میں، جو خاصا بڑا تھا سب لوگ جمع ہوجاتے۔ لطیفے بازی ہوتی، فلموں، کہانیوں اور کتابوں پر تبصرے ہوتے اور پھر پاکستانی فلموں کے معیار کے بارے میں گفتگو شروع ہوجاتی۔ دلجیت مرزا آگے چل کر مزاحیہ اداکار اور پھر فلم ساز و ہدایت کار بنے اور کافی شہرت حاصل کی۔ ساقی صاحب سے بھی اسی کمرے میں ملاقات ہوئی تھی جو بعد میں دوستی میں تبدیل ہوگئی۔

ساقی صاحب اس زمانے میں بھی مزاحیہ خاکے بنا کر سنایا کرتے تھے اور اس معاملے میں ان کا اور دلجیت مرزا کا برابر کا جوڑ تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ دلجیت مرزا نے بعد میں محفلوں میں بھی مزاحیہ اداکاری کا نمونہ پیش کیا اور اس راستے سے فلمی صنعت میں پہنچ گئے۔ ساقی صاحب نے کبھی محفلوں یا اسٹیج شو میں اپنی ہنر مندی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ انہوں نے اپنی تمام تر صلاحیتیں فلموں کے لیے سنبھال کر رکھ لی تھیں۔ ساقی صاحب نے اپنی فلمی زندگی کا آغاز ہالی وڈ کی فلم ''بھوانی جنکشن'' سے کیا تھا جو لاہور میں بنائی

گئی تھی۔ اداکارہ نیلو اور ہدایت کار قدیر غوری کے علاوہ اور بھی کئی فن کاروں نے اس فلم میں پہلی بار مختلف حیثیتوں میں حصہ لیا اور آگے چل کر اپنے اپنے شعبوں میں نام پیدا کیا۔ ساقی صاحب اس وقت تک پاکستان کی فلمی صنعت سے وابستہ نہیں ہوئے تھے۔ مگر ''بھوانی جنکشن'' میں انہیں کام ملنے کی بڑی وجہ ان کی شخصیت، بے تکلفی اور بول چال کا ڈھنگ تھا۔ وہ نہ صرف انگریزی بلکہ اٹھارہ دوسری زبانیں بھی روانی سے بول لیتے تھے جن میں پاکستان کی علاقائی زبانوں کے علاوہ عربی، فارسی بھی شامل ہیں۔ ہر زبان کو مخصوص لب و لہجے کے ساتھ بولتے تھے۔ امریکی لہجے میں انگریزی بڑی روانی سے بولتے اور اسی انداز میں شانے اور ہاتھ ہلاتے جس طرح امریکی کرتے ہیں۔ ان کی قوتِ مشاہدہ بہت تیز تھی اور پھر قدرت نے نقالی کی صلاحیت بھی عطا کی تھی۔ وہ جب انٹرویو کے لیے ''بھوانی جنکشن'' کے مشہور زمانہ ہدایت کار جارج کوئیکر کے پاس گئے تو وہ ان کی گوناگوں خوبیوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے بھلا امریکا میں ایسا شخص کہاں دیکھا تھا جو ہر زبان پر پوری دسترس رکھتا ہو۔ اس فلم میں انہوں نے معاون ہدایت کار کے طور پر بھی کام کیا اور ایک انقلابی ہندو لیڈر کا مختصر کردار بھی کیا تھا۔ ساقی صاحب اس فلم میں کام کرنے کی لگن میں کوٹری (سندھ) سے بطور خاص لاہور آئے تھے فلم کی تکمیل کے بعد واپس چلے گئے مگر اداکاری کے جراثیم ان کے جسم میں سرایت کر چکے تھے۔ لاہور آتے رہے اور فلمی لوگوں سے ملاقاتیں بھی کرتے رہے۔

انہیں پاکستانی فلموں میں متعارف کرانے کا سہرا ایس گل صاحب کے سر ہے جن کا اصلی نام سید فضل علی شاہ جاموٹ تھا۔ فنِ موسیقی سے دیوانگی کی حد تک لگاؤ تھا۔ اداکاری اور فلم سازی سے بھی دلچسپی تھی۔ سندھ کے ممتاز زمیندار تھے۔ انہوں نے نذیر اجمیری صاحب کی فلم ''بے قرار'' میں راگنی کے بالمقابل ہیرو کا کردار کیا اور پھر فلمی صنعت سے وابستہ ہو کر رہ گئے۔ فضل شاہ جاموٹ نے ایس گل کے نام سے فلموں کا رخ کیا تھا بطور فلم ساز ان کی پہلی فلم بے قرار اور دوسری التجا تھی۔ اسی زمانے میں ایس گل صاحب سے بھی میری ملاقات ہوئی جو بعد میں شناسائی اور پھر دوستی میں بدل گئی۔ ایس گل صاحب انتہائی شائستہ اور با اخلاق انسان ہیں۔ انہوں نے اپنی فلم ''التجا'' کی موسیقی گل حیدر کے نام سے خود ہی مرتب کی تھی۔ موسیقی کے فن میں وہ غلام حیدر مرحوم کے شاگرد تھے۔ اس فلم کی ہیروئین بھی راگنی تھیں۔ بعد میں ان کا اور راگنی کا مستقل ساتھ ہو گیا۔ جن دنوں محمد خان جونیجو پاکستان کے وزیرِ اعظم تھے ایس گل صاحب کے صاحب زادے سے ان کی صاحب زادی کی شادی ہوئی تھی اور وہ ان کے سمدھی بن گئے۔

ساقی نے لاہور میں سالہا سال قیام کیا اور لگ بھگ پانچ سو فلموں میں کام کیا مگر فلم حقیقی معنوں میں کبھی ان کی کفالت نہ کر سکی۔ حالانکہ وہ اردو، پنجابی، پشتو بھی زبانوں کی فلموں میں کام کر لیتے تھے اور ہر زبان مخصوص لب و لہجے کے ساتھ بولتے تھے۔ زندگی کے آخری سالوں میں وہ اچانک دل برداشتہ ہو کر لاہور سے کوٹری چلے گئے اس کا سبب بھی ان کی زود حسی اور فن کارانہ غیرت تھی۔ ہوا یہ کہ اداکار علاؤ الدین جو اپنے زمانہ عروج میں فلم والوں کی آنکھوں کا تارا بنے ہوئے تھے آخری دنوں میں ان کی سرد مہری اور غفلت کا شکار ہونے لگے۔ ایک محفل میں ساقی نے علاؤ الدین کے ساتھ حاضرینِ محفل کی بے پروائی اور سرد مہری کا نظارہ کیا تو اتنے دل برداشتہ ہوئے کہ فلمی صنعت سے کنارہ کش ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ کسی مرحلے پر خود اپنے ساتھ اس بے اعتنائی کا مظاہرہ برداشت نہیں کر سکتے تھے اس لیے عزت و احترام کے ساتھ فلمی دنیا کو خیر باد کہہ دیا لیکن فلم اور اداکاری عمر بھر ان کے ذہن سے نہ نکل سکی۔ ان کی چند فلموں کے نام یہ ہیں، رات کے راہی، لاکھوں میں ایک، آگ کا دریا، بیٹی، بارہ بجے، ناگن، ہمراہی، شہید، مٹھی بھر چاول۔

انڈیا کے فلم ساز، گلوکار اداکار کشور کمار کے بارے میں بہت کم لکھا گیا ہے اور ان کے بارے میں بہت زیادہ معلومات موجود نہیں ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ وہ انڈیا کے مایہ ناز اداکار اشوک کمار کے چھوٹے بھائی تھے۔ ان کی ذاتی اور خاندانی زندگی کے بارے میں صرف اس وقت پتا چلتا ... جب ان کی شادی کی خبر اخبارات میں شائع ہوتی ...
اس کی وجہ یہ ہے کہ کشور کمار ایک گوشہ نشین اور کم آمیز فن کار تھے۔ فلمی تقاریب میں وہ نظر نہیں آتے تھے۔ اکثر وہ اسٹوڈیو اور گھر کے سوا اور کہیں نہیں پائے جاتے تھے۔ وہ صحافیوں سے بات چیت کرنے سے کتراتے تھے اور انٹرویو دینے سے معذرت کر دیتے تھے۔ ان کی بہت زیادہ شہرت اس وقت ہوئی جب انہوں نے اداکارہ مدھو بالا سے شادی کی تھی۔ یہ





شادی مدھو بالا کی زندگی میں یعنی نو سال تک باقی رہی۔

اس عجیب و غریب شخص کا انٹرویو لینے میں ایک بھارتی صحافی پرتش باندی کامیاب ہو گئے۔ یہ کیسے ہوا اس کو بھول جائیے۔ صرف انٹرویو کو پڑھیے اور لطف اٹھائیے۔ یہ انٹرویو ذیل میں سوال و جواب کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ ایک انوکھے آدمی کا انوکھا انٹرویو شاید آپ اس سے لطف اندوز بھی ہوں اور با خبر بھی! (نوٹ: یہ انٹرویو تازہ ترین نہیں ہے)

سوال: میں نے سنا ہے کہ آپ بمبئی چھوڑ کر کھنڈوہ جا رہے ہیں؟

جواب: دوستوں سے محروم بیوقوفوں کے شہر میں کون رہنا پسند کرے گا جہاں ہر روز ہر لمحہ ہر شخص دوسرے سے فائدہ اٹھانے کے چکر میں رہتا ہے؟ کیا آپ یہاں کسی پر بھروسا کر سکتے ہیں۔ کیا یہاں کوئی ایسا ہے جس پر بھروسا کیا جا سکے؟ کیا کوئی ایک بھی ایسا فرد ہے جسے آپ اپنا ''دوست'' کہہ سکتے ہیں۔ میں نے اس چوہے بلی کے کھیل والے شہر کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں کبھی بھی یہاں خوش نہیں رہا۔ ہمیشہ اپنے شہر کھنڈوہ جا کر رہنے کی کوشش کرتا رہا۔ کھنڈوہ میرے باپ دادا کا شہر ہے، میں بھی وہیں جا کر مرنا چاہتا ہوں۔ اس بدصورت شہر میں مرنا کون پسند کرے گا۔

سوال: اگر یہ شہر اتنا ہی برا ہے تو جناب یہ بتائیے کہ آپ یہاں آئے کیوں تھے؟

جواب: میں یہاں اپنے بڑے بھائی اشوک کمار سے ملنے آیا کرتا تھا۔ اس زمانے میں وہ بہت بڑے اداکار تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ میرا تعارف کے ایل سہگل سے کرا دیں گے جو کہ میرے آئیڈیل رہے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ سہگل اپنی ناک سے گانے کے لیے آواز نکالتے تھے۔ تو پھر کیا ہوا۔ وہ ایک عظیم گلوکار تھے بلکہ وہ مجھ سے بڑے گلوکار تھے اور ہمیشہ رہیں گے۔

سوال: میں نے سنا ہے کہ آپ سہگل کے نغمات کا ایک البم بنا رہے ہیں؟

جواب (بات کاٹ کر) مجھ سے یہ فرمائش کی تو گئی تھی مگر میں نے صاف انکار کر دیا۔ میں ان کے گانے گا کر ان کا مقابلہ کیوں کروں اور کیسے کروں۔ انہیں میری یادوں میں رہنا زیادہ اہم ہے۔ کسی کو یہ موقع نہیں دینا چاہتا کہ وہ کہے کہ کشور کمار نے ان سے اچھا گایا ہے۔

## جیاں گانوزنگ

چین کے ممتاز نوبل انعام یافتہ ادیب۔ وہ گینزو (Ganzhoo) صوبہ جیانگ میں ایک آفیسر کے ہاں پیدا ہوئے۔ والدہ اداکارہ تھیں۔ 1962ء میں بیجنگ یونیورسٹی سے فرانسیسی زبان کی ڈگری لی۔ وہ کمیونسٹ پارٹی کے بھی رکن تھے، تاہم 1969 میں مستعفی ہو گئے۔ 1981ء سے 1987ء تک مختلف ادبی رسالوں میں مضامین لکھتے رہے۔ اس دوران انہوں نے ڈراما نگاری کی جانب بھی توجہ دی اور 1986 میں ''The Other Shore'' کے عنوان سے ان کا ڈراما اسٹیج پر دکھایا گیا۔ اس ڈرامے میں انہوں نے ثقافتی انقلاب کو ہدفِ تنقید بنایا تھا۔ لہٰذا حکومت نے ڈرامے پر پابندی لگا دی۔

چونکہ وہ پابندی کے ماحول میں لکھنے لکھانے سے قاصر تھے، لہٰذا 1987ء میں ہجرت کر کے پیرس کو اپنا وطنِ ثانی بنایا۔ وہ ایک اعلیٰ پائے کے ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اعلیٰ پائے کے مصور بھی ہیں اور ان کے فن پاروں کی نمائشیں دنیا بھر میں منعقد کی جا چکی ہیں۔ 12 اکتوبر 2000ء کو سویڈش اکیڈمی نے ان کے لیے ادب کے نوبل انعام کا اعلان کیا۔

مرسلہ: سہر ش، شیخوپورہ

سوال: اچھا یہ بتائیے کہ اگر آپ کو بمبئی پسند نہیں تھا تو آپ یہاں کیوں رہ پڑے؟ شہرت کے لیے یا دولت کے لیے؟

جواب: میں پھنس گیا۔ میں تو بس گانا چاہتا تھا۔ میرا کبھی اداکار بننے کا ارادہ نہیں تھا۔ میں اداکاری سے دور بھاگتا تھا۔ لیکن حالات ایسے ہو گئے کہ مجھے فلموں میں اداکاری کرنی پڑ گئی۔ میں کسی لمحے بھی یہاں خوش نہیں رہا۔ میں بس یہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ میں جان بوجھ کر اپنے مکالمے بھول جاتا تھا۔ یہ ظاہر کرتا تھا کہ میں ذہنی طور پر ٹھیک نہیں ہوں، سنکی ہوں۔ میں جان بوجھ کر المناک منظر میں کامیڈی پیدا کر دیتا تھا۔ بلاوجہ چیخنا چلانا شروع کر دیتا تھا۔ مگر مجھے اداکاری کرنی پڑی لیکن میں جان بوجھ کر مینا کماری سے بولے جانے والے مکالمے مینا رائے کے

سامنے بول دیا کرتا تھا۔اس کے باوجود کسی نے مجھے چھٹکارا نہیں دلایا۔مگر کسی نے پروا نہیں کی...... انہوں نے تو سوچ لیا تھا کہ وہ مجھے اداکار بنا کر ہی دم لیں گے۔

سوال: مگر کیوں۔وہ ایسا کیوں چاہتے تھے؟

جواب: اس لیے کہ میں دادا منی (اشوک کمار) کا بھائی تھا۔ اشوک کمار بہت بڑے اداکار تھے، میں اتنا مصروف تھا کہ شوٹنگ کے لیے ایک سیٹ سے دوسرے سیٹ پر بھاگا پھرتا تھا۔

سوال: لیکن بالآخر آپ اپنے انداز کی اداکاری کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

جواب: یہ بات تو ہے۔ میں ایک زمانے میں دلیپ کمار کے بعد سب سے بڑا باکس آفس اسٹار تھا۔ میں ان دنوں میں بیک وقت بہت سی فلموں میں کام کررہا تھا۔ میں ایک فلم کے سیٹ سے دوسرے فلم کے سیٹ پر بھاگا پھرتا تھا اور راستے ہی میں لباس تبدیل کرلیتا تھا۔ ذرا غور فرمایئے کہ قمیص کہیں پھینک رہا ہوں تو پتلون کہیں پڑی ہے۔کئی بار تو اس بھاگ دوڑ میں میری وگ ہی اتر جاتی تھی۔کئی بار تو میں اپنی فلموں کے مکالمے اس طرح گڑبڑ کرتا تھا کہ کسی فلم کے مکالمے کسی اور فلم میں بول دیتا تھا۔ ایک فلم کے رومانی مکالمے دوسری فلم میں بولتا تھا تو زیادہ فرق بھی نہیں پڑتا تھا کیونکہ ہماری فلموں میں سارے رومانی مناظر ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔لیکن اس وقت گڑبڑ ہوجاتی تھی جب ڈرامائی سین کے مکالمے رومانی سین میں بول جاتا تھا۔ یہ بہت غلط تھا اور مجھے اپنے کام سے نفرت ہوگئی تھی۔ان واقعات سے مجھے اسکول کے زمانے یاد آجاتے تھے۔ فلم ڈائریکٹرز بھی اسکول ٹیچرز کی طرح ہوتے ہیں۔ یہ کرو، وہ نہ کرو، مجھے اس زمانے میں ایسی باتیں بہت بری لگتی تھیں یہی وجہ ہے کہ میں اسکول سے بھاگ جاتا تھا اور اسکول جانے سے گھبراتا تھا۔

سوال: آپ تو اس کے لیے بدنام تھے کہ ہدایت کاروں اور فلم سازوں کو بہت پریشان کرتے تھے، ایسا کیوں تھا؟

جواب: نان سنس، میں نہیں وہ مجھے پریشان کرتے تھے۔کیا آپ سمجھتے ہیں کہ انہیں میری پروا تھی؟ نہیں۔ بالکل نہیں۔ وہ مجھے اس لیے اہمیت دیتے تھے کہ میرا نام بکتا تھا۔ میرے برے دنوں میں کون میری فکر کرتا تھا۔ اس کاروبار میں کون ایک دوسرے کی فکر کرتا ہے۔

سوال: شاید اسی لیے آپ تنہا رہنا پسند کرتے تھے۔ سب سے الگ تھلگ؟

جواب: سنو، میں تمباکو نوشی نہیں کرتا۔ نہ شراب پیتا ہوں نہ ہی محفلوں میں شریک ہوتا ہوں۔ اگر اس کو آپ تنہائی پسندی کہتے ہیں تو یہی سہی۔ میں اسی حالت میں خوش ہوں۔ جس کام کے لیے باہر نکلتا ہوں اور سیدھا گھر واپس آجاتا ہوں۔گھر میں مجھے خوشی اور سکون ملتا ہے میں ڈرامائی فلمیں دیکھتا ہوں۔ درختوں سے باتیں کرتا ہوں۔ گاتا ہوں، اس خود غرض دنیا میں ہر شخص تنہا رہنے پر مجبور ہے۔ جو بھی تخلیق کار اور فن کار ہے وہ اکیلا ہے۔ مجھ سے میرا یہ حق کون چھین سکتا ہے۔

سوال: آپ کے زیادہ دوست بھی نہیں ہیں۔

جواب: میرا کوئی دوست نہیں ہے، ایک بھی نہیں۔

سوال: یہ جواب کچھ مبالغہ آمیز نہیں ہے؟

جواب: یہ بات نہیں ہے۔ لوگوں سے مجھے بوریت ہوتی ہے۔ فلم کے لوگوں سے میں خاص طور پر بہت بور ہوتا ہوں۔ اس کے مقابلے میں مجھے درختوں سے باتیں کرنا اچھا لگتا ہے۔

سوال: مطلب یہ کہ آپ فطرتی ماحول کو پسند کرتے ہیں۔

جواب: ہاں، اسی لیے میں کھنڈوہ جانا چاہتا ہوں۔ یہاں رہ کر میں فطرت سے بہت دور ہوگیا ہوں۔ میں نے سوچا تھا کہ اپنے بنگلے کے اردگرد ایک نہر بنواؤں گا تاکہ میں کشتی کی سیر کرسکوں۔ جب میرے آدمی نہر کھود رہے تھے تو میونسپل کمیٹی والے خاموش بیٹھے دیکھتے رہے۔ ایک روز نہر کھودتے ہوئے ایک ہاتھ کا پنجر دریافت ہوا۔اس کے بعد کوئی مزدور نہر کھودنے کو تیار نہ تھا۔ میرا چھوٹا بھائی انوپ کمار گنگا جل لے کر آگیا اور منتر پڑھنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ نہر میں کسی قبرستان پر بنا رہا ہوں۔ بہرحال میں اپنے گھر کو وینس نہیں بنا سکا۔ اپنی ایک چھوٹی سی خواہش بھی پوری نہ کرسکا۔

سوال: لوگ سمجھتے ہیں کہ آپ کا دماغ چل گیا ہے؟

جواب: کون کہتا ہے کہ میرا دماغ چل گیا ہے۔ دراصل میں پاگل نہیں ہوں، دنیا پاگل ہوگئی ہے۔

سوال: آپ کے بارے میں یہ مشہور کیوں ہے کہ آپ عجیب وغریب حرکتیں کرتے ہیں؟

جواب: یہ سب باتیں اس وقت شروع ہوئیں جب ایک لڑکی میرا انٹرویو کرنے آئی تھی، ان دنوں میں تنہا رہتا تھا۔ اس نے کہا آپ کو تنہائی کا احساس نہیں ہوتا؟ میں نے کہا، بالکل نہیں۔ آؤ میں تمہیں اپنے دوستوں سے ملواؤں، میں اس کو باغ میں لے گیا اور کہا میں تمہیں اپنے کچھ دوستوں سے ملواتا ہوں' میں نے اس کا تعارف اپنے دوست درختوں سے کرایا۔ ان سے ملو، یہ چنار دھن ہے۔ یہ گھیونندنی ہے۔ یہ گنگا دھر ہے، یہ جگن ناتھ ہے۔ یہ بدھو رام ہے اور یہ جھٹ پٹ ہے، میں نے اسے بتایا کہ اس ظالم دنیا میں یہ سب میرے دوست ہیں۔ وہ صحافی لڑکی بھی خوب نکلی۔ اس نے جا کر یہ سب کچھ اخبار میں لکھ دیا۔ اس نے لکھا کہ میں اپنا زیادہ وقت اپنے باغ میں اور درختوں کے ساتھ گزارتا ہوں۔ ان سے لپٹ کر گانے گاتا ہوں تو اس میں کیا برائی ہے؟ تم ہی مجھے بتاؤ، درختوں سے دوستی کرنے میں کیا برائی ہے؟

سوال: کوئی نہیں۔

جواب: اور پھر یہ گھر سجانے والا آگیا۔ گرمی کے موسم میں وہ گرم سوٹ اور بوٹ پہن کر آیا تھا۔ اس نے مجھے خوبصورتی، ڈیزائن اور ماحول کے بارے میں لیکچر دینا شروع کردیا۔ میں آدھے گھنٹے تک تو اس کی بک بک سنتا رہا۔ وہ خالص امریکی لہجے میں انگریزی بول رہا تھا۔ میں اپنے ڈرائنگ روم کے لیے بالکل سادہ سجاوٹ چاہتا تھا۔ یہ بات میں نے اس کو بھی بتادی۔ میں نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ اس کمرے میں پانی ہو۔ ایک فٹ گہرا۔ صوفوں کی بجائے کشتیاں پانی میں تیر رہی ہوں۔ میں نے اس سے کہا کہ اس کمرے کے درمیان ایک ستون پر چائے نوشی کا سامان ہوتا کہ جو چاہے اپنی کشتی میں تیرتا ہوا جائے اور چائے وغیرہ پیے۔ میں نے اس سے کہا کہ کشتیاں ایسی ہوں کہ ہم لوگ جب چاہیں رک کر ایک دوسرے سے بات کرسکیں۔

اس نے مجھے پریشانی سے دیکھا۔ لیکن جب میں نے اس کو کمرے کی دیوار کی سجاوٹ کے بارے میں اپنی خواہش بتائی تو اس کی پریشانی کی حد نہ رہی، لگتا تھا وہ گھبرا گیا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ اس دیوار پر زندہ کوے لٹکا دیے جائیں تصویروں کی جگہ کوے اور دوسرے پرندے لٹکے ہوئے ہوں کیونکہ میں فطرت سے نزدیک رہنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ چھت پر پنکھوں کی جگہ بندر اچھلتے پھرتے ہوں۔ یہ سن کر وہ آہستہ آہستہ پچھلے قدموں باہر کی طرف کھسکنے لگا۔ اس کے بعد اس نے اتنی تیزی سے گیٹ کی طرف دوڑ لگائی کہ اتنی تیز رفتاری سے الیکٹرک ٹرین بھی نہیں بھاگ سکتی۔

اب آپ مجھے یہ بتایئے کہ اگر میں اپنے گھر کو اس طرح سجانا چاہتا ہوں تو اس میں کیا پاگل پن ہے؟ پاگل تو وہ تھا جو سخت گرمی میں تھری پیس گرم سوٹ پہن کر آیا تھا۔ اگر وہ ایسا کرسکتا ہے تو پھر میں اپنے کمرے کی چھت پر پنکھوں کی جگہ بندر لٹکانا چاہتا ہوں تو اس میں کیا پاگل پن ہے۔ اگر میں کمرے کی دیواروں پر تصویروں کی جگہ زندہ کوے لٹکاؤں؟ اگر وہ سخت گرمی میں تھری پیس گرم سوٹ پہن سکتا ہے تو میں دیواروں پر کوے کیوں نہیں لٹکا سکتا۔

سوال: آپ کے خیالات بالکل نئے اور انوکھے ہیں۔ یہ بتایئے کہ آپ کی فلمیں آج کل بری طرح فلاپ کیوں ہورہی ہیں؟

جواب: اس کے لیے میں پہلے ہی اپنے تقسیم کاروں کو بتادیتا ہوں کہ آپ میری فلم نہ خریدیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ فلم صرف ایک ہفتے چلے۔ ظاہر ہے کہ یہ سن کر وہ بھاگ جاتے ہیں اور پھر پلٹ کر نہیں آتے۔ آپ کو دنیا میں کوئی ایسا پروڈیوسر ڈائریکٹر ملے گا جو تقسیم کار کو پہلے سے ہی بتادے کہ آپ میری فلم نہ لیں چونکہ آپ سمجھ ہی نہیں سکتے کہ وہ کیا بنائے گا۔

سوال: تو پھر آپ فلمیں کیوں بناتے ہیں؟ کس کے لیے؟

جواب: اس لیے کہ میری روح بے تاب ہوکر مجھے اکساتی ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ میری فلمیں کامیاب بھی ہوتی ہیں مثلاً میری فلم ''دور گگن کی چھاؤں میں'' جب ریلیز ہوئی تو اس کو دیکھنے والے صرف دس لوگ تھے۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں خود اس وقت سینما ہال میں موجود تھا۔ پہلے شو میں صرف دس افراد تھے۔ یہ النکار سینما میں ہوا تھا۔ اس فلم کی ریلیز بھی عجیب حالات میں ہوئی تھی۔ میرے بہنوئی کے بھائی سبودھ مکرجی نے یہ سینما آٹھ ہفتے کے لیے کرائے پر لیا تھا۔ وہ اپنی فلم ''اپریل فول'' اس سینما میں چلانا چاہتے تھے۔ سب جانتے تھے کہ یہ ایک سپرہٹ فلم ہوگی۔ اور سب یہ بھی جانتے تھے کہ میری فلم زبردست فلاپ ہوگی۔ اس لیے سبودھ مکرجی نے ایک ہفتے کے لیے سینما مجھے دے دیا تھا کہ میں اپنی فلم چلالوں۔ انہوں نے بڑی فراخدلی سے کہا تھا کہ تم ایک ہفتے اپنی فلم چلالو۔ میں اپنی فلم کے لیے سات ہفتے رکھ لوں گا۔ میری فلم ایک ہفتے سے زیادہ نہیں چل سکی۔

سچ تو یہ ہے کہ یہ فلم دو دن بھی نہیں چل سکتی تھی۔ میں نے اس میں بھی یہ یقین دہانی کرادی تھی۔ لیکن پہلے شو میں صرف دس لوگ دیکھ کر وہ بھی پریشان ہوگئے۔ پھر مجھے تسلی دینے لگے کہ کوئی بات نہیں۔ بعض اوقات ایسا ہو جاتا ہے۔ لیکن میں تو پریشان نہیں تھا۔ یہ بات ساری انڈسٹری میں پھیل گئی۔ جیسے جنگل میں آگ پھیلتی ہے۔ پھر یہ ہوا کہ فلم دیکھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا یہاں تک ہاؤس فل ہوگیا اور میری فلم وہاں پورے آٹھ ہفتے ہاؤس فل گئی۔ سبودھ مکرجی نے مجھ سے جھگڑنا شروع کردیا کہ بھئی اب سنیما خالی کروتا کہ میں اپنی فلم چلاؤں لیکن میں سنیما کیسے چھوڑ دیتا جب کہ ہاؤس فل جا رہے تھے۔ آٹھ ہفتے کے بعد میں نے اپنی فلم النکار سنیما سے اتار کر سپر سنیما میں لگادی۔ اس سنیما میں یہ فلم 21 ہفتے چلی۔ ایک ہٹ فلم کا ایسا معاملہ ہوتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کون سی فلم کتنے عرصے چلے گی۔ کوئی یہ بات سبودھ مکرجی کو جا کر سمجھائے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ سبودھ مکرجی کی فلم ''اپریل فول'' جب ریلیز ہوئی تو خلافِ توقع بری طرح فلاپ ہوگئی۔ فلمی دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے۔

سوال: مگر ایک ڈائریکٹر کی حیثیت سے آپ کو تو علم ہونا چاہیے۔

جواب: ڈائریکٹر کو کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ مجھے کبھی کسی اچھے ڈائریکٹر کے ساتھ کام کرنے کا موقع ہی نہیں ملا سوائے ستین بوس اور بمل رائے کے۔ میں نے دیکھا کہ ان دونوں کے علاوہ کوئی ڈائریکٹر فلم کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ انہیں تو فلم کی الف بے تک معلوم نہیں ہے۔ ایسے ڈائریکٹروں کی فلموں میں کوئی اچھا کام کیسے کرسکتا ہے۔ میرا ایس ڈی نارنگ جیسے ڈائریکٹروں سے بھی پالا پڑا جنہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ کیمرا کہاں رکھنا چاہیے۔ ان کی عادت تھی کہ سگریٹ کے لمبے لمبے کش لیتے رہتے تھے اور ''خاموش، خاموش'' کہتے رہتے تھے۔ وہ چند فرلانگ گھوم پھر کر دیکھتے تھے اور پھر بھی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا تو کیمرا مین سے کہتے تھے ''بھئی جہاں تمہارا جی چاہے کیمرا رکھ دو۔'' میرے لیے ان کی ہدایت کاری صرف اتنی تھی کہ وہ مجھ سے کہتے رہتے تھے، کچھ کرو، کچھ کر کے دکھاؤ۔''

میں پوچھتا۔ ''میں کیا کروں؟''

وہ کہتے ''ارے کچھ بھی کرو۔ کرو تو سہی۔''

یہ سن کر میں جو جی میں آتا تھا کرتا تھا۔ بتایئے بھلا۔ کیا اداکاری اس طرح ہوتی ہے؟ کیا فلم کو ڈائریکٹ کرنے کا یہ طریقہ ہے، اس کے باوجود نارنگ صاحب نے بہت سی ہٹ فلمیں بنائیں۔ اس کو آپ کیا کہیں گے؟

سوال: آپ نے کسی اچھے ڈائریکٹر کے ساتھ کام کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟

جواب: بابا میں کیا کوشش کرتا؟ میں تو بڑے ڈائریکٹروں سے ڈرتا تھا۔ ستیہ جیت رے ایک بار میرے گھر آئے۔ وہ اپنی فلم ''پارش پاتھور'' میں مجھے کاسٹ کرنا چاہتے تھے۔ یہ فلم کامیڈی تھی اور بہت کامیاب ہوئی تھی۔ لیکن میں ایسا خوف زدہ ہوا کہ بھاگ کھڑا ہوا۔ بعد میں تلسی چکرورتی نے یہ کردار کیا۔ یہ بہت زبردست کردار تھا اور میں بھاگ کھڑا ہوا۔ اب آپ کو پتا چلا کہ میں بڑے ڈائریکٹرز سے کتنا خوف کھاتا تھا۔

سوال: مگر آپ کی تو ستیہ جیت رے سے اچھی جان پہچان تھی۔

جواب: ہاں، میری جان پہچان تو تھی۔ انہوں نے مجھ سے پانچ ہزار روپے قرض بھی لیا تھا جو انہوں نے پائی پائی ادا کر دیا تھا۔ لیکن مجھے خوشی ہے کہ اس کلاسکی کے بنانے میں میرا بھی کچھ حصہ ہے۔

سوال: کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ آپ کو دولت کا لالچ ہے۔ کچھ لوگ آپ کو مسخرہ کہتے ہیں ایسا مسخرہ جو سنجیدہ بننے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کے ساتھ ہی آپ ایک اچھے کاروباری بھی ہیں؟

جواب: میں مختلف اوقات میں مختلف کردار کرتا ہوں۔ مختلف ہدایت کاروں کے ساتھ کام کرتا ہوں۔ پاگلوں کی اس دنیا میں صرف عقلمند لوگ ہی دوسروں کو پاگل نظر آتے ہیں میری طرف دیکھیے، کیا تم سمجھتے ہو کہ میں پاگل ہوں۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ مجھے کوئی بیوقوف بنا سکتا ہے۔

سوال: یہ میں کیسے جان سکتا ہوں اور اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔

جواب: میں نہیں مانتا، تم ضرور جانتے ہو۔ کسی بھی شخص کو ایک نظر دیکھ کر اس کے بارے میں اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ان فلم والوں کی طرف دیکھو۔ انہیں ایک نظر دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ بہت برے اور بدمعاش لوگ ہیں۔

جواب: ہاں، اس کا مجھے بھی یقین ہے۔

سوال: لیکن مجھے یقین نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان لوگوں پر بالکل بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔ جس دن میں بمبئی



آیا تھا اسی وقت مجھے مشکلات کا احساس ہوگیا تھا۔ میں گلوکار بننے آیا تھا مگر مجھے اداکار بنا دیا گیا۔ مجھے چاہیے تھا کہ اسی وقت......

جواب: مجھے آج تک اس بات کا افسوس ہے۔ واقعی مجھے فوراً واپس کھنڈوہ چلا جانا چاہیے تھا۔

اسی وقت ایک شخص جو شکل ہی سے یتیم نظر آتا تھا، نمودار ہوا۔ کشور کمار نے چائے کے لیے کہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ چائے لے کر آیا ہوگا لیکن اس کے ہاتھ میں پرانی سی فائلوں کا ایک بنڈل تھا۔ فائلیں کافی پرانی اور پھٹی پرانی تھیں یوں لگتا تھا جیسے چوہوں نے انہیں کتر لیا ہے، اس شخص نے فائلوں کا وہ پلندا کشور کمار کے سامنے رکھ دیا۔

میں نے کشور کمار سے پوچھا۔ ''یہ کس چیز کی فائلیں ہیں؟''

کشور کمار: یہ میرے انکم ٹیکس کی پرانی فائلیں ہیں۔

میں نے کہا'' یہ تو بہت پھٹی پرانی ہیں۔ جیسے کہ چوہوں نے انہیں کھایا ہو۔''

کشور کمار: تم نے سچ کہا، ہم انہیں چوہا مار دوائی کے طور پر ہی استعمال کرتے ہیں۔ چوہے جب انہیں کھانے کی کوشش کرتے ہیں تو مر جاتے ہیں۔

میں نے پوچھا۔ ''جب انکم ٹیکس والے آپ سے کاغذات مانگتے ہیں تو آپ کیا کرتے ہیں۔ کیا یہی چوہوں کی کھائی ہوئی فائلیں انہیں دکھاتے ہیں۔

کشور کمار: میں جان بوجھ کر انہیں ایسی جگہ رکھتا ہوں کہ چوہے انہیں کھائیں۔

سوال: تو پھر جب انکم ٹیکس والے آپ سے کاغذات مانگتے ہیں تو آپ انہیں کیا دکھاتے ہیں؟

جواب: مردہ چوہے۔

سوال: کمال ہے۔

کشور کمار: تمہیں مردہ چوہے پسند ہیں؟

سوال: ہرگز نہیں۔

کشور کمار: بہت سے لوگ تو چوہے کھاتے بھی ہیں۔

سوال: ہاں کھاتے تو ہیں۔

کشور کمار: چوہوں کا سوپ بہت مزیدار ہوتا ہے۔ بہت مہنگا بھی ہوتا ہے۔

سوال: ''واقعی؟''

کشور کمار: ''ارے، تمہیں نہیں معلوم۔ چوہوں کا کاروبار بھی بہت اچھا اور فائدہ مند ہوتا ہے۔ اگر کوئی ہوشیار بزنس مین ہو تو اس کاروبار میں بہت کما سکتا ہے۔

## ڈاکٹر راشد لطیف خاں

عالمی شہرت یافتہ پاکستانی پروفیسر اور پاکستان میں ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے خالق۔ وہ ملتان میں رائے لطیف حسن خاں کے گھر میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ مئی 1961ء میں نشتر میڈیکل کالج ملتان سے ایم بی بی ایس کیا۔ 1965ء میں رائل کالج آف گائنا کالوجی لندن سے امراضِ نسواں میں ڈپلوما لیا اور 1967ء میں لندن سے ایم آر سی او جی کا امتحان پاس کیا۔ پھر ایڈنبرا کی معروف طبی درسگاہ رائل کالج آف سرجنز سے ایف آر سی ایس کی ڈگری لی۔ 1974ء میں جون ہاپکنز میڈیکل اسکول بالٹی مور (میری لینڈ) امریکا نے انہیں اے ٹی ایم ایف کی اعزازی ڈگری دی اس طرح حکومت بھارت نے بھی سب سے بڑی طبی ڈگری بطور اعزاز پیش کی۔ علاوہ ازیں کالج آف فزیشنز اینڈ سرجنز نے بھی ان کی طبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں ایف آر سی پی کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔ وہ علامہ اقبال میڈیکل کالج لاہور میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ پاکستان میں پہلی ٹیسٹ ٹیوب بے بی پیدا کرنے والی ٹیم کے سربراہ ہیں۔ یہ بے بی 2 جولائی 1989ء میں پیدا ہوئی۔

مرسلہ: سلمیٰ ممتاز، حیات آباد

سوال: میرا خیال ہے پیسے کے معاملے میں آپ کافی جھگڑالو ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ آپ کو کسی پروڈیوسر نے آدھی رقم ادا کی تھی تو آپ اس کے سیٹ پر آدھا شیو بنا کر آدھے سر کو منڈا کر، ایک طرف کی مونچھیں کاٹ کر شوٹنگ کے لیے پہنچ گئے۔ جب پروڈیوسر نے پوچھا یہ کیا ہے تو آپ نے کہا کہ جب آپ بقیہ آدھا معاوضہ ادا کردیں گے تو میں بھی سب کچھ ٹھیک کر کے سیٹ پر آؤں گا۔

کشور کمار: پروڈیوسر بھی تو مجھے بیوقوف سمجھتے ہیں۔ بلکہ ہر ایک کو بیوقوف سمجھتے ہیں۔ یہ فلم ساز اس وقت تک معاوضہ ادا نہیں کرتے جب تک انہیں سبق نہ سکھایا جائے۔ ایک بار میں مدراس کی فلم میں کام کرنے وہاں گیا ہوا تھا۔ شاید فلم کا نام ''مس میری'' تھا۔ ان لوگوں نے پانچ دن تک مجھے ہوٹل کے کمرے میں بند رکھا اور کوئی کام نہیں کرایا۔ میں خالی بیٹھے بیٹھے تنگ آگیا، تنگ آ کر میں نے سوچا کہ مجھے کچھ

تو کرنا چاہیے۔ میں نے قینچی اٹھا کر اپنے سر کے ایک طرف کے بال کاٹنے شروع کیے۔ میں نے آئینہ دیکھا تو دوسری طرف کے بال زیادہ لمبے نظر آئے، میں نے رائٹ سائیڈ کے بال بھی قینچی سے کاٹ دیے لیکن آئینہ دیکھا تو لگا یہ دائیں جانب کے بال میں نے کچھ زیادہ ہی کاٹ دیے ہیں۔ اس لیے میں نے دوسری جانب کے بال بھی تھوڑے سے کاٹ دیے مگر بال ایک طرف کے پھر بھی بڑے نظر آئے۔ اس طرح میں دونوں طرف کے بال کاٹتا رہا یہاں تک کہ میرے سر پر برائے نام بال ہی رہ گئے۔ جب میں شوٹنگ کے لیے سیٹ پر پہنچا وہ سب کے سب تقریباً بے ہوش ہوگئے۔ ان کا خیال تھا کہ میرا دماغ چل گیا ہے۔

یہ بات بمبئی بھی پہنچ گئی کہ میں پاگل ہوگیا ہوں۔ جب میں بمبئی پہنچا اور ائیر پورٹ پر اترا تو میں نے محسوس کیا کہ کوئی میرے پاس نہیں آیا۔ سب دور دور ہی سے مجھے ویلکم کہتے رہے۔ ہر کوئی میرے نزدیک آتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ میں نے جب کسی سے بات کرنے کی کوشش کی تو وہ گھبرا کر چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ یہاں تک کہ وہ دوست جو مجھے دیکھ کر خوشی سے آکر مجھ سے لپٹ جاتے تھے اس روز مجھ سے دور دور رہنا چاہتے تھے۔ پھر کسی نے مجھ سے پوچھا۔ ''آپ کا کیا حال ہے؟''

''فائن' بہت ہی مزے میں۔'' شاید میرے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ وہ اچانک پلٹا اور بھاگ کھڑا ہوا، وہ جتنی جلد ممکن ہو مجھ سے دور جانا چاہتا تھا۔

سوال: (ہنستے ہوئے) یہ بھی عجیب لطیفہ ہے۔ لیکن ایک بات سچ سچ بتائیے۔ آپ پیسے کے معاملے میں اتنے لالچی کیوں ہیں۔ سنا ہے کہ ہر وقت پیسے بنانے کی فکر میں رہتے ہیں؛

جواب: کیوں، آخر مجھے ٹیکس بھی تو دینا پڑتا ہے۔

سوال: میں نے سنا ہے کہ آپ کی انکم ٹیکس کی پرابلمز بھی ہیں؛

جواب: انکم ٹیکس کی پرابلمز تو کبھی کو ہوتی ہیں۔ اس معاملے میں صرف میں ہی تو اکیلا نہیں ہوں۔ دراصل میرے ٹیکس اتنے زیادہ نہیں ہیں۔ ان پر سود بہت ہے کیونکہ میں وقت پر ٹیکس ادا کرنا بھول جاتا ہوں۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ کھنڈوہ جانے سے پہلے یہ تمام مسائل حل ہو جائیں۔ میں انہیں ختم کر کے ہی جاؤں گا۔

سوال: آپ نے ایک بار سنجے گاندھی کے کہنے پر گانے سے انکار کر دیا تھا جب وہ عملاً انڈیا کا حکمران تھا۔ سنا ہے کہ اسی کے بعد سے انکم ٹیکس والے آپ کے پیچھے پڑ گئے کیا یہ سچ ہے؟

جواب: میں نہیں جانتا کہ انکم ٹیکس والے میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں۔ لیکن کوئی بھی مجھے زبردستی گانے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ خواہ وہ کوئی بھی ہو۔ میں کسی کی خواہش ...... پر نہیں گاتا' نہ کسی کے حکم پر گاتا ہوں۔ ہاں میں خیراتی اور فلاحی کاموں کے لیے ضرور گاتا ہوں۔ میں چوبیس گھنٹے فلاحی کاموں کے لیے گا سکتا ہوں مگر کسی کے حکم پر نہیں۔

(نوٹ، سنجے گاندھی جن دنوں عروج پر تھے انہوں نے بمبئی میں کانگریس کے ایک جلسے میں گانے کے لیے کہا تھا، کشور کمار نے صاف انکار کر دیا۔ سنجے گاندھی نے آل انڈیا ریڈیو سے کشور کمار کے گانے نشر کرنے پر پابندی لگا دی۔ کشور کمار پھر بھی نہ جھکے۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد بہت لوگوں نے کوشش کی کہ کشور کمار سنجیو گاندھی سے معافی مانگ لیں لیکن کشور کمار نے صاف انکار کر دیا۔ آخر فلمی صنعت کے ممتاز ترین فلم سازوں اور ہدایت کاروں نے سنجیو گاندھی سے ملاقات کی اور کشور کمار کے گانوں پر سے پابندی ہٹا دی گئی)

سوال: اچھا، اب کچھ اپنی گھریلو زندگی کے بارے میں کچھ بتائیے۔ آپ کی گھریلو زندگی اتنی گڑبڑ کیوں رہی ہے؟

جواب: اس لیے کہ میں ہمیشہ تنہا رہا ہوں۔ میں نے کبھی کسی کو اپنا ہمدرد اور غم گسار نہیں پایا۔

سوال: آپ کی پہلی بیوی روما دیوی آپ سے علیحدہ کیوں ہوئی تھیں؟

جواب: وہ بہت باصلاحیت خاتون تھیں لیکن ہمارا گزارہ نہ ہو سکا کیونکہ ہمارے نقطہ نظر میں بہت فرق تھا۔ وہ ایک میوزک گروپ بنانا چاہتی تھیں اور ایک کیریئر وومن بننے کی خواہش مند تھیں۔ لیکن میں ایسی بیوی چاہتا تھا جو کیریئر نہیں گھر بنائے۔ وہ میرے گھر کی رونق بنے۔ دیکھیے، میں ایک سیدھا سادا دیہاتی قسم کا آدمی ہوں۔ چاہتا ہوں کہ بیوی کا پہلا کام گھر بنانا ہے۔ اس لیے میں نہیں سمجھ سکا کہ عورتیں کیریئر کیوں بنانا چاہتی ہیں۔ ان دونوں چیزوں کو اکٹھا کیسے کیا جا سکتا ہے۔ کیریئر اور گھریلو پن دونوں الگ چیزیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے راستے الگ ہوگئے۔



سوال: اور آپ کی دوسری بیوی مدھو بالا کے بارے میں کیا خیال ہے؟

جواب: مدھو بالا کا معاملہ الگ تھا۔ ان سے شادی کرنے سے پہلے ہی میں جانتا تھا کہ وہ بہت بیمار ہیں۔ مگر میں نے ان سے شادی کا وعدہ کیا تھا۔ میں نے اپنا وعدہ لفظ بہ لفظ پورا کیا۔ میں نے انہیں بیوی بنا کر رکھا۔ مجھے معلوم تھا کہ شدید بیمار ہیں اور زندہ نہیں رہیں گی کیونکہ وہ دل کے مرض میں مبتلا تھیں۔ نو سال تک میں نے ان کی تیمارداری کی۔ میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے انہیں مرتے ہوئے دیکھا۔ آپ ان کی تکلیف کا اندازہ نہیں لگا سکتے جب تک کہ بہ ذات خود ایسی تکلیف سے نہ گزریں۔ وہ اتنی خوبصورت خاتون تھیں لیکن انہوں نے مرنے سے پہلے بہت تکلیف برداشت کی۔ انہیں جب مایوسی اور ڈپریشن کا دورہ پڑتا تھا تو وہ چیختی چلاتی اور روتی تھیں۔ اگر کوئی ہر وقت مصروف رہنے والا شخص نو سال تک بستر پر تکلیف سے بے حال پڑا رہے' شدید تکلیف میں بھی مبتلا ہو' تنہا بھی ہو۔ کوئی اس کا حال کبھی نہ پوچھے تو ذرا سوچیے کہ اس کے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ میں انہیں منانے اور خوش رکھنے کی پوری کوشش کرتا رہتا تھا۔ ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ انہیں ہمیشہ خوش و خرم رکھو۔ میں نے ہر طرح کوشش کی جو بھی میرے بس میں تھا ان کے لیے کیا۔ ان کے آخری سانس تک میں انہیں خوش رکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ میں ان کے ساتھ ہنستا تھا، ان کے ساتھ روتا تھا۔

سوال: اور آپ کی تیسری شادی؟ یوگیتا بالی سے بھی تو آپ نے شادی کی تھی۔

جواب: وہ تو ایک مذاق تھا۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ شادی کے معاملے میں سنجیدہ تھی۔ دراصل اس کے دل و دماغ پر اس کی ماں سوار تھی۔ وہ ماں کے بغیر میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تھی۔

سوال: اس کی وجہ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ آپ ساری رات جاگتے اور نوٹ گنتے رہتے تھے۔

جواب: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں اتنا احمق اور لالچی ہوں، کیا میں پاگل ہوں؟ مجھے آپ پاگل سمجھتے ہیں؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ اچھا ہی ہوا ہماری جلدی علیحدگی ہوگئی۔

سوال: اچھا، اب اپنی موجودہ شادی کے بارے میں کچھ بتائیں؟

جواب: لینا مختلف قسم کی عورت ہے، وہ بھی ایک ایکٹریس ہے مگر دوسری ایکٹریسوں سے بالکل مختلف۔ اس نے المناک دن دیکھے ہیں۔ غم اٹھائے ہیں۔ دکھ سہے ہیں۔ جس عورت کی آنکھوں کے سامنے اس کے شوہر کو گولی مار کر ہلاک کر دیا جائے اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ایسے واقعات انسان کو بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ وہ مجھے سمجھتی ہے۔ میرا خیال رکھتی ہے۔ میں اب اکیلا پن محسوس نہیں کرتا۔ اب میں خوش ہوں۔

سوال: آپ کی نئی فلم کے بارے میں بتائیے۔ کیا آپ خود اس میں ہیرو ہوں گے؟

جواب: نہیں، بالکل نہیں۔ میں صرف پروڈیوسر اور ڈائریکٹر ہوں، آپ کو میں نے بتایا تو ہے کہ اداکاری سے مجھے نفرت ہے۔ البتہ میں فلم میں چند لمحوں کے لیے کسی بوڑھے کا کردار کرنا چاہتا ہوں۔

سوال: جس طرح الفریڈ ہچکاک کرتا ہے۔

جواب: بالکل اسی طرح، وہ میرا پسندیدہ ہدایت کار ہے اور رہے گا۔ اس نے بے مثال ڈراؤنی فلمیں بنائیں ہیں۔ اس کے سسپنس میں مجھی ڈر تھا۔ دیکھنے والے سہمے رہتے تھے مگر لطف اندوز ہوتے تھے۔ میں مردہ انسانوں کے ڈھانچوں سے پیار کرتا ہوں وہ میرے دوست ہیں۔ مخلص اور بے لوث۔ ڈھانچے بہت اچھے لوگ ہوتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر آپ انہیں سمجھنے لگیں تو ان کے بارے میں بہت کچھ جان سکتے ہیں۔ وہ فلم والوں کی طرح نہیں ہوتے۔ وہ بہت اچھے ہوتے ہیں۔ (پھر اچانک) کیا آپ کسی ڈھانچے کو جانتے ہیں۔

جواب: میں ان سے دوستی نہیں کرتا۔ نہ ان سے دوستی کر سکتا ہوں۔

کشور کمار: کبھی ان سے دوستی کر کے دیکھو، وہ بہت نفیس لوگ ہوتے ہیں۔ ہاں کچھ لوگ ان سے ڈرے رہتے ہیں۔

پرتش نانڈی (صحافی) خیر، میں ان سے ڈرتا بھی نہیں ہوں۔

کشور کمار: دیکھو، ذرا دیکھو ایک دن ہمارا کیا حشر ہوگا۔ یہ سامنے میز پر رکھی ہوئی چیز کو دیکھو۔

کشور کمار نے میز پر انسانی سر کا ڈھانچا رکھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں کے پیچھے سے سرخ روشنی نکل رہی تھی۔

کشور کمار: ذرا سوچو، جب یہ زندہ تھا تو عورت تھا یا مرد؟ یہ سر کا ڈھانچا کتنا اچھا ہے اور میں نے اپنی عینک اس

کی ناک پر لگادی ہے حالانکہ اس کی تو ناک نہیں ہے۔

پرتش ناندی: واقعی، یہ بہت اچھا نظر آرہا ہے۔

کشور کمار: تم بہت اچھے انسان ہو، تم زندگی کی حقیقت کو سمجھتے ہو۔ ایک دن تم بھی ویسے ہی ڈھانچے بن جاؤ گے۔

(اور اس کے ساتھ ہی انٹرویو ختم ہوگیا) کشور کمار کا یہ انٹرویو لکھا ہے جس میں کشور کمار کی اصلی شکل نظر آتی ہے۔ کشور کمار کے بارے میں بالی وڈ میں اور پاکستان میں مختلف کہانیاں مشہور ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ کشور کمار نے مدھو بالا کی دولت اور شہرت کی وجہ سے اس سے شادی کی تھی۔ لیکن دراصل کشور کمار کے انٹرویو سے معلوم ہوا کہ وہ صحیح معنوں میں مدھو بالا سے محبت کرتا تھا۔ جہاں تک دولت کا تعلق ہے مدھو بالا کے پاس تو ایک پیسا تک نہ تھا۔ سب کچھ اس کے والد عطا اللہ خان نے اپنے قبضے میں کر رکھا تھا۔ وہ شدید بیماری کے باوجود مدھو بالا سے فلموں میں کام کرا کے دولت سمیٹنا چاہتا تھا۔

حیرت ہوتی ہے کہ وہ کس قسم کا باپ تھا؟ خود غرض، لالچی اور مطلب پرست، سونے کی چڑیا کو اپنے قابو میں رکھنے کے لیے وہ دلیپ کمار اور مدھو بالا کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گیا تھا۔ اس نے مدھو بالا سے اس کی پہلی اور آخری محبت کو زبردستی چھین لیا تھا جس کے بعد مدھو بالا ایک زندہ لاش بن کر رہ گئی تھی۔ جب اس کی بیماری نے زور پکڑا اور ڈاکٹروں نے اس کو فلموں میں کام کرنے سے منع کر کے آرام کرنے کا مشورہ دیا تو عطا اللہ خان کی کماؤ بیٹی سے محبت ختم ہوگئی۔ پھر وہ اس کو بوجھ اور مصیبت سمجھنے لگا۔ مدھو بالا نے اپنے باپ کی بدلی ہوئی نظریں بھانپ لی تھیں۔ اس وقت اس کا کوئی اور سہارا نہ تھا۔ کشور کمار کے اظہارِ محبت پر اس نے باپ کی مرضی کے خلاف اس سے شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا اور جب گھر سے رخصت ہوئی تو پہنے ہوئے جوڑے کے سوا اس کے پاس کچھ نہ تھا۔

کشور کمار نے اس کی خدمت کی۔ اس کا علاج معالجہ کرایا۔ وہ تو اس کو علاج کے لیے لندن بھی لے جانا چاہتا تھا مگر ڈاکٹروں نے اتنے طویل فضائی سفر سے روک دیا۔ جیسا کہ انٹرویو میں کشور کمار نے کہا اس نے آخر دم تک مدھو بالا کو خوش رکھنے کی کوشش کی۔ وہ اس کے ساتھ ہنستا اور اس کے ساتھ روتا۔ مدھو بالا کی آخری سانس تک وہ اس کا پرستار اور شوہر رہا۔

قدرت نے اس حسن کی دیوی کی قسمت میں جو لکھ دیا تھا بالآخر ہونا تو وہی تھا۔ وہ ایک ایسی خوبصورت اور معصوم گڑیا تھی جسے بچپن میں جو بھی دیکھتا بے اختیار پیار کرنے پر مجبور ہوجاتا مگر نکٹھو اور لالچی باپ نے اس کی معصومیت سے بھی فائدہ اٹھایا اور اس کو چائلڈ اسٹار بنا کر اس کی کمائی کھاتا رہا۔

مدھو بالا کو اللہ تعالیٰ نے بے تحاشا حسن کی دولت سے نوازا تھا۔ شہرت اور مقبولیت نوکروں کی طرح اس کے آگے ہاتھ باندھے کھڑی رہتی تھیں مگر اس بدنصیب کو سکھ، آرام اور خوشی کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ زندگی بھر وہ ان سے محروم رہی، جب باپ کے قید خانے سے نجات ملی تو وہ سخت بیمار تھی۔ زندگی کے آخری نو سال اس نے روتے، بلکتے اور تکلیف سے چلّاتے گزارے، فلم والے اس کو بھول چکے تھے۔ کوئی اس سے ملنے کے لیے نہ آتا تھا۔ وہ ہر گھڑی کسی ملاقاتی کی منتظر رہتی تھی مگر کوئی نہ آیا۔ اگر آئی تو صرف موت۔ جو لوگ مدھو بالا کی زندگی پر رشک کرتے تھے وہ حقیقت سے لاعلم تھے۔ شاعر نے سچ کہا ہے۔

...... ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ

☆☆☆

آئیے کچھ پرانے لوگوں کو یاد کرتے ہیں اور ان کے حوالے سے آج کے اداکاروں کا بھی تذکرہ کرتے ہیں۔

شوکت ہاشمی کے بارے میں مختصراً پہلے بھی بتایا جاچکا ہے۔ شوکت ہاشمی نے بمبئی اور پھر پاکستان میں فلمی صنعت میں کام کیا اور قابلِ ذکر حیثیت حاصل کی۔ شوکت ہاشمی نے 1921ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔ وہ محلہ نبی شیر خان میں پیدا ہوئے تھے۔ شوکت ہاشمی کو فلمی صنعت سے لڑکپن ہی سے دلچسپی تھی۔ انہوں نے لاہور میں ایک سنیما گھر میں کلرک کی حیثیت سے کام کیا لیکن اس کام میں ان کا دل نہ لگا۔ انہیں تعلیم حاصل کرنے کا شوق تھا۔ تنگدستی اور نامساعد حالات کے باوجود انہوں نے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ لاہور کے باوقار تعلیمی ادارے گورنمنٹ کالج سے بی اے کی ڈگری حاصل کی اور پھر علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ تعلیم حاصل کرنے کے دوران میں بھی فلموں سے وابستگی برقرار رہی، وہ فلمی جرائد اور اخبارات میں مضمون لکھتے رہتے تھے۔ فلم کا شوق انہیں بالآخر بمبئی لے گیا جو کہ اس زمانے میں (بلکہ آج بھی) فلم میں قسمت آزمائی کرنے والوں کی آخری منزل سمجھا جاتا تھا۔ ہر روز سیکڑوں



نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اداکار بننے کے شوق میں بمبئی جا کر فلم اسٹوڈیوز کے چکر لگاتے رہتے تھے اور آج بھی یہی حال ہے۔

شوکت ہاشمی کو اداکاری کا نہیں ہدایت کاری اور مصنف بننے کا جنون تھا۔ یہی وجہ ہے کہ فلمی نگارخانوں کے پھیرے لگانے کی بجائے انہوں نے دانشوروں، ہدایت کاروں اور معروف لکھنے والوں کو اپنا ہدف بنایا اور ان سے ملنے کی کوشش کی، خواجہ احمد عباس ایک معروف اور ممتاز مصنف، فلم ساز اور ہدایت کار تھے۔ وہ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ وہ بمبئی کے مشہور اخبار ''بمبئی کرانیکل'' کے ایڈیٹر بھی تھے۔ انہوں نے کچھ عرصے بابوراؤ پٹیل کے میگزین ''فلم انڈیا'' کی ادارت بھی کی تھی۔ فلم انڈیا انگریزی کا جریدہ تھا۔ اس کی اشاعت تو بہت زیادہ نہیں تھی لیکن فلمی حلقوں میں اس کا اثر و رسوخ بہت زیادہ تھا۔ ایک زمانے میں اس کو بمبئی کی فلمی صنعت کا بے تاج بادشاہ کہا جاتا تھا۔ فلم انڈیا کے فلمی تبصروں کو بہت اہمیت حاصل تھی، ان کے تبصرے پڑھ کر بہت سے لوگ فلم دیکھنے یا نہ دیکھنے کا فیصلہ کرتے تھے۔ بابوراؤ پٹیل کے قلم میں ایسی بات تھی کہ جس کے بارے میں لکھتے تھے وہ چین سے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔

بابوراؤ پٹیل ایک مراٹھیہ تھے۔ مراٹھیوں اور مسلمانوں کی کشمکش پرانی ہے۔ یہ دونوں اقوام کبھی ایک دوسرے کی دوست نہیں بنیں۔ سعادت حسن منٹو نے بابو راؤ پٹیل کا بہت اچھا خاکہ لکھا ہے۔ انہوں نے لکھا کہ عام میل جول میں بابوراؤ پٹیل نے کبھی تعصب کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اس نے اپنی کار کا ڈرائیور بھی ایک مسلمان کو رکھا تھا۔ لیکن یہ صاحب بابوراؤ پٹیل کی بیٹی کی محبت میں گرفتار ہوگئے۔ اس نے بھی محبت کا جواب محبت سے دیا کیونکہ بمبئی میں پنجاب، سرحد اور دوسرے علاقوں کے جانے والے نوجوان خوش شکل اور صحت مند ہوتے تھے۔ یہ محبت رنگ لائی اور ایک دن بابوراؤ پٹیل کی بیٹی چپکے سے ڈرائیور کے ساتھ بھاگ گئی۔ بابوراؤ کے لیے یہ صدمہ بہت گہرا تھا۔ اس نے منٹو صاحب سے کہا۔ ''منٹو، میں ان مسلوں پر کیسے بھروسا کروں؟ ایک پر بھروسا کر کے ڈرائیور رکھا تو وہ میری بیٹی ہی کو بھگا کر لے گیا۔''

خیر، یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ ذکر یہ تھا کہ نوجوان شوکت ہاشمی نے خواجہ احمد عباس کی شاگردی اختیار کرلی۔ خواجہ احمد عباس نہ صرف بہت قابل تھے بلکہ الطاف حسین حالی کے (اگر حافظہ غلطی نہیں کررہا ہے تو) پوتے بھی تھے، شوکت ہاشمی جیسے نوآموز نوجوان کے لیے خواجہ احمد عباس جیسے شخص کے ساتھ کام کرنا کسی اعزاز سے کم نہ تھا۔

قسمت جب مہربان ہوتی ہے تو نئے نئے بہانے ڈھونڈ لیتی ہے۔ خواجہ احمد عباس کے پرچے میں کام کرنے کے علاوہ شوکت ہاشمی فلم کے سیٹ پر بھی ان کو اسسٹ کرتے تھے۔ ایک روز خواجہ صاحب ... اداکارہ نرگس کی ادب نواز والدہ جدن بائی سے ملاقات کے لیے گئے تھے۔ جدن بائی بمبئی سے ایک ماہنامہ ''نرگس'' کے نام سے نکالنے کا منصوبہ بنا رہی تھیں۔ انہوں نے سنگیت فلم کمپنی کے نام سے فلم ساز ادارہ بنایا تھا اور فلم سازی کا ایک طویل منصوبہ بنایا تھا۔ جدن بائی کی خواہش تھی کہ خواجہ صاحب ''نرگس'' کی ادارت کریں۔ خواجہ صاحب نے اپنی مصروفیات کا عذر کر کے اس کام کے لیے شوکت ہاشمی کی سفارش کی۔ اس طرح شوکت ہاشمی جدن بائی کے فلمی ماہنامہ ''نرگس'' کے مدیر ہوگئے۔ جدن بائی نے اپنے فلم ساز ادارے کا نام تبدیل کر کے ''نرگس آرٹ کنسرن'' رکھ دیا۔ اس طرح شوکت ہاشمی کو اس ادارے میں کہانی نویس اور اسکرپٹ لکھنے کا موقع بھی مل گیا۔

شوکت ہاشمی فلمی حلقوں میں معروف ہوگئے تھے۔ وہاں ایک معاون اداکارہ پورنیما کے ساتھ ان کا رومان شروع ہوگیا اور دونوں نے شادی کرلی۔ یہ شادی زیادہ عرصہ نہ چل سکی اور پورنیما نے ایک بیٹے کو جنم دینے کے بعد شوکت ہاشمی سے علیحدگی (طلاق) حاصل کرلی۔

شوکت ہاشمی نے پاکستان واپسی کا ارادہ کیا۔ ان کے بیٹے کا نام انور ہاشمی تھا جو بمبئی ہی میں رہ گئے تھے۔ آج کے بالی وڈ کے معروف اور کسی حد تک بدنام اداکار عمران ہاشمی انور ہاشمی کے بیٹے اور شوکت ہاشمی کے پوتے ہیں۔ عمران ہاشمی ایک اچھے اداکار ہیں لیکن ان کی فلموں کو بے باک فلمی مناظر کی وجہ سے بہت شہرت حاصل ہوئی۔ گزشتہ مہینوں میں ان کی دو تین فلمیں یکے بعد دیگر سپرہٹ ہوئیں تو اب وہ بھی بالی وڈ کے مقبول اور زیادہ معاوضہ لینے والے اداکاروں کی فہرست میں شامل ہوچکے ہیں۔ اس طرح انہیں بھی پاکستانی فن کاروں کی نسل سے وابستہ کیا جاسکتا ہے۔

شوکت ہاشمی کے علاوہ نصرت ہاشمی نے بھی بہت شہرت حاصل کی وہ بہت اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ دنیاوی علوم

کے علاوہ مذہبی اور دینی علوم میں بھی وہ دسترس رکھتے تھے۔ وہ سرائیکی زبان کے مصنف تھے۔ انہیں شاعری اور ادب سے بھی دلچسپی تھی۔ ان کے دو بیٹے بشارت ہاشمی اور وجاہت ہاشمی بھی پاکستان ہی میں مقیم ہیں۔

شوکت ہاشمی نے پاکستان آکر نئے سرے سے جدوجہد شروع کی۔ اس سلسلے میں ان کا ایک لطیفہ بھی مشہور ہوا تھا۔ جب وہ پاکستان آئے تو اس زمانے میں انڈیا میں ایکشن اداکار جان کاوس بہت مشہور تھے۔ ان کی صورت شکل میں شوکت ہاشمی کی شباہت تھی۔ وہ بمبئی سے لاہور پہنچے تو لوگوں نے ریلوے اسٹیشن پر انہیں جان کاوس سمجھ کر نعرے لگائے اور بہت خاطر مدارات کی۔ کسی نے پوچھا کہ فلموں میں تو آپ بہت قوی ہیکل اور طاقتور نظر آتے ہیں مگر دیکھنے میں ایسے نہیں ہیں۔

شوکت ہاشمی نے کہا۔ ”تمہیں معلوم نہیں ہے۔ کیمرا ٹرک Camera Trik کے ذریعے کمزور کو طاقتور بنا کر دکھایا جاسکتا ہے۔“

پاکستان میں شوکت ہاشمی نے چند فلموں کے اسکرپٹ لکھے اور ایک فلم ”ہم سفر“ بھی بنائی۔ اس کی موسیقی بہت مقبول ہوئی تھی۔ مصلح الدین اس کے موسیقار تھے۔ پاکستان میں ”ہم سفر“ کے علاوہ .... ”ڈاکٹر“ اور ”درندہ“ بھی بنائیں مگر انہیں وہ کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ 1970ء میں انہوں نے کراچی کے فلم ساز عبدالقدیر خان کے لیے فلم ”جلے نہ کیوں پروانہ“ بنائی تھی جس کے مصنف بھی وہ خود ہی تھے لیکن اس فلم کو بھی زیادہ کامیابی نہ مل سکی۔ ان کی بطور ہدایت کار آخری فلم ”بندھن“ تھی۔ وہ فلموں کے اسکرپٹ لکھتے رہے اور روزناموں سے بھی وابستہ رہے۔ آخری عمر میں ان کی صحت خراب رہنے لگی تھی۔ ایک حادثے میں ان کی کولہے کی ہڈی بھی ٹوٹ گئی تھی۔ 1995ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔ وہ اقبال ٹاؤن کے قبرستان میں مدفون ہیں۔

شوکت ہاشمی تو دنیا سے رخصت ہوگئے مگر عمران ہاشمی وغیرہ کی صورت میں اپنی یادگاریں چھوڑ گئے۔ ان کی بہن بیگم پروین نے بھی چند فلموں میں کام کیا تھا۔ وہ بے حد خوبصورت خاتون تھیں مگر اداکارانہ صلاحیتوں سے مالا مال نہ تھیں، وہ شوکت ہاشمی کی حقیقی بہن تھیں مگر دیکھنے میں دونوں میں کوئی مشابہت نہ تھی۔ شوکت ہاشمی گندمی رنگ کے قد آور اور متناسب قدوقامت کے مالک تھے۔ چیچک کے نشانوں نے ان کے چہرے پر گہرے نقوش چھوڑے تھے۔ اس کے برعکس بیگم پروین درمیانہ قد تھیں لیکن سرخ وسفید رنگ، متناسب نقوش اور بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کی وجہ سے انہیں ایک دلکش حیثیت حاصل تھی۔

شوکت ہاشمی اور پروین کا تعلق سرائیکی علاقے سے تھا۔ شوکت ہاشمی کے والد نواز ہاشمی سے ان کی بیگم کی علیحدگی ہوچکی تھی۔ ان کا تعلق بلوچ قبیلے سے تھا۔ طلاق حاصل کرنے کے بعد بیگم پروین اپنی والدہ کے ساتھ بمبئی چلی گئی تھیں۔ بمبئی میں بیگم پروین نے چند فلموں میں کام کیا تھا۔ بیگم پروین نے فلم ”تیری یاد“ میں بھی کام کیا تھا جسے پاکستان کی پہلی فلم کہا جاتا ہے مگر یہ متنازعہ معاملہ ہے کیونکہ ”تیری یاد“ کی فلم بندی قیام پاکستان سے پہلے شروع ہوچکی تھی البتہ پاکستان کے قیام کے بعد ریلیز ہونے والی یہ پہلی فلم تھی۔ ہدایت کار لقمان کا دعویٰ تھا کہ قیام پاکستان کے بعد سب سے پہلی فلم ”شاہدہ“ تھی جس کے ہدایت کار لقمان تھے۔ بہرحال یہ ایک علیحدہ معاملہ ہے۔

پاکستان آنے کے بعد بیگم پروین نے ”برسن، نیک دل، اور غلط فہمی، میں کام کیا تھا۔ انہوں نے ”دیار حبیب“ اور ”سیلاب“ میں بھی کام کیا تھا۔ یہ فلمیں غالباً 1953ء میں ریلیز ہوئی تھیں۔ بیگم پروین نے ہدایت کار این ای اختر سے شادی کرنے کے بعد اداکاری ترک کردی تھی۔ اس شادی سے ان کی اولاد میں دو بیٹیاں پیدا ہوئی تھیں۔ ایک نجمہ خانم اور دوسری ناہید خانم، ناہید خانم نے تھیٹر کی طرف توجہ دی اور آج کل لاہور میں تھیٹر کی ممتاز شخصیت ہیں وہ اپنے ڈراموں کی ہدایت کاری بھی خود ہی کرتی ہیں۔ اس طرح پاکستان میں ناہید خانم اور بھارت میں عمران ہاشمی اس خاندان کا نام روشن کیے ہوئے ہیں۔

عمران ہاشمی نے پہلی بار مہیش بھٹ کی فلم میں کام کیا تھا۔ وہ آج بھی پاکستان اور ملتان کو یاد کرتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ موقع ملنے پر اپنے آبائی وطن ضرور آئیں گے۔

دیکھیے، ایک ہی خاندان کی یہ کہانی کتنے افراد اور فن کاروں پر مشتمل ہے۔ پاکستانی علاقوں سے دلیپ کمار، پرتھوی راج، راج کپور، شاہ رخ خان جیسے مایہ ناز فن کار انڈیا کی فلمی صنعت میں اپنے فن کا لوہا منوا چکے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ناہید خانم اور عمران ہاشمی کے بعد اس گھرانے سے کون سا فن کار آسمان فلم پر جگمگائے گا؟

جاری ہے



# زورآور

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

سندھ کے اس نامور ملاکھڑا پہلوان نے محبت کی مگر یہ محبت حادثاتی تھی۔ کسی نے دشمنی نبھانے کی خاطر محبت نامہ اس کے دشمن کے گھر پھینکا جو محبت کی بنیاد بنا۔ دشمن کی بیٹی سے عشق سندھ کے معاشرے میں ایک نہایت خطرناک بات تھی مگر وہ تو خطروں سے کھیلنا ہی زندگی سمجھتا تھا۔ تبھی تو اس بے مثال کہانی نے جنم لیا۔

**سندھ کے ایک نامور پہلوان کے حالاتِ زیست کا دوسرا و آخری حصہ**

ماسٹر پیرل کو رات کے اندھیرے میں مخبری کے الزام میں قتل کردیا گیا۔ اس وقت خیر بخش اور دھنی بخش بہت چھوٹے تھے یتیم بیٹوں کو ماں نے محنت مزدوری کرکے پالا۔ بچے بڑے ہوئے تو رب ڈنو کی دوستی میں اس کے باپ روشو پہلوان کے اکھاڑے میں جاکر ملاکھڑا سیکھنے لگے۔ روشو پہلوان نے اندازہ لگایا کہ یہ دونوں بھائی اس فن میں بہت آگے جائیں گے۔ وہ اپنے بیٹے کو آگے بڑھانے کی خاطر دونوں بھائیوں سے نفرت کرنے لگا مگر وہ دونوں اپنی کوششوں سے آگے بڑھتے رہے۔ انہوں نے مقابلے بھی جیتنا شروع کردیے۔ روشو پہلوان نے انہیں الجھانے کی ایک خطرناک کوشش کی۔ ماسٹر پیرل کے قتل میں جن لوگوں کا نام آرہا تھا ان میں سے ایک کی بیٹی کو اس کے بیٹے نے محبت نامہ لکھا جو روشو پہلوان کے ہاتھ لگ گیا۔ اس محبت نامے پر مرسلہ کا نام کاٹ کر اس نے خیر بخش کا نام لکھا اور لڑکی کے پاس بھیج دیا۔

**اب آگے پڑھیے**

اس کی اس چال کا گھناؤنا مقصد یہی تھا کہ زمیندار اللہ ورایو کی بیٹی ماروی کو جب یہ رقعہ ملے گا تو...... وہ یقیناً برافروختہ ہوجائے گی۔ کوئی بعید نہیں کہ یہ رقعہ زمیندار اللہ ورایو یا گھر کے کسی اور فرد کے ہاتھ بھی لگ جائے۔ یہ خاندان چونکہ پہلے ہی دونوں بھائیوں پر ادھار کھائے بیٹھا تھا، یہ حرکت یقیناً جلتی پر تیل کا کام کرڈالتی۔

سازش مضبوط اور جامع تھی بلکہ بنی بنائی تھی۔ چنانچہ روشو پہلوان نے رقعہ میں نام کی تبدیلی کے بعد ویسے ہی ماچس کی ڈبیا میں لپیٹ کر رکھ دیا۔

روشو پہلوان کو شاید اس خدشے کا احتمال کم ہی تھا کہ اس کا بیٹا رب ڈنو دوبارہ اس رقعے کو کھول کر دیکھے گا کیونکہ رقعے کی ماچس کی ڈبیا میں ''پیکنگ'' کی مضبوطی سے یہی اندازہ ہوتا تھا۔ ماچس کے اندر پتھر کے ایک چھوٹے سے ''ڈلے'' کی موجودی بھی یہ ظاہر کرتی کہ ماچس کو وزن دار کرکے ہدف کی جانب بہ آسانی اچھالا جاسکے۔

وہ دن گزرا اور روشو دھڑکتے دل کے ساتھ، امڈ نے والی متوقع قیامت کا بے چینی سے منتظر رہا مگر کچھ نہ ہوا۔ دوسرا دن گزرا تب بھی کوئی ہنگامہ نہ ہوا۔ حتیٰ کہ تیسرا دن بھی ہوگیا تو وہ بالکل ہی مایوس ہوگیا کہ اس کی یہ سازش ناکام گئی...... یا تو اس کے بیٹے رب ڈنو نے کسی وجہ کے باعث وہ رقعہ دوبارہ کھول کر دیکھا ہوگا اور اپنے نام کی بجائے خیر بخش کا نام دیکھ کر اس نے اپنے نام کا دوسرا محبت نامہ تیار کرلیا ہوگا یا پھر رب ڈنو نے ویسے ہی محبت نامہ ہدف تک پہنچانے کی ہمت نہ کی ہو اور ''مرسل'' کیے بغیر پھاڑ ڈالا ہو۔

بہر طور...... ادھر یہ دونوں بھائی اپنے دیدہ و نادیدہ دشمنوں کی سازشوں سے بے خبر اپنی ہی دُھن میں مست اَلست تھے۔

وہ خیر پور پہنچے اور اس کے بعد وہاں سے یہ تینوں ملھ پہلوان (بہ شمول کادو پہلوان) سائیں محبوب شاہ کے ساتھ اس کی گاڑی میں کشمور کے لیے روانہ ہوگئے۔

☆☆☆

کشمور، سندھ کے بڑے دنگلوں میں سے ایک تھا۔ اس روز یہاں کا یہ عظیم الشان ملھ دنگل، نامی گرامی ملاکھڑا پہلوانوں کا بڑا سنسنی خیز مقابلہ تھا۔

سچل ایوارڈ اور لطیف ایوارڈ ملھ جیتنے والوں کو دیے جاتے تھے۔ اس بڑے دنگل میں خیر پور اور کشمور سمیت کندھ کوٹ، دادو اور لاڑکانہ کے نامی گرامی ملاکھڑا پہلوانوں نے شرکت کرنا تھی۔ اس میں کچھ منجے ہوئے پرانے زور آور اور کندھار (بڑے) پہلوان بھی تھے تو کچھ نئے اور ابھرتے ہوئے بھی۔

خیر بخش اور دھنی بخش اور کادو پہلوانوں کا شمار نئے اور ابھرتے ہوئے پہلوانوں میں کیا جاسکتا تھا۔

اس بڑے دنگل میں سات علاقائی اور تین صوبائی شہرت کے حامل ملاکھڑا پہلوان شریک ہونا تھے جبکہ نئے اور ابھرتے ہوئے پہلوانوں کی تعداد گیارہ تھی مگر اکھاڑے میں ان سب کا مقابلہ ہونا تھا۔

علاقائی اور صوبائی شہرت کے حامل ملاکھڑا پہلوان نئے اور ابھرتے ہوئے ملھ پہلوانوں کو ''چارہ'' اور نمبر کمانے کا ایک آسان اور سہل ذریعہ سمجھا کرتے۔ اصل ملھ مقابلہ تو ان کا آپس میں ہوتا تھا۔

عموماً علاقائی یا صوبائی شہرت یافتہ ملھ پہلوان ہی سچل یا لطیف ایوارڈ حاصل کرتے تھے۔ بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ کوئی نو آموز پہلوان یہ ایوارڈ جیتا کرتا تھا اور وہ بھی ان بڑے نامی گرامی جغادری پہلوانوں سے نبرد آزما ہوکے فتح مند ہوتا۔

ان دونوں بھائیوں خیر بخش اور دھنی بخش کی بھی یہی خواہش تھی کہ وہ اپنے جیسے نو آموز پہلوانوں کو پچھاڑنے کے بعد ان میں سے کسی جغادری پہلوان کو بھی شکست دے کر لطیف ایوارڈ حاصل کرلیں۔ مگر یہ بات صرف سوچنے کی حد تک ٹھیک تھی، عملی طور پر اس مظاہرے میں کامیاب ہونا آسان بات نہ تھی۔ کیونکہ ایک نو آموز پہلوان کا کسی بڑے نامی گرامی پہلوان کے مقابلے میں نامزد ہونا ہی بہت بڑی بات تصور کی جاتی تھی اور اس پر طرہ یہ کہ وہ جیت بھی نو آموز پہلوان کی ہوتی تو اس کی شہرت یکدم چار دانگ صوبے میں پھیل جاتی۔

یہ بات منجے ہوئے پہلوانوں کے لیے زندگی اور موت کا معاملہ ہوتی۔ اس لیے کچھ جذباتی قسم کے پہلوان کسی نو آموز سے شکست کھانے کے بعد ہمیشہ کے لیے اکھاڑا چھوڑ دیا کرتے تھے یا ملھ پہلوانی سے ہی کنارہ کش ہوجاتے تھے۔

جیتے ہوئے نو آموز پہلوان کو بھی اس مقابلے میں کوئی نہ کوئی خطاب ضرور دیا جاتا تھا اور وہ ہی خطاب اس کے نام کا لاحقہ بن کے ساری عمر اس کے ساتھ نتھی رہتا تھا کیونکہ یہی خطاب تاعمر اس کی وجۂ شہرت کی علامت بنا رہتا تھا۔



بہر طور کشمور کی حدود اور چوراہوں پر عظیم الشان ملاکھڑا دنگل کے بینر اور پوسٹرز جھولتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ حتیٰ کہ شائقین ملاکھڑا نے تو جگہ جگہ دیواروں پر معروف ملاکھڑا پہلوانوں کے تنگ دھڑنگ خاکے بھی بنا رکھے تھے۔

دونوں بھائیوں کو کشمور میں ایک خاص گہما گہمی کی فضا نظر آرہی تھی۔ ایک جوش اور ولولے کی کیفیت دکھائی دے رہی تھی۔

پہلوانوں کی رہائش کا بھی بندوبست کیا گیا تھا اور ایک کھلے میدان میں تنبو لگائے گئے تھے۔ ایک کھاد بنانے والی کمپنی جو اس ملھ مقابلے کو فنانس کررہی تھی، یہ سارا بندوبست اس نے کیا تھا۔

یہ ملھ مقابلہ دیکھنے کے لیے دور و نزدیک شہروں سے ہی نہیں، بلکہ اندرون دیہاتوں اور گوٹھوں سے بھی شائقین جوق در جوق یہاں پہنچ رہے تھے۔ ان دنوں یہاں اقامتی ہوٹلوں میں مسافروں اور اوطاقوں میں دوست احباب کی آمد کچھ زیادہ دیکھنے میں آتی تھی۔

روشو پہلوان اور اس کا بیٹا رب ڈنو بھی یہ ملھ مقابلہ دیکھنے آپہنچے تھے اور اپنے ایک عزیز رشتے دار کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔

اگلے دن میدان میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ علاقائی اور صوبائی طرز کے ملاکھڑا نامی گرامی پہلوان عین مقابلے والے دن پہنچے تھے۔ یہ مقابلہ دو دن جاری رہتا تھا۔ لگے ہاتھوں مقامی انتظامیہ کی طرف سے میلے کا بھی انعقاد کرادیا جاتا تھا اور اسٹالوں اور دکانوں کی بکنگ پندرہ دن پہلے ہی شروع ہوجاتی تھی۔ یوں گہما گہمی کچھ زیادہ ہی سوا ہوجایا کرتی تھی۔ میلے کی مدت تین روز ہوتی تھی۔

دیگر نو آموز پہلوانوں (بہ شمول خیر بخش اور دھنی بخش) کو چھوڑ کر علاقائی طرز کے سات پہلوانوں میں سے صرف چار ہی آپائے تھے اور یہی صورتِ حال صوبائی شہرت کے حامل پہلوانوں کے ساتھ تھی جو صرف دو ہی پہنچ سکے تھے۔

علاقائی طرز کے چار پہلوان، دودا خان سومرو، بخشل مغری، دلی جان کھوسہ اور بھاڑو ماچھی شامل تھے صوبائی شہرت کے دو ملاکھڑا پہلوان دادن ماچھی اور بشام چھلگری تھے۔ جبکہ گیارہ نو آموز پہلوانوں میں قابلِ ذکر یہ پہلوان...... خیر بخش، دھنی بخش، کادو جکھرانی اور کھمڑو خان تھے۔

مقابلہ شروع ہوا۔ کمنٹیٹر نے اپنا ایک ٹھکانا بنا رکھا تھا...... ایک چھوٹے سے تنبو میں ایک میز اور چند کرسیاں رکھے وہ اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ موجود تھا۔ مائیک اس کے سامنے میز پر رکھا ہوا تھا۔

اس نے مقابلے سے پہلے تعارفی کمنٹری شروع کردی تھی۔

مقابلہ شروع ہوا اور ایک نو آموز پہلوان کے مقابلے میں علاقائی طرز کا ملھ پہلوان دودا خان کو اتارا گیا۔ دودا خان نے تین نو آموز پہلوانوں کو ملھ مات دے ڈالی۔ فاتح پہلوان دودا خان کا صوبائی شہرت کے پہلوان دادن ماچھی کے ساتھ مقابلہ ہوا، دودا خان نے اسے بھی شکست دے ڈالی اور فاتح قرار پایا۔

اس کے بعد دادن ماچھی کا کادو جکھرانی کے ساتھ مقابلہ ہوا تو اس میں دادن کو شکست ہوئی جبکہ کادو جکھرانی نے دل جان سومرو کو بھی ملھ مات دے ڈالی مگر کادو آخری کے دو مقابلے بخشل مغری اور دلی جان کھوسہ سے ہار گیا۔

نو آموز پہلوانوں میں اب صرف یہ دونوں بھائی خیر بخش اور دھنی بخش باقی بچے تھے۔ باقی سارے نو آموز پہلوان شکست کھا چکے تھے۔ صوبائی شہرت کے فقط دو پہلوان دادن ماچھی اور بشام چھلگری رہے تھے۔ جبکہ علاقائی شہرت کے حامل میں سے دلی جان کھوسہ اور بھاڑو ماچھی، دودا خان مقابلے میں قائم تھے۔

خیر بخش کا مقابلہ دلی جان کے ساتھ ہوا۔

خیر بخش کی عمر بیس برس تھی، اس کا ڈیل ڈول برابر تھا۔ مگر اس میں پھرتیلا پن بلا کا تھا۔ اس کے برعکس پچیس سالہ دلی جان ایک لمبا تڑنگا، بھاری بھرکم پہلوان تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو سخت حریفانہ نظروں سے گھورا اور پھر کود کے کھاڑ کے ایک دوسرے پر جھپٹ پڑے۔ چھاتیاں ملتے ہی دونوں نے ایک دوسرے کے سوتروں پر ہاتھ ڈال دیے۔

یہ مقابلہ برابری کی سطح کا نہ تھا۔ کیونکہ خیر بخش پہلوان دلی جان کے مقابلے میں نو آموز تھا اور اس نے اب تک علاقائی سطح کا کوئی ایوارڈ نہیں جیتا تھا۔ نہ ہی اسے کوئی خطاب ملا تھا۔ جبکہ اس کے برعکس دلی جان ایک منجھا ہوا علاقائی شہرت یافتہ ملاکھڑا پہلوان تھا جس نے دو سچل ایوارڈ، دو شہباز اور ایک لطیف ایوارڈ جیتے تھے۔

دلی جان کے انداز و اطوار میں ایک نو آموز اور اپنے سے کم عمر پہلوان کو جلد سے جلد پچھاڑنے کی عجلت اور خاطر میں نہ لانے والی ایک طرح کی رعونت محسوس ہوئی، اس میں

حریف کو یقینی طور پر شکست سے ہمکنار کرنے کا اطمینان بھی شامل تھا۔

جب دل جان نے خیر بخش کے سوتروں میں اپنے دونوں ہاتھ ڈال کر اپنے مضبوط بازوؤں کے شکنجے میں لیا تو خیر بخش کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے گرد آہنی دیواریں چن دی گئی ہوں۔ دل جان نے چھاتی ملاتے ہی خیر بخش کو ایک بارہی اڑنگا لگایا۔ خیر بخش کے تھوڑے قدم بہکے ضرور تھے مگر اس نے پھرتیلے پن سے خود کو بچایا اور ساتھ ہی اس نے حریف کے اگلے متوقع داؤ کا بھی اندازہ لگالیا۔

دل جان نے بالترتیب بالو والا اڑنگا ناکام جانے کے بعد فوراً اندریں اڑنگا لگایا تو خیر بخش نے اپنی بائیں ٹانگ اس کے اندریں اڑنگے کے دائیں ٹانگ پر اٹکا دی۔ یہ اپنی جگہ دفاعی اڑنگا تھا مگر اس میں حریف خود اپنے ہی داؤ سے مار کھاتا تھا۔ دل جان کو یہ توقع نہ تھی کہ ایک نوآموز پہلوان اس طرح کی زودفہمی کا مظاہرہ کرے گا، نتیجتاً وہ مار کھا گیا اور خیر بخش نے پہلے ہی ہلّے میں اسے چت کر ڈالا۔

میدان میں زور کا شور ابھرا۔ اس کا دوست رب ڈنو، جو اس بڑے دنگل میں شامل نہ تھا اور اپنے باپ روشو پہلوان کے ساتھ صرف یہ مقابلہ دیکھنے کی غرض سے آیا تھا، اپنے دوست کی اس فتح پر خوشی کے مارے نعرے بلند کرنے لگا۔

ادھر ایک نوآموز پہلوان کے ہاتھوں شکست کھا کر دل جان پہلوان کا چہرہ احساسِ ذلت سے مسخ ہو کر رہ گیا۔

خیر بخش کے مقابلے میں بھاڑو ماچھی کو اتارا گیا جس نے ابھی کچھ دیر پہلے صوبائی شہرت کے حامل ملھ پہلوان دادن ماچھی کو شکست سے دوچار کیا تھا اور وہ خاصا پرجوش اور خوش نظر آ رہا تھا کیونکہ اس نے اپنے سے ذرا اونچی سطح کے ملھ پہلوان کو شکست دی تھی جبکہ کچھ یہی حال خیر بخش کا بھی تھا کیونکہ اس نے بھی علاقائی حیثیت کے معروف پہلوان دلی جان کو شکست دی تھی اور وہ بھی زیادہ پُرجوش دکھائی دے رہا تھا۔

دونوں پہلوان گودے کھاڑ کے سامنے آ گئے۔ کنمنٹری زور شور سے جاری تھی۔ لوگوں کا جوش و خروش بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ روشو پہلوان دونوں بھائیوں کی کامیابی پر بری طرح جل بھن رہا تھا کیونکہ ادھر خیر بخش کے چھوٹے بھائی دھنی بخش نے بھی اپنے ہم پلّہ نوآموز چار پہلوانوں کو بری طرح شکست سے دوچار کیا تھا اور اب خیر بخش اور بھاڑو پہلوان کے بعد اس کی ملھ علاقائی سطح کے پہلوان بخشل مغری کے ساتھ ہونے والی تھی۔

ادھر خیر بخش اور بھاڑو ماچھی نے ایک دوسرے کے ساتھ چھاتیاں ملادیں اور سوتروں میں ہاتھ ڈالتے ہی زور آزمائی شروع کر دی۔

دونوں پہلوان اصیل مرغوں کی طرح آپس میں بھڑ چکے تھے۔ بھاڑو ماچھی نے خیر بخش کے گرد اپنے مضبوط بازوؤں کا حصار قائم کرتے ہی اسے جاٹھا (اوپر اٹھانا) لگانے کی کوشش کی، خیر بخش نے اپنی ٹانگیں سکیڑنے کی بجائے زمین پر ''کیل'' کر دیں مگر بھاری بھرکم زور آور بھاڑو ماچھی نے خیر بخش کو اپنی طاقت کے زور پر اوپر اٹھایا اور خیر بخش کو ٹانگیں یا گھٹنے سکیڑنے کا موقع دیے بغیر پل کے پل بار یں اڑنگا بھی لگا دیا۔

جاننے والے جانتے تھے کہ یہ کس قدر خطرناک اور یقینی جیت سے ہمکنار کر دینے والا غضب ناک داؤ تھا۔ اور کوئی منجھا ہوا چوٹی کا ملاکھڑا پہلوان ہی خود کو اس خطرناک داؤ سے بچانے کی بجلی کی سی پھرتی کا مظاہرہ کر سکتا تھا۔

خیر بخش نے اپنے حواس قائم رکھے اور پل کے پل بہ سرعت اس نے مدِمقابل بار یں اڑنگا اپنی دائیں ٹانگ جو زمین سے چند انچ ہی معلق تھی کو اندریں اڑنگے کے طور پر اس کی پنڈلی پر رکھ کر توڑا اور بایاں اندریں اڑنگا بھاڑو ماچھی کی اس ٹانگ کو جو زمین پر ''کیل'' تھی، پر پھنسا کر جسم کو مدِمقابل کے مخالف تڑپ کر زوردار جھٹکا بھی دے دیا۔

نتیجتاً دونوں پہلوان زمین بوس ہو گئے مگر گرتے گرتے بھاڑو پہلوان خود کو پہلے چاروں شانے چت ہونے سے نہ بچا سکا اور خیر بخش اس کے اوپر آ رہا۔

علاقائی شہرت یافتہ بھاڑو پہلوان کو اس نے ملھ مات دے ڈالی۔

مجمع میں زور کا شور ابھرا اور لاؤڈ اسپیکر پر کمنٹیٹر کے پکارنے کی آواز ابھری۔ ''واہڑے واہ... خیرو پہلوان...... قہر کر ڈالا بابا تونے۔''

خیر بخش نے نوآموز پہلوانوں سمیت علاقائی و صوبائی سطح کے پہلوانوں کو زیر کر ڈالا تھا اور روشو پہلوان کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ اس نے جس ''خوف'' کے باعث دونوں بھائیوں کو اپنے اکھاڑے سے خارج کیا تھا، آج اس اکھاڑے میں ایک بھائی نے خود کو منوالیا تھا۔ یہی نہیں،



جب دوسرے بھائی دھنی بخش کو بخشل مغری کے ساتھ اکھاڑے میں اتارا گیا تو بدقسمتی سے دھنی بخش بخشل مغری سے ہار گیا۔ ایک مقابلے کے بعد دھنی بخش کا دوسرا مقابلہ علاقائی سطح کے پہلوان دودا خان کے ساتھ ہوا۔

دھنی بخش نے دودا خان کو چند سیکنڈ میں پچھاڑ کے رکھ دیا۔ فوراً بعد اس کا مقابلہ دلی جان سے کرایا گیا تو دھنی بخش نے اسے بھی بری طرح شکست سے دوچار کر دیا۔

اس عظیم الشان ملھ مقابلے کے دوسرے اور آخری دن.... خیر بخش کو صرف ایک حریف پہلوان بشام چھلگری کے ساتھ مقابلہ کرنا تھا جبکہ دھنی بخش کو ایک علاقائی شہرت کے حامل پہلوان بخشل اور ایک صوبائی سطح کے معروف پہلوان دادن ماچھی کے ساتھ مقابلہ کرنا تھا۔

ملھ کے اس آخری اور دوسرے دن زیادہ سنسنی خیزی محسوس کی جا رہی تھی۔ پہلے ہی دن دونوں بھائیوں نے خود کو ایک بڑے اور زور آور پہلوانوں کی حیثیت سے منوالیا تھا۔

مقابلہ شروع ہوا۔ دھنی بخش اور بخشل پہلوان آمنے سامنے ہوئے۔

اپنے بڑے بھائی خیر بخش کے مقابلے میں دھنی بخش کا جسم زیادہ طاقت ور محسوس ہوتا تھا۔ اس کے پہاڑ سے وجود میں طاقت تو تھی لیکن اپنے بھائی خیر بخش کی طرح پھرتیلا پن اتنا زیادہ نہ تھا۔ تاہم دونوں بھائی شہ زور پہلوان ہونے کے ساتھ ساتھ بلا کے ذہین بھی تھے۔

ان کی ملھ پہلوانی میں طاقت اور پھرتیلا پن تو تھا ہی مخالف کے متوقع روایتی داؤ پیچ کا توڑ اور غیر متوقع خطرناک داؤ کو پہلے سے سمجھنے کی ذہانت بھی ان دونوں بھائیوں نے ابھار لی تھی۔

اکھاڑے کے مبصرین نے ان دونوں بھائیوں کی اس صلاحیت کا کھلے دل کے ساتھ اعتراف کیا تھا کہ یہ دونوں بھائی نہ صرف ملاکھڑا کے میدان میں غضب کی شہ زوری دکھاتے ہیں بلکہ اپنی ذہانت اور قوتِ فیصلہ کو بھی برمحل اور بروقت بروئے کار لاتے ہیں۔

دھنی بخش اور بخشل پہلوان آپس میں نبرد آزما ہو چکے تھے۔ دھنی بخش نے بخشل کے دو وار کا کامیابی سے جواب دیا اور اسے اکھڑی لگا دی۔ بخشل نے اپنی دونوں ٹانگیں اوپر اٹھا دیں اور گھٹنے سکیڑ کر اس کے سینے پر جما دیے۔

مگر دھنی بخش نے اسے چک پھیریاں نہ دیں اور ''مکار ہاتھی'' کی طرح اپنے سینے سے اس کے اترنے کا انتظار کرتا رہا اور پھر جب بخشل نے اگلے ہی لمحے داؤ آزمانے کی غرض سے، جیسے ہی اپنی دونوں ٹانگیں زمین پر ٹکائیں، دھنی بخش بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت میں آ گیا۔

اس نے بایاں اڑنگا لگا کر مدِمقابل کو کھدیڑا اور بخشل پہلوان چاروں شانے چت تھا۔

اس طرح بخشل پہلوان کو شکست دینے کے بعد بڑے بھائی خیر بخش اور بشام چھلگری آمنے سامنے ہوئے۔

اب دونوں پہلوان ایک دوسرے کو سخت حریفانہ نظروں سے گھور رہے تھے۔ مجمع کو یکلخت جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔

اچانک پھر مجمع میں ہلاشیری کا شور ابھرا اور دونوں پہلوانوں نے آگے بڑھ کر ایک دوسرے کے سوتروں میں ہاتھ ڈال دیے۔ لوگوں کا شور تھم گیا اور جب خیر بخش نے بشام پہلوان کے سوتر پر ہاتھ ڈالتے ہی اسے بائیں ٹانگ کا اڑنگا لگا کر کھدیڑا تو پھر شور گونجا۔

ادھر بشام پہلوان نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ خیر بخش کے اس داؤ سے خود کو بچایا اور اپنی چھاتی خیر بخش کی چھاتی سے ملادی۔ اس کے بعد اس کے بدن کے زور پر خود کو بیک وقت سہارتے ہوئے اسے اپنے دونوں مضبوط بازوؤں کے حصار میں لے کر نصف دائرے کی ایک زبردست پھیری لگاتے ہوئے چت کرنے کی کوشش کی تو خیر بخش نے اپنی بروقت فطری پھرتی سے استفادہ کرتے ہوئے خود کو گرنے سے بچایا اور اپنی دونوں ٹانگیں بھربھری مٹی والی زمین پر کیل کر ڈالیں۔

پہلوان بشام چھلگری نے خیر بخش کے قدم اکھیڑنے کی اپنی سی کوشش کی تھی مگر وہ خیر بخش کو اپنی جگہ سے محض چند انچ ہی ہلا سکا تھا، گرا نہ سکا تھا اور تب خیرو کو دوسری بار اپنے مدِمقابل پر داؤ آزمانے کا موقع ملا تو اس نے ذرا بھی دیر نہ لگائی۔

بائیں ٹانگ کا ''اندریں'' اڑنگا حریف کی دونوں ٹانگوں کے درمیان رکھا تو بشام یہ سمجھا شاید خیرو اسے جاٹھا (اوپر اٹھانا) مار کر چت کرنا چاہتا ہے لہٰذا وہ اس داؤ کا مقصد غلط سمجھ بیٹھا اور اپنی پوزیشن بدلنے کی ضرورت نہ سمجھی بلکہ اپنے وجود کو خم کر کے خیرو پہلوان کی چھاتی سے اپنی چھاتی مزید جم کر ملادی۔

خیرو کا داؤ چل گیا۔ اس نے اسے کھدیڑا، بشام چھلگری جب تک اس کے داؤ کی حقیقت کا اصل مقصد سمجھتا،

اسے دیر ہو چکی تھی۔

دھکا لگنے سے اس کی دونوں ٹانگوں نے یکے بعد دیگرے حرکت کی تو اس کی دوسری ٹانگ خیر بخش کے اندریں اڑنگے سے ٹکرا گئی نتیجتاً بشام کا توازن بگڑا اور وہ خود کو سنبھال نہ پایا، اس کے چاروں شانے چت ہوتے ہی اسے زبردست ملھ مات مل گئی۔

مجمع میں زور کا شور بلند ہوا اور پھر تو یہ شور تھمنے ہی میں نہ آتا تھا۔

سائیں محبوب شاہ کے حامیوں نے ان دونوں پہلوان بھائیوں کو اپنے کاندھوں پر اٹھالیا اور یوں کشمور کا یہ ملاکھڑا میدان ان دونوں بھائیوں کے نام ہوا۔

ملھ ملاکھڑا کے بڑوں نے دونوں بھائیوں کو ''زور آور'' پہلوان کا خطاب دے ڈالا۔

ڈھول تاشوں کے شور کے ساتھ ان دونوں ملھ پہلوان بھائیوں کی برات نکل آئی اور بسوں، ٹرکوں کے ذریعے ''برات'' کشمور سے خیر پور پہنچی اور پھر وہاں سے احمد پور تو روشو پہلوان جل کر کباب بن گیا مگر اس کا بیٹا...... رب ڈنو اپنے گوٹھ سے تعلق رکھنے والے ''زور آور'' پہلوان بھائیوں کی اس فقید المثال کامیابی پر بے حد خوش نظر آ رہا تھا اور سارا وقت ان کے دونوں کے ساتھ گزارہ۔ دونوں بھائیوں نے بھی اسے اس خوشی کے موقعے پر خود سے دور نہیں کیا تھا۔

دونوں بھائیوں کی پورے گوٹھ میں خوب واہ واہ ہوئی۔ ملھ کے شیدائیوں کی کہاں کمی تھی۔ ملھ پہلوانوں کو تو لوگ ہیرو سمجھتے تھے۔ ہر کوئی انہیں عزت وقدر کی نگاہ سے دیکھا کرتا تھا اور پھر سب سے بڑی بات یہ تھی .... کہ ان دونوں زور آور بھائیوں کے سر پر تو سائیں محبوب شاہ کا ہاتھ تھا جو پورے علاقے میں اچھا خاصا اثر ورسوخ رکھتا تھا۔ ان دونوں بھائیوں کو حسد وعناد کی نظروں سے دیکھنے والے بھی تھے جن میں زمیندار اللہ ورایو، صیقل مراد اور روشو پہلوان شامل تھے۔

خیر پور میں تو سائیں محبوب شاہ نے باقاعدہ تقریب کا انعقاد بھی کر ڈالا تھا۔ ''ادا دھنی بخش! آج امڑ (ماں) زندہ ہوتی تو کتنی خوش ہوتی......'' خیر بخش نے بڑی غمناک حسرت سے کہا۔

''ہاں...... ادا خیرو! مگر اماں کو تو ہمارے تعلیم جاری نہ رکھنے کا ہی غم لے گیا۔ بے چاری کو کتنا ارمان تھا کہ ہم دونوں پڑھ لکھ کر بڑے آدمی بنیں۔ آج وہ ہماری یہ شان دیکھتی تو اس کے دل کو کچھ نہ کچھ ڈھارس تو ہوتی۔'' دھنی بخش دکھ بھرے لہجے میں بولا۔

دونوں بھائی ماں کو یاد کر کے غم زدہ ہو گئے تھے۔ حیاتِ انسانی کا یہ فطری اصول ہوتا ہے کہ کسی بھی خوشی کے بڑے اور پُرمسرت موقعے پر بچھڑا ہوا کوئی اپنا بڑی شدت کے ساتھ یاد آتا ہے۔ یہی حال اس وقت دونوں بھائیوں کا تھا۔

باپ کو ان کی آنکھوں کے سامنے بے گناہ اور انتہائی بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا۔ اس وقت ان کی عمریں ہی کیا تھیں۔ مگر وہ خونیں منظر ان کی آنکھوں میں جیسے ثبت ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کے بعد ان کی ماں (مائی نوراں) نے انہیں کس طرح پال پوس کر جوان کیا تھا، یہ بھی دونوں بھائی نہیں بھولے تھے۔

آج خوشی کا موقع تھا۔ دونوں بھائیوں نے اپنی منزل پالی تھی اور اب شہرت وعزت کے دروازے ان کے سامنے کھلے پڑے تھے۔ انہیں اب صرف قدم بڑھاتے رہنا تھا مگر ساتھ ہی انہیں اس بات کا قلق ایک ٹیس بن کر چوکے لگاتا رہتا تھا کہ ماں کی زندگی میں اسے کوئی خوشی نہ دے سکے تھے۔ وہ انہیں بڑا آدمی دیکھنا چاہتی تھی۔

انہیں وہ دکھ بھرے اور غمناک لمحات بھی یاد تھے جب یہ دونوں بھائی اپنے بچپن میں، باپ کے ساتھ سائیکل پر آگے پیچھے بیٹھ کر اسکول جایا کرتے تھے۔ مگر اس کے مرتے ہی دونوں پیدل اسکول جاتے تو ان کے ننھے معصوم دل میں ایک ہوک سی اٹھا کرتی تھی۔ دکھ کا احساس انہیں چین نہیں لینے دیا کرتا تھا۔ اپنے دکھ کا اظہار ان سے اتنا ہی ہو پایا تھا کہ دونوں خاموش خاموش رہتے تھے پھر انہوں نے پڑھائی کے بجائے پہلوانی سے دل لگانا شروع کر دیا تھا اور انہیں یہ بھی یاد تھا کہ اسکول نہ جانے کی وجہ سے ان کی ماں کس قدر نالاں رہتی تھی۔ مگر پھر ایک وقت وہ بھی آیا جب کھانے کے لالے پڑ گئے تو ماں کو تنگدستی اور مفلسی کے دکھ نے ناسور بن کے اندر ہی اندر کھانا شروع کر دیا اور وہ بالآخر ٹی بی جیسی موذی بیماری میں مبتلا ہو کر اس جہان فانی سے کوچ کر گئی۔

آج جب دونوں بھائیوں کو بے پایاں خوشی ملی تھی تو اپنی ماں کو یاد کرتے ہوئے دونوں بھائیوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ ''ادا، ہم یہ گھر چھوڑ دیں گے۔''

اس روز چھوٹے بھائی دھنی بخش نے بڑے رنجور لہجے میں خیر بخش سے کہا تھا۔



بڑا بھائی ہونے کے ناتے خیر بخش نے بھی اپنے اس دکھ کو چھپانے کی ناکام کوشش کی مگر چھوٹے بھائی کی بات نے اسے اندر سے چھیل ڈالا، بولا ''ادا! کیا ہم اپنی ماں پیو کی یہ نشانی چھوڑ دیں؟''

چھوٹا تڑپ کر بولا ''ادا خیرو! پتا نہیں کیوں، باہر سے ہم خوش خوش اپنے گھر میں داخل ہوتے ہیں اور یہاں اپنے گھر میں داخل ہونے کے بعد نہ جانے میرا دل کیوں کٹنے لگتا ہے۔ کیا تیرا دل ایسا نہیں کرتا؟''

خیر بخش اپنے آنسو پی کر خاموش ہو گیا۔

ایک روز گوٹھ میں کسی کے بیٹے کی رسم سنت تھی۔ اندرونِ سندھ میں رسم سنت جسے رسم طہور (ختنہ) بھی کہا جاتا ہے، بڑے دھوم دھام سے منائی جاتی تھی۔ جیسے کوئی شادی کی تقریب ہو۔ باقاعدہ شادی کے ولیمے جیسی دعوت کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ امیر ہو چاہے غریب، بیٹے کی رسم طہور کی خوشی اپنی بساط بھر ایسے ہی منایا کرتے تھے اور کچھ نہیں تو گڑ یا چنوں کے چاول ہی سے مہمانوں کی تواضع کر دیا کرتے تھے۔

ایک جاننے والے کی ایسی ہی تقریب میں دونوں بھائی مدعو تھے .... مگر چھوٹا دھنی بخش موڈی تھا۔ وہ نہ گیا تھا البتہ خیر بخش نے ضرور شرکت کی تھی اور اس کا دوست رب ڈنو بھی ساتھ تھا۔

خیر بخش کچھ دنوں سے محسوس کر رہا تھا کہ رب ڈنو فنِ پہلوانی سے رفتہ رفتہ دور ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا باپ روشو پہلوان اسے اکھاڑے میں لانے کی جتنی کوشش کرتا، وہ اتنا ہی دور ہوتا جاتا تھا۔

رب ڈنو کی ماں بھی اس دعوت میں شریک تھی۔ مردوں کے لیے مقامِ دعوت گھر کے باہر کھلی جگہ پر قناتیں اور شامیانے لگا کر قائم کی گئی تھی۔ جبکہ عورتیں وغیرہ گھر کے اندر تھیں اور پیدا ہونے والے بچے کی مناسبت سے گیت گا رہی تھیں۔ خیر بخش دعوت میں مصروف تھا اور ایک جگہ بچھی ہوئی چارپائیوں پر اپنے چند دوستوں کے ساتھ موجود تھا۔

جب وہ رخصت ہونے لگا تو اچانک اس کی نظر دعوت والے گھر سے برآمد ہونے والی چند عورتوں پر پڑی جن میں سے کچھ نے ٹوپی والے (شٹل کاک) برقعے پہنے ہوئے تھے اور چند جوان لڑکیوں نے اجرکوں کی چادر لپیٹی ہوئی تھی۔

خیر بخش نے فوراً نظریں نیچی کر لیں اور عورتوں کو راستہ دینے کے لیے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

جب سب عورتیں گزر گئیں تو وہ سر اٹھا کر آگے بڑھا اور دوسرے ہی لمحے ٹھٹک گیا۔

ایک جوانِ رعنا اجرک پوش سرو قد لڑکی، بہت دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ شاید اس نے خیر بخش کو دیکھ کر کسی پُرشوخ کونج کی طرح خود کو جھنڈ سے الگ کر لیا تھا یا اور بات تھی مگر اتفاقاً جیسے ہی ایک دوسرے کے قریب سے گزرنے لگے تو دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔

خیرو کو یوں لگا جیسے سہانی شام اتر آئی ہو۔ لڑکی نے اجرک کی چادر کا تیر نما نقاب لیا ہوا تھا اور بڑی بڑی سرمگیں آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا تھا، اس کے بعد وہ کچھ بے چینی یا عجلت میں نظر آنے لگی۔ خیرو کو اس لمحاتی وقفے کے دوران اس کی اجرک کی چادر کے اندر کچھ حرکت سی محسوس ہوئی، تب اس نے اس کا مرمریں، گداز اور گورا گورا ہاتھ باہر نکلتے دیکھا اور اس کے ہاتھ سے کچھ دور جو اس کے قدموں سے تھوڑا قریب تھا کچھ گرا لڑکی آگے بڑھ گئی اور خیرو تذبذب میں مبتلا ہو گیا۔ اسے اس لڑکی کی نگاہوں میں ان کہا پیغام محسوس ہوا تھا۔ وہ اسے پہچان تو گیا تھا کہ یہ زمیندار اللہ ورایو کی بیٹی ماروی تھی جسے وہ اپنے باپ کے قاتلوں اور ذمے داروں میں سمجھتا تھا مگر ماروی کی اس حرکت نے اس کے دل ودماغ میں ہلچل مچا دی تھی۔

اس نے بالآخر اپنے قدموں پر گری ہوئی وہ شے اٹھالی اور بہ غور دیکھے بنا فوراً اپنی مٹھی میں داب کر آگے بڑھ گیا۔

اب وہ اپنے گھر کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا مگر اس کے اوسان کہیں اور گامزن تھے۔ اب وہ ایسا تھا، ایسا نہ تھا کی گردان میں الجھ گیا تھا۔ یہ شے جو ماروی نے اپنے ہاتھ سے اس کی طرف پھینکی تھی، وہ اس کی دانستہ حرکت تھی یا اس کے ہاتھ سے گر گئی تھی؟ اب اسے دیکھنا چاہیے کہ آخر وہ ہے کیا؟ ورنہ گھر لے جانے سے پہلے وہ اسے ادھر ہی پھینک دے گا۔

گھر کے ذرا قریب پہنچ کر ایک کیکر کے درخت کے قریب آ کر اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ وہ شے اپنے کُرتے کی جیب سے نکالی اور پہلی بار اسے غور سے دیکھنے لگا۔

وہ ماچس کی ڈبیا تھی جسے نوٹ جوڑنے والی سفید اسکاچ ٹیپ سے لپیٹا گیا تھا۔

اسے حیرت ہوئی کہ یہ کیا شے ہے؟ تاہم اس نے اسے کھولا تو اندر سے تہ کیا ہوا پرچی نما کاغذ برآمد ہوا۔

خیر بخش دھڑکتے دل سے اسے کھولنے لگا، پھر وہ جیسے سن ہو کر رہ گیا۔

اس میں کچھ لکھا ہوا تھا، وہ پڑھنے لگا۔

"بے وقوف! اس طرح ماچس میں محبت نامہ ڈال کر اور اپنا نام مع ولدیت لکھ کر پھینکنے کی کوشش پھر کبھی مت کرنا...... وہ تو اچھا ہوا کہ اس وقت میں صحن میں لسی بلو رہی تھی ورنہ کسی اور کے ہاتھ لگ جاتا تو تیری جان خطرے میں پڑ جاتی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم مجھ سے اس قدر محبت کرتے ہو؟ جواب کافی دنوں سے لکھ کر رکھا ہے۔ ہر وقت اپنے ساتھ رکھتی ہوں کہ کبھی موقع ملے تو تجھ تک پہنچا دوں۔ پتا نہیں یہ موقع ملتا بھی ہے یا نہیں۔ چھوٹے بچے کے ذریعے رابطہ مناسب رہے گا۔ نام نہیں لکھ رہی، مجھے تو تم جانتے ہی ہو ناں۔"

بہت سنوار سنوار کر یہ تحریر لکھی گئی...... تاہم یہ پیغام پڑھ کر بے چارے خیر بخش کے تو چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔

وہ سخت حیران و پریشان ہو رہا تھا کہ آخر یہ کیا معاملہ تھا؟ اس نے تو آج تک گوٹھ کی کسی لڑکی کو... ایسا کوئی محبت نامہ ماچس میں ڈال کر نہیں پھینکا تھا اور... وہ بھی اپنے دشمن زمیندار اللہ ورایو کی بیٹی...... ماروی کو۔ وہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا اور حیران بھی۔ گوٹھ احمد پور تھا ہی کتنا بڑا، سب ایک دوسرے کے دیکھے بھالے تھے۔ کیا مرد کیا بوڑھے اور کیا جوان۔ اپنے بچپن سے ہی خیر بخش، ماروی بلکہ دونوں ایک دوسرے کو پہچانتے تھے۔

"کیا ماروی نے میرے ساتھ دانستہ مذاق کیا تھا؟" اس نے سوچا۔ پھر نہ جانے کیوں اسے یہ مذاق اچھا لگا۔ اس اچانک رونما ہونے والے عجیب و غریب واقعے نے اسے ابتدا میں تو خاصا پریشان اور گومگو رکھا مگر پھر جیسے اسے رفتہ رفتہ اچھا محسوس ہونے لگا۔

خیر بخش آخر ایک جوان لڑکا تھا اور اب تو وہ ایک باقاعدہ ملاکھڑا پہلوان بن چکا تھا۔

وہ ساری رات سو نہ سکا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ماروی کا ہی سندر و چنچل چہرہ گردش کرتا رہا اور پھر اس کے دل کے نہاں خانے میں جو بیج پھوٹا وہ جاگتی رات سے بیدار ہوتی صبح تک ایک پودے اور بعد میں تناور درخت کی شکل صورت اختیار کر چکا تھا۔

اس نے صبح تک اپنے تئیں یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ ماروی کے دل میں یقیناً پہلے ہی اس کی محبت کی کونپل پھوٹ چکی تھی۔ اس نے دانستہ رسم الفت کو آگے بڑھانے کا یہ طریقہ بہانے کے طور پر اختیار کیا تھا اور ایک معصوم سے جھوٹ کا سہارا لے کر ایک طرح سے ماروی نے اس سے اپنی محبت کا اظہار کیا تھا۔

اس نے وہ خط کئی بار پڑھا تھا اور آپوں آپ مسکرایا تھا۔ حالانکہ حقیقت اور تھی کہ...... کچھ روز پہلے رو... پہلوان نے اپنے بیٹے رب ڈنو کی جیب سے وہ محبت... اتفاقاً ہی برآمد کیا تھا اور بعد میں روشو پہلوان نے اس... سے اپنے بیٹے کا نام کاٹ کر خیر بخش کا نام لکھ دیا تھا تا کہ ا... یا اس کے گھر کے کسی اور فرد کے ہاتھ یہ محبت نامہ لگ... تو خیر بخش کی شامت آجائے۔ ایسا اس نے حسد کے زیر ا... کیا تھا مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی یہ حرکت اپنی سچائی... کے ساتھ دو دلوں کے بیچ سچ مچ کا ربط قائم کر چکی تھی۔

خیر بخش نے آخر کار ماروی کو جواب دینا ضروری ... مگر اس نے ماروی کی ہدایت پر عمل کرنا مناسب نہیں جانا کہ وہ "پیغام رسانی" کے لیے کسی چھوٹے بچے کا سہارا لے۔ اس نے خود ہی ماروی سے دو بہ دو ملاقات کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسے ایک موقع بھی مل گیا۔ وہ اپنی کسی سہیلی کے گھر سے لوٹ رہی تھی اور اتفاق سے خیر بخش بھی مخالف سمت سے چلا آرہا تھا۔ جون کی پسینا بہاتی گرمیاں تھیں اور فضا میں بادِ سموم کی سی تپش تھی۔ اِکا دُکا لوگ ہی دور کہیں کھیتوں میں کام کرتے نظر آرہے تھے۔

وہ ایک بل کھاتی کچی پگڈنڈی تھی جو بیچ کھیتوں سے گزر کر ماروی کے گھر تک جاتی تھی۔ راہ میں ایک سایہ دار درخت تھا۔ دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں تو خیر بخش، ماروی کو پُرشوق نظروں سے تکتا ہوا اس درخت کے سائے تلے آکر کھڑا ہو گیا۔ ماروی بھی گویا کچے دھاگے سے بندھی اس کے قریب چلی آئی۔

"مجھے تمہارا پیغام ملا تھا۔" خیر بخش نے اپنے خشک پڑتے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

ماروی کی بھیدوں بھری نگاہوں میں تھرتھراہٹ ابھری اور بولی "خیرو! تم جانتے ہو...... میں کس کی بیٹی ہوں؟"

"ہاں...... زمیندار اللہ ورایو کی...... تو پھر...... کیا تم بھی اپنے باپ کی طرح مجھے اپنا دشمن سمجھتی ہو؟" خیرو نے اس کی جھیل سی گہری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

ماروی کے چہرے پر حیرت سی ابھری "میں تمہیں دشمن سمجھنے کا حق نہیں رکھتی۔ میں نے تو اس لیے تمہیں یاد دلایا تھا کہ میں تو تمہارے دشمن کی بیٹی ہوں...... کیا پھر بھی تم... مجھ سے......؟"

خیر بخش مسکرایا تھا۔ وہ اب اس کی بات کا مطلب سمجھ... تھا۔ اب ذرا سنجیدگی سے بولا۔

"ماروی! حقیقت یہ ہے کہ ہم نے کبھی تمہارے باپ کو اپنا دشمن نہیں سمجھا تھا، ایسا وہ کرتا آیا ہے۔ اسے شاید میرے باپ کو قتل کروانے کے باوجود سکون نہیں ملا ہے۔"

"مگر میرے باپ نے تو ایسا کچھ نہیں کیا؟" وہ بھی سنجیدہ ہو گئی تھی۔

"رویوں سے بہت کچھ ظاہر ہو جاتا ہے۔ مگر ہم نے بھی تو جواب میں کچھ نہیں کیا۔ ورنہ میں وہ منظر آج تک نہیں بھولا ہوں، جب میں اپنے باپ کی خون میں لت پت لاش سے لپٹ کر رویا تھا اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ مجھے اس حقیقت کا بھی ادراک ہونے لگا تھا کہ یہ کس کی سازش تھی، اس کے ذمے داروں میں کون کون شامل تھا۔"

محبت کی طرف بڑھنے والی گفتگو ابتدا ہونے سے قبل ہی دم توڑ گئی تھی اور اس کا موضوع گمبھیر ہو گیا تھا۔ شاید اس بات کو محسوس کرتے ہوئے ماروی نے شکوہ کیا۔

"کیا تم یہ سب بھول نہیں سکتے؟"

"ہم نے تو بھلا دیا اور معاملہ اللہ سائیں پر چھوڑ دیا ہے۔"

"ہمارے معاملے کا کیا ہوگا؟" ماروی نے نگاہیں جھکا کر معنی خیز لہجے میں کہا تو اس کی بات کا مطلب سمجھ کر خیر بخش اس کی طرف دیکھ کر ہولے سے مسکرایا اور پھر بولا۔

"ماروی! تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟"

اس کی بات پر ماروی کا چہرہ شرم سے گلنار ہو گیا تو خیر بخش نے اپنے ایک ہاتھ سے اس کی ٹھوڑی کو ذرا سا اوپر کر کے چہرہ اپنے سامنے کیا۔

ماروی نے بے اختیار اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ تب وہ بھی گہرے لہجے میں جیسے ڈوب کر بولا "ماروی، تمہاری حیا بار آنکھیں اور حسین چہرے کی گلناری میرے سوال کا جواب دے رہی ہے، اگر یہ بات ہے تو خیر بخش بھی پیچھے نہیں ہٹے گا۔"

تب ماروی نے بے اختیار اپنی کجراری آنکھیں کھول کر کہا "خیرو! کیا ان حالات میں ہمارا ملن ہو سکے گا؟" گفتگو پھر سنجیدہ موڑ پر آگئی۔

"ضرور ہوگا، بس تم ثابت قدم رہنا۔" خیر بخش نے مضبوط لہجے میں کہا۔

جانے کیوں ماروی نے اس کے لہجے کے استحکام کو محسوس کر لیا تھا اور اس کے معصوم چہرے پر امید کے سائے ابھرے تھے۔ وہ بھی اسی لہجے میں بولی "خیرو! میں تمہارے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی۔" یہ کہہ کر وہ جلدی سے آگے بڑھ گئی۔

خیر بخش تب تک اپنی جگہ کھڑا اسے جاتے دیکھتا رہا جب تک کہ وہ اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔

پھر جب وہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا تو سوچنے لگا کہ اس نے ماروی سے بہت بڑی بات کہہ دی تھی۔ کیا ایسا ممکن ہو سکتا ہے کہ ماروی کا باپ اللہ ورایو اسے اپنا داماد بنائے گا؟ مگر خیر بخش ناامید نہ تھا۔

سائیں محبوب شاہ ان دونوں زور آور بھائیوں کو اپنی اولاد کی طرح سمجھتا تھا۔ اس نے تاڑ لیا تھا کہ ہر وقت پُرجوش رہنے والا خیر بخش اب کھویا کھویا سا کیوں رہنے لگا تھا۔ نیز یہ کہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس عمر میں اس طرح کا کھویا پن کب اور کیوں ہوتا ہے؟ تاہم اس نے اور طریقے سے پوچھا۔

"کیوں خیرو! تو آج کل کچھ پریشان سا رہنے لگا ہے۔ یاد رکھ، ایک ملاکھڑا پہلوان کا کبھی بھی دھیان نہیں بدلنا چاہیے۔ اس کی نظریں ہمیشہ اکھاڑے اور حریف پر ہونی چاہئیں۔ بہت جلد ہم لاڑکانہ کے ایک اہم ترین مقابلے میں شامل ہونے والے ہیں۔ یہ علاقائی مقابلہ ہے جس میں صرف صوبائی شہرت کے ملھ پہلوان ملاکھڑا لڑیں گے اور یہ تم دونوں زور آور بھائیوں کے لیے اہم مقابلہ ہے اور تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تم دونوں بھائیوں کا یہ سخت اور مشکل وقت ہے۔ ابھی تم نے ایک ہی مقابلہ جیتا ہے اور خلافِ توقع پہلے ہی مقابلے میں "زور آور" کا خطاب لے کر تم دونوں بھائیوں نے خود کو مشکل میں ڈال لیا ہے کیونکہ جلد ملنے والا اعزاز چھن بھی سکتا ہے۔ اور خطاب لینا بڑی بات نہیں، اسے برقرار رکھنا زیادہ اہم ہے۔"

خیر بخش نے بڑے غور سے...... اس کی بات سنی اور اپنے دل کی بات اس سے کہہ دی۔ ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ وہ کس کی بیٹی ہے اور اس کے باپ کے ان لوگوں سے کس قسم کے "تعلقات" ہیں۔

اس کی بات سن کر سائیں محبوب شاہ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اسے تسلی دیتے ہوئے بولا "ٹھیک ہے...... اگر یہ بات ہے تو تو یہ مجھ پر چھوڑ دے۔ پر دیکھ...... ابھی تو شادی وغیرہ کے چکروں میں نہ پڑ۔ ابھی تجھے بہت آگے جانا ہے۔ تو نے تو ایک ہی قدم رکھا ہے، ابھی تیرا نام علاقے کی حد تک ہے، صوبائی شہرت حاصل کرنی ہے۔"

''استاد سائیں! شادی تو میں بھی ابھی نہیں کرنا چاہتا۔ میں تو چاہ رہا ہوں ...... ماروی کو میرے نام کردیا جائے۔'' خیر بخش نے کہا۔

''ہاں ہاں، ٹھیک ہے۔ میں زمیندار اللہ ورایو سے بات کرنے کی کوشش کروں گا۔'' استاد نے اسے تسلی دی۔ خیر بخش کچھ مطمئن ہوا، کچھ نہیں۔

لاڑکانہ میں ہونے والے ملھ مقابلے کی تیاریاں زور شور سے جاری تھیں۔ دونوں بھائی باقاعدگی کے ساتھ سائیں محبوب شاہ کے اکھاڑے میں کسرت کیا کرتے تھے۔

حقیقت یہی تھی کہ ''زورآور'' کا خطاب اس سے پہلے کسی پہلوان کو نہیں ملا تھا اور اس تگ ودو میں تو آموز پہلوان ہی نہیں بلکہ کہنہ مشق اور علاقائی سطح کے پہلوان بھی یہ خطاب حاصل کرنے کی تگ ودو میں رہتے تھے۔

گزشتہ دنوں کشمور میں ہونے والے ملھ مقابلے میں خیر بخش اور دھنی بخش نے بالکل غیر متوقع طور پر یہ خطاب حاصل کرلیا تھا۔ اس طرح پہلے ہی مقابلے میں علاقائی و صوبائی ملاکھڑا پہلوانوں کو شکست دے کر دونوں بھائیوں نے بیک وقت یہ خطاب حاصل کیا تھا تو استاد سائیں محبوب شاہ کی یہ بات غلط بھی نہیں تھی کہ ایسے ملنے والے اعزاز حاصل کرنے کا مطلب جہاں خوشی کا مقام ہوتا ہے وہیں اس سے زیادہ تفکر اور پریشانی کی بات بھی ہوتی ہے اور انہیں اس ''خزانے'' کی حفاظت بھی کرنی تھی۔

عنقریب لاڑکانہ میں ہونے والے ملاکھڑے کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بہ خوبی لگایا جاسکتا تھا کہ اس میں صرف صوبائی سطح کے ملھ پہلوانوں کو شرکت کرنا تھی اور ان کے نام انگلیوں پر گنے جاسکتے تھے اور یہ وہ پہلوان تھے جنہوں نے یکے بعد دیگرے ملھ مقابلے جیتنے کے بعد اپنے خطابات کو گویا ''قلعہ بند'' کردیا تھا۔ ادھر ماروی والے معاملے میں سائیں محبوب شاہ کو اپنے ہونہار ''پٹھے'' کی طرف سے ''تسلی'' دیکھنے میں نہ آئی تو اسے تشویش ہونے لگی۔ اس نے سوچا کہ خیر بخش کی تسلی ضروری تھی۔

لاڑکانہ میں ہونے والے مقابلے میں کئی روز تھے۔ چنانچہ سائیں محبوب شاہ نے زمیندار اللہ ورایو سے بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

سائیں محبوب شاہ کو علاقے میں بڑی عقیدت مندانہ حیثیت حاصل تھی اور لوگ اسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے اور احترام کرتے تھے۔ پانچ روز کے اندر اندر خیر بخش کو اپنے استاد محترم کی طرف سے بالکل غیر متوقع خوش خبری ملی۔ یہ خوش خبری زمیندار اللہ ورایو کی طرف سے رضامندی ... خیر بخش کے لیے یہ خوشی غیر متوقع ملنے والے اعزاز ... تھی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ ایسا سائیں محبوب شاہ کی محترم شخصیت کے باعث ہوا تھا۔

سائیں محبوب شاہ نے زمیندار اللہ ورایو سے ... شروع کرنے سے پہلے اتنا ضرور کہا تھا۔

''دیکھو بابا! خیر بخش کے باپ نے جو کیا، اس کا ... اس نے پالیا۔ اس نے اچھا کیا یا برا، اس کا فیصلہ تو روز ... ہوگا ...... مگر اس سے تم نے بدلہ چکالیا۔ بات تب آ... بڑھتی جب اس کے جواب میں دونوں بھائی (خیر بخش، دھنی بخش) تمہارے خلاف کوئی قدم اٹھاتے۔ مگر وہ ... چارے مسکین اور شریف بھائی ہیں اور امن پسند ہیں۔ انہوں نے بات آگے نہیں بڑھائی۔ اب تمہیں یہی سوچ ... اپنا دل صاف کرلینا چاہیے۔''

یوں بڑے خوبصورت اور دوستانہ ماحول میں یہ بات طے پاگئی اور بات منگنی پر منتج ہوگئی۔ مگر یہاں ایک معاملہ سلجھا تو دوسرا کھڑا ہوگیا۔ چھوٹے بھائی دھنی بخش کے علم میں یہ بات آئی کہ اس کا بڑا بھائی خیر بخش باپ کے قاتل کی بیٹی سے بیاہ رچانے والا ہے تو اسے چپ لگ گئی۔ خیر ... اپنی سرخوشی میں مست تھا، اسے چھوٹے بھائی کی خاموش ناراضی کا علم نہ ہوسکا۔

دھنی بخش کو یہ بھی معلوم ہوچکا تھا کہ اس کا بھائی ماروی سے محبت کرتا تھا۔ خیر بخش نے ماروی سے اپنی محبت حادثاتی قرار دیا تھا اور آج تک اس نے یہ بات ماروی سے چھپائی تھی کہ پہلا محبت نامہ اس کی طرف ''رسید'' کرنے میں اس کا ہاتھ نہ تھا اور نہ ہی وہ اس کی طرف سے ''مرسل کردہ'' تھا یا اس نے لکھا تھا۔ بلکہ حقیقت تو یہ تھی کہ آج تک وہ یہ نہ جان سکا تھا کہ وہ پہلا محبت نامہ اس کے نام سے ... نے ارسال کیا تھا؟

چھوٹے بھائی کی بڑے بھائی سے خاموش ناراضی کا معاملہ اپنی جگہ ...... مگر اصل بجلی تو خیر بخش کے دوست ر... ڈنو پر آن گری تھی کہ یہ کیا ہوگیا تھا؟ وہ نہیں جانتا تھا کہ کارِ خیر اس کے سازشی باپ روشو پہلوان نے انجام دیا ... اور تو اور روشو پہلوان اس عجیب وغریب اتفاق پر خود انگشت بدنداں رہ گیا تھا۔

آدمی گھاگ تھا، پرانا پاپی، سمجھ گیا کہ اس نے اپنے تئیں خیر بخش کا جو برا سوچا تھا، وہ اس کے لیے اچھا ثابت ہوا اور اس کے بیٹے کے لیے برا ہوا۔

اس نے اپنا سر پیٹ ڈالا۔ رب ڈنو تو دل مسوس کر رہ گیا تھا۔ اس نے روایتی عاشقوں کی طرح رقابت کی آگ میں اندھے ہوکر اپنے دوست خیر بخش کے خلاف ذرا بھی اپنے دل میں انتقامی روش کے بارے میں سوچا تک نہیں، بس جس کی تقدیر، اس کا نصیب سمجھ کر چپ ہو رہا تھا مگر یہ اپنی جگہ کہ وہ اندر ہی اندر ماروی کے ناکام عشق میں گھلنے ضرور لگا۔

ادھر باپ نے بھی اپنے مجنوں بیٹے کی حالت کو محسوس کرلیا تھا اور جو اپنے منہ سے کچھ نہیں کہتا تھا مگر روشو کا دل بیٹے کی اس ''خاموش'' اذیت پر کڑھتا ضرور تھا۔ یوں دونوں بھائیوں کے خلاف روشو پہلوان کے دل میں نفرت کی آگ مزید سلگ اٹھی مگر وہ بے بس تھا۔ اب اس کے ہاتھ میں کچھ بھی کرنے کو نہ رہ گیا تھا۔ گویا اس نے خیر بخش کے لیے جو گڑھا کھودا تھا، اس میں وہ خود گر گیا تھا بلکہ اپنے اکلوتے بیٹے کو بھی گرادیا تھا۔ اپنے بیٹے کی حالت کا وہ خود کو ذمے دار سمجھتا تھا۔

لاڑکانہ کا ملاکھڑا مقابلہ تیار تھا۔ چند روز بعد خیر پور کے یہ دو زورآور پہلوان بھائی، اپنے استاد محبوب شاہ کے ساتھ روانہ ہوئے۔ اس مقابلے میں کندھ کوٹ اور کشمور سے دو نامور ..... ملھ پہلوان دادن سندھو اور ایوب بھٹی آئے تھے۔ جبکہ لاڑکانہ کے تین نامی گرامی صوبائی شہرت یافتہ پہلوان ملنگ خان، قلندر بخش اور آغل شاہ شامل تھے۔

ایوب بھٹی اور آغل شاہ کا شمار اس وقت کے دو ایسے پہلوانوں میں ہوتا تھا جو اَب تک ناقابلِ تسخیر تھے یعنی ان کے کریڈٹ میں آج تک شکست نہ دیکھی گئی۔

ملاکھڑا کے بڑوں نے ان دونوں پہلوانوں کو آپس میں لڑانے کا بھی اہتمام کیا تھا مگر مقامی و ضلعی انتظامیہ نے اس عظیم الشان مقابلے کو ''چیلنج'' کا ٹھپا لگا کر اس پر پابندی عائد کردی۔

بڑے ملھ مقابلے سے پہلے مقامی انتظامیہ کو دنگل شروع ہونے سے ایک ماہ قبل پہلوانوں کے نام اور مقام سے آگاہ کرنا ضروری ہوتا تھا پھر ان مذکورہ پہلوانوں کو گوٹھوں کے ''امیروں'' کی ذمے داری یا ان کی ضمانت پر کہ ان مذکورہ پہلوانوں کے درمیان کوئی دیرینہ عداوت یا پرانی دشمنی تو نہیں چلی آرہی ہے، اس بات سے مطمئن ہونے کے بعد ملاکھڑے کی اجازت ملا کرتی تھی۔

کہنے والے ان باتوں کو ایک انفارملٹی کہتے تھے۔ تاہم اس میں حقیقت بھی تھی۔ لاڑکانہ میں ''وارہ'' کے کھلے میدان میں یہ عظیم الشان ملھ دنگل تھا تو جہاں دیگر پہلوانوں کی ہاہاکار مچی ہوئی تھی وہیں ان دونوں زورآور بھائیوں خیر بخش اور دھنی بخش کی بھی کم دھوم نہ تھی۔

''وارہ'' میں باقاعدہ میلے کا سماں باندھا جاتا تھا۔ وہاں مقابلہ شروع ہونے سے چند روز پہلے یہ چھپر نما چائے خانے، سگریٹوں کی مانڈلیاں (کیبن) اور ٹھیلے لگنا شروع ہوجایا کرتے تھے۔

آغل شاہ اور ایوب بھٹی کے علاوہ ملنگ خان اور دادن سندھو کی بھی یہ دیرینہ خواہش تھی کہ اس مقابلے میں اپنے دیگر حریفوں کے علاوہ وہ ان دونوں زورآور پہلوان بھائیوں کو خاص طور پر ملھ مات سے دوچار کریں۔

جبکہ ادھر یہ دونوں بھائی بھی ایسا ہی عزم کیے ہوئے تھے کہ ناقابل تسخیر کہلانے والے ان دونوں ملھ پہلوانوں کو شکست دیں۔

دنگل شروع ہوا۔ پہلے لاڑکانہ کے پہلوان ملنگ خان اور کندھ کوٹ کے دادن سندھو کے درمیان مقابلہ ہوا تو ملنگ خان نے اسے نو سیکنڈ کے اندر شکست دے دی پھر ملنگ خان اور دھنی بخش آمنے سامنے ہوئے۔

ملنگ خان اور دھنی بخش نے میدان میں اترتے ہی ایک دوسرے کے سوتروں میں ہاتھ ڈال کر چھاتیاں ملادیں۔ میدان میں شور ابھرا۔ دونوں پہلوانوں کے بیچ زور آزمائی کا مرحلہ شروع ہوگیا۔ ملنگ خان نے دھنی بخش کے پہاڑ سے وجود کو کھدیڑنے کی کوشش کی تو دھنی بخش دانستہ ایک گام پیچھے ہوا اور پھر اس نے ملنگ خان کے ہی زور پر اسے جھپی ڈالے پہلے دائیں پھر بائیں پھیری دی۔ ملنگ خان نے اپنے حریف کا متوقع داؤ تاڑلیا اور اس سے قبل ہی اپنا داؤ کھیلنے کی کوشش کرتے ہوئے اسے ہلکا سا جاٹھامار (اوپر اٹھانا) کے دائیں بازیں اڑنگا لگانا چاہا تو دھنی بخش نے فوراً اس کا توڑ نکالتے ہوئے اپنی بائیں ٹانگ کو اس کی دائیں ٹانگ کے اڑنگے سے نکال کر بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ بایاں اور اندریں اڑنگا لگایا، محض ساتویں سیکنڈ میں ملنگ خان چت ہوچکا تھا۔ مجمع میں غضب کا شور ابھرا۔

دھنی بخش نے صوبائی شہرت کے حامل پہلوان کو ملھ مات دے دی تھی اور ثابت کردیا تھا کہ وہ ایک زورآور پہلوان ہے۔

دادن سندھو کا قلندر بخش کے ساتھ مقابلہ ہوا اور قلندر بخش نے دسویں سیکنڈ میں دادن سندھو کو چاروں شانے چت کر دیا تھا۔

پھر جب خیر بخش اور آغل شاہ کو میدان میں اتارا گیا تو مجمع کو سانپ سونگھ گیا۔ بات ہی ایسی تھی۔ خیر بخش جیسے ایک ابھرتے ہوئے پہلوان کے مقابلے میں ناقابلِ تسخیر پہلوان آغل شاہ کو اتارا گیا تھا۔ اور دونوں زبردست حریف اپنے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے کیا عزم رکھے ہوئے تھے، یہ بھی لوگ جانتے تھے۔

آغل شاہ، خیر بخش سے پانچ برس بڑا تھا اور لمبے چوڑے وجود کا مالک تھا۔

اس نے بڑی سخت حریفانہ نظروں سے خیر بخش کو گھورا اور پھر دونوں پہلوانوں نے سوتروں میں ہاتھ ڈال کر چھاتیاں ملا دیں۔ کمنٹیٹر نے لاؤڈ اسپیکر پر پورے جوش کے ساتھ بنکارنا شروع کر دیا تھا۔

آغل شاہ نے خیر بخش کو تر نوالا سمجھ کر یہ تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اسے چار پانچ سیکنڈ سے زیادہ میدان میں ٹکنے نہیں دے گا مگر اس نے جیسے ہی زور آزمائی کی ابتدا کرتے ہوئے داؤ کھیلا تو خیر بخش چکنی مچھلی کی طرح اس کے داؤ سے نہ صرف نکل چکا تھا بلکہ اس نے اپنے دونوں مضبوط بازوؤں کے حصار میں آغل شاہ کے بھاری بھرکم وجود کو کس کر جانٹھا مار کر اوپر اٹھا لیا اور تین چار زوردار پھیریاں دے کر پٹخنے کی کوشش کی تو آغل شاہ نے فوراً اپنی ستونوں جیسی ٹانگیں بھربھری مٹی والے میدان پر کیل کر لیں اور زور آور خیر بخش کو آغل شاہ کا وجود یوں لگا جیسے زمین پر کوئی مضبوط ستون گڑ کر رہ گیا ہو۔ وہ اسے پھر ایک انچ بھی نہ ہلا پایا مگر پھر اس نے فوراً ہی اپنے وجود کی ساری طاقت اپنے دونوں بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے آغل شاہ کو کھدیڑا تو آغل شاہ چند قدم پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گیا مگر اس کے ساتھ ہی اس نے خیر بخش کو دائیاں اڑنگا لگا دیا۔ اس دوران مدِمقابل کو بائیاں اڑنگا لگانے کا خاطر خواہ نتیجہ نکلتا تھا مگر مقابل بھی خیر بخش جیسا زور آور پہلوان تھا، وہ خوب جانتا تھا کہ ایسی دہری اور خطرناک صورت میں کون سا داؤ کھیلنا چاہیے تھا۔

خیر بخش نے سب سے پہلے بلا خیز پھرتی اور مہارت کے ساتھ خود کو آغل شاہ کے اڑنگے سے کامیابی کے ساتھ نکالا پھر آغل شاہ کو اس کے زور پر لامائی (نصف پھیری) دے ڈالی اور آغل شاہ کے وجود نے جیسے ہی جھول کھایا، خیر بخش نے اڑنگا لگانے کی بجائے پہلو کے بل پر دھوبی پٹا لگا دیا۔ آغل شاہ کا پہاڑ جیسا وجود کئی انچ تک ہوا میں اچھلا اور وہ بری طرح چاروں شانے چت ہو گیا۔

خیر بخش نے ایک ناقابلِ تسخیر پہلوان کو شکست دے کر اپنے خطاب کی لاج رکھ لی تھی۔

مجمع میں غضب کا شور بلند ہوا اور یہ شور تھمنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ خیر بخش کے لیے آغل شاہ کو شکست دینا معمولی فتح نہ تھی۔ سائیں محبوب شاہ تو مارے خوشی کے پاگل ہوا جا رہا تھا۔

میدان میں کافی دیر تک غل مچا رہا۔ ڈھول پیٹے جاتے رہے۔ آغل شاہ کا چہرہ شکست و ذلت کے احساس سے بری طرح مسخ ہو چکا تھا۔ تاہم اس نے پورے وقار کے ساتھ اپنے حریف کو گلے سے لگا کر مبارک باد دی۔

اس کے بعد ایوب بھٹی، دھنی بخش آمنے سامنے ہونے۔ ان دونوں کے آمنے سامنے ہونے کا تو ہر کسی کو شدت سے انتظار تھا۔ کیونکہ بڑے نے تو ایک ناقابلِ شکست حریف ہرا کر پالا مار لیا تھا۔ اب چھوٹے کو بھی یہ میدان مارنا تھا۔

ڈیل ڈول میں میدان برابر کا تھا۔ مگر دھنی بخش اور ایوب بھٹی کے بیچ ایک تفاوت تھی اور وہ عمر کی تھی۔ ایوب بھٹی پورے دس سال اس سے بڑا تھا۔ دھنی بخش بیس کے لپیٹے میں تھا جبکہ ایوب تیس اکتیس سال کا تھا۔ جب دونوں پہلوانوں نے ایک دوسرے سے چھاتیاں ملا دیں تو مجمع جیسے سانپ سونگھ گیا۔ حتیٰ کہ چند لمحات کے لیے تو کمنٹیٹر کو بھی ایک عجیب سی چپ لگ گئی۔ پھر جب ایوب بھٹی نے دھنی بخش کو کھدیڑا کر داؤ کھیلا تو جیسے مجمع کو زبان مل گئی۔ ہلاشیری کا طوفان امڈ پڑا اور کمنٹیٹر نے بھی بنکارنا شروع کر دیا۔

ایوب بھٹی نے دھنی بخش کو اٹھتے ہی دھوبی پاٹ مارنے کی کوشش کی تھی مگر دھنی بخش بھی غضب کا کایاں تھا۔ وہ اس کے پہلو والے داؤ سے نکلا اور بھٹی کو چکر پھیری دی۔ بائیں جانب لامائی (نصف پھیری) دے کر دایاں اڑنگا لگا دیا۔ ایوب بھٹی یکدم اچھل کر اس کے داؤ سے نکلا۔ دھنی بخش کے پہاڑ جیسے وجود کو اپنے جثے کی طاقت اور موٹی ستونوں ایسی ٹانگوں کے زور پر کھدیڑا اور یکدم جانٹھا مارا (اوپر اٹھایا) دھنی بخش نے فوراً اپنی دونوں ٹانگیں ٹکا کر گھٹنے اس کے پیٹ پر رکھ دیے۔ ایوب بھٹی نے گلا پھیری دینا شروع کر دی۔



میدان میں ناقابلِ شکست اور زور آور کے درمیان غضب کا رن پڑ چکا تھا۔ شائقین کی آنکھوں میں بلا کا تجسس اور سنسنی خیزی پائی جاتی تھی۔ کمنٹیٹر چیخے جا رہا تھا۔ دھنی بخش سمجھا تھا کہ ایوب بھٹی اسے محض دو تین پھیریاں دے کر اتارنے پر مجبور ہو جائے گا مگر ایسا نہ ہوا، دھنی بخش کا سر گھومنے لگا اور اس نے سیدھے سادے داؤ کو خطرے کی طرف جاتے محسوس کر لیا کیونکہ سر گھومنے کا مطلب تھا جب ایوب بھٹی اسے نیچے اتارتا تو پلک جھپکتے ہی اڑنگا لگانے کی کوشش کرتا اس طرح دھنی بخش خود کو نہ سنبھال پاتا۔ چنانچہ دھنی بخش نے اس کے پیٹ سے اپنے دونوں ”ٹکے“ ہوئے گھٹنے ہٹا دیے اور ایک پاؤں زمین سے لگا دیا، دوسری ٹانگ زمین سے چند انچ معلق رکھتے ہوئے حریف کی چکر کھاتی ٹانگوں کے درمیان اڑنگا لگا دیا۔

ملھ کشتی میں ایک بار سوتروں میں ہاتھ ڈال دیے اور چھاتیاں مل گئیں تو یہ تب ہی علیحدہ ہوتی تھیں جب دونوں حریفوں میں سے ایک کو فتح یا شکست مل جاتی۔

دھنی بخش نے بہت خطرناک پچویشن میں خطرناک داؤ کھیلا تھا اور اس پر سوا یہ کہ اس کھیلے جانے والے داؤ کی خطرناکی نہ صرف حریف کے لیے بلکہ خود داؤ ڈالنے والے کے لیے بھی نقصان دہ ہو سکتی تھی لیکن دھنی بخش نے بھانپ لیا تھا کہ وہ ایوب بھٹی کے ”قلعہ نما“ داؤ میں مقید ہو چکا ہے اور اب جوا کھیلنے کے سوا کوئی چارہ نہیں، اس لیے اس نے یہ داؤ کھیلا اور پھر دوسرے ہی لمحے خود اس کے وجود کو جھٹکا لگا۔ ادھر ایوب بھٹی بھی بری طرح لڑکھڑایا۔ یک بیک دونوں پہلوان اس خطرناک داؤ میں خلط ملط ہو گئے۔ اب جس نے پہل کی اس نے میدان مارا والا معاملہ تھا۔

دھنی بخش نے خود کو سنبھالا دینے میں زیادہ وقت ضائع نہ کیا اور جیسے ہی اس نے محسوس کیا کہ ایوب بھٹی کے قدم اکھڑنے لگے ہیں تو اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ پوری طاقت سے ایوب بھٹی کو کھدیڑ ماری اور ایوب بھٹی نیچے آ رہا۔ مجمع میں غضب کا شور بلند ہوا۔ کمنٹیٹر کمنٹری کرتے کرتے فرطِ جوش سے اٹھ کر کھڑا ہوا نتیجتاً اس کی آواز مائک سے ہٹ گئی مگر اس نے کھڑے ہو کر مائیک پکڑ لیا اور لاؤڈ اسپیکر میں بنکارنے لگا۔ ”واہ ڑے...... واہ...... دھنی بخش...... آج تو نے بڑا میدان مارا۔ دونوں زور آور بھائیوں نے آج کے ملاکھڑے میں اب تک ناقابلِ تسخیر رہنے والے دونوں ملھ پہلوانوں، ایوب بھٹی اور آغل شاہ کو شکست دے ڈالی۔

سائیں محبوب شاہ کی آنکھیں خوشی سے لبریز تھیں۔

ڈھول پیٹنے میں لگے خیر پور کے باسیوں نے دونوں زور آور بھائیوں کو پھولوں اور نوٹوں کے ہار ڈال دیے۔

دو تین دنوں تک لاڑکانہ میں ہی دعوتوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ تیسرے روز لاری بھر کر خیر پور پہنچی تو... پورے خیر پور میں چراغاں کیا گیا۔ زمیندار اللہ ورایو اپنے ہونے والے داماد خیر بخش اور اس کے بھائی کی شاندار فتح پر خوش تھا۔

ان دونوں بھائیوں کی شاندار دعوت کا انتظام کیا گیا مگر اس میں دھنی بخش نے شرکت نہیں کی تھی اور بہانہ بنا لیا تھا۔

ایوب بھٹی، آغل شاہ اور قلندر بخش کو شکست دینا معمولی بات نہ تھی۔

چار دانگ دونوں زور آور بھائیوں کے ڈنکے بجنے لگے تھے۔ بڑے بڑے ملھ مقابلوں کی انہیں دعوتیں ملنے لگی تھیں۔

☆☆☆

### جون ایلیا

(1930ء ۔ 2002) ممتاز اردو شاعر اور ادیب۔ وہ امروہہ میں پیدا ہوئے۔ 1957ء میں انہوں نے پاکستان ہجرت کی۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد شفیق حسن ایلیا کی سرپرستی میں حاصل کی۔ اردو، فارسی اور عربی میں ایم اے کیا۔ آٹھ برس کی عمر میں پہلا شعر کہا۔ 18 برس کی عمر میں فلسفے پر کتاب کے مصنف تھے۔ تاریخ، فلسفہ، مذاہب عالم پر ان کا مطالعہ بڑا گہرا تھا۔ وہ اردو کے منفرد اور صاحب اسلوب شاعر تھے اور بین الاقوامی شہرت کے حامل تھے۔ شاعری کو انہوں نے مکالمے میں تبدیل کر دیا۔ مشاعروں میں ان کے سامنے کسی اور کا چراغ مشکل ہی سے جلتا تھا۔ لیکن کثرتِ شراب نوشی نے ان کی صحت کو برباد کر دیا۔ کلام کا واحد مجموعہ ”شاید“ نے عوامی پذیرائی حاصل کی، دوسرا مجموعہ ”یعنی“ کے نام سے مرتب کیا۔ کراچی میں انتقال کیا۔

مرسلہ: اصغر علی سید، لاہور

''تو نے کچھ کر کے نہیں دیا...... دیکھ، دونوں بھائیوں کو...... کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ تو ان سے زیادہ اچھی ملھ لڑتا تھا مگر ایک چھوکری کے پیچھے خوار ہوگیا۔'' روشو پہلوان نے اس روز اپنے بیٹے رب ڈنو کو خوب لتاڑا ہے۔

''یہ بات تو بھی جانتا ہے اچھی طرح...... کہ آج وہ دونوں بھائی جس مقام پر ہیں، وہ تیری وجہ سے ہیں۔ اڑے...... پہلوان تو تو تھا، وہ دونوں تو یتیم ہونے کے بعد گوٹھ کی دھول اڑاتی گلیوں میں آوارہ پھرتے تھے۔ تیری دوستی کے باعث انہیں ملاکھڑے سے دلچسپی پیدا ہوئی، دونوں ننگے بھوکے بھائیوں کے پاس کھانے کو پیسے نہیں ہوتے تھے اور تو ان سنپولیوں کو اپنے باڑے کی بھینسوں کا خالص دودھ پلایا کرتا تھا۔ دیکھ لیا تو نے...... آج خیر بخش نے تیری محبت پر شب خون مارا...... دوستی کی آڑ میں تیری پیٹھ میں خنجر گھونپا۔''

باپ کی باتوں نے رب ڈنو کے سینے میں خوابیدہ آتش فشاں کو بھڑکا دیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس کا باپ کچھ ایسا غلط بھی نہیں کہہ رہا ہے مگر پھر وہ یہ بھی سوچتا کہ اس میں بھلا ان دونوں بھائیوں کا کیا قصور تھا؟

پھر خیر بخش کو بھی کہاں معلوم تھا کہ جس لڑکی کو وہ چاہتا ہے، وہ رب ڈنو کی پسند تھی؟ لیکن اس کے باپ نے رب ڈنو کے دل ودماغ میں دونوں بھائیوں کے خلاف جو زہر بھرنا چاہا تھا، وہ اس میں کامیاب ہو چکا تھا۔

رب ڈنو انہی جذبات سے ایک روز اس قدر مغلوب ہوا کہ وہ خیر بخش کے آڑے آگیا۔ اس وقت خیر بخش کے ہمراہ اس کا چھوٹا بھائی دھنی بخش بھی تھا۔

باپ نے جو زہر رب ڈنو کے دل ودماغ میں بھرا تھا، اس نے وہی ان دونوں بھائیوں کے سامنے اگل دیا۔

خیر بخش کے مقابلے میں دھنی بخش زیادہ گرم مزاج تھا۔ ''یہ کیا بکواس کر رہا ہے تو رب ڈنو! زبان سنبھال کر بات کر۔'' دھنی بخش نے غصے سے سرخ ہو کے کہا تو خیر بخش نے بُردبارانہ سنجیدگی کے ساتھ چھوٹے بھائی کو مخاطب کیا۔

''دھنی بخش! تم چپ رہو، مجھے بات کرنے دو۔''

پھر اس نے رب ڈنو کی طرف دیکھ کر معتدل لہجے میں کہا۔ ''رب ڈنو! تمہاری یہ بات درست ہے بلکہ ہم تمہارے احسان مند بھی ہیں کہ ہمیں ملاکھڑے کے میدان میں لانے، ہماری رہنمائی ومدد کرنے میں تمہارا ہی ساتھ اور تعاون ہے اور ہم نے تمہارے باپ کے اکھاڑے میں ہی ملھ پہلوانی کی ابتدائی سوجھ بوجھ سیکھی۔ رہی بات ماروی کی، مجھے تو تمہاری سوچ پر افسوس کم اور حیرت زیادہ ہو رہی کہ تم نے اتنی بڑی بات کیسے کہہ دی؟ اتنا بڑا الزام مجھ کیسے لگا دیا کہ میں نے تمہاری محبت پر ڈاکا ڈالا ہے۔ اڑے یار، ہم تو یاروں کے یار ہیں۔ اگر مجھے پتا ہوتا کہ ماروی تیری پسند ہے تو قسم مرشد علی مولا کی، میں پیچھے ہٹ جاتا۔ اب تو بات پکی ہو چکی ہے اور تو جانتا ہے کہ......''

''بس...... بس کر میرے یار!'' معاً رب ڈنو کا جیسے دماغ کدورت سے پاک ہوگیا اور وہ شرمسار سا نظر آنے لگا۔ دونوں بھائیوں نے رب ڈنو کو گلے لگا لیا۔ رب ڈنو فطرتاً برا نہ تھا۔ اب دونوں بھائیوں نے اس پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کہ اسے ملاکھڑا کے میدان میں دوبارہ لوٹنا ہے۔

روشو پہلوان کو جب پتا چلا کہ دونوں بھائیوں نے اس کے بیٹے رب ڈنو کے دل سے کدورت دھو ڈالی ہے تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔

☆☆☆

ادھر یکے بعد دیگرے کشمور اور لاڑکانہ کے عظیم الشان مقابلوں کے میدان مارنے کے بعد دو مقابلے شکارپور اور خیر پور میں منعقد ہوئے۔ ایک بھائی نے خیر پور میں شرکت کی اور دوسرے نے شکارپور میں، دونوں بھائیوں نے یہ میدان بھی مار لیے تھے۔

اس دوران خیر بخش کی شادی ماروی کے ساتھ بڑی دھوم دھام کے ساتھ انجام پاگئی تھی کہ دو عجیب واقعات رونما ہوئے۔

دھنی بخش نے وہ گھر چھوڑ دیا اور خیر پور میں ہی ایک دو کمروں والا چھوٹا سا مکان خرید لیا۔ دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ رب ڈنو اور اس کے باپ روشو پہلوان نے گوٹھ سے [illegible] ہجرت کرلی۔

خیر بخش کو البتہ اپنے چھوٹے بھائی دھنی بخش کا مکان چھوڑنے پر حیرت ضرور ہوئی، وہ سمجھا تھا کہ شاید مکان چھوٹا پڑنے کے باعث ایسا تھا مگر یہ بات نہ تھی کیونکہ مکان چھوٹا نہ تھا، دو گھرانوں کے لیے بہت تھا۔ خیر بخش کے پوچھنے پر دھنی بخش نے اسے گول مول سا جواب دیا تھا۔

اس نے ناراضی کی وجہ اپنے دل تک ہی محدود رکھی تھی۔ مگر تاڑنے اور محسوس کرنے والے بھی غضب کی نظر رکھتے تھے۔

دونوں بھائی مشہور تھے۔ ان کی ناراضی بھی چھپی نہ رہ سکی۔

سائیں محبوب شاہ تک یہ بات پہنچی تو اس نے سب سے پہلے بڑے بھائی خیر بخش سے علیحدگی میں اس کی وجہ دریافت کی۔

''میں خود حیران ہوں مرشد سائیں! آخر اوا دھنی بخش کو کیا ہو گیا ہے؟'' خیر بخش نے دانستہ جانتے بوجھتے ہوئے بھی گول مول جواب دیا تھا۔

''کہیں ایسا تو نہیں کہ ماروی سے شادی تم دونوں کے بیچ ناراضی کا سبب بنی ہو؟'' بالآخر سائیں محبوب شاہ نے شنیدہ بات کا اظہار کر ہی دیا۔

''ممکن ہے مرشد سائیں کہ ایسا ہی ہوا ہو؟'' خیر بخش نے بھی تائید کی۔

''ہوں...... میں دھنی بخش کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔'' سائیں محبوب شاہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

سائیں محبوب شاہ نے پھر دھنی بخش کو اپنے تئیں سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر دھنی بخش بھلا کب سمجھنے والا تھا۔ وہ جو سمجھ چکا تھا، اب بھلا اس سے آگے سمجھنے کی کیا گنجائش باقی بچی تھی۔

خیر بخش کے لیے ماروی بہت اچھی بیوی ثابت ہوئی۔ بہت محبت کرنے والی، نیک اور شوہر کی وفادار۔ مگر اس نے بھی جلد ہی اپنے شوہر...... کے دل میں چھپی ہوئی بھائی کی ناراضی کے دکھ اور کسک کو محسوس کر لیا تھا۔ ''سائیں......! آپ کہیں تو میں خود جا کر بھا دھنی بخش کو منانے کی کوشش کرتی ہوں۔''

''نہیں ماروی! کہیں تجھے دیکھ کر اس کی ناراضی بھڑک نہ اٹھے۔'' خیر بخش نے کہا۔

''میں اس کی بھاجائی (بھابی) ہوں۔ شاید وہ میرا مان ہی رکھ لے۔'' ماروی نے اصرار کیا۔ درحقیقت اسے اپنے شوہر...... کے دکھ کا اندازہ تھا اور وہ صدقِ دل سے یہ چاہتی تھی کہ دونوں بھائیوں کے بیچ صلح ہو جائے۔

خیر بخش کو اپنے چھوٹے بھائی دھنی بخش سے بہت محبت تھی۔ اس کی ناراضی نے اسے واقعی اندر سے گھائل کر دیا تھا۔ بیوی کے اصرار پر اور بھائی کی ناراضی ختم ہونے کی امید پر اس نے بالآخر اس کی بات مان لی۔

دونوں میاں بیوی دھنی بخش کے گھر خیر پور پہنچے۔ دھنی بخش نے بے تاثر انداز میں ان کا استقبال کیا تھا اور جب ماروی نے دھنی بخش سے وہ ''حساس'' موضوع چھیڑا تو دھنی بخش نے فوراً روایتی انداز میں اپنے کاندھے کی اجرک بھابی کے سر پر ڈال دی اور سنجیدگی سے بولا۔ ''بھاجائی! مجھے تیرے سے کوئی ناراضی نہیں، تو اب ہمارے خاندان کی ''لج'' (عزت) ہے۔ یہ معاملہ صرف ہم دونوں بھائیوں کے بیچ ہے، اسے ہم دونوں تک ہی محدود رہنے دو۔''

یہ روکھا جواب تھا یا دوٹوک، اس نے دونوں میاں بیوی کو مایوس کر دیا تھا۔ خیر بخش کو شاید پہلے سے اندازہ تھا، یہی سبب تھا کہ وہ بھی کچھ کہنے کے لیے سوچ کر آیا تھا، بولا۔ ''اوا دھنی بخش! اگر تو اس مکان میں (احمد پور والے) رہنا چاہتا ہے تو بے شک رہ، میں اور ماروی دوسرا مکان دیکھ لیتے ہیں۔''

ایسا اس نے اس لیے کہا تھا کہ چلو اس بہانے بھائی اپنے پاس گوٹھ میں تو رہے گا مگر دھنی بخش نے اس بات سے بھی صاف انکار کر دیا۔

ملھ مقابلے جاری تھے۔ اور دونوں بھائی شہرت کی بلندیوں کو چھو رہے تھے۔ ملھ دیکھنے کے شائقین ان دونوں بھائیوں کو بھی مدِمقابل دیکھنے کے خواہش مند تھے۔ دونوں کے مقابلے بھی ہوتے رہتے تھے مگر دونوں چونکہ ہم پلہ تھے اس لیے دونوں کے حصے میں برابر کی ہار جیت آتی رہتی تھی۔

انہی دنوں خیر پور میں ایک اور ملاکھڑا پہلوان خمیسو نوناری کے چرچے ہونے لگے۔ وہ انہی کے اکھاڑے (سائیں محبوب شاہ کے اکھاڑے) سے تعلق رکھتا تھا۔

خمیسو خان نوناری کا آباڑاں گوٹھ (آبائی گاؤں) خیر پور ناتھن شاہ تھا جو ضلع دادو میں واقع ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ سائیں محبوب شاہ کا تعلق بھی اسی گاؤں سے تھا۔ خمیسو خان اس کے دور پرے کے رشتے داروں میں سے تھا۔ کچھ عرصہ قبل پرانی دشمنی کے باعث وہ ہجرت کر کے یہاں خیر پور آگیا تھا اور سائیں محبوب شاہ کے اکھاڑے میں شامل ہوگیا تھا۔

کہنے والوں سے یہ بھی سنا گیا تھا کہ خمیسو خان کی ملاکھڑے میں کوئی خاص شہرت نہ تھی۔ مگر جب اس نے سائیں محبوب شاہ کے اکھاڑے میں شمولیت حاصل کی اس کا فنِ پہلوانی تیزی سے نکھرا تھا۔

(حاجی نکھڑوں خان اور شیرو جلاد جیسے نامی گرامی پہلوان بھی سائیں محبوب شاہ کے شاگرد رہ چکے تھے)

ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ ایک ہی اکھاڑے کے ملھ پہلوان آپس میں ''زور آزما'' ہوتے۔ البتہ نچلی سطح کے

مقابلے ... عموماً ہوتے رہتے تھے۔ مگر شائقین ملاکھڑا نے جہاں دونوں زورآور بھائیوں کو ایک میدان میں ایک دوسرے کے مدِمقابل کر دیا تھا تو یہ بھی ان کے لیے کوئی مشکل کا باعث نہ تھا۔ یوں خمیسو خان اور یہ دونوں بھائی آمنے سامنے ہوئے۔

کچھ لوگوں کے مطابق یہ چیلنج مقابلہ تھا لیکن چونکہ چیلنج مقابلوں پر سخت پابندی تھی اس لیے اسے ظاہر نہیں ہونے دیا گیا تھا۔ اور اس (چیلنج) اکھاڑے میں..... ان تینوں کے مقابلے کو چیلنج کی زد سے بچانے کے لیے بیرونِ شہر کے ملھ پہلوانوں کو بھی ملاکھڑے کی دعوت دی گئی تھی۔

☆☆☆

سمجھنے والے اس مقابلے کو چیلنج ہی سمجھتے تھے۔ ملاکھڑے کا آغاز ہو چکا تھا اور بیرونِ شہر سے آئے ہوئے ملھ پہلوانوں کے درمیان مقابلہ شروع ہو چکا تھا۔ خمیسو خان بھی جیت رہا تھا اور دونوں بھائی بھی۔

چوتھے ملھ مقابلے میں بالآخر وہ وقت آ گیا جس کا شائقین کو شدت سے انتظار تھا۔

یعنی خمیسو خان اور خیر بخش آمنے سامنے ہوئے۔

دونوں پہلوان آمنے سامنے ہوئے اور پھر ایک دوسرے کے سوتروں میں ہاتھ ڈال کر چھاتیاں ملا دیں۔ خمیسو خان کے ملھ لڑنے کے انداز سے خیر بخش اچھی طرح واقف تھا اور یہی حال خمیسو خان کا بھی تھا۔ گویا دونوں ایک دوسرے کے داؤ پیچ اور رموز سے واقف تھے۔

چھاتیاں ملاتے ہی دونوں کو اندازہ تھا کہ وہ پہلے کون سا داؤ کھیل سکتا تھا۔ ایسے حالات میں ڈاج بازی سے کام لیا جاتا تھا لیکن یہ پہلا کام خمیسو نے کیا اور خیر بخش کو کھدیڑ کر پہلے بایاں اڑنگا لگایا۔ خیر بخش نے اچھل کر یہ اڑنگا توڑا تو خمیسو خان نے پہلو کے بل پر خیر بخش کو بایں اڑنگا دے کر اس کے وجود کو اچکنے کی کوشش کی تاکہ دھوبی پٹا مار کر اسے چاروں شانے چت کر دے مگر مقابلے میں بھی زورآور پہلوان تھا۔ لہٰذا خیر بخش نے اس کا یہ داؤ بھی توڑ دیا اور دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے ستونوں جیسے پاؤں بھربھری مٹی والے میدان پر گاڑ کر خمیسو خان کو کھدیڑا اور اڑنگا لگا دیا۔ خمیسو خان خود کو اس داؤ سے نہ بچا سکا مگر گرتے گرتے اس نے داؤ پیچ کی تکنیک کو خیرباد کر کے اپنے بھاری بھرکم وجود کی پوری قوت کا زور لگا کر خیر بخش کو بھی لامائی (نصف پھیری) دے ڈالی اور فیصلہ تقدیر پر چھوڑ دیا۔

یہ ایک جوا تھا جو آڑے وقت میں کھیلا جاتا تھا۔ مدِمقابل کے داؤ میں آ جانے کے بعد اس سے خود کو بچانے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ خیر بخش اپنے بھاری بھرکم جسم رکھتے ہوئے جتنی بھی پھرتی اور تکنیک بروئے کار لا سکتا تھا وہ لایا تھا مگر عین آخری لمحات میں خمیسو خان کے بھاری ڈیل ڈول کی طاقت کے ''دیے'' خود کو نہ بچا پایا۔

اب دونوں پہلوان ایک دوسرے کے زیرِ داؤ آ چکے تھے۔ دیکھنا یہ تھا کہ زمین کی کششِ ثقل پہلے اپنی طرف کھینچتی ہے اور یہ بدقسمتی خیر بخش کے حصے میں آئی تھی۔ وہ چاروں شانے چت ہو گیا اور خمیسو خان اس کے اوپر آ رہا۔

مجمع میں غضب کا شور ابھرا اور یوں خمیسو خان نے خیر بخش کو ملھ مات دے دی۔

دو ایک مقابلوں کے بعد خمیسو خان اور دھنی بخش آمنے سامنے ہوئے۔ اس کے دل میں شدت کے ساتھ یہ خواہش ابھری تھی کہ وہ خمیسو خان سے اپنے بڑے بھائی خیر بخش کی شکست کا بدلہ ضرور لے گا۔

ملاکھڑے کا یہ ان دونوں کے بیچ آخری مقابلہ تھا۔ شائقین میں بھی اب پہلے سے زیادہ جوش و خروش پایا جاتا تھا۔

بہرحال دونوں پہلوان اکھڑیاں (قدم) مارتے ہوئے میدان میں اترے اور چھاتیاں ملا دیں۔

اس بار بھی خمیسو خان نے ہی پہلے داؤ کھیلا تھا حالانکہ دھنی بخش پر تولے بیٹھا تھا۔ دونوں جسمانی طاقت، ڈیل ڈول کے لحاظ سے برابر کے حریف تھے۔ زور آزمائی کی ابتدا شروع ہو گئی اور دونوں پہلوان اپنے اپنے بھاری بھرکم وجود کی پوری طاقت لگا کر ایک دوسرے کو کھدیڑنے کی کوشش کرتے رہے۔ مجمع میں ہلاشیری کا شور پڑ چکا تھا۔

خمیسو خان کو دھنی بخش سے زور آزمائی کرنے کے دوران اندازہ ہو گیا تھا کہ دھنی بخش بھی کم نہ تھا۔ یہی نہیں اپنے بڑے بھائی خیر بخش کے مقابلے میں جوش میں اس سے بھی سوا تھا۔

جب دونوں مدِمقابل ایک دوسرے کو زیادہ نہ کھدیڑ پائے تو دھنی بخش نے ایک خطرناک ڈاج سے کام لیا۔ یکدم خمیسو خان کو دارا کھانے دیا۔ خمیسو خان اپنے تئیں یہی سمجھا تھا کہ دھنی بخش اس کے زور...... کے سامنے نہیں ٹک سکا ہے مگر دوسرے ہی لمحے جب دھنی بخش نے بیدار مغزی اور بلاخیز پھرتی و طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے خمیسو خان کو پھیری لگائی اور اسے آناً فاناً اپنے دائیں پہلو کے دھوبی پٹے پر لیا تو کہیں جا کر خمیسو خان اس کے ڈاج کو سمجھا اور پریشان ہو گیا۔

اب وقت تھا کہ فوری طور پر اس زورآور پہلوان کے شکنجہ نما داؤ سے نکلا جائے ورنہ دھنی بخش کی جیت اور اس کی ہار یقینی ہوتی۔ چنانچہ خمیسو خان نے اپنے حواسوں کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے وجود کی پوری طاقت داؤ توڑنے اور اس سے نکلنے میں لگاتے ہوئے ایک پاؤں زمین پر ''کیل'' کر لیا اور دوسرے پاؤں کو فضا میں معلق کر کے توازن قائم رکھتے ہوئے اس نے دھنی بخش کو لامائی (نصف پھیری) دینے کی کوشش کی۔ خمیسو خان کا یہ دوہرے انداز کا دفاعی داؤ تھا اگرچہ وہ پھر بھی دھنی بخش کے شکنجہ نما داؤ کو توڑ نہ سکا تاہم اس کا فوری طور پر اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ دھنی بخش کے داؤ کی قوت منقسم ہو گئی اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ نتیجہ ڈھاک کے تین پات ہی رہا اور مجبوراً اسے خمیسو خان کو اپنے شکنجے نما داؤ سے ازخود ہی نکالنا پڑا۔

خمیسو خان نے بڑی خوبصورتی اور مہارت کے ساتھ دھنی بخش کے ''زرخیز'' داؤ پر ''قینچی'' لگا دی تھی اور دھنی بخش کو اسے چھوڑتے ہی بنی۔

اب دونوں پہلوان پہلے والی پوزیشن میں آ گئے اور بدستور ایک دوسرے کے سوتروں پر مضبوطی کے ساتھ جمائے رکھے اور چھاتیاں ملائے رکھی تھیں۔ گویا زور آزمائی کا سلسلہ ایک بار پھر وہیں سے شروع ہو گیا جہاں سے منقطع ہوا تھا۔

اس بار دھنی بخش نے خمیسو خان کو داؤ آزمانے کا موقع نہ دیا اور اندریں اڑنگا لگایا۔ خمیسو خان نے اچھل کر اڑنگا توڑا اور دھنی بخش کو لامائی دی۔ دھنی بخش نے اپنے بازو کے حصار کو تنگ کیا اور خمیسو خان کے سہارے خود کو گرنے سے بچا لیا پھر یکے بعد دیگرے نتیجہ خیز انداز میں پہلے دایاں اندریں اڑنگا لگایا پھر پلک جھپکتے ہی بایاں اور باریں اڑنگا لگا کر جھولتے ہوئے خمیسو خان کو پوری قوت کے ساتھ اٹھا کر پٹخ دیا۔

گویا خمیسو خان کو دھنی بخش کے ہاتھوں ملھ مات مل گئی۔ مجمع میں نعرے گونجنے لگے۔

دونوں بھائیوں نے خیرپور کا میدان بھی مار لیا تھا۔ نامی گرامی پہلوان آغل شاہ، قلندر بخش، ملنگ خان، دادن سندھو اور اب خمیسو خان کو بھی شکست سے دوچار کر کے دونوں بھائیوں نے خود کو صوبے بھر میں زورآور پہلوان ثابت کر دکھایا تھا۔

دھنی بخش بہت خوش تھا مگر یہ خوشی خیر بخش کے اندر رہنے والی کسک کی نظر رہنے لگی تھی۔

ملھ مقابلے کے بعد دھنی بخش اپنے بھائی خیر بخش سے الگ ہو گیا۔ اس نے جھوٹے منہ بھی بھائی کو اپنے گھر چلنے کو نہ کہا تھا اور اوطاق سے گھر لوٹ آیا تھا۔

خیر بخش کو اپنی بیوی ماروی سے بھی بہت محبت تھی اور وہ جانتا تھا کہ وہ بےچاری اس کے اندر کے دکھ سے پریشان ہے۔ اس نے اسے خوش رکھنے کے لیے کیا کیا جتن نہ کیے تھے۔ اس لیے خیر بخش کی کوشش یہی تھی کہ وہ اپنے بھائی دھنی بخش کی ناراضی کو ظاہر نہ ہونے دے۔

اس دوران خیر بخش ایک بیٹے کا باپ بن گیا۔ ماروی کا خیال تھا کہ اب شاید خیر بخش کا دھیان اپنے ''چہیتے'' بھائی کی طویل ناراضی سے ہٹ جائے اور ایسا ہوا بھی تھا مگر کچھ عرصے کے لیے۔ اس کے بعد پھر اس پر وہی ازلی قنوطیت طاری رہنے لگی۔ وہ چپ چپ اور خاموش رہنے لگا تھا۔

ماروی جب تک بیوی تھی، تو وہ برداشت کرتی رہی مگر اب جبکہ وہ ایک ماں بھی بن چکی تھی تو اس کے اندر کی انا پرست اور روایتی عورت بیدار ہو گئی تھی۔

ادھر گزرتے وقت کے ساتھ خیر بخش کو بھی یہ احساس ستانے لگا کہ اس نے ماروی کے ساتھ شادی کر کے... غلطی کی تھی۔ اس شادی نے بھائی کو کھو دیا۔ اسے چھوٹے بھائی سے بہت محبت تھی اور یہ محبت آج سے نہیں، بچپن سے تھی۔

خیر بخش کو اب ہر وقت یہی احساس اندر ہی اندر کچوکے لگاتا تھا کہ اس نے ماروی سے شادی کر کے کچھ اچھا نہیں کیا تھا۔

اس نے ماروی کی اس ''حادثاتی'' محبت میں اندھے ہو کر غلط فیصلہ کر لیا تھا جس کے باعث اسے اس بات کا بھی ہوش نہ رہا تھا کہ اس فیصلے سے اس کا بھائی چھوٹ جائے گا۔ یہی نہیں اسے تو اس بات کا بھی اندازہ نہ تھا کہ ماروی اس کے دشمن کی بیٹی تھی۔ مگر پھر جب وہ غیر جذباتی ہو کر اپنی دماغی عقل کو بروئے کار لاتا تو اسے اپنا فیصلہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں لگتا تھا۔

اول تو یہ کہ اس سارے معاملے میں ماروی بےچاری کا کیا قصور تھا؟ اور پھر آج تک تو اس حقیقت سے بھی پردہ نہیں اٹھایا جا سکا تھا کہ اس کے باپ ماسٹر پیر بخش کے قتل میں کیا واقعی زمیندار اللہ ورایو کا ہی ہاتھ تھا؟ جبکہ کسی وقت کی شنیدہ باتوں سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ ماسٹر پیرل کے قتل

میں بدنام زمانہ دھاڑیل (ڈاکو) محبّ شیدی کے گروہ کا ہاتھ تھا اور یہ الگ بات تھی کہ دوستانے میں برادری کے توسط سے زمیندار اللہ ورایو کے ساتھ تعلقات تھے۔

تیسری بات خیر بخش کے دماغ میں یہ آئی تھی کہ اگر دور پرے کے لاحقے سے یہ بات تھوڑی دیر کے لیے فرض کی جاتی کہ ماسٹر پیرل کے قتل میں زمیندار اللہ ورایو کا ہی ہاتھ تھا تو اول وہ خیر بخش کو اپنی بیٹی ہی نہ دیتا، ورنہ تو اس قسم کی دشمنیوں میں تو دشمن کو پانی بھی نہیں پلایا جاتا تھا۔

خیر بخش نے جب اپنے استاد سائیں محبوب شاہ سے یہ بات کہی تو اس نے اس کا بالکل سیدھا سادا اور منطقی جواب دیا تھا۔

"اگر ان افواہوں میں صداقت ہے بھی تو خیر بخش، کیا یہ کافی نہیں کہ اللہ ورایو نے اپنی بیٹی تمہیں دے کر اس دشمنی کو ختم کر دیا ہے؟"

"مگر استاد سائیں! دھنی بخش کو کون سمجھائے؟ وہ مجھ سے ناراض ہو کر بہت دور ہو گیا ہے۔ اب تو مجھ سے بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتا۔"

"یہ معاملہ تو اللہ سائیں پر چھوڑ دے اور ثابت قدم رہ۔ تیرا فیصلہ رب سائیں کو تو پسند ہے ناں، اتنی محبت کرنے والی اور وفادار بیوی تجھے ملی اور اب اس نے تجھے صاحبِ اولاد بھی کر دیا۔"

خیر بخش نے اپنے استاد سائیں کی یہ بات پلّے سے باندھ لی اور اپنے چھوٹے بھائی دھنی بخش کی ناراضی کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا اور اپنے بیوی بچے میں مگن ہو گیا۔

سائیں محبوب شاہ کی بات چند دنوں بعد ہی درست ثابت ہوئی۔ دیکھنے والوں نے دیکھا تھا کہ کچھ روز بعد دھنی بخش خود چل کر اپنے بڑے بھائی خیر بخش کے پاس پہنچا تھا۔

بے چارے خیر بخش اور اس کی بیوی ماروی اسے اپنے ہاں دیکھ کر خوشی سے پاگل سے ہونے لگے۔

دونوں بھائی بڑے پُرتپاک انداز میں ایک دوسرے سے گلے ملے تھے۔ خیر بخش نے اس دوران بہت عجیب بات محسوس کی تھی۔ اس کا بھائی دھنی بخش بار بار اس بات کی گردان کر رہا تھا۔

"ادا سائیں! زندگی موت کا کوئی بھروسا نہیں، اس طرح روٹھے رہنا اچھا نہیں لگتا۔ مختصر زندگی ہے، جس قدر ہو سکے ہنسی خوشی گزار لینا چاہیے۔ اللہ بہتر انصاف کرنے والا ہے۔"

خیر بخش نے جب یہ بات سائیں محبوب شاہ کو بتائی تو اس نے پُرسوچ انداز میں ایک ہمکاری بھری اور بڑا عجیب جملہ خیر بخش سے کہا تھا۔ "اللہ سے دعا کرو۔"

ٹھیک دوسرے دن ہی خیر بخش کو یہ جانکاہ اطلاع ملی کہ اس کے بھائی دھنی بخش کا ایک روڈ حادثے میں انتقال ہو گیا ہے۔

اسے جیسے سانپ سونگھ گیا۔

پھر دیکھنے والوں نے ایک بہت ہی عجیب و غریب منظر دیکھا تھا۔ چھوٹے بھائی دھنی بخش کے کفن دفن اور اسے لحد میں اتارنے تک انہوں نے خیر بخش کی آنکھوں میں آنسو کا ایک قطرہ بھی نہیں دیکھا تھا۔ ورنہ کم از کم اس کی بیوی ماروی کو یہ خدشہ تھا کہ بھائی کی اس جانکاہ موت کا غم اس کے شوہر کو بھی نہ لے ڈوبے، جسے محض ناراضی نے ہی ایک عرصے تک بے دم کر رکھا تھا۔ خیر بخش بس چپ اور کھویا کھویا رہنے لگا تھا۔

دھنی بخش کو اس کے آبائی گاؤں احمد پور کے قبرستان میں ہی دفن کیا گیا تھا جہاں اس کا باپ ماسٹر پیرل بھی آسودۂ خاک تھا۔

خیر بخش نے بہت طویل عمر پائی۔ ایک بیٹے کی ولادت کے بعد اللہ نے اسے ایک بیٹی اور ایک بیٹا اور بھی عطا کیا۔ سب سے چھوٹے بیٹے کا نام خیر بخش نے اپنے چہیتے مرحوم بھائی دھنی بخش کے نام پر رکھا۔ بعد میں سائیں محبوب شاہ کا بھی انتقال ہو گیا اور اب اس کا اکھاڑا خیر بخش نے سنبھال لیا ہے مگر عین شہرت کی بلندیوں پر پہنچ کر اس نے ملاکھڑے کے میدان کو خیرباد کہہ دیا۔ کسی نے اس سے یہ سوال کیا کہ آخر اتنی جلدی ملاکھڑے کے میدان سے کنارہ کشی کی وجہ کیا ہے؟ تو خیر بخش نے بڑے سکون سے مسکرا کر کہا۔ "اڑے بابا! اس میدان میں ابھی اور زور آور پہلوانوں نے آنا ہے۔ ان کو بھی نام کمانے کا حق ہے۔"

اس جواب میں عاجزانہ غرور بھی تھا، ملاکھڑے سے محبت بھی۔

آخری دم تک لوگوں نے خیر بخش کو سائیں محبوب شاہ مرحوم کے اکھاڑے کی خدمت کرتے ہی دیکھا اور کئی ایسے ملھ پہلوانوں نے خیر بخش سے تربیت حاصل کی جنہوں نے آگے چل کر ثقافتی کھیل کو فروغ دیتے ہوئے بڑا نام کمایا۔ گویا خیر بخش نے خود میدان خالی کر کے اپنی دولت ملاکھڑے کے میدان پر نچھاور کر دی اور اپنی اس بات کو سچ ثابت کر... دکھایا کہ اب اوروں کو نام کمانے کا حق ملنا چاہیے۔





# ترک

محمد ایاز راہی

وہ باہمت قوم جس نے آدھی دنیا پر حکمرانی کی اور اب تک آدھی دنیا پر پھیلی ہوئی ہے۔ اسی بہادر قوم کا مختصر سا تذکرہ جس کا ذکر حضور اکرمؐ نے کیا۔ یکساں نام کی وجہ سے پہچان مشکل ہے کہ ان میں سے کس قوم کے بارے میں آپؐ نے بشارت دی تھی۔

## ترک، ایک منفرد قوم!

حدیث مبارکہ ہے کہ ایک بار شمعِ رسالت کے پروانوں میں سے کسی نے بارگاہِ نبویؐ میں لب کشائی کی کہ یارسول اللہ ﷺ میرے ماں باپ آپؐ پر قربان۔ اس کرۂ ارض پر ایک آزاد خانہ بدوش قبیلہ ہے جو ترک قبیلہ کہلاتا ہے ان کے بارے میں کچھ ارشاد فرمایئے۔ اس پر آپؐ نے ترکوں کی آزاد فطرت کو یوں سندِ دوام بخشی۔ فرمایا: "ترکوں کو ان کے حال پہ چھوڑ دو۔" کچھ عرصہ مزید گزرا تو کسی نے

پھر آپ کی توجہ مبارک ترکوں کی طرف مبذول کرائی۔ آپ نے دوسری بار انہی مبارک الفاظ سے ترکوں کا مستقبل روشن اور تابناک فرمادیا کہ ترکوں کی بان سیکھو کیونکہ ان کے مقدر میں طویل حکمرانی لکھ دی گئی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان اکسیر حروف والفاظ نے ذرے کو آفتاب بننے کی سچی بشارت سے نواز دیا۔ (فرمانِ الٰہی ہے کہ میرا حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی زبان سے کچھ نہیں کہتا بلکہ اللہ کی مرضی ومنشا کا اظہار فرماتا ہے) ابونعیم اپنی کتاب طبرانی میں لکھتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ''ترکوں سے مت الجھنا جب تک وہ تم سے نہ الجھیں اس لیے کہ سب سے پہلے ترک ہی مسلمان عربوں سے ان کا ملک چھینیں گے۔'' امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی گراں قدر تصنیف۔ مسئلہ خلافت کے مطابق ترک سلطان سلیم خان اول نے جب 1517 عیسوی (23 ہجری) میں مصر وشام پر قبضہ کیا تو آخری عباسی خلیفہ اور خلیفۃ المسلمین التوکل علی اللہ نے ترک سلطان سلیم خان اول کے ہاتھ پر بیعت کی اور خلافت کے تمام حقوق، امتیازات اور اختیارات ترک سلطان کو سونپ دیے۔ سب سے بڑی چیز مقاماتِ مقدسہ اور حرمین شریفین کی چابیاں تھیں۔ تین آثارِ نبویہ مثلاً نبی کریم ﷺ کی تلوار مبارک، جھنڈا اور چادر مبارک بھی ترک سلطان سلیم خان اول کے حوالے کی گئی جو آج بھی استنبول (ترکی) میں بہ طور سند سابقہ خلافت موجود ہیں۔ حج کی امارت بھی ترکوں کو تفویض ہوئی جو شرعاً خلافت کے اہم ترین فرائض میں سے ہے۔ یوں ترک سلاطین خلیفۃ المسلمین کے لقب اور مسند کے حق دار ٹھہرے اور پھر آیندہ پانچ صدیوں تک تمام عالم اسلام کے بلاشرکتِ غیرے قائد اور خلیفۃ المسلمین رہے۔

علامہ ابن خلدون اپنی شہرۂ آفاق کتاب، مقدمہ ابن خلدون میں رقم طراز ہیں کہ کسی بھی قوم کے عروج وزوال کا عرصہ تین صدیوں پر محیط ہوتا ہے۔ پہلے سو سال میں وہ جدوجہد کرکے عروج حاصل کرتی ہے، اگلے سو سال تک ان کا عروج رہتا ہے جبکہ تیسرے اور آخری سو سال میں وہ قوم زوال پذیر ہوکر قصۂ پارینہ بن جاتی ہے۔ مگر ترک مکمل اور مسلسل چار سو سال تک بغیر کسی نزاع ومخالفت کے تمام عالمِ اسلام کے امام اور خلیفہ رہے۔ اسلام کی مرکزی خلافت کا دعویٰ کوئی قوم بھی نہ کرسکی۔ شکوہ ترکمانی کا جاہ وجلال پورے کرۂ ارض پر صدیوں حاوی رہا۔ عرب لوگ صحرانشیں ہونے کے ناتے ہمیشہ سمندر سے خوف زدہ رہے اور یہ ترک ہی تھے جنہوں نے بعد میں یورپ کے اس مفروضے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا کہ مسلمان سمندر سے خوف زدہ ہیں۔ مسلمانوں کا کوئی بھی حکمران خاندان فتح یورپ میں ترکوں کا شریک نہیں۔ سلاطین ترک میں سے دوسرا ترک سلطان اور خلیفۃ المسلمین سلیمان اول (1520 عیسوی تا 1566 عیسوی) اپنی زندگی میں دنیا کا سب سے بڑا ترک حکمران تھا اور (SULIEMAN-THE-MAGNIFICENT) سلیمان ذی شان، سلیمان پُرشکوہ اور سلیمان اعظم کے نام ولقب سے مشہور ہے۔ ایسی ... بارعب شخصیت کہ غیر ملکی یا یورپی وفود اور سفراء آتے تو دورانِ گفتگو درمیان میں پردہ تان دیا جاتا کہ وہ لوگ سلیمان ذی شان کا سامنا نہیں کر پاتے تھے۔ امیر البحر خیرالدین باربروسہ اسی سلطان کا بحری سپہ سالار تھا۔ ترک فاتح عالم، صاحبِ قران امیر تیمور گورگاں (1369 تا 1398 عیسوی) کا یہ قول تاریخ عالم میں ضرب المثل ہے کہ یہ روحِ سکوں (پوری دنیا، چوتھائی حصہ خشکی، یعنی زمین) میرے عزم وہمت کے آگے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ تاریخ گواہ ہے کہ امیر تیمور نے اپنے اس قول کو عمل سے ثابت کر دکھایا اور فاتح عالم کا اعزاز پایا۔ سمرقند کا یہ عقاب ہی بعد میں علامہ اقبال جیسے مردِ قلندر کا شاہین بنا۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ اسلام کا چشمہ اس دنیا میں جہاں جہاں سے بھی گزرا تو ہر قوم کے مقامی اثرات اور روایات نے اس صاف چشمے کو میلا اور گدلا ضرور کیا سوائے ترک قوم کے کہ صرف ترکوں نے ہی اس اسلامی چشمے کو جوں کا توں رکھا۔ ترک سلطان ملک شاہ سلجوقی (1072 عیسوی تا 1092 عیسوی) نے مدرسہ نظامیہ کے بانی نظام الملک طوسی، نابغہ روزگار حکیم اور شاعر عمر خیام اور دیگر ممتاز ہستیوں کی سرپرستی کی۔ اسی عہدِ زریں میں امام غزالی، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور شہاب الدین سہروردی جیسے بزرگوں نے گلشنِ اسلام کی آبیاری کی اور نام پایا۔ فنِ خطاطی میں خط دیوانی اور خط رقعہ ترکوں کی ایجاد ہے۔ ترک خطاط ابراہیم حنیف نے 1453 عیسوی میں خط دیوانی ایجاد کیا۔ اسی طرح ترک خطاط ممتاز بک نے 1477 عیسوی میں خط رقعہ ایجاد کیا۔ دونوں امر ہوگئے۔ اردو شاعری سے متعلق یہ قول فیصل، مسلّم اور مستند ہے کہ اردو شاعری ایک ترک (امیر خسرو، وفات 1324 عیسوی) سے شروع ہوئی اور ایک ترک (غالب۔ 1799 عیسوی تا 1869 عیسوی) پہ ہی ختم ہوگئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نظم ونثر میں ربّ النوع، اسد اللہ خان غالب سلجوقی، اگر سلجوقی ترکوں کی آبرو ہیں تو دیگر ترکوں کا سرمایہ صد ناز، شاعری کے علاوہ اردو ادب میں غالب کے خطوط بھی بے نظیر اور اپنی مثال آپ ہیں۔ خواجہ ابوالحسن ولد امیر سیف الدین محمود عرف امیر خسرو ترکوں کے قبیلہ لاچین کے چشم وچراغ تھے جنہیں طوطی ہند کا خطاب ملا۔ شاعری کے ساتھ ساتھ موسیقی کے بھی نائیک (موجد وامام) تھے۔ چنانچہ موسیقی میں خیال ترانہ، قول، قلبانہ، قوالی اور طبلہ امیر خسرو کی ایجاد ہے۔ امیر خسرو، خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے محبوب مرید تھے۔ خواجہ نظام الدین اولیاؒ فرمایا کرتے تھے کہ اے اللہ، اس ترک (امیر خسرو) کے سوزِ دروں کے طفیل مجھے بخش دے۔ خواجہ نظام الدین اولیاؒ، امیر خسرو کو ترک اللہ (اللہ کا سپاہی) بھی کہہ کر پکارتے تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے ایک پوتے کا نام ترک تھا جس سے ترکوں کی نسل چلی۔ ترک ولد یافث ولد نوح علیہ السلام، ترک کے معنی ہیں سپاہی، محبوب معشوق، مرد، بہادر، خوبصورت جوان، سورج کو ترکِ چین، ترکِ رز، ترکِ روزگار، ترکِ فلک، ترکِ گردوں اور ترکِ ہم روز کہا جاتا ہے۔ کھانے پینے کے حوالے سے دہی ترکوں کی ایجاد ہے۔

ترک، شعرِ اقبالؒ کے آئینے میں۔

عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی، نطق اعرابی
(نظم، طلوع اسلام، بانگ درا)

کوئی تقدیر کی منطق سمجھ سکتا نہیں ورنہ
نہ تھے ترکانِ عثمانی سے کم ترکانِ تیموری
(بالِ جبریل، نظم 38)

جو کرے گا امتیاز رنگ وخوں مٹ جائے گا
ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر
(نظم، دنیائے اسلام، بانگ درا)

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا
(نظم، طلوع اسلام، بانگ درا)

آج جس خطۂ ارض کو ترکی کہتے ہیں اس کے علاوہ بھی ایسے کئی ممالک ہیں جہاں کے باشندوں کو ترک کہا گیا ہے۔ جس میں سب سے پہلا نام ترکستان کا ہے جو وسطی ایشیائی میں خطہ زمین پر واقع ہے۔ اس کے مشرق میں صحرائے گوبی، مغرب میں بحیرہ کیسپین، جنوب میں ایران، افغانستان اور تبت واقع ہیں۔ یہاں یکے بعد دیگرے مختلف تہذیبیں وجد میں آئیں۔ کبھی یہ علاقہ انتہائی زرخیز تھا۔ لیکن اب زیادہ تر پہاڑی اور صحرائی ہے، البتہ کہیں کہیں نخلستان بھی ہیں۔ سلسلہ کوہ تیان شان ترکستان کو مغربی اور مشرقی حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ مشرقی یا چینی ترکستان کی سطح مرتفع جسے کبھی کاشغر کہتے تھے، تین طرف سے پہاڑوں سے گھری ہوئی ہے۔ یہ اصل میں صحرائے اعظم گوبی کا نخلستانی حصہ ہے جسے چھوٹی پہاڑی ندیاں سیراب کرتی ہیں۔ ایلی (Aelli) یارقند، ختن اور کاشغر اس علاقے کے بڑے بڑے شہر ہیں۔ یہ حصہ چین میں شامل ہے اور اس کا نیا نام سن جیانگ ہے۔ اس کا رقبہ تقریباً پانچ لاکھ پچاس ہزار مربع میل ہے۔ سمرقند کا شہر جو تیمور کی سلطنت کا دارالحکومت تھا، ازبکستان میں واقع ہے۔ فرغانہ کی ریاست، جہاں سے چل کر بابر نے ہندوستان میں مغل سلطنت کی بنیاد ڈالی اور بخارا، جو کبھی اسلامی تہذیب کا مرکز تھا کے علاوہ تاشقند، جمہوریہ ازبکستان کا دارالحکومت ہے۔ اس کا رقبہ تقریباً پونے چھ لاکھ مربع میل ہے۔ یہ حصہ ان دنوں کئی ریاستوں میں بٹا ہوا ہے۔ پورے ترکستان میں جس میں مغربی اور مشرقی دونوں حصے شامل ہیں، معدنیات کی بہتات ہے۔ کوئلہ، سیسہ، مٹی کے تیل، نمک، لوہا اور دوسری دھاتوں اور قیمتی پتھروں کی افراط ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور ملک اسی نام سے پہچانا جاتا ہے جسے ترک، جمہوریہ شمالی قبرص کہا جاتا ہے۔ (Turk, Republic of Northern Cyprus) ترک جمہوریہ شمالی قبرص، قبرص کا حصہ تھا لیکن 15 نومبر 1983ء کے اعلان کے تحت اس کے باشندوں نے یکطرفہ طور پر آزادی کا اعلان کردیا۔ یہ ترکی کے جنوبی ساحل پر یورپ میں واقع ہے۔ یہ قبرص کا شمالی حصہ ہے اور قبرص کے پینتیس 35 فیصد رقبے پر مشتمل ہے۔ ترکی کے سوا کسی دوسرے ملک نے اسے تسلیم نہیں کیا۔ اس کا رقبہ 1295 مربع میل یا 3355 مربع کلومیٹر پر مشتمل ہے جبکہ آبادی تقریباً ڈھائی لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ اس اعتبار سے فی مربع میل تقریباً دوسو افراد آباد ہیں۔ قبرصی کل آبادی کا 18 فیصد ہیں۔ ترک قبرصی باشندوں کی اکثریت ہے، ان کی آبادی کا تناسب 99 فیصد ہے۔

شمالی نکوسیا ملک کا دارالحکومت ہے اور غازی نگوسا

(فاما گستا) بڑا شہر ہے۔ یہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ ترکی کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ انگریزی رابطے کی زبان ہے۔ اس کی آب وہوا سارا سال خوشگوار رہتی ہے۔ بارش کی سالانہ اوسط 100 سینٹی میٹر ہے۔ اس کی اپنی قانون ساز اسمبلی ہے جس کے ارکان کی تعداد 50 ہے۔ ملک میں کثیرالجماعتی نظام نافذ ہے۔ 1985ء میں ترک قبرصی ائرلائنز کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس ضمن میں رکن کے مقام پر بین الاقوامی ہوائی اڈا تعمیر کیا گیا ہے، دوسرا بڑا بین الاقوامی ہوائی اڈا گیکا ٹیکل میں ہے۔ کل 14 ہوائی اڈے ہیں، فاما گستا ایک اہم بندرگاہ بھی ہے، اس کے ذریعے بحری تجارت ہوتی ہے، سڑکوں کی لمبائی 11 ہزار کلومیٹر سے زائد ہے۔ ترشاوہ پھل، آلو اور تمبا کو اس کی اہم زرعی پیداوار ہیں۔ اسے اگرچہ متعدد ممالک نے تسلیم نہیں کیا تاہم چند ممالک اس سے تجارت بھی کرتے ہیں۔ اہم برآمدات میں ترشاوہ پھل، آلو اور تمبا کو جبکہ درآمدات میں مشینیں اور دیگر اشیائے صرف شامل ہیں۔ ترکش لیرا سکے کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ ملک میں چار یونیورسٹیاں ہیں۔ اسے ابھی تک عالمی اداروں نے تسلیم نہیں کیا، تاہم اسلامی ممالک کی تنظیم (OIC) نے اسے مبصر کا درجہ دے رکھا ہے۔ یہاں صدارتی طرزِ حکومت رائج ہے۔

1960ء میں قبرص کی آزادی کے بعد ملک میں جو آئین نافذ ہوا تھا اس میں ترک نژاد قبرصی باشندوں کے جائز سیاسی حقوق اور ایک آئینی شق کے مطابق اہم سیاسی امور میں، ویٹو کا حق دیا گیا تھا نیز آئین میں یہ شق بھی رکھی گئی تھی کہ مملکت کا سربراہ یونانی قبرصی اور نائب صدر ترک قبرصی ہوگا اور موخرالذکر کو امور خارجہ، دفاع، حفاظتی امور، قانون سازی اور ویٹو کا حق حاصل ہوگا علاوہ ازیں، 70 فیصد نمائندے یونانی قبرصی اور تیس فیصد ترک قبرصی ہوں گے اور اسی نسبت سے پولیس، مسلح افواج اور حکومت کے دیگر اداروں میں ترک قبرصیوں کو نمائندگی دی جائے گی، تاہم اکثریت کی نیت ٹھیک نہ تھی کیونکہ قبرصی رہنما آرچ بشپ میکاریوس نے ترک اقلیت سے متعلق آئین کی دفعات میں تبدیلی کرنا چاہیں۔ اس تحریک جس کا مقصد اقلیت کی مراعات کو کم کرنا تھا۔ ترکوں میں فوری طور پر اس کا ردِعمل ہوا، چنانچہ دسمبر 1963ء میں ملک بھر میں ہنگامے شروع ہوگئے جس کے نتیجے میں انتہا پسند یونانیوں نے ترک قبرصیوں پر حملے شروع کردیے۔ ہزاروں ترکوں کو جزیرے کے شمالی حصے میں پناہ لینی پڑی۔ مجبوراً ترکی نے مداخلت کی، چنانچہ 27 دسمبر 1963ء کو یہ مسئلہ سلامتی کونسل میں زیرِ بحث آیا۔ فروری 1964ء کو اس مسئلے پر دوبارہ بحث ہوئی اور ترکی اور قبرصی جنگ بندی پر آمادہ ہوگئے۔ دسمبر 1963ء میں ہی تین ماہ کے لیے امن فوج تعینات کردی گئی۔ اگست 1964ء میں پھر فسادات شروع ہوگئے، تاہم ان پر جلد قابو پالیا گیا۔ 15 جولائی 1974ء کو انتہا پسند یونانیوں نے آرچ بشپ میکاریوس کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور 7 دسمبر 1974ء تک میکاریوس کی واپسی تک گلیفکس کلیریڈس نے قائم مقام صدر کی حیثیت سے فرائض انجام دیے۔ قبرص کے بارے میں یونان کے خطرناک عزائم اور یونانی قبرصی اکثریت کی جانب سے ترک قبرصیوں کی نسل کشی کے سبب 20 جولائی 1974ء کو ترکی نے اپنی چالیس ہزار فوج جزیرے پر اتاری۔ 20 تا 30 جولائی اور 14 تا 16 اگست 1974ء کو دو حملوں کے دوران ترکی کی افواج نے قبرص کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کرلیا۔ نتیجتاً 2 لاکھ قبرصی بے گھر ہوئے۔ قبرص کے بحران کو اقوام متحدہ میں لے جایا گیا۔ اقوام متحدہ نے یہ قرارداد منظور کی کہ علاقہ سے تمام غیرملکی فوجیں چلی جائیں لیکن اس قرارداد پر عمل درآمد نہ ہوسکا۔ یونانی قبرصیوں کے رویے سے تنگ آکر ترک قبرصی جنہوں نے 13 فروری 1975ء اور رؤف ڈینکتاش کی قیادت میں ایک خودمختار ترک قبرصی ریاست کے قیام کا اعلان کردیا۔ 1980ء میں اقوام متحدہ کے تحت امن مذاکرات ہوئے ترک قبرصیوں نے 35 فیصد علاقے میں سے 4 فیصد علاقہ قبرص کو واپس کرنے اور دو لاکھ مہاجرین میں سے چالیس ہزار کو اپنے ہاں بسانے کی پیش کش کی۔ قبرصی حکومت نے رؤف ڈینکتاش سے مذاکرات بھی کیے لیکن یہ بھی نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئے۔ 15 نومبر 1983ء کو رؤف ڈینکتاش نے پارلیمنٹ میں بھی یک طرفہ طور پر ترک جمہوریہ شمالی قبرص کی علیحدگی کا اعلان کردیا۔ یونانی قبرصی حکومت نے اقوام متحدہ کا اجلاس طلب کرلیا صدر رؤف ڈینکتاش نے کہا کہ ترک جمہوریہ شمالی قبرص اقوام متحدہ کے منشور پر عمل کرے گی اور غیر جانبدارانہ حکمتِ عملی اختیار کرے گی۔ اس مسئلے پر اقوام متحدہ کے ساتھ بات چیت کے متعدد ادوار ہوئے لیکن یہ بات چیت ناکام رہی۔ 19 نومبر 1983ء کو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے کہا کہ کسی قبرصی حکومت کو تسلیم نہ کیا جائے۔ قرارداد کے حق میں 13 ووٹ آئے صرف پاکستان نے مخالفت کی۔ 1984ء





میں اقوام متحدہ کی امن تجاویز بھی مسترد کردی گئیں، 5 مئی 1985ء کو نئے آئین کا نفاذ ہوا۔ 9 جون 1985ء کو رؤف ڈینکتاش کو دوبارہ جمہوریہ شمالی قبرص کا صدر منتخب کرلیا گیا۔ اسی سال قبرصی صدر کپریانو اور رؤف ڈینکتاش کے مابین پھر مذاکرات ہوئے۔ 1988ء میں صدر ویسیلو نے مذاکرات کیے۔ 29 جون 1989ء کو یونانی قبرص کے صدر جارج ویسیلیو اور جمہوریہ ترک قبرص کے صدر رؤف ڈینکتاش کے مابین مذاکرات ہوئے۔ فریقین نے اس مسئلے کو پُرامن طور پر حل کرنے پر زور دیا، پھر اقوام متحدہ نے قبرصی صدر سے مل کر 24 جولائی 1989ء کی تاریخ برائے مذاکرات مقرر کی۔ چونکہ ترک قبرص کی رضا مندی حاصل نہ کی گئی تھی، لہٰذا مذاکرات نہ ہوسکے۔ 23 اگست 1989ء کو ترک قبرصی پارلیمنٹ نے یہ قرارداد منظور کی کہ ترک قبرصیوں کے علاقے اور مساوی حیثیت تسلیم کیے بغیر کسی سمجھوتے تک پہنچنا ناممکن ہے۔ 1991ء میں بھی مذاکرات ہوئے، یہ بھی نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئے۔

18 جون تا 24 جون 1992ء ترک جمہوریہ شمالی قبرص کے صدر رؤف ڈینکتاش نے نیویارک میں اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل سے قبرص کے مسئلے پر مذاکرات کیے جن کے نتیجے میں 15 جون 1992ء کو دونوں قبرصی رہنماؤں کے مابین بات چیت کا اہتمام کیا، 15 جولائی 1992ء تک مذاکرات جاری رہے لیکن یہ بھی بے نتیجہ رہے۔ مذاکرات کا دوسرا دور 14 اگست 1992ء کو ختم ہوگیا۔ دوسرے دور میں سیکریٹری جنرل نے تنازعہ کو حل کرنے کے لیے آٹھ نکاتی فارمولا پیش کیا، لیکن رؤف ڈینکتاش نے اسے مسترد کردیا۔ 26 اگست 1992ء کو قبرص کے مسئلے پر سلامتی کونسل نے قرارداد منظور کی، جس میں کہا گیا تھا کہ قبرص کی نئی جمہوریہ واحد حکومتی بالادستی، بین الاقوامی شناخت اور واحد شہریت کے اصولوں کو بروئے کار لایا جائے۔ دسمبر 1993ء میں شمالی جمہوریہ ترک قبرص میں عام انتخابات ہوئے۔ اپریل 1995ء کے صدارتی انتخابات میں رؤف ڈینکتاش نے قومی اتحاد پارٹی کے رہنما درویش ارغلو کو ہرادیا۔

جولائی 1996ء میں اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل کے خصوصی نمائندے ہین سنگ جو (Han Song Jou) نے فریقین سے مذاکرات کیے لیکن یہ بھی بے نتیجہ رہے اور جنوری 2003ء تک اس مسئلے کا کوئی حل تلاش نہ کیا جاسکا اور آج تک یہ مسئلہ ہوا میں معلق ہے۔

## رائی (Mustard)

ایک ایسا پودا ہے جس کا بیج عموماً مسالوں میں استعمال ہوتا ہے۔ پودے کی لمبائی تقریباً چھے فٹ ہوتی ہے اور اس میں چار پتیوں والے، پیلے رنگ کے پھولوں کے گچھے لگتے ہیں۔ بیجوں کی پھلی یا ڈوڈا ایک انچ لمبا ہوتا ہے۔ اس پودے کا وطن ایشیا ہے اور اسے سیاہ رائی کہتے ہیں۔ اسی سے ملتا جلتا ایک پودا یورپ میں کاشت کیا جاتا ہے جو سفید رائی کہلاتا ہے۔ رائی کے بیجوں کو پیس کر اور پانی اور آٹا ملا کر پلٹس بھی بناتے ہیں۔ نیز اس سفوف کو اچاروں میں بھی ڈالا جاسکتا ہے۔ مسکن درد ہے۔ یعنی چوٹ کے درد پر لگایا جائے تو درد کھینچ لیتا ہے۔

مرسلہ: فراز حیدر، علی پور چٹھہ

ایک اور علاقے کے باشندے ترک کہلاتے ہیں۔ اس ملک کا پورا نام ترکش اینڈ کائیکس آئی لینڈز (Turks and Caicos Islands) برطانیہ کے زیرِ اثر یہ علاقہ، 30 جزائر کا مجموعہ ہے۔ اس کے جنوب میں 90 میل کے فاصلے پر ہیٹی واقع ہے۔ رقبہ 166 مربع میل یا 430 مربع کلومیٹر ہے، آبادی 15000 نفوس پر مشتمل ہے۔ آبادی کی اکثریت افریقی باشندوں پر مشتمل ہے۔ دارالحکومت: جیمز ٹاؤن ہے اور زبان انگریزی ہے، مذہب اینگلیکن، رومن کیتھولک وغیرہ ہیں، یہ برطانیہ کا خودمختار علاقہ ہے۔ 30 اگست 1976ء کو علاقے کا آئین نافذ ہوا، تاہم 1986ء میں اسے منسوخ کردیا گیا۔ اس کا انتظام گورنر چلاتا ہے۔ مکئی اور مچھلیاں یہاں کی اہم زرعی پیداوار ہیں جبکہ سیاحت اور مچھلی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں۔ کرنسی امریکی ڈالر ہے، اہلِ ہسپانیہ نے 1512ء میں اس کی دریافت کی 1765ء میں اسے بہاما کی تحویل میں دے دیا گیا اور 1972ء میں برطانوی نو آبادی قرار پایا پھر 1976ء میں اسے اندرونی خودمختاری دے دی گئی۔

اس کے علاوہ ترک کہلانے والی قوم کا ایک اور ملک ہے ترکمانستان (Turkmenistan) یہ وسط ایشیا میں واقع ہے، اس کا کل رقبہ 188،455 مربع میل یا 488100 مربع کلومیٹر ہے جبکہ آبادی 4518000

ہے۔ جنوب میں اس کی سرحدیں افغانستان اور ایران سے ملتی ہیں۔ مشرق اور شمال مشرق میں ازبکستان اور کزاخستان ہیں۔ مغرب میں بحیرۂ خزر ہے۔ اشک آباد صدر مقام ہے۔ ٹرانس کیسپین ریلوے آمدورفت کا واحد ذریعہ ہے۔ اس علاقے کا 80 فیصد رقبہ صحرائی ہے۔ آبادی نخلستانوں اور وادیوں میں ہے۔ جنوب میں دریائے آمو اور مرغاب بہتے ہیں۔ یہاں کا سکہ منات، ریال ترکمان کہلاتا ہے، روسی اور ازبک بولی جاتی ہیں۔ معدنی پیداوار میں تیل، سنگ مرمر، گندھک، قدرتی گیس اور نمک وغیرہ شامل ہیں۔ کاراکم نہر صحرا سے گزرتی ہے، جو آبپاشی اور پن بجلی کی ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ کپاس یہاں کی اہم پیداوار ہے، جو نخلستان اور نہر کے ساتھ ساتھ کاشت کی جاتی ہے۔ قراقلی بھیڑیں، گھوڑے اور اونٹ پالے جاتے ہیں۔ پھل کی کاشت بھی ہوتی ہے۔ شہروں میں صنعت وحرفت نے خوب ترقی کی ہے۔ نصف سے زائد ترکمان مسلمان ہیں جو ترکی زبان بولتے ہیں۔ آٹھویں صدی میں اس علاقے پر عربوں کا قبضہ ہوگیا۔ گیارہویں صدی میں سلجوق برسرِاقتدار آئے۔ تیرہویں صدی میں چنگیز خان نے اس کو فتح کرلیا اور چودھویں صدی میں یہ تیمور کے قبضے میں آگیا۔ پندرہویں صدی کے آخر میں تیموری خاندان کے خاتمے پر ازبک اور انیسویں صدی کے اوائل میں خان خیوا اس پر قابض ہوگیا۔ 1881ء میں یہ علاقہ سلطنتِ روس کا حصہ بنا اور 1924ء میں اسے سوویت یونین کی ایک آئینی جمہوریہ بنادیا گیا۔ 13 مئی 1965ء کو اسے سوویت یونین میں شامل کرلیا گیا۔ اگست 1990ء کے ریفرنڈم میں 94.1 فیصد افراد نے آزادی کے حق میں ووٹ ڈالے۔ دسمبر 1991ء میں یہ آزاد ریاستوں کی دولت مشترکہ میں شامل ہوا۔ جون 1992ء میں انتخابات منعقد ہوئے اور سپر مراد نیازوف صدر منتخب ہوئے۔ اس دوران مئی 1992ء میں ملک میں نیا آئین نافذ کیا گیا۔ عوام کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے جناب نیازوف نے معیشت پر کڑا کنٹرول رکھا اور خورد ونوش اور روز مرہ استعمال کی دوسری اشیا (وسطی ایشیا کے بعض ممالک) اور دوسرے ممالک کی نسبت بہت سستی کردیں۔ عوام کو گیس، بجلی اور پانی کی سہولت مفت فراہم کی گئی۔ جنوری 1994ء میں ترکمانستان نے منات کے نام سے اپنی کرنسی جاری کی۔ 15 جنوری 1994ء کے ریفرنڈم میں نیازوف کو آئندہ پانچ برسوں کے لیے قوم نے 99.9 فیصد ووٹوں سے صدر چن لیا۔

اپریل 1997ء میں ترکمانستان نے ایران اور آرمینیا سے تجارتی، مواصلاتی بینکاری، توانائی اور سیاحت کے معاہدے کیے۔ 1997ء کے اواخر میں پاکستان کے ساتھ بھی گیس پائپ لائن معاہدہ طے پایا۔ ترکمانستان کے دارالحکومت اشک آباد میں افغان متحارب گروپوں کے مابین مذاکرات ہوتے رہے ہیں۔

13 مئی 1990ء کو ترکمانستان اور افغانستان کے مابین کمرشل بنیادوں پر ہوائی سفر اور کم نرخوں پر گیس کی فراہمی کے معاہدے پر کابل میں دستخط ہوئے۔

مگر ترکوں کا مشہور ملک ترکی ہے جو ایشیائے کوچک اور جنوب مشرقی یورپ میں واقع ایک جمہوریہ ہے۔ یہ بحیرۂ اسود (شمال) اور بحیرۂ روم (جنوب) کے مابین واقع ہے۔ اس کے شمال میں آرمینیا، جارجیا، جنوب میں عراق اور شام، مشرق میں ایران اور مغرب میں بلغاریہ اور یونان ہیں۔ اس کا رقبہ 300،949 مربع میل یا (779،452 مربع کلومیٹر) ہے۔ آبادی (2000ء) 7,00,00,000 (80 فیصد ترک، باقی کرد، اور یہودی 20 فیصد)۔ دارالحکومت: انقرہ کے دیگر مشہور شہر: استنبول، ازمر، عدنہ، قونیہ، ارض روم اور برسہ ہیں۔ یہاں زبان: ترکی، کرد اور عربی ہے۔ جبکہ مذہب اسلام ہے اور سکہ: ترکی لیرا کہلاتا ہے۔

ملک کا غالب حصہ 97 فیصد، ایشیا میں ہے۔ یورپی حصے کو درہ دانیال، بحیرۂ مارمور اور خلیج باسفورس ایشیا (اناطولیہ) سے جدا کرتی ہے۔ سب سے بڑا، قدیم اور تاریخی شہر استنبول (قسطنطنیہ) یورپی حصے میں ہے۔ زمین زرخیز ہے۔ روئی، تمباکو، زیتون کا تیل، ریشم اور گنا اہم زرعی پیداوار ہیں۔ معدنیات میں کوئلا، کروم اور تانبا قابلِ ذکر ہے۔ ملک میں شیشہ، کاغذ، شکر، کپڑا، قالین، سیمنٹ اور سگریٹ بنانے کے بڑے بڑے کارخانے ہیں۔

ترکی میں 73 ولایتیں (صوبے) ہیں جن پر گورنر حکومت کرتے ہیں۔ پارلیمنٹ (گرینڈ نیشنل اسمبلی) یک ایوانی ہے۔ قومی اسمبلی کے 450 ارکان 4 سال کے لیے بالغ حق رائے دہی کی بنیاد پر منتخب ہوتے ہیں۔

ترک قوم منگول نسل سے ہے۔ چھٹی صدی عیسوی میں منگول ترکوں کے قبیلے ترکستان میں آباد ہوئے۔ ساتویں اور آٹھویں صدی میں انہوں نے اسلام قبول کیا۔ سلجوتی ترکوں نے 1055ء میں خلافت عباسیہ پر سیاسی غلبہ حاصل کرلیا اور



ایشیائے کوچک میں اپنی سلطنت قائم کرلی۔ جب عثمانی ترکوں کو منگولوں نے وسطی ایشیا سے بھگادیا تو وہ سلجوقیوں کی پناہ میں آگئے اور 1299ء میں عثمان اول نے اپنی بادشاہت کا اعلان کردیا۔ عثمانی فرماں رواؤں نے 1354ء میں گیلی پولی پر اور 1453ء میں قسطنطنیہ پر قبضہ کرلیا اور یورپ میں داخل ہوگئے۔ 1480ء تک وہ پورے بلقان پر قابض ہوچکے تھے۔ سولہویں صدی کے وسط تک ان کی سلطنت مصر، شام، عرب، عراق، طرابلس اور ہنگری تک پھیل چکی تھی۔ 1550ء کے بعد سلطنت عثمانیہ روبہ زوال ہونے لگی، حالانکہ اسی زمانے میں ترکوں نے قبرص 1571ء اور کریٹ 1669ء پر قبضہ کرلیا تھا۔

ترکوں کو 1683ء میں شہر ویانا (آسٹریا) میں شکست ہوئی۔ اس کے بعد ان کے تمام مقبوضات یکے بعد دیگرے ان کے قبضے سے نکلتے گئے۔ 1699ء میں ہنگری آزاد ہوا۔ 1774ء میں روس نے مولداویہ ولاچیا اور کریمیا سے نکال دیا۔ انیسویں صدی کے آغاز میں بلقان اور یونان آزاد ہوگئے۔ صلح نامہ برلن 1878ء کی رُو سے بلغاریہ، بوسنیا اور ہرزے گووینا بھی ان کے ہاتھ سے نکل گئے اور ترکی یورپ کا "مرد بیمار" بن کر رہ گیا۔ آخر سلطان کی عیش پرستیاں اور وزراء اور امراء کی خودغرضیاں اور غداریاں رنگ لائیں اور ترکی میں وطن پرستی کی تحریک کا آغاز "نوجوان ترکوں" کی تنظیم سے ہوا۔ ان کی جدوجہد سے مجبور ہوکر سلطان نے 1908ء میں آئینی اصلاحات نافذ کیں۔ اٹلی نے موقع پاکر طرابلس پر قبضہ کرلیا۔ 1911-1912ء اور بلقانی ریاستوں نے ترکوں کو البانیہ اور مقدونیہ سے بھی نکال باہر کیا۔

پہلی جنگِ عظیم میں ترکی نے قیصر جرمنی کا ساتھ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں اور فرانسیسیوں نے ترکی کے ایشیائی مقبوضات، شام، عراق، عرب وغیرہ پر قبضہ کرلیا اور مصر بھی، جو اَب تک برائے نام ترکی کا باجگزار تھا، انگریزوں کے زیرِ اثر آگیا۔ جنگِ عظیم میں ترکوں کی شکست سے فائدہ اٹھا کر یونانیوں نے 1919ء میں ازمیر پر قبضہ کرلیا۔ اس حادثے سے غیور ترکوں میں سلطان عبدالحمید اور اس کی حکومت کے خلاف شدید نفرت پھیل گئی اور ایک فوجی افسر مصطفیٰ کمال پاشا نے 1920ء میں انقرہ میں ایک عارضی حکومت قائم کرلی اور یونانیوں سے لڑنے کا عزم کیا۔ ترکی قوم نے مصطفیٰ کمال پاشا کا ساتھ دیا اور یونانیوں کو ترکی سے نکال باہر کیا۔

1922 میں کمال اتاترک نے عثمانی خلافت کے خاتمے کا اعلان کردیا اور 29 اکتوبر 1923ء کو ترکی جمہوری ریاست بن گیا۔ کمال اتاترک نے ترکوں کو بنیاد پرستی کے اثر سے آزاد کیا۔ اس لیے کہ ..... اپنے مفاد کی خاطر انہوں نے ہی عوام کو تقسیم کرکے ملک کو کمزور کیا تھا اس لیے اس نے مغربی تہذیب کو اپنایا اور مذہب کو سیاست اور حکومت سے یک قلم خارج کردیا۔ جب تک کمال اتاترک زندہ رہا ترکی مغربی طاقتوں کی دھڑے بندیوں سے الگ تھلگ رہا۔ کمال اتاترک کے بعد جب 1938ء میں عصمت انونو ترکی کا صدر بنا تو ترکی کی خارجہ پالیسی کا جھکاؤ ہٹلر کی طرف ہوگیا، پھر بھی ترکی دوسری جنگِ عظیم میں غیر جانب دار رہا۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد ترکی مغربی بلاک کا رکن بن گیا۔ کمال اتاترک کے زمانے میں ترکی میں فقط ایک سیاسی جماعت تھی اس کا نام ری پبلکن پارٹی تھا مگر کمال اتاترک کی وفات پر اس جماعت میں پھوٹ پڑگئی اور اس کے بعض سربرآوردہ ممبروں نے عصمت انونو کی قیادت سے نکل کر اپنی ایک الگ سیاسی جماعت ڈیموکریٹک پارٹی کے نام سے بنالی۔ اس پارٹی کے لیڈر جلال بایار اور عدنان میندریس تھے۔

1950ء کے عام انتخابات میں ڈیموکریٹک پارٹی نے قومی اسمبلی میں اکثریت حاصل کرلی اور جلال بایار صدر اور عدنان میندریس وزیراعظم منتخب ہوئے۔ 1952ء میں ترکی نیٹو (معاہدہ شمالی اوقیانوس) میں شامل ہوگیا۔ 1955ء میں ترکی اور عراق نے باہمی دفاع کے معاہدے پر دستخط کیے، جسے بعدازاں بغداد پیکٹ کا نام دیا گیا۔ 1957ء کے انتخابات میں پھر ڈیموکریٹک پارٹی کی جیت ہوئی اور عدنان میندریس نے وزارت بنائی۔ 1960ء میں جنرل جمال گرسل نے حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ ڈیموکریٹک پارٹی خلافِ قانون قرار دے دی گئی۔ عدنان میندریس، بایار اور ان کے سیکڑوں ساتھیوں پر آئین کی خلاف ورزی کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا۔ میندریس کو پھانسی اور ان کے رفقاء کو مختلف میعاد کی سزائے قید دی گئی۔

1961ء میں ریفرنڈم کے ذریعے نیا آئین نافذ کیا گیا۔ پارلیمنٹ کے دو ایوان بنائے گئے اور ایگزیکٹو کو وسیع اختیارات دے دیے گئے۔ جنرل گرسل صدر اور عصمت انونو وزیراعظم کے عہدے پر فائز ہوئے۔ 1964ء میں قبرص میں ترکوں اور یونانی باشندوں میں لڑائی چھڑ جانے سے ترکی

اور یونان کے تعلقات مزید کشیدہ ہوگئے۔ 1965ء کے انتخابات میں جسٹس پارٹی کو فتح ہوئی اور سلیمان ڈیمرل وزیراعظم بنے۔ 1966ء میں جنرل گرسل کی علالت کی بنا پر قومی اسمبلی نے جنرل جودت ثنائی کو صدر منتخب کیا۔ 1969ء کے انتخابات میں حکمران جماعت کامیاب رہی۔

1971ء میں طویل سیاسی اور اقتصادی بے چینی کے بعد فوج نے ڈیمرل کو مستعفی ہونے پر مجبور کردیا۔ نہت ارم وزیراعظم کے عہدے پر فائز ہوئے۔ 1972ء کے انتخابات میں ڈیموکریٹک پارٹی برسر اقتدار آئی۔ بلند ایجوت وزیراعظم اور ریٹائرڈ ایڈمرل فہری کوروترک صدر منتخب ہوئے۔ 1974ء میں قبرص کے نیشنل گارڈز نے، یونانی افسروں کی زیرکمان قبرص کے صدر میکاریوز کا تختہ الٹ دیا۔ ترک فوجیں ترک باشندوں کی حفاظت کے لیے، قبرص میں داخل ہوگئیں۔ مگر اقوام متحدہ کی کوششوں سے ترک اور یونانی قبرصیوں میں جنگ بند ہوگئی۔

1975ء میں بلند ایجوت نے استعفا دے دیا اور سلیمان ڈیمرل نے مخلوط حکومت بنائی۔ 5 جون 1977ء کے انتخابات میں بلند ایجوت کی ری پبلکن پیپلز پارٹی نے قومی اسمبلی کی 450 میں سے 213 نشستوں پر قبضہ کرلیا۔ 21 جون کو بلند ایجوت نے حکومت بنائی لیکن وہ اعتماد کا ووٹ حاصل نہ کرسکی اور ایجوت مستعفی ہوگئے۔ 21 جولائی کو جسٹس پارٹی کے قائد سلیمان ڈیمرل دائیں بازو کی جماعتوں کے اشتراک سے وزارت بنانے میں کامیاب ہوگئے۔ اکتوبر 1979ء کے عبوری انتخابات میں جسٹس پارٹی نے کامیابی حاصل کی اور ڈیمرل نے وزارت بنائی۔ دسمبر 1978ء میں بائیں اور دائیں بازو کے طلبا کے درمیان خون ریز جھڑپوں کے سبب ملک کے تیرہ صوبوں میں مارشل لاء نافذ کردیا گیا۔ 1979ء میں مزید چھ صوبوں میں مارشل لاء کا نفاذ عمل میں آیا۔ 11 ستمبر 1980ء کو جنرل ایورن کنعان نے اقتدار پر قبضہ کرکے ہنگامی حالت کے نفاذ کا اعلان کردیا۔

1983ء میں سول حکومت بحال کردی گئی اور 1984ء میں مارشل لاء بھی اٹھالیا گیا۔ جون 1988ء میں وزیراعظم ترگت اوزال پر قاتلانہ حملہ ہوا مگر وہ بال بال بچ گئے۔ 31 اکتوبر 1989ء کے انتخابات کے نتیجے میں ترگت اوزال سات سال کے لیے ملک کے صدر منتخب ہوگئے۔ 1991ء کی خلیجی جنگ میں ترکی نے امریکا اور اس کے اتحادیوں کا ساتھ دیا۔ اکتوبر 1991ء کے عام انتخابات میں وزیراعظم مسعود یلماز (Mesut Yilmaz) کامیابی حاصل نہ کرسکے اور نومبر 1991ء میں سلیمان ڈیمرل ان کی جگہ وزیراعظم بنے۔ اپریل 1993ء میں ترگت اوزال انتقال کرگئے تو ان کی جگہ سلیمان ڈیمرل نے صدر کا عہدہ سنبھالا اور تانسو چیلر ملک کی پہلی خاتون وزیراعظم بنیں۔ دسمبر 1995ء کے انتخابات میں تانسو چیلر کی جماعت انتخابات میں کامیابی حاصل نہ کرسکی، چنانچہ رفاہ پارٹی کے صدر نجم الدین اربکان کی جماعت 550 میں سے 158 نشستیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی چنانچہ سلمان ڈیمرل نے انہیں حکومت بنانے کی دعوت دی۔

اس دوران مارچ 1995ء میں ترکی کے 35000 فوجی کردوں کی بغاوت کا قلع قمع کرنے کے لیے عراق میں داخل ہوگئے۔ 1997ء میں مسعود یلماز اور جنوری 1997ء میں بلند ایجوت ملک کے وزیراعظم بنے۔ اس دوران بلند ایجوت کو ایک دفعہ اقتدار سے ہاتھ دھونا پڑے، لیکن جنوری 1999ء کو انہیں پھر وزیراعظم منتخب کرلیا گیا۔ 31 مئی 1999ء کو ترکی میں کرد باغیوں اور فوج میں جھڑپوں کے نتیجے میں گیارہ افراد ہلاک ہوگئے۔ 7 جون 1999ء کو انہوں نے پارلیمنٹ سے اعتماد کا ووٹ بھی حاصل کرلیا۔ 17 اگست 1999ء کو ترکی میں شدید زلزلہ آیا جس کے نتیجے میں کم وبیش چالیس ہزار افراد ہلاک ہوگئے۔ اسی ماہ میں ترک پارلیمنٹ نے وہ کلیدی شق منظور کرلی جس کے تحت ممتاز اسلام پسند رہنما نجم الدین اربکان کو سیاست میں حصہ لینے اور پارلیمنٹ کا رکن بننا ممکن ہوگیا۔ اس دوران 1998ء میں وزیراعظم نجم الدین اربکان کی جماعت فضیلت پر عدالت نے پانچ سال تک سیاست میں حصہ لینے پر پابندی عائد کردی تھی۔ وزیراعظم پر یہ الزام تھا کہ انہوں نے ترکی کے سیکولر آئین کو تبدیل کرنے کی کوشش کی تھی۔ ادھر کرد رہنما اوچلان کی جماعت کردستان ورکرز پارٹی نے اعلان کیا کہ وہ ترکی کے خلاف جنگ بند کردیں گے۔ انہوں نے 1984ء میں ترکی کے خلاف ہتھیار اٹھائے تھے۔ 12 جنوری 1999ء کو بلند ایجوت کو ملک کا وزیراعظم مقرر کیا گیا۔

یہ تھا ان تمام ممالک کا تذکرہ جو ترک کے نام سے مشہور تھے۔ اب ان میں سے کن کی جانب حضور اکرم کا اشارہ ہے یہ ہنوز غور طلب ہے۔ خدا اور رسولؐ کی باتیں خدا و رسولؐ جانیں۔



# افریقا وا فریقا

الطاف شیخ

ترجمہ: ابراھیم جمالی

پُراسراریت کی سرزمین افریقا جہاں قدرت کی فیاضی قدم قدم پر منتظر ہے، جہاں ہرے بھرے انتہائی گھنے جنگل ہیں تو خونخوار درندے بھی۔ جہاں معصوم صفت لوگ ہیں تو آدم خور قبائل بھی مگر کئی شہر ترقی یافتہ اتنے ہیں کہ ان پر یورپ وامریکی شہروں کا دھوکا ہوجاتاہے۔ عام طور پر افریقا کے سفرناموں میں صرف اور صرف جنگل کا ذکر نظر آتا ہے لیکن یہ الطاف شیخ کا کمال ہے کہ وہ رودادِ سفر سناتے وقت سب سے الگ زاویہ سامنے لاتے ہیں۔ زیرِنظر سفرنامے میں آپ کو افریقا کا ایک نیا رخ نظر آئے گا۔

## خوبصورت الفاظ سے سجا ایک منفرد سفرنامہ

ملائیشیا میں ملازمت کے دوران ایک مرتبہ ہمارے آفس والوں نے ہم (غیر ملکی اساتذہ) میں سے کسی کو وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے ممباسا بھیجنے کا پروگرام بنایا۔ وہاں کی ایک نیول اکیڈمی یا شاید انجینئرنگ کالج میں "میرین بوائلرز اور فیول ٹیکنالوجی" پر ایک ہفتے تک لیکچر دینا تھا۔ یہ کام ملازمت کے معاہدے کے مطابق ہمارے لیے ضروری نہ تھا۔ انتظامیہ کی خواہش تھی کہ ہم غیر ملکی ٹیچرز میں سے کوئی ایک وہاں ضرور جائے۔ اس طرح ادارے کو

شہرت ملتی اور اس کی نیک نامی میں اضافہ ہوتا۔ ایسی کئی باتیں ہوتی ہیں جو گو کہ ملازمت کے تحریری معاہدے میں شامل نہیں ہوتیں لیکن انتظامیہ ہم غیر ملکی معلموں کے فائدے کے لیے انہیں برداشت کرتی ہے......اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ادارہ اپنا نقصان برداشت کر کے ہمیں فائدہ پہنچانے والے فیصلے کرتا ہے۔

یہ پہلی مرتبہ ہو رہا تھا کہ ہم میں سے کسی کو اس قدر دور دراز کے ملک میں بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا تھا حالانکہ اس سے پہلے ملائیشیا ہی میں، خاص طور پر جنوبی شہر ایپوح کے پولی ٹیکنک انسٹی ٹیوٹ میں لیکچر دینے کے لیے مجھے بھیجا جاتا تھا۔ یہ ایک ایسا کام ہے جس میں کوئی مالی فائدہ نہیں ہوتا لیکن ایک نئے شہر میں جا کر نئے لوگوں اور نئے طلبا سے مل کر مجھے خوشی ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ ایپوح کی دلچسپ باتیں لکھنے کا موقع بھی ملتا تھا۔

ہم میں سے کچھ لوگوں نے ممباسا جانے پر آمادگی ضرور ظاہر کی تھی لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ اس کام کی اجرت ان کی بجائے ادارے کو ملے گی تو وہ ڈھیلے پڑ گئے۔ ہمیں اس ڈیوٹی کی اجرت نہ ملنے کے حوالے سے بات کرتے ہوئے ہمارے چیف صاحب نے بتایا۔

"اگر آپ اتوار یعنی تعطیل کے دن لیکچر دیں گے تو اس کا اضافی مشاہرہ آپ کو ضرور ملے گا اس کے علاوہ ہفتے کے باقی ایام کے پیسے نہیں ملیں گے کیونکہ یہ دن آپ کی ڈیوٹی میں شامل ہیں جسے آپ ملاکا میں انجام دیں یا ایپوح میں بہرحال ایپوح جانے کے لیے ہوائی جہاز کا ریٹرن ٹکٹ فور اسٹار ہوٹل میں رہائش، کھانے، ٹیکسی کے کرائے کے ساتھ چائے وغیرہ کے اخراجات ہمارے آفس کے ذمے تھے اور اب کینیا کی بندرگاہ ممباسا جانے کے لیے بھی یہی اصول تھا۔ ممباسا دور ہونے کے سبب کسی نے بھی وہاں جانے کے لیے رضامندی ظاہر نہیں کی۔

ہمارے پاکستانی ساتھیوں کا خیال تھا کہ اس سلسلے میں انتظامیہ کی مدد کی جائے۔ اس طرح وہ بھی خوش ہوں گے اور ہمارے ملک کی تعریف بھی ہوگی۔ ان کا یہ خیال نیک تو تھا لیکن سب کو یہ کام بے مزہ بھی لگ رہا تھا۔ وہ گروپ کی صورت میں میرے پاس آئے۔ وہ یہ سوچ کر آئے تھے کہ مجھے ممباسا جانے پر آمادہ کر لیں گے۔

"بھئی آخر میں ہی کیوں جاؤں؟" میں نے ان سے پوچھا۔

"اس میں آپ کی دلچسپی کا سامان بھی ہے۔"

"لاحول ولا ...... کیا مطلب؟ ممباسا میں میری کوئی پرانی گرل فرینڈ رہتی ہے؟"

"نہیں سر۔" ایک نے کہا۔ "ہمارا مطلب ہے کہ آپ کو سفر نامہ لکھنے کے لیے مختلف ملکوں اور مقامات پر جانے کا شوق ہے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے حالانکہ یہ سب کچھ ڈیوٹی کی مجبوری کے سبب ہے لیکن آپ لوگ سچ سچ بتائیں کہ آپ کو جانے پر کیوں اعتراض ہے؟" میرے اس سوال پر انہوں نے یہ اسباب گنوائے۔

"وہ ٹیچنگ لائن میں ابھی نوارد ہیں۔ اس لیے کسی اجنبی مقام پر، تیاری کے بغیر تدریس میں وقت محسوس کرتے ہیں۔" ان کی یہ بات درست تھی۔ برسوں سے تدریسی خدمات انجام دیتے ہوئے اب یہ میرے لیے کوئی کٹھن اور مشکل کام نہیں رہا تھا۔

دوسری اہم بات، جس سے میرے ہم وطن ساتھی بچنا چاہ رہے تھے وہ تھی ممباسا تک پہنچنے کا طویل اور تھکا دینے والا سفر۔ ملائیشیا سے ممباسا تک کوئی ڈائریکٹ پرواز نہیں تھی۔ کوالالمپور سے ممبئی پہنچنا تھا۔ وہاں سے دوسری فلائٹ حاصل کرنے کے لیے ائرپورٹ پر آٹھ گھنٹے انتظار کرنا تھا پھر کینیا کے دارالحکومت نیروبی پہنچ کر تین گھنٹے کے بعد ممباسا جانے والے جہاز میں سوار ہونا تھا۔

یہ سن کر میں نے ہامی بھر لی کیونکہ ائرپورٹ پر انتظار کرنا اور ہوائی جہاز کا طویل سفر میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ مسئلہ تو بحری جہاز میں سفر کرنے سے بھی نہیں بشرطیکہ اسے چلانے والے دوسرے ہوں۔ ہم صرف نیند لیتے رہیں یا اخبارات کے لیے کالم تحریر کرتے رہیں۔ ائرپورٹ اور ہوائی جہاز کے ماحول کی تو بات ہی مختلف ہے۔ خاموشی، خوشگوار ٹھنڈک اور چاروں طرف رنگ ہی رنگ، خوشبو ہی خوشبو۔ جب تک دل چاہے سوچتے رہیے جب دل چاہے پرانی بات یاد کر کے لکھنے بیٹھ جائیں۔ اس کے علاوہ ہمسفر سے گپ شپ ہوتی رہے۔ طلب کرنے پر فوراً چائے، کافی اور کھانا حاضر......اور کیا چاہیے۔

ایک مرتبہ ناروے کے ائرپورٹ اوڈینسڈ میں موسم کی خرابی کے سبب ہماری پرواز چوبیس گھنٹے لیٹ ہو گئی تھی..... اوڈینسڈ ایک چھوٹا شہر بلکہ فشنگ ویلیج ہے۔ وہاں اتنے مسافروں کی رہائش کے لیے کوئی بڑا ہوٹل بھی موجود نہیں تھا۔ تمام



مسافروں کو ائرپورٹ کے صوفوں پر بیٹھ کر وقت گزارنا پڑا تھا۔ کوئی ائرپورٹ سے باہر بھی نہیں جا سکتا تھا کیونکہ سخت طوفان اور برفباری کے سبب درجہ حرارت منفی بیس تک پہنچا ہوا تھا۔ ائرپورٹ کی کسی شیشے کی کھڑکی میں ذرا سی بھی درز تھی تو اس میں سے آنے والی ہوا جسم کو چھری کی طرح کاٹتی تھی۔

تمام مسافر پریشان تھے لیکن میری گویا خدا نے سن لی تھی۔ اس قدر فرصت کم ہی میسر آتی ہے۔ میں نے کاؤنٹر سے دس بارہ سادہ صفحے لیے اور گزشتہ باتیں یاد کر کے لکھنے لگا۔ چند صفحات لکھ کر کاؤنٹر سے چائے اور بسکٹ لے آتا۔ وہاں کھانے کا انتظام نہیں تھا البتہ فضائی کمپنی کی جانب سے مسافروں کے لیے ہر وقت چائے، کافی، بسکٹ اور سینڈوچز کا بندوبست تھا۔ پورک کے خیال سے میرے لیے سینڈوچز، پیزا اور برگر ممنوع تھے۔ اس کے باوجود ان حالات میں صرف چائے اور بسکٹ بھی غنیمت تھے۔ گھنٹا بھر لکھتا اور گھنٹا بھر سوچتا رہتا۔ اس دوران میں بیٹھے بیٹھے جھپکی بھی لے لیتا۔ معلوم ہی نہ ہو سکا کہ کس طرح چوبیس گھنٹے پلک جھپکتے ہی گزر گئے۔ اعلان ہوتے ہی ہم سفری بیگ اٹھا کر جہاز میں سوار ہو گئے۔

اگر میں اس بات کا اظہار دوسرے مسافروں سے کرتا تو وہ یقیناً مجھ پر خفا ہوتے جو ائرپورٹ پر طویل انتظار کے بعد سخت بور اور بیزار ہو چکے تھے۔ ایسے مواقع پر ہمارے کیڈٹ کالج کے انگریز پرنسپل بہت یاد آتے ہیں۔ وہ ہر وقت ہمیں مطالعے اور کچھ لکھنے کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جسے مطالعے کی عادت ہو وہ جنگل میں تنہا بھی ہوگا تو بور نہ ہوگا۔ ہم اس وقت آٹھویں جماعت میں تھے۔ وہ کالج پٹارو کی بجائے عارضی طور پر میرپور خاص کی ایک بلڈنگ میں قائم تھا۔ ایسے میں کرنل کومبس، جو دوسری جنگِ عظیم میں جاپانیوں کے قیدی (Pow) رہے تھے، انگلینڈ سے ہمارے پرنسپل بن کر آ گئے۔ وہ پہلے ہی ہفتے ہمیں بس میں بٹھا کر سیر کرانے لے چلے۔ وہ میرپور خاص کے قریب "جھلوری" نامی نہر پر لے گئے تھے۔ ہم سب طالب علم دیہی علاقوں سے تعلق رکھتے تھے اور اس سے بڑی نہروں کو دیکھ چکے تھے۔ ہمیں اپنے گورے پرنسپل پر بہت حیرت ہوئی۔ ہم نے جب سیر کے بارے میں سنا تھا تو یہی سوچا تھا کہ ہمیں بس میں بٹھا کر حیدرآباد لے جایا جائے گا۔ جہاں صدر کے نیو میجسٹک سینما میں انگریزی فلم بھی دکھائی جائے گی لیکن وہ ہمیں گدلے پانی والی "جھلوری" نہر پر لے آئے تھے۔

ہم میں سے کچھ طلبا نے اس مٹیالے پانی میں سوئمنگ بھی کی اور پھر کیچڑ آلود پیروں میں بوٹ پہن کر واپس پہنچے اور ہاسٹل کے باتھ روم میں دوبارہ نہائے۔ اگلا اتوار کا دن تھا۔ ہم ہاسٹل کی میس میں موجود تھے۔ اچانک ہمارے پرنسپل میس میں نمودار ہوئے اور بولے۔

"میں آپ لوگوں سے جھلوری نہر کے بارے میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔" ہم سمجھے کہ اب وہ ہمیں جھلوری نہر پر لے جا کر بور کرنے پر افسوس کا اظہار کریں گے اور اس کا ازالہ کرنے کے لیے ہمیں حیدرآباد لے جانے کے پروگرام کا اعلان کریں گے لیکن وہ سب محض ہمارے خیالات تھے۔ کرنل کومبس کڑک دار آواز میں گویا ہوئے۔

"کل میں تمہیں سیر کرانے جھلوری نہر پر لے گیا تھا۔ آج آپ سب لوگ اپنے کمروں میں جا کر اس سیر پر انگریزی میں مضمون لکھیں۔ اس مضمون کا عنوان ہوگا Our trip to Jhilory" ہم یہ سن کر مزید پریشان ہو گئے۔

"کھایا پیا کچھ نہیں گلاس توڑا بارہ آنے۔" والی مثال ہم پر صادق آ رہی تھی لیکن جناب یہ پہلی اور آخری دفعہ نہ تھا۔ ہم نے پانچ برس کیڈٹ کالج میں گزارے تھے اور یہ تمام عرصہ کرنل کومبس ہمارے پرنسپل رہے۔ انہوں نے ہمیں لائبریری کی بے شمار کتابیں پڑھائیں اور کئی مضامین لکھوائے۔ کئی تقریریں کرائیں اور آج مجھ جیسے ان کے کئی اسٹوڈنٹس لکھنے اور پڑھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ انہیں تنہائی اور بھوک بھی نہیں ستاتی، اگر ان کے پاس پڑھنے کے لیے کوئی کتاب اور لکھنے کے لیے کاغذ اور قلم موجود ہے۔

☆☆☆

جہاز کوالالمپور سے ٹیک آف کرنے کے بعد سنگاپور سے ہوتا ہوا ممبئی پہنچا۔ چھ گھنٹے کا سفر اور ممبئی ائرپورٹ پر آٹھ گھنٹے کا Stay میں نے نیند اور مطالعہ کرتے ہوئے گزارہ۔ اب ممبئی سے نیروبی تک کی طویل پرواز کے دوران لنچ کے بعد وقت گزارنے کی خاطر میں نے قریب بیٹھے ہوئے مسافروں کے ساتھ بات چیت کرنے کا ارادہ کر لیا۔ وقت گزارنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ ہم سفر کے ساتھ گپ شپ کی جائے۔ جیلوں میں قید، قیدی بھی یہی کرتے ہیں یعنی اپنے بارے میں سناتے ہیں اور دوسروں کی سنتے ہیں۔ بحری جہاز کے طویل سفر کے دوران جہاز کے مسافر بھی یہی طریقہ اپناتے ہیں۔

میری قریبی سیٹ پر ایک خاتون بیٹھی تھیں۔ وہ کوئی

ٹین ایجر لڑکی نہیں تھیں البتہ انہیں نوجوان عورت کہا جاسکتا ہے۔ بہرحال مجھ سے خاصی کم عمر تھیں۔ خوب صورت بھی تھیں، لباس اور زیور سے امیر بھی معلوم ہوتی تھیں۔ دورانِ سفر انہوں نے کچھ نوٹس لکھے تھے۔ ان کی ہینڈ رائٹنگ دیکھ کر اندازہ ہوا کہ وہ خاصی تعلیم یافتہ بھی ہیں۔ سامنے خواہ مرد ہو یا عورت، گفتگو کا آغاز کرنا میرے لیے کبھی مسئلہ نہیں رہا۔ پہلے سے تعارف یا جان پہچان ہو یا نہ ہو میں آسانی سے بے تکلفی کی فضا قائم کرکے گپ شپ کا ماحول بنالیتا ہوں لیکن حال ہی میں، میں نے ایک لطیفہ پڑھا تھا اور پہلی مرتبہ گفتگو کا آغاز کرنے میں تذبذب کا شکار ہونے لگا تھا۔ پہلے وہ لطیفہ آپ بھی پڑھ لیں۔

ایک فضائی سفر میں مجھ جیسے ایک مرد مسافر نے اپنے قریب بیٹھی ہوئی لڑکی سے فری ہونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”خاصا طویل سفر ہے کیوں نہ آپس میں بات چیت کرکے وقت گزارہ جائے۔“

”ہوں۔“ لڑکی نے گویا اس کی تائید کرتے ہوئے ہنکارا ابھرا۔

”ہم کسی ایک موضوع کو منتخب کرکے اس پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔“ مرد نے کہا۔

”مثلاً کس موضوع پر؟“ لڑکی نے پوچھا۔

دل پشوری کے شوقین نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ”مثلاً فضائی آلودگی یا گلوبل وارمنگ وغیرہ پر بات کرتے ہیں۔“

”پہلے مجھے آپ ایک سوال کا جواب دیں۔“ لڑکی نے کہا۔

”ضرور، ضرور پوچھیے۔“

”بکری، گدھا اور بھینس یہ تینوں جانور گھاس کھاتے ہیں لیکن ایسا کیوں ہے کہ بکری مینگنیاں، گدھا لید اور بھینس گوبر کرتی ہے؟“ وہ شخص شپٹا گیا کہ اس بات کا کیا جواب دے۔ اسے خاموش پاکر لڑکی نے مزید کہا۔ ”آپ کو تو Shit کا بھی معلوم نہیں اور چلے ہیں گلوبل وارمنگ اور ماحولیاتی آلودگی جیسے موضوعات پر بحث کرنے۔“

سو دوستو! ایسا حادثہ کسی کے ساتھ بھی پیش آسکتا ہے۔ اس لیے عورت سے گفتگو کا آغاز کرنے کا خطرہ مول لینے سے پہلے سوچنا ضرور چاہیے۔ اسی خیال کے تحت میں نے اس سفر میں خاموش رہنے ہی کا فیصلہ کیا تھا۔ بہرحال مجھے اس وقت حوصلہ ملا جب میری ہمسفر خاتون نے مجھ سے بات کرنے میں پہل کی۔

”لوکل ٹائم کے مطابق یہ فلائٹ نیروبی کب پہنچے گی؟“ انہوں نے پہلا سوال کیا اور میں نے جواب دیا تو انہوں نے دوبارہ پوچھا۔ ”آپ نیروبی جارہے ہیں یا آگے کمپالا (یوگنڈا) جائیں گے؟“

گویا ان کی طرف سے گفتگو کا آغاز ہوچکا تھا۔ میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ میں میرین انجینئر نگ کا پروفیسر ہوں اور نیروبی میں اس جہاز سے اتر کر وہاں ایک رات ٹھہروں گا اور پھر اگلے دن بائی روڈ ممباسا روانہ ہوجاؤں گا۔

انہوں نے بتایا کہ ان کے والدین گجراتی ہیں اور ان کا تعلق کھمبھاٹ نامی گاؤں سے ہے لیکن وہ کمپالا میں پیدا ہوئیں اور وہیں پلی بڑھیں۔ بنیادی تعلیم کمپالا اور پھر نیروبی سے حاصل کی۔ اس کے بعد وہ میڈیکل کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلینڈ چلی گئیں۔ اب وہ یورولوجسٹ ہیں۔

آخر میں ڈاکٹر رجنی ویش مکھ نے کہا۔ ”آپ کو یقیناً حیرت ہوئی ہوگی کہ میں گجراتی ہوتے ہوئے یوگنڈا میں کیسے پیدا ہوئی؟“

”نہیں، مجھے اس پر بالکل حیرت نہیں ہوئی۔“ میں نے بتایا۔ ”مجھے معلوم ہے کہ خاصے طویل عرصے سے یوگنڈا، کینیا اور تنزانیا کی اطراف میں گجراتی ہندو، سندھی ہندو، آغا خانی اور بلوچ خوجہ اثناعشری بڑی تعداد میں مقیم ہیں۔ اب ان میں سے کئی لوگ انگلینڈ اور دوسرے ملکوں کو چلے گئے ہیں لیکن ساٹھ کی دہائی کے آخری برسوں میں جب میرا جہاز ممباسا اور افریقا کے مشرقی کنارے کی مختلف بندرگاہوں میں جاتا تھا تو اکثر لوگوں سے میری ملاقات ہوتی تھی۔ وہ کاروبار پر چھائے ہوئے تھے...... بہرحال مجھے آپ کی دوسری بات پر ضرور حیرت ہوئی ہے۔“

”کون سی بات پر؟“ انہوں نے جلدی سے پوچھا۔ وہ اس بارے میں فوراً جاننا چاہتی تھیں۔ میں نے چائے کا آخری گھونٹ لے کر خالی کپ ائر ہوسٹس کے حوالے کیا۔ اس دوران میں نے دیکھا کہ ان کے چہرے پر تجسس کے باعث دلکش کھنچاؤ سا پیدا ہوگیا تھا۔ میرے جواب کی تاخیر پر انہوں نے دوبارہ پوچھا۔

”آپ کو میری کس بات پر حیرت ہوئی؟“

”آپ کے یورولوجسٹ ہونے پر۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں سمجھتا تھا کہ یورولوجسٹ صرف مرد ہوتے ہیں۔“ میری بات سن کر انہوں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

”اسی طرح میں یہ بھی سمجھتا تھا کہ گائنا کالوجسٹ صرف عورتیں ہوتی ہیں۔“ میں نے مزید کہا۔ ”پھر جب 1960ء میں، میں میٹرک میں تھا تو ہم نے سول اسپتال حیدرآباد کے ایک ڈاکٹر سالار زار کے بارے میں سنا کہ وہ گائناکالوجسٹ ہیں۔ ملائیشیا کے شہر ملاکا میں جہاں سے میں آرہا ہوں 1985ء تک ایک بھی لیڈی ڈاکٹر نہیں تھی۔ تمام گائناکالوجسٹ مرد تھے۔ چینی اور انڈین عورتوں سمیت سلطانوں کی مسلمان بیویوں کی زچگی بھی مرد ڈاکٹروں کے ذریعے ہوتی تھی۔“

بہرحال ڈاکٹر رجنی بے حد دلچسپ شخصیت ثابت ہوئیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ انہیں زیادہ بولنے کی عادت ہے یا وہ بھی میری طرح وقت گزارنے کے چکر میں تھیں کیونکہ وہ میرے پروفیشن کے بارے میں پوچھتی رہیں اور اپنی میڈیکل فیلڈ کے متعلق بھی بتاتی رہیں۔ ان کی بتائی ہوئی میڈیکل کی معلومات، خاص طور پر گردوں میں پتھری پیدا ہونے کے اسباب اور اس کے سدِباب کے متعلق غور سے سنتا رہا کیونکہ اس مرض میں اس قدر شدید درد ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ ہمیں جہاز موڑ کر بندرگاہ کا رخ کرنا پڑا تھا جبکہ عام حالات میں مریض کو کسی قسم کی دوا دے کر جہاز کو مقررکورس ہی پر رکھا جاتا ہے تاکہ جہاز طے شدہ شیڈول کے مطابق منزل پر پہنچے اور پھر وہاں مریض کو ہاسپٹل میں داخل کرایا جائے۔ میں نے یہ بات ڈاکٹر رجنی کو بتائی۔

”ایک مرتبہ ہم اسپین کی بندرگاہ بارسلونا سے لنگر اٹھا کر میڈیٹرینین سمندر کے جزیرے مالٹا کی جانب روانہ ہوئے۔ راستے میں ایک بوڑھے خلاصی کو اس قدر شدید درد ہوا کہ ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ اسے گردے میں پتھری کی شکایت تھی۔ ہم نے اسے جہاز میں دستیاب ہر قسم کے Pain killer دیے تاکہ ایک آدھ دن کے لیے اسے آرام آجائے اور مالٹا پہنچ کر اسپتال میں داخل کرایا جائے کیونکہ ہمارا وقت پر مالٹا پہنچنا ضروری تھا لیکن مریض کی تکلیف میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ آخرکار ایک انسانی جان بچانے کے لیے ہم نے واپسی کا سفر اختیار کیا اور واپس بارسلونا پہنچے، جہاں ڈاکٹروں نے فوراً اس کا آپریشن کیا۔“

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ ڈاکٹر رجنی نے کہا۔ ”پتھری کا درد عورت کے دردِ زہ کی طرح بے حد شدید ہوتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ قدیم زمانے کے حکیم کہتے تھے کہ گردے کی پتھری، مردوں کو قدرت کی جانب سے عورت کے دردِزہ کا احساس دلانے کا ذریعہ ہے۔“ ڈاکٹر رجنی کا مطلب یہ تھا کہ مریض کو اس وقت آرام اور فرحت محسوس ہوتی ہے جب اسے اذیت پہنچانے والی پتھری سے نجات ملتی ہے۔

☆☆☆

کینیا ائرویز کے ہوائی جہاز، جس کی دم پر انگریزی میں Pride of Africa لکھا تھا، نے رات کے تقریباً آٹھ بجے روشنیوں سے جگمگ کرتے شہر نیروبی کے اوپر ایک چکر لگا کر جنوب مشرق میں واقع انٹرنیشنل ائرپورٹ پر لینڈ کیا۔ جہاز کی سیاہ فام ائر ہوسٹس نے بتایا کہ اگر دن کا وقت ہوتا تو میں کھڑکی سے یہاں کا مشہور پہاڑ ماؤنٹ کینیا دیکھ سکتا تھا اور دوسری جانب کی کھڑکی سے مجھے ماؤنٹ کلمن جارو نظر آتا۔

ماؤنٹ کینیا اس ملک کا سب سے بلند پہاڑ ہے۔ اس کی چوٹیاں، ناتیان 5200 میٹر، نیلائن 5100 میٹر اور لیناتا 5000 میٹر بلند ہیں۔ یاد رہے کہ ہمارے ایشیا کے ہمالیہ پہاڑوں میں بلند ترین چوٹی والا ایورسٹ پہاڑ 8850 میٹر بلند ہے۔ اسے دنیا کا بلند ترین پہاڑ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کا یہ انگریزی نام 1865ء میں انڈیا کے برٹش سرویئر جنرل اینڈریو واگھ کی سفارش پر رائل جیوگرافیکل سوسائٹی والوں نے رکھا تھا۔ اس سے قبل ایورسٹ پہاڑ کو Peakxv یعنی پندرہویں چوٹی کہا جاتا تھا۔ اسی طرح کینیا پہاڑ کو وہاں کے مقامی قبائل مختلف ناموں سے یاد کرتے تھے۔ انگریزوں نے 1849ء میں اس کا نام کینیا پہاڑ رکھا۔ یاد رہے کہ اس زمانے میں کینیا ملک کا وجود نہیں تھا۔ افریقا کا یہ علاقہ، جہاں آج کینیا واقع ہے British East Africa Protectorate کہلاتا تھا۔ 1920ء کے بعد انگریزوں نے یہ نام تبدیل کرکے اس ملک کا نام کینیا پہاڑ کی نسبت سے کینیا رکھا۔ پہلے اسے Kenia لکھا جاتا تھا اور بعد میں .... Kenya لکھا جانے لگا۔ جب 1963ء میں انگریزوں نے اس ملک کو خودمختاری دی تو مسٹر جومو کینیاٹا اس ملک کے پہلے صدر بنے۔ انہوں نے بھی ملک کا یہی نام برقرار رکھا۔ ان کی اپنے قبیلے کے متعلق لکھی ہوئی انگریزی کتاب Facing Mount Kenya بہت

مشہور ہوئی۔ اس کا پہلا ایڈیشن 1938ء میں شائع ہوا۔ کینیا کے مذکورہ صدر یہاں کے مقامی لوگوں میں وہی حیثیت رکھتے ہیں جو ہمارے ہاں محمد علی جناح کی ہے۔ ہم ان کا ذکر آئندہ کریں گے۔

انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے لیے مسٹر جومو کینیا تا جو پُرجوش تقاریر کرتے تھے، ہم انہیں کالج کے زمانے میں بہت شوق سے سنتے تھے۔ وہ 1960ء کا زمانہ تھا اور ہم میٹرک کے طالب علم تھے۔ ہم مسٹر جومو کو ایسا ہی ہیرو تصور کرتے تھے جیسے ستر کی دہائی کے اوائل برسوں میں کالجز اور یونیورسٹیز کے اسٹوڈنٹس ذوالفقار علی بھٹو کی تقریریں سن کر انہیں اپنا ہیرو مانتے تھے۔

کینیا پہاڑ اور اس کی چوٹیوں باتیان، نیلائن وغیرہ کو سر کرنے کی داستانوں پر مشتمل کئی کتابیں مارکیٹ میں دستیاب ہیں۔ مثلاً سر ہالفورڈ ماکندر کی کتاب The First Ascent Of Mount Kenya اس میں اس پہاڑ کی باتیان چوٹی سر کرنے کی کہانی ہے۔ ایک دوسری کتاب Snow Of The Equator ہے اور اس کے مصنف W.H.Tilman ہیں۔ اس کتاب سے یاد آیا کہ جب 1849ء میں جوہان لڈوگ کراف نامی ایک جرمن نے پہلی مرتبہ اس پہاڑ کی موجودگی سے دنیا کو آگاہ کیا تو سائنٹیفک سوسائٹی یہ سن کر حیرت میں پڑ گئی تھی کہ لڈوگ کراف نے پہاڑ کی جن برف پوش چوٹیوں کا ذکر کیا ہے حقیقت میں ان کا وجود ہے بھی یا نہیں۔ یعنی لڈوگ کراف کی بات کی صداقت میں شبہ کیا جانے لگا کیونکہ اس پہاڑ کی لوکیشن بالکل خط استوا پر ہے اور خط استوا کا بیلٹ یعنی ہر وقت سخت گرمی بھلا ایسی جگہ پر برف کیسے ہو سکتی ہے؟ یہ ایسا ہی ہے جیسے کچھ لوگوں نے بتایا تھا کہ گورکھ ہل کی چوٹی پر جون، جولائی کے مہینوں میں بھی اس قدر سردی ہوتی ہے کہ رات کو رضائی اوڑھ کر سونا پڑتا ہے۔ پہلے تو ہمیں بھی یہ سن کر بہت حیرت ہوئی تھی کہ دادو جیسا ضلع جہاں ان مہینوں میں گرمی سے پانی ابلنے لگتا ہے وہاں ایسی سردی کس طرح ممکن ہے۔

کینیا پہاڑ خطِ استوا کے زیرو ڈگری طول البلد کے بالکل جنوب میں واقع ہے۔ یہ پہاڑ نیروبی سے اتنا دور ہے جیسے کراچی سے ٹھٹھ۔ اس پہاڑ کے آس پاس یہاں کے ایک مشہور قبیلے ''ماسائی'' کے لوگ رہتے ہیں جو نیم بدو طبیعت کے مالک ہیں۔ وہ اپنے مویشی پہاڑ کے اردگرد چراگاہ میں چرانے کے لیے لے جاتے ہیں۔ وہ اس پہاڑ کو Ol Donyo Keri کہتے ہیں۔

براعظم افریقا کے سب سے بلند پہاڑ کلے من جارو کا نام ہم نے اس وقت سنا جب اسکول کے زمانے میں ہمیں انگریزی کتابیں پڑھنے کا نیا نیا شوق پیدا ہوا تھا۔ ہمارے پسندیدہ مصنفین میں ارنسٹ ہمنگوے بھی شامل تھے۔ ہم نے اس زمانے میں اس مصنف کی کتاب The Snows Of Kilimanjaro پڑھی تھی۔ ارنسٹ ہمنگوے 1899ء میں امریکا کی ریاست الینوس میں پیدا ہوئے۔ مذکورہ بالا کتاب ہمنگوے کا ماسٹر پیس قرار دیا جاتا ہے۔ انہوں نے یہ کتاب افریقا کے ٹور کے بعد لکھی تھی جہاں وہ اخباری نمائندے کی حیثیت سے گئے تھے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ 1936ء میں ''اسکوائر'' میگزین میں شائع ہوئی۔

کلے من جارو پہاڑ کینیا کے قریبی ملک تنزانیا میں ہے۔ ہمارے طالب علمی کے دور میں یہ ایک ملک نہیں بلکہ ٹانگا نیکا، زینزیبار اور نیاسالینڈ کے ناموں کے تین ملک تھے۔ ہم ان ملکوں کے خوب صورت ڈاک ٹکٹ حاصل کر کے بہت خوش ہوتے تھے۔ کلے من جارو پہاڑ کی ''اوحرو'' چوٹی 5900 میٹر بلند ہے۔ یہ پورے براعظم افریقا کا سب سے بلند پہاڑ ہے۔ اس کے بعد دوسرے نمبر پر ماؤنٹ کینیا ہے۔ جاپان کے فیوجی پہاڑ کی طرح افریقا کے یہ دونوں پہاڑ بھی خوب صورت نظر آتے ہیں۔ ان کی چوٹیاں برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔ ماؤنٹ کینیا اور فیوجی پہاڑ میں خاصی مماثلت پائی جاتی ہے۔ ان دونوں پہاڑوں کی ڈھلانیں تقریباً ایک سی ہیں۔ چوٹیاں سر کرنے اور پہاڑوں سے دلچسپی رکھنے والے افراد، فرنچ مصنف رولانڈ کی انگریزی میں ترجمہ کی ہوئی کتاب From Kenya To Kilimanjaro ضرور پڑھیں۔

دلکش نین نقش والی سیاہ فام ائر ہوسٹس سے میں نے اس کی ائر لائن یعنی کینیا ائرویز کے بارے میں پوچھا۔ میرا جہاز آخری مرتبہ 1975ء میں کینیا کی بندرگاہ ممباسا میں آیا تھا تو اس وقت ہمارے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ کینیا، یوگنڈا حتیٰ کہ دبئی، دوحا، عرب امارات جیسے ملک بھی ہوائی جہازوں کی کمپنی قائم کر سکتے ہیں اور پھر اسے نہایت خوش اسلوبی سے چلا بھی سکتے ہیں۔ اس دور میں جہاز رانی اور فضائی کمپنی کے حوالے سے ہمارے ملک کا بول بالا تھا۔ پی آئی اے کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ ہم اس زعم میں مبتلا تھے کہ ہم سا کوئی نہیں۔ اس وقت ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ بداعمالیوں کے سبب ہمارا آج جیسا حال بھی ہو سکتا ہے۔ سنگاپور، ملائیشیا اور یو اے ای جیسے ملکوں کی فضائی کمپنیاں ہمارے ہی لوگوں نے شروع کیں اور اب وہ دنیا کی مشہور، آرام دہ اور خوشحال ہوائی کمپنیاں ثابت ہو رہی ہیں اور ہمارا حال سب کے سامنے ہے۔

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ
ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے

نادیہ نامی عیسائی کینین ائر ہوسٹس نے بتایا کہ کینیا کی اس قومی ہوائی کمپنی ''کینیا ائرویز'' کا آغاز 1977ء میں ہوا اور آج اس کے پاس 26 بڑے ہوائی جہاز موجود ہیں اور ان کی عمر آٹھ سال سے بھی کم ہے۔ کینیا ائرویز کے جہاز افریقا، یورپ اور ایشیا کے کئی شہروں میں جاتے ہیں۔ گزشتہ چھ ماہ کے دوران 15 لاکھ مسافروں نے سفر کیا ہے اور یہ ہوائی کمپنی افریقا کی اعلیٰ اور امیر کمپنیوں میں سے ایک ہے۔ اس کمپنی کے جہاز ڈسپلن کے پابند ہیں اور مسافروں کا ہر طرح سے خیال رکھا جاتا ہے۔

''سب سے اہم بات یہ کہ سیکورٹی اور تحفظ کے پہلو کو اولین ترجیح دی جاتی ہے۔'' نادیہ نے بتایا۔ ''ہماری کمپنی کو تیس برس کے دوران صرف دو حادثے پیش آئے۔'' اور میں ان دونوں حادثوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ کینیا ائرویز کا پہلا خوفناک حادثہ 31 جنوری 2000ء کو پیش آیا جب ان کی فلائٹ نمبر 431 کی A310 ائربس نے 179 افراد کو اٹھا کر ''کوٹا ڈی آئیوری'' نامی ملک کے ہوائی اڈے عابد جان سے ٹیک آف کیا اور چند گھنٹوں کے بعد اس نے اٹلانٹک سمندر میں ڈبکی لگائی۔ اس پرواز میں 169 مسافر ہلاک ہوئے تھے۔ صرف دس افراد کو بچایا جا سکا تھا۔

کینیا ائرویز کا دوسرا بڑا حادثہ 5 مئی 2007ء کو پیش آیا۔ بوئنگ 800-737 نیروبی سے 26 ملکوں کے 105 مسافروں کو اٹھا کر عابد جان ائرپورٹ کے لیے فضا میں بلند ہوا۔ راستے میں اسے ''دوآلا'' ہوائی اڈے سے بھی کچھ مسافر اٹھانے تھے لیکن ائرپورٹ تک پہنچنے سے تین چار میل پہلے جہاز تباہ ہو گیا۔ اس میں سوار تمام مسافر لقمۂ اجل بن گئے تھے۔

☆☆☆

کینیا ائرویز کے ہوائی جہاز میں آرام دہ سفر کرنے پر خوشی کے ساتھ ساتھ دل میں ہوک سی اٹھی کہ افریقا کے کینیا جیسے ملک کی ہوائی کمپنی بھی ہماری قومی ائرلائن سے بہت آگے نکل گئی ہے۔ نیروبی ائرپورٹ کے واش روم کی حالت دیکھ کر بھی دل کو احساسِ زیاں نے جکڑ لیا تھا۔ نیروبی ائرپورٹ کے واش روم یورپ کے ہوائی اڈوں کی طرح صاف ستھرے تھے۔ ایک سیاہ فام شخص واش بیسن پر لگے آئینے کو صاف کر رہا تھا۔ ہر چیز چمک رہی تھی۔ باہر آنے کے وقت وہ میری راہ روک کر نہیں کھڑا ہو گیا۔ جس طرح کراچی کے ہوائی اڈے پر مسافروں سے ٹپ کی بھیک مانگنے کے لیے صفائی کرنے والا راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ یہاں کینین سیاہ فام اپنے کام میں مشغول رہا۔ واش روم میں یورک ایسڈ کی ایسی بو بھی نہیں تھی جو ہمارے ملک کے کراچی، لاہور حتیٰ کہ اسلام آباد کے ہوائی اڈوں کی Uriners میں موجود ہوتی ہے جب تک نیروبی سے ممباسا جانے کی پرواز کا فیصلہ ہوتا تب تک میں ائرپورٹ کی عمارت کی پانچویں منزل پر واقع سمبا ریسٹورنٹ میں جا بیٹھا۔ چاروں طرف مختلف ملکوں کے لوگ، خاص طور پر یورپ کے گورے مرد اور خواتین اپنے مخصوص اور مختصر لباس میں نظر آئے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ گو کہ اب انگریزوں کا راج باقی نہیں رہا اس ملک کے سیاہ فام حکمران اور بیوروکریٹس بھی کچھ زیادہ ایماندار نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود اس قدر امن و امان ہے کہ کتنے ہی یورپین آج بھی اپنے ملک کے لباس میں ملبوس آزادانہ طور پر بے خوف و خطر یہاں سیاحت کے لیے آتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی کسی زمانے میں کراچی جیسا شہر سیاحوں سے بھرا رہتا تھا۔ مختلف ملکوں سے تعلق رکھنے والے ٹورسٹ اور جہازوں کے سیلرز کثرت سے نظر آتے تھے۔ آج کے حالات بالکل مختلف ہیں۔ عورتیں تو ایک طرف مردوں کو بھی جہاز راں کمپنیاں ہدایات جاری کرتی ہیں کہ وہ جتنے دن بھی کراچی میں رہیں بندرگاہ سے باہر ہرگز نہ نکلیں۔ شاذ ہی کوئی کرغستان، ازبکستان، ترکمانستان، کزاکستان جیسے ملکوں کے کنگلے دکھائی دیں گے۔

رفتہ رفتہ ہمارے درمیان سے رواداری، ہمدردی، مہمان نوازی، دوسروں کی عزت کرنے کا جذبہ اور ایمانداری کوچ کرتی چلی گئی۔ ہمدردی کی جگہ لوٹ مار نے لے لی۔ مہمان نوازی کے جذبے پر خود غرضی حاوی ہو گئی۔ بے ایمانی، کرپشن اور وطن فروشی جیسے کریہہ خصائل ہمارے ہاں عام و خاص آدمی میں سرایت کرنے لگے۔ دیانت داری سے

ڈیوٹی انجام دینا گویا عیب قرار پایا۔ وہ جو ہم سے سیکھ کر ترقی کی بلندیوں کو چھونے لگے اور ہم اپنی صلاحیتوں کو زنگ آلود کر کے ان ہی کے محتاج بن گئے۔ افسوس صد افسوس۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

بہرحال نیروبی ائرپورٹ پر ''سمبا'' ریسٹورنٹ کے علاوہ ایک دو کیفے ٹرائے، پب اور ایک ہوٹل بھی نظر آیا۔ جگہ جگہ وینڈنگ مشینیں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ ان میں مطلوبہ سکہ ڈال کر کھانے پینے کی چیزیں حاصل کی جا رہی تھیں۔ میں نے قیمتوں کا موازنہ کیا تو وہ وہی تھیں جو ممبئی، کولمبو، کوالالمپور، تہران حتیٰ کہ منیلا اور ہانگ کانگ ائرپورٹس پر ہیں۔ ایک ہمارا ائرپورٹ ہے اور دوسرا جدہ ائرپورٹ جہاں معلوم نہیں کیوں مسافروں کو لوٹا جاتا ہے..... اور ہاں یاد آیا تیسرا دبئی کا نام نہاد ''ڈیوٹی فری'' ائرپورٹ ہے۔ دوستو.....! اتنی مہنگائی تو اوسلو، کوپن ہیگن اور اسٹاک ہوم کے ہوائی اڈوں پر بھی نہیں ہے۔ جتنی کراچی، دبئی اور جدہ ائرپورٹ پر ہے۔

نیروبی کا یہ بین الاقوامی ائرپورٹ شہر کے جنوب مشرق میں ''ایمبا کاسی'' نامی ایک پسماندہ اور غربت زدہ علاقے میں ہے۔ اس علاقے کو یوں سمجھیں جیسے کراچی کے علاقے ماری پور اور یونس آباد ہیں۔ یہ ائرپورٹ 1958ء میں نیروبی ایمباکاسی ائرپورٹ کے نام سے تعمیر ہوا۔ ان ایام میں یہاں انگریزوں کا دور تھا اور اس ائرپورٹ کا افتتاح ملکہ الزبتھ اول نے کرنا تھا لیکن انہیں آسٹریلیا میں مصروفیت کے سبب تاخیر ہوگئی اور نیروبی کی اس افتتاحی تقریب میں نہ پہنچ سکیں۔ کچھ عرصے کے بعد اس ہوائی اڈے کا نام ''نیروبی انٹرنیشنل'' رکھا گیا۔ 1970ء میں یہ نیا ائرپورٹ تعمیر کیا گیا۔ اب اس کا نام ''جوموکینیاٹا انٹرنیشنل ائرپورٹ'' ہے۔ اس نئے ٹرمنل کے تین یونٹ ہیں۔ دو بین الاقوامی پروازوں کی آمد و رفت کے لیے اور تیسرا ڈومیسٹک فلائٹس کے لیے ہے۔ جہاں سے میں ہوائی جہاز کے ذریعے ممباسا جا سکتا تھا۔ ممباسا جانے والی مرکزی سڑک بھی ائرپورٹ کے قریب سے گزرتی ہے لیکن مجھے وہ رات نیروبی میں گزارنے کی ہدایت کی گئی تھی لہٰذا میں سمبا ریسٹورنٹ میں چائے اور سینڈوچ کا بل ادا کر کے باہر آ گیا اور ٹیکسی میں بیٹھ کر نیروبی کے مرکزی علاقے کی طرف روانہ ہوگیا۔ وہ علاقہ سینٹرل بزنس ڈسٹرکٹ کہلاتا ہے اور ائرپورٹ سے دس میل کے فاصلے پر ہے۔

میرا خیال ہے کہ میں پہلی مرتبہ 1970ء یا شاید 1969ء میں افریقا کی بندرگاہ ممباسا میں آیا تھا۔ اس سے دس سال قبل ہم میٹرک کے طالب علم تھے اور ہم جغرافیہ کی کتاب میں افریقا کے بارے میں پڑھتے تھے کہ یہ ''تاریک براعظم'' ہے۔ جہاں تہذیب سے عاری جنگلی قسم کے لوگ آباد ہیں لیکن ممباسا پہنچ کر مجھے حیرت ہوئی تھی کہ یہاں کی سڑکیں، ٹریفک کا نظام، پولیس، مختلف ادارے اور لوگوں کی گفتگو میں سلیقہ اور انداز خاصا مہذب ہے بلکہ ان کا معیار ہم سے زیادہ بہتر معلوم ہوا تھا۔ مجھے یاد ہے، ممباسا کی مارکیٹ میں پلاسٹک کی تھیلیوں میں پیک تازہ دودھ اور قصابوں کی صاف ستھری دکانیں دیکھ کر میں نے اپنے ایک واقف کار مقامی آغا خانی سے کہا تھا۔

''یہاں کا ماحول تو یورپ جیسا نظر آتا ہے۔'' یاد رہے کہ اس وقت تک ہمارے ہاں ایسی سپر مارکیٹوں کا آغاز نہیں ہوا تھا اور نہ ہی تھیلیوں میں دودھ، سبزی اور گوشت پیک شدہ حالت میں ملتا تھا۔

''یار، یہ کیسا تاریک براعظم ہے؟'' میں نے دوبارہ اپنے شناسا آغا خانی سے اظہارِ خیال کیا۔ وہ کینیا کا شہری ہے۔ اس کا دادا 1930ء میں سندھ کے شہر تلہار سے ہجرت کر کے ممباسا آ گیا تھا۔ ''یہاں کے سیاہ فام ہم سے بھی زیادہ سلجھے ہوئے اور بااخلاق نظر آتے ہیں۔''

''کبھی تو میں کہتا ہوں کہ انگریزوں کو اتنی جلدی برصغیر نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔'' اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''خاص طور پر سندھ میں انہیں مزید کچھ عرصہ رہنا چاہیے تھا کیونکہ انگریزوں کے جانے کے بعد سندھ کا تعلیم یافتہ طبقہ یعنی ہندو بھی رخصت ہوگیا یا پھر سندھ کے جاہل پیر، میر، وڈیرے نے سندھ اور سندھ کے عوام کو تباہ کر دیا۔'' اس کی بات سن کر مجھے اپنے ایک دوست کی بات یاد آ گئی جو امریکا میں مقیم ہے۔ اس کا تعلق شمالی سندھ سے ہے۔ وہ اکثر اپنے گاؤں کے وڈیرے کے مظالم کا رونا روتے ہوئے کہتا ہے۔

''انگریزوں نے سندھ پر کم از کم ایک سو سال حکومت کی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے گاؤں پر ان کی حکومت کا اثر ایک دن کے لیے بھی نہیں رہ سکا۔ ہمارے وڈیرے، سیاستدان اور رئیس وہی جاہل اور ظالم ہیں۔ علم، انصاف اور انسانیت کا سبق وہ نہ تو اسلام سے حاصل کر سکے ہیں اور نہ ہی انگریزوں سے کچھ سیکھ سکے ہیں۔''



بہرحال یورپ کی مختلف بندرگاہیں دیکھنے کے بعد مجھے افریقا کی یہ ممباسا بندرگاہ بے حد خوب صورت اور عجیب معلوم ہوئی تھی۔ چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ، خوشگوار موسم، یہاں نہ تو یورپ جیسی سخت سردی اور برفباری اور نہ مہنگی سواری، ہر شخص مطمئن اور پُرسکون، مختلف اقسام کے رنگین ملبوسات میں سیاہ فام مرد و زن، ساڑیوں میں ملبوس آغا خانی، خوجا، بوہری اور گجراتی عورتیں۔ ان تمام کے لیے یہاں ایک ہی ٹرم ''انڈین'' استعمال ہوتی ہے۔ ان کے درمیان مختصر لباس میں انگریز اور یورپین بھی نظر آئے۔ گرمی کے موسم میں بھی سفید کوٹ اور پگڑی باندھے چلتے پھرتے سندھی ہندو اور پارسی بھی کثرت سے دکھائی دیے تھے۔ میرے تصور میں اب بھی وہ منظر محفوظ ہے۔ وہ لوگ زنجیر سے منسلک نسوار کی ڈبیا سے مشابہ ''میڈ اِن سوئز'' گھڑی نکال کر وقت دیکھتے تھے۔ اس باریک زنجیر کا دوسرا سرا قمیص میں لگے سنہری بٹن میں اٹکا ہوتا تھا۔ ان ایام میں گھڑیاں عام نہیں تھیں جیسا کہ آج ہیں۔ کسی خوش پوش کو دیکھ کر وقت معلوم کیا جاتا تھا یا شہر کے گھنٹا گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے ٹائم دیکھا جاتا تھا۔

لیکن 1970ء وہ سال تھا جس میں جاپانی گھڑیاں، خاص طور پر سیکو اور سٹیزن دنیا میں مشہور ہوئیں۔ اس سے پہلے ہم جہازی ڈیوٹی فری بندرگاہوں سے فیورلوبا نامی سوئٹزرلینڈ کی گھڑیاں خریدتے تھے۔ اومیگا واچ سب سے مہنگی تھی اور ہماری قوتِ خرید سے باہر تھی۔ ہم وطن لوٹتے تھے تو قریبی عزیز اور دوست ولایتی گھڑی کی فرمائش کرتے تھے۔ آج کل چین اور تائیوان میں تیار ہونے والی الیکٹرانک گھڑیاں بیس روپے میں مل جاتی ہیں اور یہ بھی درست وقت بتاتی ہیں۔ لیکن 1970ء سے پہلے مکینیکل گھڑیاں ہوتی تھیں۔ ان میں سے صرف نامور کمپنیوں کی گھڑیاں ہی ہر وقت درست ٹائم بتاتی تھیں۔ باقی گھڑیاں کچھ وقت استعمال کرنے کے بعد مستری سے درست کرائی جاتی تھیں۔ باقاعدگی سے ان کی سوئیوں، اسپرنگ، راڈیوں کی مرمت کرائی جاتی تھی۔

ممباسا میں ہانگ کانگ، عدن اور کولمبو جیسے ڈیوٹی فری شاپنگ مال اور انگلینڈ جیسے بار، پب اور کیفے ٹیریا دیکھ کر تعجب ہوتا تھا۔ اس دوران میں یہ خیال آتا کہ یہ کس قسم کی بندرگاہ ہے جو افریقا کی سرزمین پر تو ہے لیکن اس کے باشندے مقامی سیاہ فاموں کے علاوہ ایشیائی لوگ بھی ہیں۔

جس بندرگاہ کے کلچر اور ماحول سے انگلینڈ کی خوشبو آتی ہے۔ جس کی نائٹ لائف میں یورپ کی (بد) بُو بھی ہے!

ہماری مقامی جہازراں کمپنی کے آفس میں ایک سکھ کلرک تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ نیروبی میں پیدا ہوا اور یہیں پلا بڑھا۔ آج بھی اس کا خاندان یہیں رہتا ہے۔ وہ محض ملازمت کے سبب ممباسا میں رہتا ہے۔ جیسے ہی اسے موقع ملے گا اپنا ٹرانسفر نیروبی میں کرالے گا۔

"یار کمال ہے!" میں نے حیرت سے کہا تھا۔ "ممباسا جیسا زبردست شہر چھوڑ کر جاؤ گے؟"

میں نے اس وقت تک کینیا تو کیا پورے براعظم افریقا کا صرف یہی ایک شہر ممباسا دیکھا تھا...... ہم مصر کے شہروں کا ذکر نہیں کر رہے۔ یہ ملک ایشیا میں بھی ہے اور براعظم افریقا میں بھی۔ جس طرح ترکی یورپ میں بھی ہے اور ایشیا میں بھی۔

"میرے شہر نیروبی جیسا کوئی شہر ہی نہیں ہے۔" سکھ نے گویا دوٹوک انداز میں جواب دیا۔

"لیکن ممباسا ایک بندرگاہ بھی ہے۔ سمندر قریب ہونے کے سبب گرما میں بھی یہاں کا موسم خاصا خوشگوار رہتا ہے۔ جبکہ کینیا خطِ استوا کی پٹی پر واقع ہونے کے سبب وہاں ہر وقت سخت گرمی پڑتی ہوگی۔" میں نے کہا تھا۔

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" سکھ نے جواب دیا۔ "لیکن میرے شہر نیروبی میں موسم گرما بھی بہت خوشگوار رہتا ہے۔ کیونکہ وہ سطح سمندر سے خاصی بلندی پر واقع ہے...... بالکل ایسے، جیسے آپ کے کوئٹہ اور کوہ مری ہیں۔"

یہ بات بھی میرے لیے خاصی حیرت انگیز تھی۔ میرا بھی خیال تھا کہ افریقا "تاریک براعظم" ہے یعنی جاہلوں اور اجڈ لوگوں کا ملک! جہاں پانی ہے نہ وافر مقدار میں خوراک دستیاب ہے۔ جہاں ہر وقت جھلسا دینے والی گرمی پڑتی ہے۔ ایسے میں یہ باتیں سن کر میری حیرت بجا تھی۔ یہ بات دیگر ہے کہ آئندہ چل کر معلوم ہوا کہ رہوڈیشیا اور ساؤتھ افریقا خطِ استوا سے اس قدر دور ہیں کہ وہاں ہر وقت سردی رہتی ہے اور موسم سرما میں برف باری بھی ہوتی ہے۔

ان دنوں، یعنی 1970ء کی ایک اور بات یاد آرہی ہے کہ ہم نے مذکورہ سکھ کو جب اپنے ملک اور کراچی بندرگاہ کی باتیں بتا کر متاثر کرنے کی کوشش کی (یاد رہے کہ اس وقت کے کراچی بندرگاہ کی صفائی ستھرائی اور efficient ہونے کی تعریف امریکن بھی کرتے تھے۔ کراچی شہر کی خوبصورتی اور ماڈرن ٹیکنالوجی کے سامنے پینانگ، کوالالمپور، جکارتا، حتیٰ کہ بینکاک اور منیلا بھی کچھ نہ تھے) اور اس دوران میں ہم نے سکھ کو بتایا کہ کراچی میں ڈرائیو اِن سینما بھی ہے۔ جہاں ہم اپنی کار میں بیٹھ کر فلم دیکھتے ہیں۔

"نیروبی میں دو ہیں۔" سکھ نے قہقہہ لگا کر بتایا۔ "ہم سکھ کمیونٹی کے نوجوان دوست کبھی کبھی مستی میں آکر ٹرک میں سوار ہو کر ڈرائیو اِن سینما میں فلم دیکھنے جاتے ہیں...... اور ٹکٹ صرف ایک گاڑی کا لیتے ہیں۔"

اس کی یہ باتیں سن کر ہم مزید حیران ہوئے تھے۔ گویا ہمیں معلوم ہی نہیں تھا کہ افریقا میں نیروبی جیسے شہر بھی ہیں جنہیں انگلش طرز کے شہر کہا جا سکتا ہے۔ یہاں لارینزو مارکس (جو اَب موپوتو کہلاتا ہے) ڈکار اور عابد جان، خارطوم جیسے شہر بھی ہیں جو نہ صرف افریقا اور ایشیا کے خوبصورت شہروں کا منظر پیش کرتے ہیں بلکہ پرتگال اور فرانس کے شہروں سے ان کا موازنہ کیا جا سکتا ہے...... ہمیں اپنے خیال کو تبدیل کرنا پڑا کہ پورا افریقا جنگل اور بیابان ہرگز نہیں ہے!

☆☆☆

نیروبی، دنیا کا ایک عجیب شہر ہے۔ یہاں ہر وقت مختلف ممالک کے ٹورسٹ آتے رہتے ہیں۔ یہ صاف ستھرا اور خوبصورت شہر ہے۔ یہاں ماڈرن بلند عمارتیں اور ہوٹلز ہیں، اس کے ساتھ ہی سفاری (جانوروں کو کھلی فضا میں دیکھنے کے مواقع) ماؤنٹینرنگ (پہاڑ پر جانے) اور شکار کے شوق پورے کرنے کے انتظامات بھی ہیں۔

نیروبی سیاسی اور معاشی طور پر بھی ایک اہم شہر ہے۔ یہاں کئی بین الاقوامی کمپنیوں اور آرگنائزیشنز کے دفاتر ہیں۔ نیروبی میں یو، این، او کے آفس بھی ہیں۔ نیروبی اسٹاک ایکسچینج (NSE) افریقا کی سب سے بڑی ایکسچینج ہے۔ اور ٹریڈنگ والیوم میں افریقا کے چوتھے نمبر پر ہے جو یومیہ ایک کروڑ سودے (trades) کرنے کی طاقت رکھتی ہے۔ جس طرح مشرق بعید میں ٹوکیو، ہانگ کانگ اور سنگاپور جیسے شہر ہیں اور عرب دنیا میں بیروت اور قاہرہ ہیں۔ ہماری طرف ممبئی ہے...... بالکل اسی طرح افریقا کے مشرقی کنارے پر نیروبی شہر ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ دیگر تمام شہر ایک طویل عرصے سے آباد ہیں جبکہ نیروبی کی عمر محض سو برس بھی نہیں ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز، یعنی سن 1900ء میں بھی کسی کو نیروبی کی خبر نہ تھی۔ جب اس کا وجود ہی نہیں تھا تو اس کے بارے میں کسے معلوم ہو سکتا تھا!

یورپی اقوام نے جہاز تیار کر کے سمندر پر حکمرانی حاصل کر لی پھر اس کے بعد وہ افریقا اور ایشیائی ملکوں پر قبضہ کرنے کے چکر میں پڑ گئے۔ افریقا کا کچھ حصہ اٹلی والوں کے ہاتھ لگا اور کچھ حصے پر فرنچوں اور پرتگالیوں نے قبضہ کر لیا۔ کہیں اسپین اور انگلینڈ نے اپنا راج قائم کر لیا۔ امریکا کے دریافت ہونے کے بعد اسپین اور پرتگال کے لوگوں نے اُدھر کا رخ کیا۔ اسی لیے سوائے اکا دکا ملکوں اور جزیروں کے باقی ہر جگہ ہسپانوی اور پرتگالی چھا گئے۔ آج چلی اور کولمبیا سے یو ایس اے کی ریاستوں، میکسیکو، ٹیکساس اور لوزیانہ وغیرہ تک اسپینی زبان بولی جاتی ہے۔ یاد رہے اسپینی اور پرتگالی زبانوں میں محض انیس بیس کا فرق ہے۔ جیسے ڈینش اور سویڈش زبانیں ملتی جلتی ہیں اور جیسے پنجابی اور سرائیکی زبانوں میں خاصی مماثلت ہے۔

افریقا کا مشرقی کنارے والا یہ حصہ، جو اَب کینیا اور یوگنڈا کہلاتا ہے، انگریزوں کے قبضے میں آگیا۔ دیگر یورپین کے مقابلے میں انگریز اس حوالے سے قابلِ تعریف ہیں کہ انہوں نے جہاں بھی حکومت کی وہاں انہوں نے جی بھر کر لوٹ مار تو کی لیکن اس کے ساتھ ہی وہاں امن وامان، جوڈیشری، ڈاک کا نظام، پولیس ڈپارٹمنٹ، تعلیمی نظام، سڑکوں کی تعمیر اور ریلوے سسٹم قائم کیا۔ یہی سبب ہے کہ ملایا (آج کا مغربی ملائیشیا) اور سنگاپور سے ہانگ کانگ اور انڈیا میں ریلوے لائن کا جال بچھا ہوا ہے۔ انگریزوں کے تعمیر کیے ہوئے اس زمانے کے ریلوے اسٹیشنز آج بھی کئی شہروں میں قائم ہیں، کراچی، حیدرآباد اور لاہور ہی کو دیکھ لیجیے۔

آج کا کینیا اور یوگنڈا، یعنی افریقا کا مشرقی کنارے والا یہ علاقہ جیسے ہی انگریزوں کے ہاتھ لگا، انہوں نے ممباسا سے کمپالا تک ریل چلانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ 1899ء کی بات ہے۔ ان دنوں نیروبی کا نام ونشان نہ تھا۔ بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ ممباسا اور کمپالا اس وقت کے اہم اور بڑے شہر تھے۔ ممباسا بندرگاہ تجارت کے لیے اور کمپالا وکٹوریا جھیل کے قریب ہونے کے سبب بہترین موسم اور اہمیت کا حامل شہر تھا۔

انگریزوں کو کینیا اور یوگنڈا سے چائے، کافی اور کاٹن وغیرہ ممباسا میں جمع کر کے اپنے وطن انگلینڈ روانہ کرنے تھے۔ اس کے لیے ٹرین کا ہونا لازمی تھا۔ ریل کی پٹریاں اور چوبی سلیپر وغیرہ بچھانے اور جنگل صاف کرنے کے لیے انہوں نے برصغیر سے ہزاروں مستری اور مزدور منگوائے۔ خاص طور پر اس کام کے لیے پنجاب سے سکھوں کا انتخاب کیا گیا۔ کیونکہ وہ محنتی اور سخت جان تھے اور اس کام کے ماہر بھی۔

جب ریلوے لائن بچھانے کے کام کا آغاز ہوا تو انہوں نے آج کے نیروبی والے مقام کو تعمیری سامان اور مشینری وغیرہ رکھنے کا ڈپو بنایا۔ یہ جگہ ممباسا اور کمپالا کے وسط میں تھی۔ جس طرح کراچی، حیدرآباد سپر ہائی وے تعمیر کرنے والے اطالویوں نے کراچی اور حیدرآباد کے درمیان میں سڑک کی تعمیر میں کام آنے والی مشینری اور دیگر سامان رکھنے کا ڈپو قائم کیا تھا۔ اب اس جگہ نوری آباد شہر آباد ہے۔

موجودہ نیروبی والا مقام نہ صرف اس ریلوے لائن کے بالکل درمیان میں تھا بلکہ اس جگہ کی چند دیگر اور اہم خصوصیات بھی تھیں۔ elevation پر ہونے کے سبب یہاں کا موسم انتہائی خوشگوار تھا اور انجینئر، مزدور سکون کی نیند سو سکتے تھے۔ وہیں سے ایک ندی بہتی تھی جسے مقامی قبیلے "ماسائی" کے لوگ "ان کاری نائی روبی" کہتے تھے۔ یعنی ٹھنڈے پانی کی جگہ۔ ماسائی قبیلے کے بعض لوگ اپنی زبان میں اس ندی کو Ewaso Nyirobi بھی کہتے تھے۔

بہرحال ریلوے کا کام کرنے والے مزدور اور انگریزوں نے اس کا نام "نیروبی ندی" رکھ دیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ریلوے والوں کی مختصر کالونی کی جگہ ایک چھوٹے شہر نے لے لی۔ وہاں انگریزوں کے خوبصورت بنگلے، باغ اور باغیچے دیکھنے کے لائق تھے۔ اب یہ چھوٹا شہر "نیروبی" کہلانے لگا تھا۔ کئی سرکاری دفاتر اور کاروباری لوگوں کی کوٹھیاں ممباسا سے نیروبی منتقل ہو گئیں۔ 1907ء میں اس علاقے کا پایۂ تخت نیروبی قرار پایا جبکہ اس سے پہلے ممباسا تھا۔ یاد رہے اب تک اس علاقے کا نام کینیا مقرر نہیں ہوا تھا۔ یہ پورا ملک اور یوگنڈا کا ایک وسیع حصہ فی الوقت "برٹش ایسٹ افریقا" کہلاتا تھا۔ بعد میں کینیا پہاڑ کی نسبت سے اس ملک کا نام کینیا رکھا گیا۔ 1963ء میں انگریزوں کے رخصت ہونے کے بعد مقامی لوگوں نے بھی اس کا نام "کینیا" برقرار رکھا اور دارالحکومت بھی نیروبی ہی رہا۔ بہرحال نیروبی شہر سطح سمندر سے 1800 میٹر بلند ہے۔ شہر کے وسط سے نیروبی ندی اس طرح گزرتی ہے جیسے لندن کے درمیان میں سے ٹیمس اور ملاکا شہر سے ملاکا ندی گزرتی ہے۔

جن ایام میں ممباسا اور کمپالا کے درمیان ریلوے لائن بچھائی جارہی تھی، ان دنوں میں نیروبی کا یہ علاقہ، جو آج یورپ کے کسی ماڈرن شہر کا منظر پیش کرتا ہے، گھنے جنگل، جھاڑیوں اور دلدل کی وجہ سے بالکل ایسا ہی تھا جیسے ابتدائی دنوں میں دلدلی شہر کوالالمپور تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پینے کے لیے میٹھا پانی وافر مقدار میں موجود تھا۔ موسم ایسا خوشگوار کہ بھری دوپہر میں بھی فرحت کا احساس ہوتا...... لیکن مچھر کی کثرت اور ان کی وجہ سے ملیریا کا مرض اس قدر عام ہوگیا تھا کہ کوئی ایسا دن نہ گزرتا جب کسی نہ کسی کی لاش نہ اٹھانی پڑتی ہو۔ ایک موقع ایسا بھی آیا کہ لوگ بیماری اور موت کے خوف سے اس شہر سے جانے پر بھی تیار ہوگئے تھے۔

انگریز راج میں اس شہر نے بڑی تیزی سے وسعت اختیار کی۔ اس قدر کہ اردگرد رہنے والے ماسائی قبیلے کے لوگ درختوں کی جابجا کٹائی پر بگڑنے لگے۔ ظاہر ہے عمارتوں کی تعمیر کے لیے جگہ اور لکڑی کی ضرورت تھی۔ ان کے بعد کویو قبیلے کے لوگ اس مطالبے کے ساتھ سامنے آئے کہ انگریز ان کی زمینوں پر قبضہ کر بیٹھے ہیں، وہ انہیں واپس کی جائے۔“

انگریزوں نے انہیں دبانے کی پوری کوشش کی لیکن ان کے غصے اور احتجاج میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ آخرکار اس قبیلے کا ایک شخص جوموکینیاتا نے ”ماؤ ماؤ“ نامی تحریک کا آغاز کیا اور انگریزوں کے خلاف بغاوت کا اعلان کردیا۔ جوموکینیاتا کو جیل میں بھی قید کیا گیا لیکن انگریز مطلوبہ نتائج حاصل نہ کرسکے۔ دوسری جنگِ عظیم نے بھی انگریزوں کے غبارے سے ہوا نکال دی تھی۔ جس برصغیر پر وہ فخر کرتے تھے، وہ بھی ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ ان پر ہر طرف سے دباؤ بڑھنے لگا۔ ملائیشیا، سنگاپور، نائیجیریا...... ہر ملک خودمختاری اور آزادی مانگنے لگا۔ آخرکار انگریزوں نے 1963ء میں کینیا کو خودمختاری دی اور خود بوریا بستر باندھ کر لندن، لورپور اور مانچسٹر روانہ ہوگئے۔

نیروبی، افریقا کا ایک شہر ہے لیکن اس میں اتنے غیرملکی ادارے، بین الاقوامی بزنس فرم اور یونائیٹڈ نیشن کے دفاتر ہیں کہ یہاں غیرملکی لوگوں خاص طور پر یورپین اور امریکی باشندوں کی بھیڑ سی لگی رہتی ہے۔ ان لوگوں کی رہائش کے لیے اعلیٰ قسم کے ہوٹلز کا جال سا بچھا ہوا ہے۔ کسی ملک میں ہوٹلوں کی کثرت اور سیاحوں کی آزادانہ آمدورفت سے وہاں کے امن وامان کے بارے میں اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ برنڈی جیسے افریقی ملکوں کی طرح ہمارے ہاں کراچی جیسے شہر میں بھی گزشتہ تیس برسوں سے وہی چار پانچ فائیو اسٹار ہوٹلز ہیں اور وہ بھی خالی رہتے ہیں۔ ہمارے پیارے دوست محمود باویجا اکثر کہتے رہتے ہیں کہ ان کا ”ریجنٹ ہوٹل“ (سابق تاج محل ہوٹل) ستر فیصد خالی رہتا ہے۔

”بچت اور کمائی تو درکنار، ملازموں کی اجرت اور بجلی، گیس کے بل ادا کرنا بھی مشکل ہوتا جارہا ہے۔“ محمود نے بتایا تھا۔

کوالالمپور، سنگاپور، ممبئی، دہلی، تہران کی طرح نیروبی شہر میں بھی جگہ جگہ خوبصورت ہوٹلز کی عمارات دیکھ کر حیرت ہوئی ہے۔ مقامی سیاہ فام اور غیرملکی گورے سیاحوں کو رات دیر تک نیروبی کی سڑکوں پر چلتے پھرتے دیکھ کر دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کاش ہمارے ملک میں بھی ایسے حالات لوٹ آئیں۔ ساٹھ کی دہائی میں اور ستر کے عشرے کے ابتدائی برسوں میں کراچی بھی بالکل اسی طرح امن وامان کا گہوارہ تھا...... لیکن اب اسلام آباد اور لاہور میں بھی حالات بہتر نہیں ہیں۔

نیروبی کی سڑکوں پر چلتے ہوئے جو ہوٹلز دیکھے تھے، ان میں سے چند نام اس وقت یاد آرہے ہیں۔

سٹی سینٹر کے علاقے میں واقع ہوٹل گرانڈ ریجنسی، ہلٹن ہوٹل، انٹرکانٹیننٹل، نیروبی سیرینا ہوٹل، دی نورفوک، دی اسٹینلے وغیرہ۔ یہ تمام فائیو اسٹار ہوٹلز ہیں۔ ان کا یومیہ کرایہ 90 سے 130 ڈالر ہے۔ تھکا روڈ پر واقع سفاری پارک ہوٹل بھی فائیو اسٹار ہے۔ اس کا کرایہ یومیہ 95 ڈالر ہے۔ یہ رقم آج کے حساب سے آٹھ ہزار روپے بنتی ہے۔ ہمارے ہاں شیریٹن اور پی سی جیسے ہوٹلز کا یومیہ کرایہ دس، بارہ ہزار سے ہرگز کم نہیں ہے۔

نیروبی میں ایک جگہ ونڈسر گولف اور کنٹری کلب نامی فائیو اسٹار ہوٹل نظر آئے۔ یہاں یومیہ کرایہ ایک سو ڈالر وصول کیا جاتا ہے۔ میں سلور اسپرنگ نامی ایک فور یا شاید تھری اسٹار ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ اس کا یومیہ کرایہ 43 ڈالر تھا۔ یو این او والوں کو دس فیصد رعایت دی جاتی ہے، مجھے بھی دی گئی تھی۔

نیروبی میں اس قسم کے کئی فور اور تھری اسٹار ہوٹل ہیں مثلاً فیرویو ہوٹل، بلیوارڈ ہوٹل، ہالیڈے اِن، Jacaranda، لیماناؤنٹ ہوٹل وغیرہ۔



☆☆☆

جب ہم نائن الیون، القاعدہ اور افغانستان کی جنگ کی بات کرتے ہیں تو کینیا کے اس شہر نیروبی کو بھی یاد کرتے ہیں۔ یہاں 7 اگست 1998ء کو امریکی سفارت خانے پر بم سے حملہ کرکے اس کی عمارت کو تباہ کردیا گیا تھا۔ اس میں 12 امریکن سمیت 212 افراد مارے گئے اور 4000 زخمی ہوئے تھے۔

افریقا میں قائم دو امریکن سفارت خانوں کو دس منٹ کے وقفے سے بموں سے اڑادیا گیا تھا۔ ایک بم دھماکا نیروبی میں اور دوسرا افریقی ملک تنزانیا کے شہر دارالسلام میں کیا گیا تھا۔ دوسرے دھماکے میں 11 افراد مارے گئے اور 85 زخمی ہوئے تھے۔ ان دھماکوں کا تعلق مصر کی تنظیم اسلامک جہاد سے جوڑا گیا اور اس کے ماسٹر مائنڈ اسامہ بن لادن اور ایمن الزواہری کو قرار دیا گیا۔

اس حملے کے جواب میں امریکا کے صدر بل کلنٹن نے سوڈان اور افغانستان پر کروز میزائل کے ذریعے حملہ کردیا۔ سوڈان میں ان میزائلوں نے وہاں کی الشفا فارماسوٹیکل فیکٹری کو تباہ کردیا۔ اس فیکٹری میں سوڈانی عوام اور جانوروں کی بیماریوں کے لیے 50 فیصد دوائیں تیار ہوتی تھیں۔ کلنٹن کی انتظامیہ نے دعویٰ کیا کہ ان کے پاس ثبوت موجود ہیں، اس فیکٹری میں کیمیائی ہتھیار تیار کیے جاتے ہیں۔ لیکن میزائلوں سے برپا ہونے والی تباہی کے بعد تفتیش کی گئی تو معلوم ہوا کہ امریکا کے انٹیلی جنس ڈپارٹمنٹ کی رپورٹ غلط تھی۔

اب نیروبی میں جو امریکن ایجنسی ہے، وہ دوسری جگہ تعمیر کی گئی ہے۔ پرانی تباہ ہونے والی ایمبسی (سفارتخانے) کی جگہ یادگار کے طور پر ”میموریل پارک“ تعمیر کیا گیا ہے۔

جس طرح کراچی کا مرکز صدر ہے، اسی طرح نیروبی کا وسط ”سٹی اسکوائر“ ہے۔ یہیں سے شہر چاروں طرف پھیلا۔ کینیا کی پارلیمنٹ بلڈنگ، ہولی فیملی کیتھڈرل، نیروبی سٹی ہال، نیروبی کی کورٹس اور کینیاتا کانفرنس سینٹر جیسی اہم عمارتیں یہیں سٹی اسکوائر میں ہیں۔ جس طرح کراچی شہر، کلفٹن، کیماڑی، ملیر، ماری پور جیسے علاقوں میں تقسیم ہے۔ اسی طرح نیروبی کے اہم علاقے یہ ہیں مکادارا، کاموکنجی، لنگاتا، ویسٹ لینڈس، کاسارانی، ایمباکاسی وغیرہ۔ کئی عمارتوں، علاقوں اور سڑکوں کے نام انگریزی میں ہیں جن سے برٹش راج کی یادیں وابستہ ہیں۔

نیروبی خوبصورت پارکوں اور باغیچوں کا شہر ہے۔ شاید اسی لیے اس شہر کو ”Green cityin the Sun“ کہا جاتا ہے۔ سڑکوں کے کنارے گھنے درخت نظر آتے ہیں۔ شہر کے درمیان میں سے دریا گزرتا ہے۔ خطِ استوا پر ہونے کے سبب یہاں ہر وقت بارش ہوتی رہتی ہے۔ سطح سمندر سے بلند ہونے کی وجہ سے موسم انتہائی خوشگوار رہتا ہے۔ نیروبی میں داخل ہوتے ہی مقامی سیاہ فام لوگوں کو دیکھ کر یہ شہر ضرور افریقا کا معلوم ہوتا ہے لیکن ایسا لگتا ہے جیسے کسی یورپی شہر میں موجود ہوں۔ شہر میں کھلے میدان بھی کثرت سے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نیروبی لینڈ مافیا سے محفوظ ہے۔ کہنے کو یہ افریقی شہر ہے اور افریقا کے کئی شہروں کا حال کچھ زیادہ اچھا نہیں ہے۔ لیکن کینیا میں قوائد وضوابط اور قانون کسی حد تک سخت اور فعال ہے۔ اسی لیے نیروبی، ممباسا اور دیگر شہروں کی رونق اور خوبصورتی برقرار ہے۔ نیروبی کا سب سے بہترین اوہورو پارک ہے۔ ”اوہورو“ کا مطلب ”آزادی“ ہے۔ عوام کسی معاملے پر بگڑتے ہیں تو اس پارک میں پہنچ کر احتجاج اور مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہ پارک گویا لندن کے ہائیڈ پارک جیسی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں حکومت کے خلاف تقریریں بھی کی جاتی ہیں۔

ملک کا سابق صدر ڈینیل آراپ موئی اپنی سیاسی پارٹی KANU کے لیے اس پارک کے بیچ میں 62 منزلہ ہیڈکوارٹر تعمیر کرکے اس کا ستیاناس کرنا چاہتا تھا۔ عوام نے اس پر بھرپور احتجاج کیا۔ خاص طور پر ”میڈم ونگاری ماتھائی“ نے صدر کے خلاف بھرپور مہم چلائی اور وہ اس میں کامیاب رہیں۔ میڈم ماتھائی کی اس قسم کی جدوجہد اور عوامی خدمات کے عوض انہیں 2004ء کا نوبل ایوارڈ دیا گیا۔

میڈم ماتھائی کے لیے 2004ء میں جیسے ہی نوبل انعام کا اعلان ہوا تو خاص طور پر افریقا کے سیاہ فاموں کو بہت خوشی ہوئی تھی.... کیونکہ وہ پہلی افریقین عورت تھیں جنہیں اس اہم اور بڑے انعام کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ جب ہمیں ان کے بارے میں معلوم ہوا تو ہمارے دل میں تجسس سا پیدا ہوا کہ وہ کینیا کے کس شہر سے تعلق رکھتی ہیں، انہوں نے کہاں تک اور کن موضوعات میں تعلیم حاصل کی ہے۔ وہ کس قسم کی ملازمت کرتی ہیں اور انہوں نے امن کے لیے کیا خدمات انجام دیں؟

میڈم ماتھائی کی جیون کتھا خاصی عجیب ہے۔ وہ ایک

غریب گھر میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد ایک انگریز کے فارم پر یومیہ اجرت پر کام کرتے تھے۔ وہ ایک ایسے دیہی اور پسماندہ علاقے میں رہتے تھے کہ جہاں کوئی پرائمری تعلیم بھی مشکل ہی سے حاصل کرسکتا تھا۔ ایسے ماحول میں پیدا ہونے والی ماتھائی آئندہ چل کر اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ثابت ہوئیں۔ یہ کینیا کی پہلی عورت ہیں جنہوں نے پی ایچ ڈی کیا۔

وہ یکم اپریل 1940ء میں کینیا کے ضلع نائیری کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئیں۔ ان کا نام وانگاری موتا رکھا گیا۔ ان کا تعلق کےکویو قبیلے سے تھا۔ اس ملک کے پہلے صدر مسٹر جومو کینیاتا بھی اسی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔

میڈم وانگاری کے والد زمینوں پر مزدوری کرتے تھے اور وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ اپنی والدہ کے قصبے میں پرائمری کی تعلیم حاصل کرتی رہیں۔ جب وہ گیارہ برس کی ہوگئیں تو انہیں نائیری شہر کے ایک عیسائیوں کے بورڈنگ اسکول میں رکھا گیا۔ جہاں انہیں عیسائی بنایا گیا اور نام تبدیل کرکے ''جوزفین'' رکھا گیا۔ انہوں نے اسی اسکول میں اور بعد میں کالج سے بھی اول پوزیشن حاصل کی۔ اس کے بعد انہوں نے کمپالا کی ''یونیورسٹی آف ایسٹ افریقا'' میں داخلہ لینے کا پروگرام بنایا۔ وہ 1960ء کا زمانہ تھا۔ افریقا کے کئی ملکوں میں انگریزوں کا راج آخری سانسیں لے رہا تھا۔ کینیا کے ایک سیاست دان ٹام بویا نے اس دوران میں یہ کوشش کی کہ اس کے وطن کے نوجوانوں کو تعلیم کے لیے دوسرے ملکوں میں بلوایا جائے۔ ان ایام میں جان ایف کینیڈی امریکا کے سینیٹر تھے۔ انہوں نے کینیا کے اس سیاستدان کی درخواست قبول کی، اپنے ''کینیڈی'' خاندان کی فاؤنڈیشن کے ذریعے کینیا سے 300 قابل طلبا کو اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا بلوالیا۔ ان میں وانگاری بھی شامل تھیں۔ میں یہاں یہ بھی بتاتا چلوں کہ صرف ٹام بویا ہی نہیں بلکہ کینیا کے دیگر کئی سیاستدانوں نے بھی اپنے علاقوں، قصبوں اور گاؤں کے نوجوانوں کو یورپ اور امریکا کے مختلف تعلیمی اداروں میں اسکالرشپ دلوائی۔ اس سلسلے میں انہوں نے تعلیمی اداروں کو جس طرح Convince کیا، یہ قابلِ تعریف بات ہے۔ وہ اپنی ان کوششوں سے اپنے علاقوں میں صحت اور تعلیم کے حوالے سے خاصی بہتری لانے میں کامیاب رہے۔

ملائیشیا میں بھی وہاں کے سیاستدانوں کا یہی کردار رہا ہے۔ جس کے نتیجے میں جنگل جیسا ملک آج یورپ کا ... پیش کرتا ہے۔ دراصل یہی ایسی چیزیں ہیں جس میں ہم ... کھا گئے ہیں۔ آج 63 برس گزرنے کے بعد بھی ہمارے سیاستدانوں کو اپنے علاقوں کے نوجوانوں کی تعلیم کی فکر ... اور نہ ہی صحت اور سلامتی کی۔ پنجاب بہرحال اس معاملے میں کسی حد تک بہتر رہا ہے۔ اس کے علاوہ کراچی میں بھی قدرے بہتری کے آثار نظر آتے ہیں جبکہ اندرون سندھ ... کوئی پرسانِ حال نہیں۔ وہاں کے وڈیروں نے تعمیر شدہ اسکولز کو بھی اپنی بیٹھک، اوطاق اور بھینسوں کے باڑے میں تبدیل کردیا ہے...... کوئی پیر، میر، وزیر یا وڈیرا کسی یونیورسٹی کے لیے کوشش کرے اور غریبوں کے لیے خیراتی اسپتال تعمیر کرائے فی الحال یہ خواب ہی معلوم ہوتا ہے۔

میڈم وانگاری کو امریکا کی کنساس ریاست میں تعلیم حاصل کرنے کی اسکالرشپ ملی۔ انہوں نے وہاں کے کالج سے 1964ء میں بائلوجی میں گریجویشن کیا۔ اس کے بعد امریکا کی یونیورسٹی آف پٹسبرگ سے ایم ایس سی کیا۔ وہ 1966ء میں تعلیم مکمل کرکے نیروبی واپس آگئیں اور یہاں انہیں تدریس کی جاب مل گئی۔ ملازمت کے دوران میں ان کی ملاقات وانگی ماتھائی سے ہوئی جو اُن کی طرح امریکا سے تعلیم حاصل کرچکا تھا۔ نیروبی پہنچ کر وانگاری نے اپنا عیسائی نام تبدیل کرکے پیدائشی نام ''وانگاری موتا'' دوبارہ اختیار کرلیا۔ پھر وانگی ماتھائی سے شادی ہونے کے بعد اپنے شوہر کی ذات ''ماتھائی'' کے حوالے سے پروفیسر ماتھائی کہلانے لگیں۔

1967ء میں میڈم ماتھائی نے پی ایچ ڈی کرنے کے بعد جرمنی کی یونیورسٹی آف میونخ میں داخلہ لے لیا۔ وہاں سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ 1969ء میں واپس نیروبی آگئیں اور مسٹر وانگی ماتھائی سے شادی کرلی۔ انہوں نے اینا ٹومی کے سبجیکٹ میں پی ایچ ڈی کیا تھا۔ وہ نیروبی یونیورسٹی میں یہی سبجیکٹ پڑھاتی رہیں۔ ان کے دو بچے ہوئے۔ بیٹا واویرو اور بیٹی ونجیرا۔

1977ء میں شوہر نے ان سے علیحدگی اختیار کرلی۔ دو سال کے بعد اس نے بیوی پر الزام عائد کرکے کورٹ میں طلاق کی درخواست پیش کی۔ جج نے اس کیس میں شوہر کے موقف کو درست قرار دیا۔ اس فیصلے کے چند دن بعد پروفیسر ماتھائی نے Viva میگزین کو انٹرویو دیتے ہوئے جج کے بارے میں ریمارکس دیے کہ وہ Incompetent اور Corrupt ہے۔ اس انٹرویو کے بعد جج بہت خفا ہوا اور میڈم ماتھائی پر...... Contempt of Court کا کیس چلا۔ جس میں وہ مجرم قرار پائیں اور انہیں چھ ماہ قید کی سزا سنائی گئی۔

1982ء میں انہوں نے پارلیمنٹ کے الیکشن میں حصہ لیا، بلکہ حصہ لینا چاہا تھا تو قانون کے مطابق انہیں ملازمت چھوڑنے کا کہا گیا۔ انہوں نے یونیورسٹی آف نیروبی کی ملازمت سے استعفیٰ دیا اور الیکشن کے لیے فارم جمع کرادیے۔ ملی بھگت سے حکومت نے ان کے فارم رد کردیے۔ اس کے بعد انہیں دوبارہ یونیورسٹی کی ملازمت بھی نہ ملی۔ ان کا کہنا تھا کہ ملک کا صدر آراپ موئی ان کے خلاف تھا کیونکہ وہ ان کے مخالف قبیلے سے تعلق رکھتی تھیں۔ انہیں یونیورسٹی کیمپس والی رہائش گاہ بھی فوری طور پر خالی کرنے کی ہدایت کی گئی جبکہ استعفیٰ کے بعد وہ اس گھر میں قانونی طور پر چھ ماہ رہنے کا حق رکھتی تھیں۔

انہوں نے 2002ء میں دوبارہ الیکشن میں حصہ لیا، جس میں نہ صرف وہ خود کامیاب ہوئیں بلکہ ان کی پارٹی نے حکومتی پارٹی کو شکست دی تھی۔ انہیں 98 فیصد ووٹ ملے تھے۔ اسی لیے میں جیکب آباد کی مائی جوری کے لیے اکثر دعا کرتا رہتا ہوں کہ ممکن ہے دوسری مرتبہ وہ اپنے علاقے سے بڑی اکثریت کے ساتھ الیکشن جیت جائے۔ آخرکار میڈم وانگاری ماتھائی کے بارے میں کون یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہ قبائلی سرداروں اور وڈیروں سے مقابلہ کرسکے گی!

☆☆☆

انگریزوں کے ریل گاڑی چلانے پر کینیا اور یوگنڈا کے کئی قبیلوں، خاص طور پر نانڈی قبیلے نے سخت احتجاج کیا تھا۔ کیونکہ ریل گاڑی کی پٹڑیاں جنگلوں اور ان کی بستیوں کے پاس سے گزرتی تھیں۔ ان پٹڑیوں اور ریل گاڑی کے لیے مقامی لوگوں کو کئی قسم کے خوف، وسوسے، شک اور شبہات تھے کہ ریل گاڑی کے چلنے سے وہ تباہی کا شکار ہوجائیں گے۔ ان قبیلوں نے 1895ء سے 1905ء تک مسلسل دس برس ریل گاڑی کے خلاف مظاہرے کیے اور شدید توڑ پھوڑ کی۔ دوسری جانب انگریز ہر صورت میں یہ کام کرگزرنا چاہتے تھے اور آخرکار انہوں نے اس سرزمین پر ریل گاڑی چلا کر ہی دم لیا۔

انگریزوں نے اس کام کے لیے مستری، محنت کش اور مزدور پُرکشش اجرت پر برصغیر سے منگوائے تھے۔ ان لوگوں کو افریقا میں کئی خطرات لاحق تھے۔ اس ریلوے لائن کی تیاری میں برصغیر سے تعلق رکھنے والے سکھ، پنجابی، پٹھان اور مقامی ورکر بڑی تعداد میں موت کا شکار ہوگئے تھے۔ زیادہ تر لوگ ملیریا کا شکار ہوئے اور سانپ، بچھو، دیگر زہریلے حشرات بھی ان کی موت کا سبب بنے۔ بعض لوگ جنگلی درندوں کی خوراک بن گئے۔ یہ اس دور کی بات ہے جب ریلوے لائن کا کام ''ساوو'' (Tsavo) کے مقام پر چل رہا تھا۔ اس دوران میں کئی سکھ اور مقامی سیاہ فام ورکر وہاں کے دو آدم خور شیروں کے حملے کا شکار ہوگئے۔

یہ دو شیر دنیا میں Tsavo Maneaters کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کے مارے جانے کے بعد ان کی کھال میں بھس بھر کر انہیں اصل صورت دی گئی ہے۔ اب یہ شکاگو فیلڈ میوزم میں موجود ہیں۔ نیروبی سے بائی روڈ ممباسا جاتے ہوئے سلطان ہمود، کب ویزی اور اندیئی شہروں کے بعد مذکورہ شہر Tsavo آتا ہے۔ جس کے نام

سے یہ آدم خور شیر دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ آج کے اس ماڈرن اور خوبصورت شہر کے ایک ائر کنڈیشنڈ ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر چائے پینے کے دوران میں ایک صدی پہلے کے زمانے کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس دور میں ہمارے خطے کے غریب سکھ، پنجابی، پٹھان اپنی بیوی اور بچوں کو چھوڑ کر روزگار کے حصول کی غرض سے یہاں کی سخت گرمی اور سانپوں، بچھوؤں سے بھرے جنگل میں کام کرنے آئے تھے۔ ان کے خاندان کو ان کی کمائی پہنچنے کی بجائے ان کی موت کی خبر پہنچتی تھی۔

امرتسر اور پشاور میں رہنے والے لوگ مچھروں اور ملیریا کے بارے میں تو سوچ سکتے تھے۔ لیکن انہیں کیا معلوم تھا کہ ان کے پیارے ایک ایسی سرزمین پر کام کر رہے ہیں جہاں ایسے شیر موجود ہیں جو ہرن، بکرے یا کسی جانور کو مارنے کی بجائے سوتے ہوئے انسانوں پر حملہ کر دیتے ہیں۔

کینیا کے اس روہڑی اور کوٹڑی جیسے شہر کا یہ نام Tsavo ندی کی وجہ سے پڑا۔ یہ ندی شہر کے درمیان میں سے گزرتی ہے۔ دریا کو عبور کرنے کے لیے ایک پل بنا ہوا ہے۔ 1898ء میں ریلوے کے جاری کام کے دوران تعمیر کیا گیا تھا۔ اس پل کی تعمیر کا پروجیکٹ برطانوی آرمی کے ایک کرنل ہنری پیٹرسن کو سونپا گیا تھا۔ اس شہر Tsavo سے وابستہ ان آدم خور شیروں کے بارے میں مجھے بھی معلوم نہ ہوتا کہ یہ اس قدر شہرت رکھتے ہیں۔ لیکن کینیا آنے سے صرف ایک ماہ قبل مجھے متذکرہ بالا کرنل پیٹرسن کی کتاب "The Man- Eaters of Tsavo" کے کچھ ابواب پڑھنے کا موقع ملا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے ایک فلم "دی گھوسٹ اینڈ دی ڈارکنیس" دیکھی جو "ساوو" کے ان دو آدم خور شیروں کے متعلق ہے۔ اس فلم میں ایک شیر کا نام "گھوسٹ" اور دوسرے کا "ڈارکنیس" ہے۔ یہ فلم 1996ء میں تیار ہوئی تھی۔

"ساوو" (Tsavo) کے ان دو آدم خور شیروں کے بارے میں ایک انتہائی پرانی فلم Bawana Devil بھی ہے جو 1952ء میں بنائی گئی تھی۔ ساوو کے بس اسٹاپ پر واقع ایک اسٹال کے مالک نے بتایا تھا کہ اس فلم کی سی ڈی نیروبی اور ممباسا کی وڈیو شاپس سے مل سکتی ہے۔

انگریز افریقا میں آج سے 110 برس قبل ممباسا بندرگاہ سے کمپالا تک جو ریلوے لائن بچھا رہے تھے، اسے ساوو نامی گاؤں کے قریب سے گزرنا تھا اور اس لائن کو آبادی کے درمیان میں سے گزرنے والے دریا پر بنائے گئے پل پر سے گزارنا تھا۔ یہ شہر اور نیروبی آج اس قدر ماڈرن نظر آتے ہیں جبکہ اس زمانے میں ممباسا اور مالندی کے علاوہ سب ... جیسے تھے۔ ان کے چاروں اطراف میں گھنا جنگل اور ... تھے۔ رات کے وقت کوئی بھی تنہا اپنے کیمپ سے دور نہیں ... تھا۔ جنگل کے جانور جب کسی کو تنہا دیکھتے تو اس پر حملہ ... ہو جاتے۔ ایسے جانور ٹولیوں کی صورت میں موجود افراد ... قریب جانے سے ڈرتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ کوئی ... جانور خود پر حملہ ہوتے ہوئے دیکھ کر یا خوف کی صورت ... میں انسان پر حملہ کرتا ہے۔ عام حالات میں وہ چھوٹے ... چھوٹے اور کمزور جانوروں کو کھا کر اپنا پیٹ بھر لیتے ہیں۔ لیکن ... دنیا میں کبھی کبھی ایسے جانور بھی پیدا ہوتے ہیں، خاص طور ... شیر اور چیتا! ان کے منہ کو انسانی گوشت ایسا لگتا ہے کہ ... دوسرے شکار کی موجودگی کے باوجود ہر وقت انسان کی تلاش میں رہتے ہیں۔

ساوو کے یہ دو آدم خور ببر شیر ایک عرصے سے مقامی سیاہ فاموں کا شکار کرتے رہے تھے۔ اور یہ شیر مقامی لوگوں کے قابو میں نہیں آتے تھے۔ جب 1898ء میں انگریزوں نے "ممباسا کمپالا ریلوے لائن" کے سلسلے میں ساوو ندی پر کام کا آغاز کیا تو پورے نو مہینے تک یہ شیر انڈیا کے سکھ، پنجابی اور پٹھان مزدوروں کو شکار کرتے رہے۔ وہ رات کے وقت کیمپ میں گھس آتے اور مزدوروں کو گھسیٹ کر لے جاتے تھے۔ مزدوروں نے خود کو شیر سے بچانے کے لیے کئی جتن کیے۔ اسے خوفزدہ کرنے کے لیے رات بھر الاؤ جلا کر رکھتے، ڈھول بجائے جاتے لیکن کوئی طریقہ کارآمد ثابت نہ ہوا۔ شیر اس قدر ڈھیٹ اور بے خوف تھے کہ وہ حملہ کرنے سے باز نہ آتے تھے۔ اس کے بعد مزدوروں کے کیمپوں کے گرد یہاں کے سخت کانٹوں والے درختوں Bomas کی باڑھ لگائی گئی۔ لیکن شیر ان کو بھی ہٹا کر یا نیچے سے کسی طرح اندر داخل ہو جاتے اور اندر سے لوگوں کو گھسیٹ لانے میں کامیاب ہو جاتے۔ آخر کار سیکڑوں مزدوروں نے کام کرنا چھوڑ دیا اور ساوو سے بھاگ گئے۔ اس طرح پل کی تعمیر کا کام رک گیا۔ اس کے بعد پل کے پروجیکٹ انچارج نے شیروں پر قابو پانے کے لیے ... قسم کے دام اور پھندے لگائے لیکن اسے کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ یہ شیر کہیں نہ کہیں سے آجاتے اور لوگوں کو گھسیٹتے ہوئے لے جاتے۔

آخر کار 9 دسمبر 1898ء کو ایک شیر تھری ناٹ تھری کی گولی کا نشانہ بن کر ہلاک ہو گیا۔ اس کے پورے تین ہفتوں کے بعد دوسرا شیر بھی زد میں آگیا اور گولیوں سے مارا گیا۔ پہلے شیر کی لمبائی لی گئی تو وہ ناک سے دم کے انتہائی سرے تک 9 فٹ 8 انچ تھی۔ یعنی تین میٹر! اس کی لاش کو آٹھ افراد اٹھا کر کیمپ تک لائے۔ پھر پل تیار کرنے والے مستری اور مزدور لوٹ آئے۔ 1899ء میں یہ پل مکمل طور پر تکمیل کو پہنچا۔ میں اسی پل کے قریب واقع ایک ریسٹورنٹ میں چائے پی کر آگے کے سفر کے لیے روانہ ہوا تھا۔

ان دو شیروں نے کئی انسانوں کو ہڑپ کر لیا تھا۔ لیکن اس سلسلے میں کوئی ریکارڈ دستیاب نہیں ہے جس سے معلوم ہوتا کہ انہوں نے کتنی انسانی جانیں ہضم کر لی تھیں۔ ایک اندازے کے مطابق بتایا جاتا ہے کہ 135 افراد شیروں کی خوراک بن گئے تھے۔ ان میں انڈیا کے مزدوروں کی تعداد تقریباً 35 ہے اور باقی ان کا نشانہ بننے والے مقامی قبائل سے تعلق رکھنے والے سیاہ فام تھے۔

پیٹرسن نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔ "میں نے پہلے شیر پر مارٹنی انفیلڈ رائفل کے ذریعے گولی چلائی جو اس کے پچھلے حصے میں لگی اور وہ بھاگ گیا۔ وہ اگلی رات دوبارہ آگیا اور میں نے اس پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ اس کے باوجود وہ ہم پر حملہ کرنے کی کوشش کرتا رہا پھر وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ ہم اس کے تعاقب میں رہے۔ خون اور قدموں کے نشانات کے ذریعے ہم اس کا پیچھا کرتے رہے۔ اور آخر کار صبح کے وقت وہ ہمیں ایک جگہ مردہ حالت میں مل گیا۔ دوسرا شیر پانچ گولیاں کھانے کے باوجود ہم پر حملہ کرتا رہا۔ اس کے بعد مارٹنی ہنری رائفل کے ذریعے اسے ہلاک کیا گیا۔"

ان دونوں شیروں کی کھال تقریباً پچیس برس تک پیٹرسن کے ڈرائنگ روم میں بچھی رہی۔ 1924ء میں امریکا کے شکاگو فیلڈ میوزم کی انتظامیہ نے 5000 ڈالر کے عوض پیٹرسن سے دونوں کھالیں خرید لیں۔ پھر ان میں بھس بھر کر، اصلی صورت میں اپنے میوزم میں سجا دیا تھا کہ نئی نسل انہیں دیکھ کر ان غریب مزدوروں کے بارے میں سوچے جنہیں ان شیروں نے چیر پھاڑ کر اپنی خوراک بنا لیا تھا۔

کئی لوگ یہ سوچتے ہیں کہ آخر وہ کیسی مجبوریاں تھیں جن کے سبب یہ شیر کسی دوسرے جانور کو کھانے کی بجائے ہر وقت انسانی گوشت کی تلاش میں رہتے تھے؟

آپ یہ سوال اس علاقے یعنی ساوو اور قریبی شہروں وائی (voi)، ماریا کانی، ممباسا کے لوگوں سے پوچھیں گے تو وہ اس سلسلے میں مختلف تھیوریز پیش کریں گے جو اس طرح ہیں۔

"کچھ عرصہ قبل بالائی علاقے میں رنڈرپیسٹ نامی وبا پھیلی تھی جس میں وہ تمام جانور مر گئے اور ان کی تعداد کم ہو گئی جن پر شیروں کی "گزربسر" ہوتی تھی۔ نتیجتاً وہ انسانوں کو کھانے پر مجبور ہو گئے۔"

ایک وجہ یہ بتائی جاتی ہے۔ "ساوو کے یہ شیر اس لیے بھی آدم خور ہو گئے کہ ان دنوں میں زینز یبار کی طرف جانے والے غلاموں کے قافلے یہاں بہنے والے دریا سے گزرتے تھے۔ ان قافلوں میں مر جانے والے غلاموں کی لاشیں اکثر دریا میں پھینک دی جاتی تھیں۔ اس ندی کے کنارے پر رہنے والے یہ شیر ان لوگوں کی لاشوں کو کھا کر آدم خور بن گئے۔"

یاد رہے کہ عمانی عربوں اور کچھ یورپی اقوام کا ان دنوں میں یہ طریقہ تھا کہ دیہی اور اندرونی علاقوں میں جا کر نوجوان سیاہ فاموں کو تشدد یا نشے کے ذریعے زنجیروں میں جکڑ کر غلام بنا لیتے تھے۔ پھر وہ غلام زینز یبار پہنچائے جاتے۔ ان میں سے کچھ غلام فروخت ہو کر سندھ لائے جاتے اور کچھ عرب ریاستوں میں جا پہنچتے تھے۔ کچھ غلام ترکی حرم خانوں میں پہنچائے جاتے جہاں انہیں انسانیت سوز عمل سے گزار کر "ناکارہ" یعنی خواجہ سرا ٹائپ کا انسان بنا دیا جاتا تاکہ وہ محل کے کام کاج، زنان خانے میں آنے جانے اور داشتاؤں کی خدمت انجام دیتے رہیں۔ بہرحال اکثر سیاہ فام غلام بے انتہا تشدد، بھوک اور نشے کے سبب سفر کے دوران ہی موت کا شکار ہو جاتے تھے۔ پھر ان مُردوں کو ساوو کے مقام سے گزرنے والے دریا کی نذر کر دیا جاتا تھا۔

بعض لوگوں نے یہ تھیوری بھی پیش کی کہ ریلوے لائن پر کام کرنے والے کئی مزدور ہندو تھے۔ وہ اپنے کسی ساتھی کے مر جانے کے بعد اس کی لاش کو نذر آتش کر دیتے تھے۔ لیکن لاش مکمل طور پر بھسم نہ ہو پاتی تھی اور وہ لوگ اپنے ساتھی کی نیم سوختہ لاش کو اسی حالت میں چھوڑ کر آگے روانہ ہو جاتے تھے۔ شیر ان کو کھا کر آدم خور بن گئے۔

کئی لوگوں کا خیال ہے کہ پہلے مارے جانے والے شیر کے دانت کسی حادثے میں ٹوٹ گئے تھے۔ اس لیے وہ فطری انداز میں شکار کرنے کی بجائے کیمپوں میں سوئے ہوئے لوگوں کو گھسیٹ کر لے جاتا تھا۔

بہرحال آج کل کینیا کی حکومت اور عوام یہ چاہتے ہیں کہ ان دونوں شیروں کو شکاگو میوزم سے واپس حاصل کر کے کینیا کے میوزم میں رکھا جائے۔

(جاری ہے)

# نئی دنیا کی تلاش

طارق عزیز خان

اس وقت جب لوگ اس بات پر متفق تھے کہ یہ دنیا چپٹی ہے، سیدھ میں پھیلی ہے اور سمندر اس کی حد ہے۔ اگر سمندر میں سیدھا سفر کیا جائے تو آخری کنارہ آجائے گا جس کے بعد خلا ہے، کچھ نہیں ہے۔ اس وقت وہ سب نئے جہان کی تلاش میں نکلے تھے مگر سمندر میں سفر کرتے ہوئے ڈر بھی رہے تھے کہ آخری کنارہ آگیا تو ہمارے بحری جہاز نیچے گرجائیں گے۔

**ایک دلچسپ معلوماتی تاریخی روداد، تحفۂ خاص**

زمین پر خشکی کے بڑے بڑے خطوں کی تشکیل کے بعد تقریباً...... 40لاکھ سال پہلے افریقا میں دو پاؤں پر چلنے والے پہلے انسان کا جنم ہوا۔ مورخین کی رائے میں قریب 60 ہزار سال پہلے افریقی انسان نے بحیرہ احمر کو پار کرکے جزیرہ نما عرب پر قدم رکھا۔ 40ہزار سال پہلے انسان نے ایشیائے کوچک کے راستے یورپ اور جنوب مشرقی ایشیا کے راستے انڈونیشیا اور براعظم آسٹریلیا تک رسائی حاصل کی۔ لگ بھگ 35ہزار سال پہلے مشرقی سائبیریا کے شکاری قبائل جمے ہوئے بحیرہ بیرنگ پر پیدل چلتے ہوئے الاسکا (شمالی امریکا) کی سرزمین میں داخل ہوئے۔

زمین پر انسانی آبادیاں قائم ہوجانے کے بعد وہاں آئے برفانی ادوار کے دوران انسانی تہذیبیں بنتی اور مٹتی رہیں۔ ایک اندازے کے مطابق لگ بھگ 12 ہزار سال قبل از مسیح میں آخری برفانی دور کے خاتمے کے بعد شمالی نصف کرّے میں خطِ سرطان (Tropic of Cancer) کے آس پاس کے خطوں مثلاً ایشیا میں عراق، پاکستان اور شام، افریقا میں مصر اور تیونس جبکہ جنوبی یورپ میں یونان، کریٹ اور اٹلی میں موجودہ انسانی تہذیب کی ابتدا ہوئی۔ مورخین ابھی حتمی طور پر یہ طے نہیں کرپائے کہ ان تہذیبوں میں سے کون سی تہذیب سب سے زیادہ پرانی ہے۔ تاہم مانا جاتا ہے کہ مصر میں تمدن، بابل، نینوا اور اطراف کے تمام علاقوں سے پہلے ظاہر ہوا۔ اسی طرح مصر کی حکومت بھی بھی حکومتوں سے پہلے قائم ہوئی۔

مصر کے مختلف علاقوں سے ملنے والی قدیم تحریروں کے مطابق وہاں حکمرانی کررہے فراعین کے 30 خاندانوں کی حکومت کا ہونا ثابت ہے۔ ان میں سے سب سے پہلے [illegible] کی حکومت کا زمانہ 5ہزار قبل از مسیح میں جبکہ آخری فر[illegible] حکومت 378 سے 340ق م کے دوران تھی۔ مصر پر [illegible] م سے 525ق م کے دوران عراق کی اشوری قوم [illegible] رکھنے والے 26ویں خاندان کی حکومت قائم تھی۔ [illegible] نیچو (Necho) کہلاتے تھے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا [illegible] مطابق کرۂ ارض کو سب سے پہلے دریافت کرنے کی [illegible] مصری فرعون نیچو سوم کے عہد (610ق م سے 595 [illegible]) میں کی گئی جب اُس کے بیڑے نے براعظم افریقا کی [illegible] کی۔ اس زمانے میں افریقی باشندے زمین کو چپٹا [illegible] مانتے تھے۔ اُن کی دلچسپی کا محور و مرکز افریقا تھا۔ ان [illegible] میں کرۂ ارض پر واقع افریقا سب سے بڑا اور واحد براعظم [illegible] وہ نہیں جانتے تھے کہ بحیرہ روم کے شمال (یورپ) ا[illegible] (ایشیا) میں واقع دنیائیں کتنی وسیع تھیں؟

لگ بھگ 600 قبل مسیح میں چار درجن کے [illegible] کھلی اور ناتواں کشتیوں پر مشتمل نیچو کے بیڑے نے [illegible] (Gulf of Suez) سے اپنی تاریخی مہم کا آغاز کیا۔ [illegible] بیڑا، بحیرہ احمر (Red Sea) اور بحرِ ہند میں افریقا کی ساحلی لکیر کے ساتھ ساتھ سفر کرتا ہوا جنوبی افریقا کے [illegible] جنوبی بحر اوقیانوس میں داخل ہوا۔ مغربی افریقی سا[illegible] رکھتے ہوئے اُن لوگوں نے شمالی بحر اوقیانوس اور بحیرہ [illegible] (Mediterranean Sea) تک رسائی حاصل [illegible] شمالی افریقا کی ساحلی لکیر کے ساتھ ساتھ سفر کرتے [illegible] بالآخر ان کی کشتیاں مصر واپس پہنچ گئیں۔ تقریباً [illegible] محیط اس داستانی سفر کے دوران مصری بیڑے نے [illegible]

[illegible]ظم کے گرد لگ بھگ 30ہزار کلومیٹر کا طویل فاصلہ طے کیا۔ [illegible]ج ہمارے پاس نیچو کے بیڑے سے متعلق کوئی مستند [illegible] تصویر موجود نہیں ہے، تاہم قدیم مصریوں کی جہاز [illegible] میں مہارت کا اندازہ 1954ء میں دریائے نیل کے [illegible] کنارے پر واقع خوفو (Khufu) کے اہرام سے ملنے [illegible] ایک قدیم کشتی کے ڈھانچے سے بخوبی لگایا جاسکتا [illegible]۔ چپوؤں کی مدد سے چلنے والی یہ کشتی لگ بھگ 2600ق م [illegible] تیار کی گئی۔ اس کشتی کی لمبائی 125 فٹ اور چوڑائی 30 [illegible] ہے۔ کشتی کی بناوٹ میں نرسل (Papyrus)، [illegible]نڈوں اور اونٹ کی کھال کا استعمال کیا گیا ہے۔

مصریوں کی جانب سے افریقا کی بحر پیمائی کے بعد [illegible]یوں نے ایشیا کی دریافت کا بیڑا اٹھایا۔ مشہور ایرانی [illegible]ان دارا اول (Darius-1) کے عہد (522ق م سے 486ق م) میں ایرانی سلطنت کا شمار دنیا کی سب سے بڑی طاقتور سلطنت میں کیا جاتا تھا۔ اپنے عروج پر سلطنت [illegible] کا کل زمینی رقبہ 40لاکھ مربع کلومیٹر تھا اور اس کی حدود [illegible] میں ترکی سے لے کر مشرق میں بلوچستان (پاکستان) [illegible] شمال میں ازبکستان سے لے کر جنوب میں خلیج فارس تک [illegible] ہوئی تھیں۔ اس زمانے میں ایرانی تاجروں کی پہنچ وسط [illegible] میں جھیل بالکش (Balqash) تک تھی۔ وہ اس علاقے [illegible] رسائی رکھنے والے چینی تاجروں سے قالینوں اور قیمتی [illegible]روں کے بدلے ریشم اور لوبان جبکہ جنوب میں خلیج فارس کی بندرگاہوں تک آنے والے عرب تاجروں سے ہندوستان سے لائے گئے گرم مصالحوں کا لین دین کیا کرتے تھے۔ ایرانی بادشاہوں کو عربوں کے توسط سے ہندوستانی سرزمین کے بارے میں معلومات برابر حاصل ہو رہی تھیں۔ ایرانیوں کو اندازہ تھا کہ اگر وہ جنوبی ایشیا تک رسائی کا خشکی کا راستہ دریافت کرلیں تو انہیں ہندوستانیوں سے تجارت کے لیے عربوں کے سہارے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ یہی وہ پس منظر تھا جس میں دارا اول کے دربار میں موجود ایک یونانی مہم جو سکائی لیکس آف کاریا (Scylax of Caria) نے 515 قبل از مسیح میں بطور پہلے یورپین کے موجودہ افغانستان اور پاکستان کے علاقوں کو دریافت کیا۔

سکائی لیکس، افغانستان میں دریائے ہلمند اور دریائے کابل کے ساتھ ساتھ سفر کرتا ہوا پاکستان میں داخل ہوا۔ وہ دریائے سندھ میں سفر کرتا ہوا جنوب میں بحیرہ عرب تک آیا اور پھر کشتیوں کے ذریعے بحیرہ عرب کو پار کرکے بحیرہ احمر سے ہوتا ہوا فلسطین اور پھر وہاں سے ایران واپس پہنچ گیا۔

یونانی جغرافیہ دان سٹرابو (Strabo) وہ پہلا شخص تھا جس نے سکائی لیکس کی مہمات پر روشنی ڈالی۔ سٹرابو کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ سکائی لیکس نے اپنی 30 ماہ کی طویل مہم کے دوران تقریباً 20ہزار کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا۔ اس نے ایرانی بادشاہ کے لیے جنوبی ایشیا کے مغربی حصے سمیت بحیرہ عرب، خلیج عدن، بحیرہ احمر، خلیج سوئز

کے لگ بھگ 30 لاکھ مربع کلومیٹر علاقے کو دریافت کیا۔ سکائی لیکس کی مہم کے نتیجے میں ایرانیوں کو ہندوستانی سرزمین کے ساتھ ساتھ بحیرۂ عرب کے بارے میں بھی معلومات حاصل ہوئیں۔

☆☆☆

پانچویں صدی قبل از مسیح میں شمالی افریقا کے فونیشیائی (Phoenicians) حکمرانوں نے اپنے بحری جہازوں کو محفوظ اور لمبے سفر کے قابل بنانے کے لیے نت نئے تجربات کیے۔ ان کے کاریگروں نے کھلے سمندر میں چل رہی تجارتی ہواؤں سے فائدہ اٹھانے کے لیے اپنی کشتیوں پر بادبان... لگائے اور سامانِ تجارت کو محفوظ رکھنے کے لیے لکڑی کے مضبوط کیبن اور تہ خانے تیار کیے۔ بحیرہ روم میں چلنے والے یہ بادبانی بحری جہاز گالے (Galley) کہلاتے تھے۔ ایک منزل پر مشتمل ان بحری جہازوں کی لمبائی 80 فٹ اور چوڑائی 35 فٹ تک تھی۔ ایک اوسط درجے کے گالے بحری جہاز کو رواں دواں رکھنے کے لیے کم از کم تین درجن ملاحوں کی ضرورت پڑتی تھی۔

480 ق م میں تیونس کے علاقوں پر مشتمل قدیم فونیشائی ریاست کارتھیج (Carthage) کی بحریہ کے ایک افسر ہنو (Hanno) نے 60 گالے بحری جہازوں کے بیڑے کے ساتھ شمالی بحراوقیانوس میں مہمات سرانجام دیں۔ اس نے مغربی افریقا کی گولائی کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف بڑھتے ہوئے لائبیریا کے ساحل پر واقع راس پالماس (Cape Palmas) کی براعظمی نوک دریافت کی۔ ہنو اپنی مہم کے آخری مرحلے میں استوائی افریقا کے ملک کیمرون اور استوائی گنی (Equatorial Guinea) تک چلا گیا تھا۔ اس نے کیمرون میں دریائے ساناگا (Sanaga) کے دہانے اور اس سے متصل جزائر پر دوپاؤں پر چلنے والی حیرت انگیز جنگلی مخلوق کو قریب سے دیکھا۔ اوسطاً پانچ فٹ قد اور ڈیڑھ سو کلو وزنی ان سیاہ فام جنگلیوں کے جسم کالے سیاہ روئیں دار بالوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ ان کے سر بڑے، ناک چوڑی، ہاتھ لمبے اور ہاتھ پاؤں کے پنجے بڑے بڑے تھے۔ ہنو کے مقامی افریقی راہنماؤں نے ان جنگلیوں کو گوریلا (Gorilla) کہہ کر مخاطب کیا۔ ہنو، براعظم افریقا کے انتہائی جنوبی سرے کو دریافت کرنا چاہتا تھا تاہم اس کے عملے نے مزید جنوب میں جانے سے انکار کردیا۔ ہنو کی مہم کے بارے میں سب سے بہتر معلومات آئرش مورخ ڈونالڈ ہارڈن بینجمن (Donald Harden Benjamin) کی 1962ء میں شائع والی کتاب The Phoenicians میں ملتی ہیں۔ ہارڈن کے مطابق ہنو نے اپنی ساڑھے تین سالہ مہم کے دوران لگ بھگ 20 ہزار کلومیٹر کا سفر طے کیا اور افریقا [illegible] ہزار کلومیٹر طویل ساحلی پٹی کو دریافت کیا۔

ہنو کے ہاتھوں مغربی افریقا کے ساحلوں کی [illegible] کے بعد کارتھیج ہی سے تعلق رکھنے والے ایک اور ملاح ہامیلکو (Himilco) نے 450 ق م میں شمالی بحراوقیانوس، پرتگال اور خلیج بسکے میں (Bay of Biscay) مہمات کے دوران اسپین کی شمالی اور فرانس کی شمال مغربی ساحلی [illegible] دریافت کیا۔ ہائے ملکو کی مہم کے بارے میں سب سے [illegible] شواہد پہلی صدی عیسوی (23ء سے 79ء) کے رومن [illegible] پلینی دی ایلڈر (Pliny the Elder) کی تصنیف Pliny's Natural History میں ملتے ہیں۔ پلینی [illegible] مطابق ہائے ملکو، خلیج بسکے تک رسائی حاصل کرنے والا پہلا [illegible] جو تھا۔ اس نے اسپین اور فرانس کے ساحلی علاقوں کی دریافت کے بعد وہاں آباد مقامی قبائل سے محدود پیمانے پر تجارتی [illegible] دین کیا۔ اس نے شمال میں رودبار انگلستان (English Channel) کی طرف جانے کی بجائے اپنے عملے [illegible] شامل چند ملاحوں کو شمالی مغربی فرانس میں نئی تجارتی کالونی [illegible] بنیاد رکھنے کا حکم دیا۔ ایک اندازے کے مطابق ہائے ملکو نے اپنی ایک سالہ مہم کے دوران پرتگال، اسپین اور فرانس کی [illegible] ہزار کلومیٹر طویل ساحلی پٹی کو دریافت کیا۔

چوتھی صدی قبل از مسیح میں خلیج فارس اور بحیرہ روم کے اطراف میں بسنے والی اقوام کی پہنچ جنوب مغربی ایشیا، [illegible] ایشیا اور وسطی و مغربی یورپ کے کچھ علاقوں کے ساتھ ساتھ افریقا کے دور دراز خطوں تک ہوچکی تھی۔ افریقا اور ایشیا [illegible] ابتدائی مہمات کے بعد مصری، ایرانی اور فونیشیائی تو تھک کر بیٹھ گئے لیکن یونانیوں کی بے چین طبیعت نے [illegible] چین لینے نہ دیا۔ اُن کی فطرت ایسی تھی کہ وہ ہر روز نیا ہنگامہ چاہتے تھے۔ اُن کی آنکھیں ہر روز ایک تماشا [illegible] اُن کی زبانیں ہر دن کسی نئے مسئلے پر گفتگو کرنا چاہتی تھیں۔ یونانیوں کی یہ خصوصیات انہیں ایک مخصوص ڈگر پر چلنے [illegible] روکتی تھیں۔ یونانیوں کی افریقا کے تاریک براعظم اور مغربی یورپ کے ٹھنڈے برفستان سے زیادہ دلچسپی [illegible] جادوئی سرزمین میں تھی۔ اس زمانے میں اہلِ یونان [illegible] کو چپٹا یا سپاٹ مانتے تھے اور اُن کے نزدیک [illegible] کائنات کا مرکز تھی۔ مشہور زمانہ یونانی فلسفی ارسطو (Aristotle) نے 340 ق م میں اپنی کتاب ''افلاک پر'' (On the Heavens) میں پہلی بار زمین کے گول ہونے کے بارے میں دلائل دیے۔ عام یونانیوں نے تو ارسطو کے خیالات کو دقیانوسی قرار دے کر اُس کا مذاق اڑایا تاہم ارسطو کے سب سے لائق شاگرد مقدونیہ کے نوجوان حکمران اسکندر اعظم... (Alexander the Great) نے اپنے استاد کے نظریات کو درست ثابت کرنے کے لیے دنیا کو فتح کرنے کا منصوبہ ترتیب دیا۔ اسکندر اعظم نے طے کیا کہ وہ مشرق کی طرف سے زمین کو فتح کرتا ہوا مغرب کی طرف سے دوبارہ یونان میں داخل ہوگا۔

اسکندر اعظم نے 334 قبل مسیح میں اپنی مہم جوئی کا آغاز کرتے ہوئے 333 قبل مسیح میں ترکی اور 332 قبل مسیح میں مصر فتح کیا۔ اُس نے شمالی مصر میں بحیرہ روم کے کنارے اسکندریہ (Alexanderia) نامی شہر کی بنیاد رکھی۔ 331 قبل مسیح میں اسکندر نے دوبارہ مشرق کی طرف توجہ دی اور وہ صحرائے عرب کو پار کرکے عراق پہنچا۔ جہاں اُس نے ایرانی حکمران دارا کے عظیم الشان لشکر کو شکست فاش دی۔ 325 ق م میں اسکندر جنوبی ایشیا میں داخل ہوا۔ وہ افغانستان اور پاکستان کے موجودہ علاقوں میں چھوٹی موٹی ریاستوں کو فتح کرتا ہوا شمالی پنجاب کے زرخیز علاقے میں داخل ہوا۔ جہاں اُس نے 326 ق م میں جہلم شہر کے قریب ہندو راجا پورس کی فوجوں کو شکست دی۔ اسکندر اپنی مہم کا دائرہ کار جنوب میں ہندوستان تک بڑھانا چاہتا تھا۔ تاہم جنوبی ایشیا کے گرم صحرائی موسم کے ہاتھوں پریشان اُس کے لشکر نے یونان واپسی کا مطالبہ کیا۔ اسکندر نے فوج کی بات مان لی اور مستقبل میں دوبارہ ہندوستان آنے کی منصوبہ بندی کرتے ہوئے ایران کی طرف روانہ ہوگیا۔ بدقسمتی سے اسکندر کو مقدونیہ جانا نصیب نہ ہوا۔ وہ جنوبی ایران میں واقع بابل کے قدیم شہر میں قیام کے دوران ایسا بیمار ہوا کہ صرف 33 سال کی عمر میں (323 قبل مسیح) میں دنیا کے اس عظیم فاتح نے موت کو گلے لگالیا۔ ایک اندازے کے مطابق اسکندر نے اپنی 11 سالہ مہم جوئی کے دوران لگ بھگ 30 ہزار کلومیٹر کا سفر طے کرتے ہوئے تقریباً ایک کروڑ مربع کلومیٹر کا ایشیائی علاقہ دریافت کیا۔ ایران اور جنوبی ایشیا میں مہمات کے دوران اسکندر نے ہرات، قندھار اور اسکندریہ سمیت کل بیس نئے شہروں کی بنیاد رکھی۔ اُس نے اپنے جرنیلوں اور سپاہیوں کو فارسی اور انڈین عورتوں کے ساتھ شادی کرنے کی ترغیب دی اور اپنے استاد کے لیے غیر ملکی حیاتیاتی نمونے جمع کیے جن میں ایک ہاتھی بھی شامل تھا۔ اسکندر اعظم زمین کے گول ہونے کو تو ثابت نہ کرسکا، تاہم اُس کی جنوب مغربی ایشیا میں مہمات کی بدولت یورپین کی ہندوستانی سرزمین میں دلچسپی بڑھ گئی۔

اسکندر اعظم کی ایشیا میں مہمات کے دوران مارسیلز (Marseille) سے تعلق رکھنے والے ایک یونانی مہم جو اور جغرافیہ دان، پائے تھیاس (Pytheas) نے اسکندر کے برعکس مغربی نصف کرّے کی دریافت کا بیڑہ اٹھایا۔ پائے تھیاس نے 325 قبل از مسیح میں اپنی کمزور کشتیوں کے سہارے خلیج بسکے اور پھر رودبار انگلستان کو پار کرنے کے بعد برطانیہ کے جزائر کو دریافت کیا۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے ان جزائر کو برطانیہ (Britannia) کا نام دیا۔ اُس نے بحیرہ شمالی (North Sea) سے ہو کر بحیرۂ ناروے (Norwegian Sea) کے راستے اسکنڈے نیویا (Scandinavia) کو دریافت کیا۔ پائے تھیاس نے موسم گرما میں ناروے کے مغربی ساحل کے قریب ایک جزیرے پر قیام کے دوران آدھی رات کے سورج Midnight (Sun) کا مشاہدہ کیا۔ وہ یہ جان کر حیران رہ گیا کہ زمین کے اس حصے میں رات کے مقابلے میں دن، بیس گھنٹے سے بھی زیادہ طویل تھا۔ پائے تھیاس نے کرۂ ارض کے اس شمالی حصے کو دنیا کے انتہائی شمالی کنارے (Thule) کا نام دیا۔ اُس نے مزید شمال مغرب میں جانے کی بجائے جنوب میں بحیرہ بالٹک (Baltic Sea) کے قرب و جوار کی سیاحت کی اور اس علاقے میں آباد قبائل کو جرمنک قبائل (Germanic Tribe) کا نام دیا۔ پائے تھیاس کا دیا ہوا یہی نام آگے چل کر جرمنی سے تبدیل ہوگیا۔

اسکندر اعظم اور پائے تھیاس کی مہمات کے بعد عام یورپین کی کرۂ ارض کے بارے میں رائے تبدیل نہ ہوسکی۔ گو کہ ارسطو اور اس جیسے کچھ دیگر یونانی فلسفی زمین کے گول ہونے میں یقین رکھتے تھے تاہم یورپ میں یہ تاثر عام رہا کہ زمین چپٹی تھی اور ایک عظیم طشتری کی صورت میں خلا میں معلق تھی۔ یورپین کی رائے میں اگر اسکندر اور پائے تھیاس مشرق اور مغرب میں آگے بڑھتے رہتے تو اپنی مہم کے نقطہ عروج پر زمین کے کناروں سے باہر نکل کر کائنات میں کہیں کھو سکتے تھے۔

# سراب

راوی : شہباز ملک

تحریر: کاشف زبیر

قسط 69

وہ پیدائشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب — ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر آسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

بابا کا اصرار تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج بھیج دیا جائے جبکہ میں آرمی میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ سویرا جو میرے دل کا حصہ تھی وہ میرے بڑے کا مقدر بنا دی گئی اور میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ میں نے کاروبار شروع کیا۔ ایک روز مری سے واپس آتے ہوئے نادر علی کا ٹکراؤ ہو گیا پھر یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ دشمنی اور دربدری کا ایک سلسلہ شروع ہوا جو دراز ہوتا چلا گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان، ڈیوڈ شا جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ اس کے بعد ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئی تھیں۔ میں دوبارہ اپنے وطن لوٹا تو فتح خان سے ٹکراؤ ہو گیا۔ اس کے آدمیوں کو شکست دے کر میں اندرون آ گیا۔ آتے وقت میرے ہاتھ حکومتِ چین کا ایک بریف کیس آ گیا۔ وہ بریف کیس شہلا کے ہاتھ لگ گیا۔ شہلا کو راضی کیا کہ وہ مجھے لاکر تک پہنچا دے تاکہ میں چائنیز بریف کیس حاصل کرلوں۔ ہم بینک میں سیف سے بریف کیس نکال چکے تھے کہ باہر سے اطلاع آئی کچھ لوگ ہمیں گھیر رہے ہیں۔ شہلا نے فتح خان کے آدمیوں کو بلالیا تھا۔ وہ مجھے یرغمال بنا کر فتح خان کے گھر میں لے آئی۔ وہاں ایک خانہ بدوش عورت کو فتح خان کے آدمی پکڑ لائے تھے اور اس کی عزت سے کھیل رہے تھے کہ خانہ بدوش چڑھ دوڑے، وہ عورت کی عزت لوٹنے والے کو سزا دلوا کر کے ہمیں سزا سنانے آئے تھے کہ آندھی طوفان کی طرح فتح خان آ گیا۔ اس نے خانہ بدوشوں کو بھگا دیا۔ تب میں نے دیکھا کہ اس کے ساتھ سویرا بھی ہے۔ وہ اسے اغوا کر لایا تھا۔ پھر اس نے مجھے مجبور کر دیا کہ سویرا کو حاصل کرنے کے لیے مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کر کے دینے ہوں گے۔ میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ اس نے میری جیکٹ پر ایک چپ چپکا دی تھی۔ جو میرے بارے میں مطلع کر رہی تھی فتح خان، برٹ شا لے آیا جو پاگل ہو چکا تھا۔ پھر اس نے میری طرف سے میل کر کے ایمن کو بلوالیا۔ وہ دور رہ کر ہم پر نظر رکھے ہوئے تھا کہ فتح خان کے آدمیوں نے فائرنگ شروع ہو گئی۔ برٹ شا نے میرے پستول سے فتح خان کو نشانے پر لیا تھا کہ اس کے آدمی نے برٹ شا کو گولی ماردی۔ مرتے وقت برٹ شا بڑبڑایا "نارتھ...... ہکسٹ" دم توڑتے برٹ شا کی آواز صرف میں نے سنی تھی، تھوڑی دیر میں اندازہ ہو گیا کہ فتح خان نے اندازہ لگا لیا ہے کہ پوری کارروائی میں میرا ہاتھ ہے، تبھی مائیک سے اعلان ہوا کہ جو بھی ہے، وہ ہاتھ اٹھا کر باہر آ جائے۔ وہ راجا صاحب کے آدمی تھے۔ وہاں سے میں محل میں آیا۔ وہاں ایمن بھی موجود تھی۔ اگلے دن ہم پنڈی جانے کے لیے نکلے۔ راستے میں فتح خان نے گھیر کر بے بس کر دیا اور ایمن کو خود کش جیکٹ پہنادی جسے اتارنے کی کوشش کی جاتی تو دھماکا ہو جاتا۔ ہم عبداللہ کی کوٹھی میں پہنچے تو فون آ گیا۔ آواز مرشد کی تھی۔ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتا تھا۔ عبداللہ نے انکار کیا کہ یہاں شہباز نہیں رہتا مگر پیغام پہنچا دیا جائے گا۔ یہ ایک خطرناک بات تھی کہ میری موجودگی سے وہ آگاہ ہو گیا تھا۔ ہم دوسری جگہ منتقل ہو گئے۔ پھر اطلاع ملی کہ شہلا کا فون آیا تھا۔ میں نے اسے کال کر کے بریف کیس مانگا۔ اس نے بریف کیس دینے کے لیے ویران جگہ مقرر کی۔ ہم وہاں پہنچے اور بریف کیس لے کر چلے تو مجھے شک ہوا اور میں نے بریف کیس ڈھلان پر رکھ دیا۔ وہ دھماکے سے پھٹ گیا۔ ہم واپس ہو رہے تھے کہ وسیم کا فون آیا کہ سویرا راستے سے لاپتا ہو گئی ہے۔ بعد میں فون آیا کہ اسے فتح خان نے حویلی پہنچا دیا ہے۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کر دیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کی تحویل میں پایا۔ میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل بھاگا۔ جیپ تک پہنچا تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ کرنل زروسکی نے ہم دونوں کو پکڑ لیا۔ وہ مجھے پھر سے انڈین آرمی کی تحویل میں دینا چاہتا تھا۔ میں نے کرنل کو زخمی کر کے بساط اپنے حق میں کر لی۔ زخمی فتح خان اور زروسکی کو لے کر چلا۔ راستے میں فتح خان کو اتار دیا۔ کچھ دور جانے کے بعد ایک کوٹھی نظر آئی جو ایک ملٹری آفیسر کی تھی۔ میں نے اسے حالات بتا کر بدقسمتی کی آفیسر زروسکی کو ملٹری پولیس کے حوالے کرنے چلا گیا تھا کہ کوٹھی پر حملہ ہو گیا۔ میں نے حملہ پسپا کیا۔ ملٹری افسر زخمی تھا، مجھے انٹیلی جنس والے ساتھ لے گئے۔ انہی لوگوں نے مجھے پنڈی پہنچانے کا انتظام کر دیا۔ میں دوستوں کے درمیان آ کر ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی کہ ایک کوٹھی میں بم دھماکا۔ کوٹھی نادر علی کی تھی جسے کسی نے تباہ کیا تھا۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ مجھے شہلا کی تلاش تھی۔ اس لیے کوٹھی کی جانب توجہ دی تبھی خبر ملی کہ شہلا کسی صابر نامی شخص سے ملنے جارہی ہے۔ میں دوستوں کے ساتھ تلاش میں نکل پڑا۔ پیچھے گئے تو پتا لگایا کہ وہ صابر کو پکڑ لیں۔ صابر تو پکڑ میں آ گیا مگر شہلا نکل گئی۔ صابر نے بتایا کہ شہلا کالی کوٹھی میں ملے گی۔ ہم وہاں پہنچے تو شہلا آخری سانس لے رہی تھی۔ کالی کوٹھی کو تباہ کرنے کے لیے ہم نے دھماکا کیا تھا کہ پولیس کے سائرن کی آواز سنائی دی۔ پولیس کے جوان بھی دھماکے میں ہلاک ہو گئے۔ پھر میں نے فیصلہ کیا کہ سونا وغیرہ کو حویلی بھیج دیا جائے۔ ہیلی کاپٹر ہائر کیا۔ جیسے ہی چوپر بلند ہوا اس پر فائرنگ شروع ہو گئی جو ایک ریموٹ کنٹرول گن سے کی جارہی تھی۔ یہ کام فاضلی کا تھا، ہم نے اسے اغوا کر لیا، اسے تہ خانے میں قید کر کے باہر نکلے۔ مجھے خیال آیا کہ ایک دو جگہیں مزید ہونی چاہیے جہاں ہم ٹھہر سکیں۔ اخبار میں ایک اشتہار نظروں سے گزرا جس میں فرنشڈ مکان کرائے پر دینے کی بات کی گئی تھی۔ ہم جا پہنچے۔ مکان پسند آیا اور اسے دس لاکھ ایڈوانس دے کر لے لیا۔ مگر اگلے دن سے مکان مالک افنان احمد نظر نہیں آیا۔ اس کی نگرانی کے لیے عبداللہ نے ایک آدمی کو لگا دیا۔ پھر خود بھی رات میں وہاں جا گا۔ تبھی اندر سے ایک آدمی بھاگتا ہوا نکلا تھا کہ افنان احمد نے اس پر فائر کر کے اسے گھسیٹتا ہوا اندر لے گیا۔ دبے قدموں میں بھی اندر آ گیا۔ ایک کمرے میں تہ خانہ نظر آیا میں اندر جھانک رہا تھا کہ تاریکی میں ایک شعلہ چمکا۔

**اب آگے پڑھیے**



شعلہ اس لائیٹر سے برآمد ہوا تھا جو افنان احمد کے ہاتھ میں تھا اور اس کے دوسرے ہاتھ میں وہی لمبی نال والا بے آواز پستول تھا۔ پستول کا رخ میری طرف تھا اس لیے میں فوراً ساکت ہو گیا تھا۔ اس نے سرگوشی نما لہجے میں کہا۔

"اپنا پستول نیچے رکھ دو اور پیر سے میری طرف سرکا دو... آہستہ سے... تیزی مت دکھانا۔"

میں نے پستول نیچے پھینک دیا۔ "اور کوئی حکم...؟"

"اب اپنی رائفل بھی شانے سے اتار کر اسی طرح نیچے رکھ کر میری طرف سرکا دو۔"

وہ نہایت چوکس تھا اور اس نے ایک لمحے کے لیے بھی مجھ سے نگاہ نہیں ہٹائی تھی۔ بدقسمتی سے اس بند جگہ ہوا بالکل نہیں تھی اور لائیٹر کا شعلہ یوں ساکت تھا جیسے بلب ہو اور اس کی روشنی بالکل ہموار تھی۔ اس لیے میں پوری طرح افنان احمد کی نظروں میں تھا۔ اس کے چہرے کے نرم اور مہذبانہ تاثرات بالکل غائب تھے اور وہ کسی بھیڑیے کی طرح چوکنا اور خونخوار دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے جتنے آرام سے فرار ہونے والے آدمی کو گولی ماری تھی یہی اس کی اصلیت کھول دینے کے لیے کافی تھا۔ میں نے بہت کم کسی انسان کے ظاہر سے ایسا دھوکا کھایا تھا۔ اگرچہ اسے دھوکا کہنا مناسب نہیں ہوگا کیونکہ میں نے اس پر کوئی اعتماد نہیں کیا تھا اور ہم اس کی نگرانی بھی کر رہے تھے لیکن اسے دیکھ کر مجھے ایک بار بھی خیال نہیں آیا کہ وہ اتنا سفاک ہوگا۔

"وہ آدمی کہاں ہے جسے تم نے گولی ماری تھی۔"

"تہ خانے میں۔" اس نے جواب دیا۔ "اس نے فرار کی کوشش کی تھی۔"

"تم نے اسے کیوں قید رکھا تھا۔"

"وہ اس کوٹھی کی نگرانی کر رہا تھا وہ تمہارا آدمی تھا؟"

میں نے سر ہلایا۔ "میں نے آنکھ بند کر کے تمہیں دس لاکھ روپے نہیں دیے تھے۔ اپنی رقم کی حفاظت بھی تو کرنی تھی۔"

"جھوٹ مت بولو تم پولیس یا کسی ایجنسی کے آدمی ہو۔"

میں چونکا وہ قانون سے خوفزدہ تھا اس کا مطلب تھا کہ وہ کسی غیر قانونی کام میں ملوث تھا ورنہ خوف زدہ ہونے کا کیا سوال تھا۔ اس کے عزائم سے لگ رہا تھا کہ وہ گولی چلانے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کرے گا۔ "فرض کرو میں کسی ایجنسی کا آدمی ہوں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"تم لوگ میرے پیچھے لگے ہو؟"

"ہمیں تم پر شک ہے۔" میں نے گول مول انداز میں کہا۔

"کیا شک ہے؟"

"آج کل حالات ٹھیک نہیں ہیں اور خاص طور سے دارالحکومت کی سیکورٹی سخت کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ان تمام افراد کی نگرانی کی جارہی ہے جن پر کسی تخریب کاری میں ملوث ہونے کا شک ہے۔"

میری آمد یقیناً اس کے لیے غیر متوقع تھی لیکن وہ کسی طرح سے میری آمد سے باخبر ہو گیا تھا اور اس نے بالکل درست جگہ گھات لگا کر مجھے گرفتار کیا تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میرے ساتھ کیا سلوک کرے۔ اس نے حالات کا تجزیہ کرلیا تھا اور طے کرلیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس نے عبداللہ کے آدمی کو شوٹ کر دیا تھا اور اب وہ ہمیں کسی ایجنسی کا آدمی سمجھ رہا تھا۔ اسے یہاں سے فرار ہونا تھا۔ اس نے کہا۔ "باہر تمہارے ساتھی موجود ہیں؟"

"بالکل۔" میں نے پورے اعتماد سے کہا۔ "باہر میرے ساتھی موجود ہیں اور ہم نے اس کوٹھی کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو اس صورت میں تم اکیلے اندر نہیں آتے بلکہ تمہیں دھاوا بول دینا چاہیے تھا۔ خاص طور سے جب میں نے تمہاری نظروں کے سامنے تمہارے ایک ساتھی کو شوٹ کیا تھا۔ تم نے اس وقت مجھے گولی کیوں نہیں ماری دی۔"

اس نے میرا جھوٹ پکڑ لیا تھا میں نے بات بنانے کی کوشش کی۔ "یہ سب اچانک ہوا تھا۔"

"بکواس کرتے ہو تم...... اصل میں تم اکیلے ہو اور اسی لیے اکیلے اندر آئے ہو۔"

"اگر میں اکیلا ہوں تب بھی کچھ دیر میں میرے ساتھی یہاں پہنچ جائیں گے اندر آنے سے پہلے میں ان کو سگنل دے آیا ہوں تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ تم ہتھیار ڈال کر خود کو ہمارے حوالے کردو۔"

"اور ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاؤں۔" اس نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "میرا تو خیال ہے میں تمہیں ہمیشہ کے لیے غائب کر دیتا ہوں، چلو تہ خانے میں اترو۔"

یہاں اس سے چوک ہو گئی۔ اپنی حفاظت کے خیال

لیے وہ مجھ سے دور تھا اور اس نے اس وقت بھی پاس آنے کی کوشش نہیں کی جب میں تہ خانے کے دروازے سے اندر داخل ہوا۔ ایک مختصر سی جگہ کے فوراً سیڑھیاں اندر اتر رہی تھیں۔ میں اندر داخل ہوا اور فوراً ہی میرے ذہن میں خیال آیا میں نے سیڑھیوں کی طرف ہوتے ہوئے اچانک دروازے کو ہاتھ مار کر بند کیا اور پھرتی سے نیچے بیٹھتے ہوئے اندر سے اس کی کنڈی لگا دی۔ افنان احمد نے سوچا نہیں تھا اس لیے اسے ردِعمل دکھانے میں ذرا دیر لگی اس نے لگا تار کئی فائر کیے اور گولیاں دروازے میں سوراخ کرتی اندر آئی تھیں۔ اگر میں کھڑا ہوتا تو یہ سوراخ میرے جسم میں بھی ہو سکتے تھے۔ میں بیٹھے ہونے کی وجہ سے بچ گیا اور فوراً ہی سیڑھیوں سے نیچے لڑھک گیا۔ چالاک افنان احمد نے اندازہ لگایا تھا کہ اب میں سیڑھیوں سے نیچے جاؤں گا اس نے اگلے فائر سیڑھیوں کی طرف کیے اس بار بھی اس نے یہ سوچ کر نشانہ لیا کہ میں کھڑا ہوں گا۔ گولیاں میرے اوپر سے گزر گئیں اور میں بال بال بچا۔

لڑھک کر نیچے آنے میں چوٹیں لگیں خاص طور سے ایک بار سر سیڑھی سے ٹکرایا تو چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔ کہنیاں اور گھٹنے بھی زخمی ہوئے۔ بہرحال یہ چوٹیں فوت ہونے کے مقابلے میں کہیں قابل قبول تھیں۔ میں نیچے پہنچا تو افنان احمد نے اوپر فائرنگ کر کے اندر کی کنڈی توڑ ڈالی اور اندر آیا۔ اس وقت میں نیچے تھا اسے دیکھتے ہی میں لپک کر دیوار کی آڑ میں ہوا اور اس کی چلائی دو گولیوں سے بچ نکلا اس کے بعد اس کا پستول خالی ہو گیا کیونکہ اب صرف ٹرچ ٹرچ کی آوازیں آرہی تھیں۔ یہ چند لمحے کی مہلت تھی کیونکہ افنان احمد کا انداز بتا رہا تھا وہ مجھے مرحوم کرنے کا پختہ فیصلہ کر چکا ہے اور بس اس پر عمل درآمد کرنا باقی تھا۔ وہ دوسرا میگزین لگاتے ہی نیچے آتا اور اپنے فیصلے پر عمل کر لیتا اگر اس سے پہلے میں کچھ نہ کر گزرتا۔ میں نے دیوار کی آڑ میں ہوتے ہی آس پاس دیکھا۔

تہ خانہ اصل میں بیس بائی پندرہ کا کمرا تھا اور عبداللہ کے آدمی کی لاش یہیں پڑی تھی۔ وہ اوندھے منہ فرش پر لیٹا تھا اور اس کی پشت خون آلود ہو رہی تھی۔ بہ ظاہر وہ لاش ہی لگ رہا تھا۔ تہ خانے میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی جسے میں اپنے دفاع کے لیے استعمال کر سکتا۔ میرے کانوں نے پستول سے میگزین نکلنے کی آواز سنی۔ افنان احمد اس میں دوسرا میگزین لوڈ کر رہا تھا۔ اب وقت بالکل نہیں تھا۔ وہ کسی لمحے بھی نیچے آجاتا اور مجھے دیکھتے ہی شوٹ کر دیتا۔ ایسے وقت جب بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ اچانک ہی ایک خیال الہام کی طرح نازل ہوا۔ تہ خانے میں روشنی کا واحد ذریعہ سیڑھیوں کے عین خاتمے والی جگہ لگا ہوا انرجی سیور تھا یہ واحد انرجی سیور بیک وقت سیڑھیوں اور تہ خانے میں روشنی کر رہا تھا۔ اگر میں اسے توڑ دیتا تو تہ خانے اور سیڑھیوں پر تاریکی چھا جاتی اور افنان احمد کے لیے مجھے نشانہ بنانا آسان نہ رہتا۔

وہاں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جسے میں انرجی سیور پر مار کر اسے توڑ دیتا۔ لہٰذا میں نے عجلت میں جوتا اتارا اور انرجی سیور پر کھینچ مارا۔ ایک تڑاخے کے ساتھ انرجی سیور ٹوٹا اور تہ خانے میں اندھیرا چھا گیا۔ افنان احمد جو نیچے آرہا تھا اس کے منہ سے ایک گندی سی گالی نکلی۔ اس دوران میں میں نے دوسرا جوتا بھی اتار لیا تھا اور وہ سیڑھیوں پر پھینک کر مارا۔ جگہ بڑی مختصر سی تھی اس لیے نشانہ خطا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ افنان احمد چلایا تو مجھے بڑی مسرت ہوئی تھی۔ اس سے پہلے میں نے دشمنوں کو گولی سے لے کر گولا تک ہر ہتھیار مارا تھا لیکن جوتے کو بہ طور ہتھیار استعمال کرنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ جوتا غالباً اس کے منہ پر لگا تھا۔ کم سے کم آواز سے تو ایسا ہی لگا تھا۔ اس نے اشتعال میں آکر دو گولیاں اور چلائیں مگر نیچے آنے کی ہمت نہیں کر سکا تھا۔ خاصی دیر بعد اس نے تکلیف زدہ لہجے میں کہا۔

”میں ابھی روشنی کا بندوبست کر کے آتا ہوں تاکہ تمہارے سر میں سوراخ کر سکوں۔“ وہ ناک سے بول رہا تھا اس کا مطلب تھا کہ جوتا اس کی ناک پر لگا تھا۔ یہ ایک اور اچھی بات تھی۔ میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اس کے بجائے میرے کان آہٹوں پر مرکوز تھے۔ وہ اوپر جا رہا تھا لیکن یہ دھوکا بھی ہو سکتا تھا وہ واپسی کا تاثر دے کر سیڑھیوں پر موجود ہوتا اور جیسے ہی میں سیڑھیوں پر نمودار ہوتا وہ آرام سے مجھے گولی مار دیتا۔ میں نے فرش پر بیٹھتے ہوئے ٹٹول کر اپنا پہلا جوتا تلاش کیا لیکن وہ تہ خانے کے دوسری طرف جا چکا تھا۔ میں پھرتی سے دوسری طرف پہنچا۔ اپنا جوتا تلاش کیا اور پھر سیڑھیوں پر پھینک کر مارا۔ اس بار جوتا اس کے منہ پر نہیں لگا تھا شاید جسم پر کہیں لگا تھا اور اس نے بے ساختہ گالی کے بعد گولی ارسال کی۔ وہ چالاکی سے سیڑھیوں پر موجود تھا۔ میں نے قہقہہ مارا۔

”میں اسی طرح تمہیں جوتے مار مار کر ہلاک کروں گا۔“



اس نے نہایت اشتعال کے عالم میں ناگفتہ بہ زبان میں بتایا کہ وہ جوتوں اور میرے ساتھ کیا کرے گا اور میرے کیا دو سے زیادہ پاؤں ہیں اب میں تیسرا جوتا کہاں سے لاؤں گا....؟ یہ سوال کرتے ہوئے وہ بھول گیا تھا کہ تہ خانے میں ابھی دو عدد جوتے موجود تھے۔ جب تک وہ بک بک کرتا رہا میں رینگتا ہوا عبداللہ کے آدمی کے پاس پہنچا اور ٹٹول کر اس کے جوتے اتارے۔ اس بے چارے کے جسم پر انڈرویئر کے بعد بس جوتے ہی تھے۔ میں نے دل ہی دل میں اس سے معذرت کی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ یہ سخت ترین قسم کے چمڑے سے بنے موٹے سول والے وزنی جوتے تھے۔ میں واپس آیا تو افنان احمد خاموش تھا۔ شاید وہ سیڑھیوں سے باہر نکل گیا تھا یا پھر وہیں دبکا بیٹھا تھا۔ میں نے آڑ میں رہتے ہوئے جیب سے ایک سکہ نکال کر اوپر کی طرف اچھالا۔ سکہ ٹن سے گرا اور اس نے بھڑک کر فائر کیا۔ وہ وہیں موجود تھا مگر مکاری سے کام لیتے ہوئے خاموش تھا۔ اس طرح فائر کرنے سے اس کے کشیدہ اعصاب ظاہر ہو رہے تھے۔

میرے پاس موبائل تھا۔ اب تک مجھے موقع نہیں ملا تھا کہ عبداللہ کو کال کروں جو شاید یہاں پہنچ گیا تھا۔ میں نے اس کا نمبر ملایا اور اسکرین کی روشنی چھپانے کے لیے اسے سامنے جیب میں رکھ لیا۔ جیسے ہی عبداللہ نے کال ریسیو کی میں نے بلند آواز سے افنان احمد سے کہا۔ ”افنان احمد مجھے جانے دو تم بھی نکل جاؤ مجھے مارنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ میرے ساتھی تمہارے بارے میں سب جانتے ہیں وہ تمہیں پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔“

”بکواس مت کرو۔“ وہ غرایا۔ ”میں اسی جگہ کو تمہارا مقبرہ بنا کر جاؤں گا۔“

”تم کیا سمجھتے ہو اس تہ خانے میں مجھے محصور کر لو گے۔ ٹھیک ہے میں نے اکیلے آکر غلطی کی لیکن جلد میرے ساتھی یہاں پہنچنے والے ہیں۔“

افنان احمد نے تکلیف زدہ قہقہہ لگایا۔ ”جب تک وہ یہاں آئیں گے میں جا چکا ہوں گا۔“

عبداللہ نے شروع میں ایک بار ہیلو کہا تھا لیکن میری آواز سنتے ہی وہ خاموش ہو گیا اور پھر موقع کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے اپنے موبائل کے مائک کا والیوم بہت ہلکا کر لیا تھا شاید وہ ٹریفک میں تھا اس لیے شور ہو رہا تھا۔ میں سمجھنے سے قاصر تھا کہ افنان احمد دیر کیوں کر رہا ہے۔ وہ اوپر سے کوئی ٹارچ یا ایمرجنسی لائٹ لا کر اس کی روشنی میں بھی میری زندگی کا چراغ گل کر سکتا تھا۔ شاید اسے خوف تھا کہ اس کی عدم موجودگی میں میں نکل بھاگوں گا۔ ٹارچ یا روشنی والی کوئی چیز کچن یا آس پاس میں نہیں تھی اور اسے دور جانا پڑتا۔ یہی بات درست تھی اور اسی مجبوری کی وجہ سے تہ خانے کا دروازہ چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ مگر اس دوران میں وہ خالی نہیں بیٹھا تھا ایک تو وہ اوپر سے میری رائفل لے آیا تھا۔ یہ کام اس نے اتنی خاموشی سے کیا کہ میں اس کے جانے اور آنے کی آہٹ نہیں سن سکا۔

پھر اس نے دوسرا کام یہ کیا کہ اس نے اپنی قمیص اتار کر اس کا گولا بنایا اور پھر اسے لائٹر سے آگ دکھا دی جب گولا اچھی طرح جلنے لگا تو اس نے اسے تہ خانے کے فرش کی طرف اچھال دیا۔ وہ آخری سیڑھی پر گرا اور لڑھک کر بالکل میرے سامنے آگیا۔ میں نے عجلت میں ایک جوتے سے جلتے کپڑے کو اپنی طرف کھینچ لیا اور پھر بال بال بچ گیا افنان احمد نے اوپر سے برسٹ مارا تھا۔ گولیاں میرے ہاتھ کے آس پاس سے گزر گئی تھیں میں نے بے ساختہ ہاتھ پیچھے کھینچا اور فوراً ہی جوتا گھما کر اوپر مارا۔ وہ اذیت بھری آواز میں چلایا تو مجھے ایک بار پھر گہری مسرت ہوئی تھی۔ یہ جوتا بھی نشانے پر لگا تھا اور میرے جوتے کی نسبت زیادہ سخت تھا اس لیے چوٹ بھی زیادہ آئی ہوگی۔ افنان احمد نے دوسرا برسٹ مارا لیکن میں آڑ میں تھا۔ کپڑا جل رہا تھا اور اس کی محدود روشنی میں بھی تہ خانہ نمایاں ہو رہا تھا۔ اگر میں سامنے آنے کی کوشش کرتا تو وہ آرام سے مجھے نشانہ بنا لیتا۔

آڑ سے نکلنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے آس پاس دیکھا پھر اوپر کا معائنہ کیا تو مجھے تقریباً سات فٹ کی بلندی پر کنکریٹ کا شیلف دکھائی دیا۔ اس قسم کے شیلف سامان رکھنے کے لیے بنائے جاتے ہیں ان پر لکڑی کے پٹ لگا کر خوب صورت شکل دے دی جاتی ہے اور سیمنٹ والے حصوں پر پلائی چڑھا دی جاتی ہے۔ مگر فی الحال یہ صرف چھجا تھا۔ میں نے اچھل کر دونوں ہاتھوں سے اسے تھاما اور پھر پاؤں دیوار پر لگاتے ہوئے بے آواز اوپر چڑھ گیا۔ افنان احمد کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جانا چاہیے تھا اور وہ نیچے آنے والا تھا کیونکہ اس کے بغیر وہ میرا خاتمہ نہیں کر سکتا تھا۔ اب اس کے پاس خودکار رائفل تھی اور وہ زیادہ پُراعتماد تھا۔ ظاہر ہے میں کہیں زیادہ خطرے میں تھا۔ چھجا مشکل سے دو فٹ نکلا ہوا تھا اور اس سے اوپر چھت تک صرف تین فٹ جگہ تھی اور

میں اس جگہ میں پیک تھا۔ اگر ایک طرف خلا نہ ہوتا تو میرے لیے حرکت کرنا بھی مشکل ہو جاتا۔ میں آہستگی سے بے آواز حرکت کرتا ہوا عین سڑھیوں کے اوپر والی جگہ آیا۔

افنان احمد کی قمیص پوری طرح جل کر بجھنے والی تھی اور وہ بجھ جاتی تو اسے شاید اپنی پتلون جلانی پڑتی اور پھر وہ صرف انڈر ویئر میں رہ جاتا۔ مگر اس کے لیے مسئلہ نہیں تھا یہاں اس کے پاس کپڑوں کی کمی نہیں تھی۔ اس نے بلا تکلف اپنی پتلون بھی جلا کر نیچے پھینک دی اور اب تہ خانہ زیادہ روشن ہو رہا تھا۔ میں ساکت بیٹھا اور کان لگائے ہوئے تھا۔ اگر افنان احمد سیڑھیاں اتر رہا تھا تو وہ بالکل دبے قدموں تھا۔ ذرا سے غور کے بعد میں نے ایک لائن آف ایکشن تیار کیا اور خود کو اس پوزیشن میں لے آیا جو عمل کے لیے بہترین تھی۔ اب مجھے انتظار تھا کہ افنان احمد نیچے آئے۔ میں آسانی سے ہتھیار ڈالنے والوں میں سے نہیں تھا۔ مرشد اور فتح خان جیسے دشمنوں سے نمٹتا رہا تھا۔ میں نے دل میں سوچا۔ ”بیٹا نیچے آؤ تمہیں پتا چلے گا کہ کس سے مقابلہ ہے۔ اتنی آسانی سے تم مجھ پر قابو نہیں پا سکتے ہو۔“

پتلون اب دھڑا دھڑ جل رہی تھی اور تہ خانے میں روشنی تیز ہو گئی تھی۔ بالکل آخری لمحے میں مجھے پتا چلا کہ وہ نیچے تک آ گیا ہے۔ وہ اچانک آ کر دائیں طرف گھوما اور ہلکا برسٹ مارا۔ اس کے خیال میں میں یہاں چھپا ہوا تھا وہ یقیناً سرپرائز ہوا تھا جب اس نے آڑ کو خالی پایا اور پھر وہ دوسری طرف گھوم رہا تھا کہ میں غیر متوقع طور پر اوپر سے نازل ہوا۔ وہ چھجے کے عین نیچے تھا اس لیے میں اس پر کود نہیں سکتا تھا اس لیے میں نے دونوں پاؤں ہوا میں اچھالے میرے دونوں ہاتھ چھجے کے کناروں پر جمے تھے اور میں یوں نیچے آیا جیسے جمناسٹر رسی پر سے گھومتے ہوئے نیچے آتا ہے ایک قوس کی صورت میں۔ میرے پاؤں اور پھر پورا جسم افنان احمد سے ٹکرایا اور وہ میرے اور دیوار کے درمیان میں پس گیا تھا۔ اس تصادم نے اس کے ہوش اڑا دیے تھے۔ رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ میں نیچے گرا تو میرا سر ایک بار پھر فرش سے لگا اور مجھے چکر آ گیا تھا۔

جس وقت میں اپنے حواس بحال رکھنے کی کوشش کر رہا تھا افنان احمد بھی خود کو سنبھال رہا تھا اور اس کے ہاتھ رائفل تلاش کر رہے تھے۔ وہ بچ انڈر ویئر میں تھا۔ اسی وجہ سے وہ پستول چھوڑ کر آنے پر مجبور ہوا تھا۔ ورنہ وہ پستول لباس میں رکھ لیتا۔ جیسے ہی اس نے رائفل اٹھائی میں نے لات چلائی اور رائفل اس کے ہاتھ سے نکل کر دیوار سے ٹکرائی۔ اس کے ہاتھ پر بھی چوٹ آئی تھی۔ اس نے چلا کر گالی دی۔ اپنی گالیوں سے وہ نہایت تھرڈ کلاس آدمی لگ رہا تھا۔ کوئی مہذب اور تعلیم یافتہ شخص ہنگامی حالات میں بھی ایسی گالیاں نہیں دیتا ہے۔ اس نے مجھے جوابی لات مارنے کی کوشش کی لیکن اس معاملے میں وہ اناڑی تھا۔ اس کا پاؤں بے تکے پن سے مجھے لگا اور میرے حواس بحال ہو گئے تھے اس لیے میں نے اسے بتایا کہ جوتے کے بعد لات کیسے مارتے ہیں۔ چند ٹھوکریں کھانے کے بعد اس نے ہتھیار ڈال دیے تھے اور چلانے لگا۔ ”مجھے مت مارو۔“

پتلون کی آگ بھی بجھ رہی تھی میں نے ایک ہاتھ سے رائفل اور دوسرے سے افنان احمد کے سفید بال پکڑے اور اسے کھینچ کر تہ خانے سے باہر لانے لگا۔ وہ تکلیف سے چلا رہا تھا لیکن میں نے ذرا رحم نہیں کھایا تھا۔ اس نے ہمارے ایک ساتھی کو سفاکی سے قتل کیا تھا اور مجھے مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ وہ کسی صورت رحم کا مستحق نہیں تھا۔ اوپر لا کر میں نے اسے کچن کے فرش پر پٹخ دیا اور وہاں کی لائٹس جلائیں۔ جیب سے موبائل نکال کر عبداللہ سے کہا۔ ”کہاں ہو تم... حالات میرے قابو میں ہیں؟“

”میں بس پہنچ گیا ہوں۔“

”گیٹ سے اندر آ جاؤ... یہاں ایک بری خبر بھی ہے۔“

”اشفاق کے بارے میں۔“ اس نے اپنے آدمی کا نام لیا۔

”ہاں اگر وہی ہے تو شاید وہ زندہ نہیں ہے، اس خبیث نے اسے میری نظروں کے سامنے گولی ماری تھی۔“

خود کار رائفل کے سامنے افنان احمد اپنی ساری چالاکی بھول گیا تھا اور بالکل کتے کی دم کی طرح سیدھا پڑا تھا۔ اسے سیدھا کرنے والی نلکی میرے ہاتھ میں تھی۔ ابھی اس سے پوچھ گچھ کا وقت نہیں آیا تھا۔ دو منٹ بعد عبداللہ وہاں پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ اس کے دو آدمی اور تھے، دو باہر تھے۔ میں نے انہیں تہ خانے میں بھیجا کہ وہ اپنے ساتھی کو دیکھیں اور انہوں نے فوری اطلاع دی کہ وہ زندہ تھا اگرچہ اس کی حالت نہایت تشویش ناک تھی۔ عبداللہ نے اسے فوری طور پر دو آدمیوں کے ہمراہ اسپتال بھجوا دیا۔ اس دوران میں عبداللہ کے آدمیوں نے کوٹھی کی تلاشی لے لی تھی وہاں سوائے افنان احمد کے اور کوئی نہیں تھا۔ مانی کو بھی اندر بلا لیا تھا۔ افنان احمد خاموش اور متفکر تھا۔ اسے معلوم تھا جلد بدیر اسے ہماری تفتیش یا انتقامی کارروائی کا نشانہ بننا پڑے گا۔ ان تمام کاموں سے نمٹ کر جب ہم اسے تہ خانے میں لے جانے لگے تو وہ گڑگڑانے لگا۔

”خدا کے لیے مجھ پر تشدد مت کرنا تم جو پوچھو گے میں بتا دوں گا۔“

اس وقت رحم کی اپیل کرنے والے کی درندگی اس وقت کھل کے سامنے آئی جب تہ خانے میں دوسرا انرجی سیور لگایا اور ہمیں وہاں کا معائنہ کرنے کا موقع ملا۔ اس نے اشفاق کے کپڑے اتار دیے تھے اور اسے رسیوں سے باندھ کر تشدد کا نشانہ بنا رہا تھا۔ اشفاق نے موقع پا کر کسی طرح سے رسیاں کھول لیں اور فرار کی کوشش کی لیکن افنان احمد نے اس کی یہ کوشش ناکام بنا دی۔ وہ اسے کھینچتا ہوا تہ خانے تک لایا تھا اور فرش پر اس کے خون کے نشانات تھے۔ عبداللہ نے اسے کسی نجی اسپتال میں بھجوایا جس کا مالک جان پہچان والا تھا۔ وہ پولیس کو اطلاع کرنے سے گریز کرتا۔ ہم نے افنان احمد کے دونوں ہاتھ پشت پر باندھے اور پھر ان ہاتھوں سے رسی باندھ کر اسے چھت کے پنکھا لٹکانے والے فولادی کڑے سے گزارا۔ افنان احمد بدستور انڈر ویئر میں تھا۔ وہ اتنا تو سمجھ گیا تھا کہ ہمارا تعلق کسی ایجنسی سے نہیں تھا ورنہ ہم اسے ساتھ لے جاتے یہیں تفتیش نہ شروع کر دیتے۔

اس نے وضاحت کرنے کی کوشش کی۔ ”سنو، مجھے تمہارا آدمی مشکوک لگا تو میں نے اسے پکڑ لیا۔“

”کیسے... وہ اتنی آسانی سے قابو میں آنے والا نہیں تھا۔“ میں نے رسی کھینچی تو افنان احمد کے بازو اوپر ہوئے تھے۔ اس نے جلدی سے کہا۔

”میں نے عقب سے جا کر اسے قابو کیا تھا۔“

باقی سب میرے علم میں تھا وہ یقیناً اس سے ہمارے بارے میں پوچھ رہا ہو گا۔ اشفاق کے جسم پر تشدد کے نشانات تھے۔ اس نے اشفاق کو قتل کرنے کی کوشش کر کے اپنی سزا خود منتخب کر لی تھی اور اسے چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن پہلے میں جاننا چاہتا تھا کہ یہ کیا چکر تھا۔ وہ اچھے خاصے شریف اور مہذب آدمی کے لبادے میں اتنا ہی بڑا بدمعاش نکلا تھا۔ اس کا مطلب تھا اس نے پہلے جو بتایا تھا وہ سب جھوٹ تھا۔ عبداللہ کے آدمی اوپر چلے گئے تھے۔ انہیں کوٹھی کے چاروں طرف نظر رکھنے کو کہا۔ مانی کو کچن میں چائے کافی تیار کرنے پر مامور کر کے میں ایک کرسی سمیت نیچے آیا۔ اس دوران میں عبداللہ اس سے تفتیش کر رہا تھا اور وہ شرافت سے اس کے سوالوں کا جواب دے رہا تھا۔ ان سوالوں کا تعلق اشفاق سے تھا۔ اس نے کہا کہ اس نے بے ساختہ گولی چلائی تھی۔ اس کا ارادہ قتل کرنے کا نہیں تھا۔ یہ کہتے ہوئے وہ بھول گیا کہ اس نے کتنی گولیاں مجھے قتل کرنے کے ارادے سے چلائی تھیں۔ اب رسی میں نے سنبھال لی اور اسے ذرا کھینچتے ہوئے پوچھا۔ ”افنان احمد اب بتاؤ یہ کیا چکر ہے؟“

”کیسا چکر؟“ وہ انجان بنا۔

”یہ کہ تم تو ایک شریف آدمی تھے اور اپنے بیٹے کے پاس امریکا جا رہے تھے۔ یہ اچانک تم اتنے بڑے بدمعاش کیسے نکل آئے کہ ایک تربیت یافتہ گارڈ پر قابو پا لیا اور اسے اپنی قید میں رکھ کر پوچھ گچھ کرنے لگے۔ پھر تم نے اسے گولی ماری اور مزید یہ کہ نہایت چالاکی سے مجھے پکڑ کر قتل کرنے کی پوری کوشش کی۔ ظاہر ہے یہ سارے کام کوئی عام آدمی نہیں کر سکتا ہے اس لیے تم اپنی اصلیت آسانی سے اگل دو۔“

”ورنہ ہم مشکل سے اگلوا لیں گے۔“ عبداللہ نے کہا۔

”پہلے تو اس کوٹھی کو کرائے پر دینے کی وجہ بتاؤ۔“

”یہ میری کوٹھی ہے اور میں کرائے پر دینا چاہتا ہوں۔“ وہ بولا تو اس کے لہجے کی کمزوری نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے عبداللہ سے کہا۔

”ذرا اس سے تفتیش جاری رکھو اور اگر اس دوران میں اس کے ہاتھ اکھڑ جائیں تو کوئی مسئلہ نہیں ہے پھر ہم اسے الٹا لٹکائیں گے۔“

رسی عبداللہ کو تھما کر میں اوپر آیا اور اس بار ذرا باریک بینی سے کوٹھی کے بیڈ رومز کا جائزہ لیا۔ الماریاں اور درازیں مقفل تھیں لیکن میں نے بلا تکلف ان کے لاک توڑ دیے۔ الماریوں میں کپڑے تھے۔ ایک اندر کی دراز سے مجھے کچھ فائلیں ملیں۔ میں نے فائلوں کا معائنہ کیا تو یہ اس مکان کے کاغذات ثابت ہوئے تھے۔ کوٹھی سچ مچ افنان احمد کے نام تھی لیکن جس افنان احمد کے آئی ڈی کارڈ کی کاپی لگی تھی اس پر جو تصویر لگی تھی وہ اس شخص سے بالکل مختلف تھی جسے میں تہ خانے میں بندھا چھوڑ کر آیا تھا۔ البتہ نام اور ولدیت وہی تھی۔ ایک لمحے کو میں چکرایا کہ ایک ہی نام کے دو آدمی کیسے ہو سکتے ہیں پھر میں نے عقل کو آواز دی اور عقل نے سمجھایا کہ یہ پاکستان ہے یہاں سب ممکن ہے۔ اس کوٹھی کا اصل مالک یہ افنان احمد تھا جس کے آئی ڈی کارڈ کی کاپی لگی تھی اور دوسرے افنان احمد نے یقیناً جعلی شناختی کارڈ

بنوایا تھا۔ اب ایک سوال یہ بھی تھا کہ اس کوٹھی کا اصل مالک کہاں گیا اور جعلی افنان احمد نے دھڑلے سے جو ڈرافٹ وصول کیا تھا اس کا اس نے کیا کیا۔ یقیناً اس نے جعلی شناختی کارڈ کی بنیاد پر بنک اکاؤنٹ کھلوالیا ہوگا۔ میں فائل لے کر تہ خانے میں آیا۔ فائل دیکھتے ہی وہ سمجھ گیا تھا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

''یہ نقلی افنان احمد ہے، یہ کوٹھی اس کی نہیں ہے اور اس نے ہم سے دس لاکھ روپے وصول کر لیے۔'' میں نے عبداللہ کو مطلع کیا اور اس سے پوچھا۔ ''اصل مالک کہاں ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم اور تم مجھ سے دس لاکھ روپے حاصل نہیں کر سکتے۔'' اس نے ڈھٹائی سے کہا۔

''یہ تمہاری غلط فہمی ہے، ہم تم سے ساری عمر کا کھایا پیا بھی نکلوا سکتے ہیں لیکن ہمیں دس لاکھ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ہمارے مجرم تم ہو اور تم ہمارے ہاتھ میں ہو۔''

صورتِ حال یک دم بدل گئی تھی اور افنان احمد ایک نقلی آدمی نکلا تھا۔ اصل آدمی کہاں تھا اور عین ممکن تھا وہ پولیس لے کر نازل ہو جاتا۔ اس سے پہلے ہمارا یہاں سے نکل جانا ضروری تھا۔ ابھی میں عبداللہ سے کہنے جا رہا تھا کہ اوپر سے مانی کی چیخ سنائی دی۔ میں اوپر کی طرف لپکا مانی ڈیپ فریزر کے پاس دم بہ خود کھڑا تھا اور اس کی وجہ فریزر میں ٹھونسی ہوئی لاش تھی۔ وہ بالکل سفید اور برف سے ڈھک گئی تھی اس کے باوجود مجھے شناخت کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ اصل افنان احمد تھا۔ میں نے قریب سے لاش کا معائنہ کیا تو اس کے سینے پر عین دل کے مقام پر سوراخ تھا اسے گولی ماری گئی تھی۔ میں نے ڈیپ فریزر بند کر دیا تو مانی چونکا۔ ''جناب... لاش۔''

''ہاں یار ہمارے ساتھ رہو گے تو لاشوں سے ہی واسطہ پڑے گا حسیناؤں سے نہیں۔''

مانی نے خود پر قابو پالیا تھا۔ ''میں چائے کے لیے دودھ تلاش کر رہا تھا۔''

''لعنت بھیجو چائے پر یہاں سے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کرو اور نکلنے کی کرو۔'' میں نے کہا اور تہ خانے کی طرف آیا عبداللہ کو تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ ''اس سے پہلے کہ پولیس یا اور کوئی آئے ہمیں یہاں سے نکل جانا ہوگا۔''

''اس کا کیا کریں۔''

افنان احمد نے ہمیں دیکھ لیا تھا اور وہ پولیس کے ہاتھ جاتا تو ہمارے بارے میں بتا دیتا اگرچہ ہم نے کوئی جرم نہیں کیا تھا لیکن پولیس مرشد کے اشارے پر پہلے ہی میری دشمن ہو رہی تھی، وہ اس کیس میں مجھے ملوث کر سکتی تھی اس لیے بہتر یہی تھا کہ ہم یہاں سے اپنے تمام نشانات مٹا کر نکل جاتے اور آیندہ بھی اس معاملے سے کوئی تعلق ظاہر نہ کرتے۔ گاڑی ایک ہی تھی ہم نے اسی میں بنڈل بنا کر افنان احمد کو ڈالا اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔ عبداللہ اور اس کے آدمی ایک جگہ اتر گئے تھے۔ عبداللہ کو زخمی اشفاق کی عیادت کو بھی جانا تھا اسے راستے میں اطلاع ملی تھی کہ اسے آپریشن روم میں لے جایا گیا تھا اور ڈاکٹر اس کی جان بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے دل میں اللہ سے دعا کی کہ اشفاق بچ جائے ورنہ میرے دل پر ایک بوجھ اور آ جاتا ایک اور انسان میری خاطر جان سے جاتا۔ عبداللہ نے کہا تھا کہ وہ گمنام کال کر کے پولیس کو اس قتل کی اطلاع کر دے گا۔ میں مانی اور افنان احمد کے ہمراہ حویلی کی طرف روانہ ہو گیا۔

رات کے ساڑھے گیارہ بجے ہم حویلی تک پہنچے۔ مین روڈ سے لائٹ بند کر کے گاڑی حویلی کے عقبی حصے تک لایا تا کہ آس پاس روشنی نمایاں نہ ہو۔ وسیم کے آدمی مستعد تھے انہوں نے گاڑی پہچاننے کے باوجود گاڑی کے اندر روشنی ڈال کر دیکھا اور جب میری صورت دیکھی تو مطمئن ہو گئے۔ میں نے گاڑی روکی اور افنان احمد کے بارے میں ہدایت کی کہ اسے تہ خانے میں پہنچا دیا جائے لیکن دوسروں سے الگ رکھا جائے۔ مانی حویلی کے ماحول اور تاریکی سے کسی قدر ڈرا ہوا تھا لیکن جب ہم اندر آئے اور اسے وسیم کی صورت دکھائی دی تو اس نے سکون کا سانس لیا اس نے جاتے ہی وسیم سے شکایت کی۔ ''آج تو بس اللہ نے بچا لیا ورنہ شوبی بھائی نے مروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔''

''بیٹے یہ تمہاری غلط فہمی ہے جب میں نے مروانا چاہا تو بچو گے نہیں۔''

میں جوتے اتار کر قالین پر دراز ہو گیا۔ وسیم اچانک مجھے ایک قیدی سمیت دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ لیکن سوال جواب سے پہلے اس نے ہمارے لیے چائے منگوائی، ساتھ میں کلیجے بھی تھے۔ مانی نے بھوک نہ ہونے کے باوجود ان سے پورا انصاف کیا۔ میں وسیم کو روداد سنانے لگا۔ جو اگرچہ خاصی المناک تھی لیکن وسیم اور مانی دل کھول کر ہنسے تھے



خاص طور سے جوتوں کو بہ طور ہتھیار استعمال کرنے کا آئیڈیا انہیں بہت پسند آیا تھا۔ وسیم نے کہا۔

''یہ شخص اسی قابل ہے اسے جوتے سے مارا جائے۔''

''یہ سزائے موت کے قابل ہے۔ اس نے کم سے کم ایک شخص کو قتل کیا، ایک پر اقدامِ قتل کیا اور ایک کو قتل کرنے کی پوری کوشش کی۔''

''اس کے علاوہ اس نے دھوکا کیا، کسی کا مکان کسی دوسرے کو کرائے پر دے دیا اور اس سے سال بھر کی رقم وصول کر لی۔'' مانی نے کہا پھر میری طرف دیکھا۔ ''فارم ہاؤس نہیں چلنا ہے آج مجھے بہت کام کرنا ہے۔''

''چلتے ہیں۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''ذرا فاضلی سے تو ملاقات کر لیں دیکھیں وہ کس حال میں ہے۔''

وسیم مسکرایا اور آغا حشر کے انداز میں کہا۔ ''شیر لوہے کے جال میں ہے۔''

مانی نے ناک سکیڑ کر کہا۔ ''آپ اسے شیر کہہ رہے ہیں جسے شوبی چوہے کی طرح پکڑ کر لے آئے۔''

''اس وقت تو تقریباً چوہا بن گیا ہے۔'' وسیم ہنسا۔ ''آئیں اس کے ڈوز کا وقت ہو گیا ہے ذرا اس کی حالت دیکھیں۔''

''ابھی تک اس سے کوئی پوچھ گچھ نہیں کی ہے؟''

''نہیں، میں نے سوچا کہ آپ کی بات درست ہے، ہر آدمی کی قوتِ ارادی مختلف ہوتی ہے۔ آج اسے چار دن ہو چکے ہیں۔ کل تک اسے ہر آٹھ گھنٹے بعد دے رہے تھے لیکن آج صبح دیا تھا اور اس کے بعد سے اب تک نہیں دیا ہے۔''

میں وسیم اور اس کے ایک آدمی کے ساتھ نیچے تہ خانے میں آیا جہاں فاضلی ایک ستون کے ساتھ زنجیر سے بندھا ہوا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ بھڑکا اور میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا صرف چار دن میں اس کی قابلِ رشک صحت افسوسناک ہو گئی تھی۔ اس کا چہرہ ست گیا تھا اور شانے ڈھلک گئے تھے میں نے وسیم کی طرف دیکھا۔ ''کیا اسے کھانا نہیں دیتے؟''

''دیتے ہیں لیکن یہ کھاتا نہیں ہے اسے تو بس ایک ہی چیز کی طلب ہے۔ اس نے صبح مشکل سے آدھی روٹی چائے کے ساتھ کھائی تھی لیکن اب بھی یہ کھانا نہیں مانگے گا۔'' وسیم نے اپنے آدمی کی طرف دیکھا تو اس نے ایک سرنج نکالی۔ فاضلی جو اب تک متوقع نظروں سے ہماری

## جے ایف 17 تھنڈر

پاکستان اور چین کے باہمی اشتراک سے تیار کیا جانے والا جیٹ طیارہ۔ یہ طیارہ ایٹمی ہتھیاروں سمیت ہر قسم کے روایتی اور غیر روایتی ہتھیاروں کو گرانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ کم وزن طیارہ ہے، جو ہر قسم کے موسموں میں پرواز کا اہل اور کثیر المقاصد خصوصیت کا حامل ہے۔ یہ طیارہ 106 میل کی رفتار سے پرواز کر سکتا ہے اور کسی بھی رفتار اور بلندی پر اپنے ہدف کو سو فیصد نشانہ بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس طیارے میں جدید ترین فلائٹ کنٹرول سسٹم نصب ہے اور اس میں ایوانکس کا جدید ترین سسٹم نصب کرنے کی بھی گنجائش رکھی گئی ہے۔

اس طیارے کو ہائی اور لوگریڈ (Low Grade) لیزر گائیڈ بم، پینی ٹریشن بم (penetration Bomb) اور کلسٹر بموں سے بھی مسلح کیا جا سکتا ہے، نیز اس طیارے کو بھارت میں تیاری کے مراحل سے گزرنے والے ایل سی اے پر بھی برتری حاصل ہے۔

2003 میں جے ایف 17 تھنڈر جیٹ کی پہلی باقاعدہ آزمائشی پرواز کامیاب رہی۔ آزمائشی پرواز چین کے صوبے سی شوان میں کی گئی۔ پہلی پرواز 8 منٹ پر محیط تھی۔ پرواز کے دوران 6 ماڈل میزائل بھی جے ایف 18 تھنڈر کے پروں کے نیچے نصب تھے۔ فائٹر جہاز میں جدید ترین ٹیکنالوجی استعمال کی گئی ہے اور یہ ایف 16 سے بہتر طیارہ ہے۔ اس کی محدود پیمانے پر تیاری جون 2004ء میں شروع کی گئی جب کہ پروڈکشن 2006ء میں شروع ہوئی۔ 2004ء میں پاکستان کے دو پائلٹوں نے چین کے شہر چنگ دو میں پہلی مرتبہ جے ایف 17 تھنڈر جیٹ طیارے کی آزمائشی پروازیں کیں، جس سے اس طیارے کی اعلیٰ کارکردگی کا ایک مرتبہ پھر یقین ہو گیا۔

مرسلہ: صدیق صدیقی، کراچی

طرف دیکھ رہا تھا سرنج پر نظر پڑتے ہی بے تاب ہو گیا۔ اس نے تقریباً گڑگڑا کر کہا۔

”یہ مجھے لگا دو... خدا کے لیے لگا دو۔“

اگرچہ یہ تجویز میں نے ہی دی تھی لیکن فاضلی کی حالت دیکھ کر بھی مجھے یقین نہیں آیا تھا۔ میں نے وسیم کی طرف دیکھا۔ ”کیا یہ واقعی عادی ہو گیا ہے؟“

”شہباز صاحب ہیروئن بڑی ظالم چیز ہے۔ یہ مضبوط سے مضبوط آدمی کی قوتِ ارادی یوں فنا کرتی ہے کہ وہ اس نام کی چیز کو بھول جاتا ہے۔ میں نے اس تباہ کن چیز کو قریب سے دیکھا ہے اللہ کا شکر ہے میں اس کے دھندے میں نہیں پڑا۔ جب میں نے اس کے اثرات دیکھے تو مجھے اسی وقت اس چیز سے نفرت ہو گئی تھی۔ اس نے نئی پاکستانی نسل کو ایک زمانے میں تباہ کر دیا تھا اب بھی اس کے اثرات موجود ہیں۔“

فاضلی کو خالص ہیروئن کے انجکشن دیے جا رہے تھے اور چار دن میں وہ اس کا عادی ہو گیا تھا۔ ہیروئن نے اس کے سسٹم پر اس طرح قبضہ جما لیا تھا کہ اب وہ اس کے بغیر رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ انجکشن دیکھ کر وہ جس طرح بھڑکا تھا اس سے اس کی طلب واضح تھی۔ میں نے کہا۔ ”فاضلی تمہیں یہ انجکشن چاہیے؟“

”ہاں پلیز یہ مجھے دے دو، میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

”یہ تمہیں مل جائے گا لیکن پہلے تمہیں ہمارے سوالوں کے جوابات دینا ہوں گے۔“

”میں دوں گا تم جو پوچھو گے وہ بتاؤں گا... مرشد کے بارے میں ... میرے بارے میں... میرے باپ کے بارے میں... میری ماں سمجھتی ہے میں اپنے اصل باپ کے بارے میں نہیں جانتا... لیکن وہ بے وقوف ہے... مجھے تب ہی پتا چل گیا تھا جب مجھے پتا چلا تھا کہ انسان باپ کیسے بنتا ہے۔“

ہم نے حیرت سے اس کی بات سنی۔ وسیم نے کہا۔ ”تمہارا اصل باپ کون ہے؟“

”مرشد۔“ اس نے عجیب سے انداز میں ہنس کر کہا۔ ”میری ماں اس کی خادمہ تھی اور معمولی شکل صورت کی تھی اس لیے میرے باپ کو کبھی خدشہ نہیں ہوا تھا۔ مگر اسے نہیں معلوم تھا میری ماں اسے دھوکا دے کر مرشد کی خواب گاہ میں جاتی تھی۔“

ہم سب ہی دم بہ خود رہ گئے تھے۔ بعض اوقات آدمی اپنے بارے میں کیسے سچ اگلتا ہے اس نے خود کبھی اس بارے میں نہیں سوچا ہوتا ہے۔ فاضلی نے بھی نہیں سوچا ہو گا کہ کبھی اسے اس طرح سچ بولنا پڑے گا یا اس کے منہ سے اس کی ذات کا نازک ترین سچ نکل جائے گا۔ فاضلی گڑگڑایا تو ہم چونکے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”اب تو دے دو... میں اس کے لیے مر رہا ہوں۔“

میں نے وسیم کے آدمی کی طرف دیکھ کر سر کو جنبش دی تو اس نے آگے بڑھ کر پہلے فاضلی کے بازو پر ربڑ کی پٹی اور پھر اس کی نس ابھار کر اس میں سرنج اتار دی۔ جیسے ہی ہیروئن فاضلی کے خون میں شامل ہوئی اس کے چہرے پر سکون کے تاثرات نظر آنے لگے۔ انجکشن لگتے ہی وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا اور ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا پھر اس نے میری طرف دیکھا اور بوجھل لہجے میں بولا۔ ”شہباز ملک... سچ سن لیا نا... جب مجھ سے کچھ پوچھنا ہو تو انجکشن لے کر آ جانا میں اس وقت سچ کے سوا کچھ نہیں... کہوں گا۔“

مجھے اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔ جب میرے ذہن میں یہ خیال آیا اور میں نے فاضلی کے حوالے سے وسیم کو اس پر عمل کرنے کا کہا تو اس وقت میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ چیز اتنی موثر ثابت ہو گی۔ ہیروئن کا نشہ آدمی کو کس طرح اپنے قابو میں کرتا ہے اس کا اندازہ مجھے فاضلی کی حالت دیکھ کر ہو رہا تھا۔ ایک انجکشن کے لیے اس نے وہ راز کھول دیا جو شاید وہ اپنے سائے سے بھی چھپاتا ہو گا۔ وسیم نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا تو میں چونکا۔ میں جذباتی ہو رہا تھا۔ فاضلی میرا بدترین دشمن تھا اور دشمن کے خلاف ہر حربہ جائز تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”فاضلی اس سے پہلے تم بیکار ہو جاؤ میرے ایک سوال کا جواب اور دو۔“

”پوچھو۔“ اس بار اس نے ذرا مشکل سے کہا ہیروئن کا نشہ اس کے دماغ پر غالب آ رہا تھا۔

”مرشد یہ بات جانتا ہے؟“

فاضلی مسکرایا۔ ”اگر وہ یہ بات جانتا تو کیا میں اب تک زندہ ہوتا۔ وہ بوجھ پالنے والوں میں سے نہیں ہے۔“

”تم نے اپنے گھر والوں کا حوالہ دیا تھا کہ مرشد انہیں نہیں بخشے گا۔ کیا تمہارے بہن بھائی ہیں۔“

”ماں باپ اور بہن بھائی کو میں بہت پہلے چھوڑ چکا ہوں ان سے میرا کوئی رشتہ ناتا نہیں ہے۔“





”تب تمہارے بیوی بچے ہوں گے۔“

اس نے بہ مشکل سر ہلایا اور پھر ستون سے ٹکا دیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ گہری نیند میں جا چکا ہو در حقیقت نشے نے اس کا ذہن ماؤف کر کے اسے سوچنے سمجھنے کے قابل ہی نہیں چھوڑا تھا۔ میں اور وسیم اس سے ذرا دور گئے تو وسیم نے کہا۔ ”یہ بہت عیار شخص ہے نشے نے اس کی قوتِ ارادی کو شکست دی ہے اس کی عیاری ختم نہیں ہوئی ہے۔“

”تم نے ٹھیک کہا اس سے پوری طرح ہوشیار رہنا اور اب ہیروئن کی مقدار کم کر دو جب یہ بالکل پاگل ہونے لگے تب ہی اسے ہیروئن دینا۔“

افنان احمد اسی تہ خانے کے ایک حصے میں بندھا ہوا تھا اور اس کے جسم پر وہی انڈرویئر تھی۔ اب اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ ہم کیا تھے اور وہ کن لوگوں سے ٹکرانے کی کوشش کر بیٹھا تھا۔ اس کی اکڑفوں تمام ہو گئی تھی اور ہمیں دیکھتے ہی اس نے گڑگڑانا شروع کر دیا۔ ”دیکھو تم جو پوچھو گے میں سچ سچ بتاؤں گا بالکل جھوٹ نہیں بولوں گا... بس تم مجھے مارنا مت۔“

میں نے اس عیار شخص کی چالاکی کا جواب چالاکی سے دینے کا فیصلہ کیا اور اس سے کہا۔ ”ٹھیک ہے اگر تم رہائی چاہتے ہو تو ہر سوال کا درست جواب دینا اور یہ سوچ کر دینا کہ ہم تصدیق کریں گے سو میں سے ایک غلط جواب تمہیں معافی سے محروم کر دے۔“

”خدا کی قسم میں ذرا بھی جھوٹ نہیں بولوں گا۔“

میں نے اس کے چہرے پر نظر جما کر کہا۔ ”سب سے پہلے تو اس چکر کی وضاحت کرو۔ تم نے اصل افنان احمد کو کیوں قتل کیا اور اس کے نام اور ولدیت پر مبنی جعلی شناختی کارڈ کیوں بنوایا۔ ویسے یہ بتا دوں کہ میں سمجھ گیا ہوں صرف تمہارے منہ سے سننا چاہ رہا ہوں۔“

اس نے بادلِ ناخواستہ کہنا شروع کیا۔ ”یہ میرا اور منور کا کھیل ہے۔ ہم بڑی کوٹھیوں کے مالکوں کے نام سے جعلی شناختی کارڈ بنواتے ہیں اور پھر ان سے بینک اکاؤنٹ کھلواتے ہیں۔ اس کے بعد ہم کوٹھی کو کرائے پر دینے یا فروخت کرنے کا اشتہار دیتے ہیں جیسے ہی پارٹی لگتی ہے اصل مالک کو اپنے قبضے میں کر لیتے ہیں۔“

”قبضے میں کر لیتے ہو یا اسے دوسری دنیا روانہ کر دیتے ہو۔“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”تم نے جلیل خانزادہ کا اصل نام بتا دیا تمہارا اصل نام کیا ہے؟“

## چودھری شجاعت حسین

معروف سیاست دان، صنعت کار۔ وہ ممتاز سیاسی رہنما چودھری ظہور الٰہی کے فرزند ہیں۔ انہوں نے گجرات میں آنکھ کھولی۔ وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ایف سی کالج لاہور سے 1967ء میں بی اے کیا پھر صنعتی شعبے میں تربیت حاصل کرنے کے لیے انگلستان کا رخ کیا۔ وہاں سے انہوں نے انڈسٹریل مینجمنٹ میں ڈپلوما لیا۔ پہلی مرتبہ 1977ء کے انتخابات میں پاکستان قومی اتحاد کے امید وار نامزد ہوئے۔ 1985ء، 1988ء، 1997ء اور 2002ء کے عام انتخابات میں مسلم لیگ کی جانب سے پانچ مرتبہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ 1982ء میں کوریا کی حکومت نے انہیں اعزازی قونصل جنرل نامزد کیا۔ صدر جنرل محمد ضیاء الحق کے دورِ حکومت میں 1982ء سے 1985ء تک مجلسِ شوریٰ کے رکن رہے۔ 2 جنوری 1986ء سے 20 دسمبر 1986ء تک وزیرِ اطلاعات اور 1987ء سے 1988ء تک وزیرِ صنعت رہے۔ میاں نواز شریف کے پہلے دور میں 1990ء سے 1993ء تک وزیرِ داخلہ، 1993ء تا 1997ء سینیٹ کے رکن رہے اور دوسرے دور میں 1997ء تا 1999ء وزیرِ داخلہ اور نارکوٹکس کنٹرول کے وزیر بنے۔ دسمبر 2002ء میں قومی اسمبلی میں مسلم لیگ (ق) کے پارلیمانی لیڈر منتخب ہوئے جب کہ جنوری 2003ء میں انہیں مسلم لیگ (ق) کا صدر اور جون 2004ء میں انہیں متحدہ مسلم لیگ کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ وزیرِ اعظم میر ظفر اللہ جمالی مستعفی ہوئے تو انہیں وزیرِ اعظم کے عہدے پر نامزد کیا گیا اور جون 2004ء میں پاکستان کا وزیرِ اعظم منتخب کر لیا گیا۔ 30 جون 2004ء کو چند مہینے وزیرِ اعظم رہنے کے بعد شوکت عزیز کے وزیرِ اعظم بننے کے حق میں دستبردار ہو گئے۔

مرسلہ: تہمینہ پروین، لاہور

"میرا نام ریاض شاہ ہے۔" اس نے یوں تیزی سے کہا جیسے نام پہلے سے سوچ کر رکھا ہوا تھا سوال کرتے ہی بتا دے۔

"تو تم نے اصل مالک افنان احمد کو قتل کر دیا اور اس کی لاش اس کے اپنے گھر کے ڈیپ فریزر میں ڈال دی اس سے تمہارا کیا مقصد تھا؟"

"ہم اسے قتل کرنا نہیں چاہتے تھے لیکن اس نے مزاحمت کی تو ہمیں گولی چلانی پڑی اور وہ مر گیا۔ ہم اس کی لاش کہیں لے جا نہیں سکتے تھے اس لیے وہیں ڈیپ فریزر میں ڈال دی۔"

"تاکہ جب کرائے دار آئے اور وہ بے چارہ دیکھے تو مصیبت میں پڑ جائے۔ اگر پولیس کو اطلاع دیتا ہے تب بھی مشکل میں پڑے گا اور اگر لاش چھپانے کی کوشش کرے گا تب بھی پکڑا جائے گا۔ یہ بتاؤ کہ دس لاکھ کہاں ہیں مسٹر..." کیا نام بتایا تھا؟"

"ایاز..." وہ روانی میں کہتے کہتے رکا۔ "ریاض شاہ۔"

میں نے وسیم کی طرف دیکھا۔ "یہ جھوٹ بول رہا ہے اور ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اسے سمجھاؤ کہ ہمیں بے وقوف بنانے کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔"

وسیم سمجھ گیا اس نے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "آپ فکر نہ کریں یہ بتائیں پہلے کیا کرنا ہے۔"

"پہلے اس سے اس کے ساتھی کے بارے میں معلوم کرو اور دس لاکھ روپے نکلواؤ اس کے بعد دیکھیں گے۔"

جعلی افنان احمد کا چہرہ پھر سفید پڑ گیا تھا وہ سمجھ گیا کہ ہم فی الحال اسے چھوڑنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ وہ پھر رونے گڑگڑانے لگا مگر ہم اس پر توجہ دیے بغیر باہر آ گئے۔ وسیم نے پھر پوچھا۔ "اس کا بعد میں کیا کرنا ہے؟"

"ویسے یہ شخص اس قابل نہیں ہے کہ اسے چھوڑا جائے لیکن پولیس میں دینے سے الٹا ہمارے لیے مسائل کھڑے ہوں گے اس لیے معاملے کو خاموشی سے نمٹانا ہی بہتر رہے گا۔ پہلے تو اس سے اس کے کرتوت اگلواؤ۔"

"فاضلی والا نسخہ نہ استعمال کریں اس میں نہ ہینگ لگے گی اور نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا آئے گا۔"

میں ہنسا۔ "تم آج کل بامحاورہ اردو بولنے لگے ہو۔"

"یہ سب مطالعے کا نتیجہ ہے۔" وسیم نے دانت نکالے۔ "آج کل فرصت زیادہ ہے اس لیے پڑھنے میں وقت گزرتا ہے۔"

"برادر خورد کا کیا حال ہے۔"

"دہشت سے برا حال ہے۔ وہ سمجھ رہا ہے کہ کسی ایجنسی نے اسے اٹھایا ہے۔ جب اس حیثیت کا آدمی اتنا ڈرتا ہے تو سوچا جا سکتا ہے کہ عام آدمی کا کیا حال ہوگا۔"

"مرشد کے بارے میں کیا اگلا ہے؟"

"کچھ خاص نہیں وہی پرانی باتیں ہیں۔"

"وسیم پرانی اور نئی باتیں ہماری لیے بیکار ہیں اصل میں ہمیں مرشد کے تمام ٹھکانوں کا پتا چلانا ہے اور اس کے تمام دھندوں کے بارے میں جاننا ہے اس کے بعد اس کے خلاف کارروائی کرنی ہے۔ تم فاضلی اور نادر سے پوچھ گچھ میں زیادہ فوکس اسی بات پر رکھو۔"

وسیم نے سر ہلایا اور پھر بولا۔ "میرا تو مشورہ ہے آپ اور مائی بھی یہیں آ جائیں۔ فارم ہاؤس صابر کی وجہ سے بیکار ہو جائے گا اور کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ ویسے بھی اس معاملے کی وجہ سے خطرہ پیدا ہو گیا ہے اس کے ساتھی کے پاس آپ کے آئی ڈی کارڈ کی کاپی سمیت کرائے داری کا معاہدہ موجود ہے۔ اگر اس نے سامنے آئے بغیر پولیس کے حوالے کر دیا تو آپ کے لیے مزید مشکلات کھڑی ہو جائیں گی۔ پولیس نیا کیس بنا دے گی۔"

میں نے اس کی بات پر غور کیا اور اتفاق کیا۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں کل یہاں آ جاتا ہوں مائی اور بیتو ایاز کے ساتھ حویلی جائیں گے۔ ہم فارم ہاؤس خالی کر دیتے ہیں۔"

"سفیر اس اسٹیٹ ایجنٹ کو اطلاع کر دے گا جس سے یہ فارم ہاؤس لیا تھا وہ خود آ کر قبضہ لے لے گا۔"

وسیم کے دو ساتھیوں اور ایک گاڑی سمیت ہم فارم ہاؤس پہنچے۔ رات کے دو بج رہے تھے اور سب کا تھکن سے برا حال تھا لیکن یہاں سے اپنا سامان سمیٹنا تھا۔ مائی نے نگرانی کے تمام آلات، کمپیوٹرز اور انٹرنیٹ سے متعلق چیزیں پیک کر کے وسیم کے آدمیوں کے حوالے کیں وہ انہیں لے کر رخصت ہو گئے۔ کچھ چیزیں تھیں جیسے ذاتی سامان اور رقم والا سوٹ کیس وہ میں نے اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا۔ میری حویلی جانے والا سامان ایاز کی جیپ میں منتقل کر دیا گیا تھا اور طے ہوا تھا کہ وہ صبح ہوتے ہی روانہ ہو جاتے۔ ایاز کام مکمل ہونے کے بعد انہیں واپس لے کر آتا۔ صبح چار بجے ہم فارغ ہوئے تو سب نے تھوڑی دیر



کے لیے آنکھ جھپک لی۔ سات بجے سب اٹھ گئے تھے۔ ایاز، بیتو اور مائی فوری روانہ ہو گئے انہوں نے ناشتا بھی راستے میں کرنا تھا۔

میں صابر کے کمرے میں آیا اس کی حالت خاصی بہتر ہو رہی تھی اور اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ "تم کیوں دیر کر رہے ہو مجھے جانے دو ورنہ تاخیر سے معاملہ خراب ہوا تو تم مجھے الزام نہیں دے سکو گے۔"

"فکر مت کرو اور تیار ہو جاؤ ہم یہاں سے نکل رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ تمہیں کہاں چھوڑیں؟"

اس نے سوچ کر کہا۔ "مجھے کسی ایسی جگہ چھوڑ دو جہاں سے میں مظفر آباد جانے والی گاڑی پکڑ سکوں۔"

اس کے پاس رقم تھی اور سامان بھی تھا میں نے اسے ایک چھوٹا بیگ دیا جس میں اس نے اپنی ساری چیزیں منتقل کیں۔ اس نے اسلحے کا مطالبہ بھی کیا لیکن میں نے اسے ٹال دیا۔ اس کا ایک عدد پستول اور چھوٹی شاٹ گن میرے پاس تھی۔ سارا اسلحہ وسیم کے آدمی لے جا چکے تھے ان میں صابر کا اسلحہ بھی تھا۔ وہ اسی میدان کا کھلاڑی تھا اور اسلحہ حاصل کرنا اس کے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ میں اسے لے کر نکلا تو دھوپ نکھر چکی تھی۔ میں نے فارم ہاؤس بند کر کے اس کی چابیاں پورچ میں رکھے ایک گملے تلے رکھ دیں اور پھر سفیر کو کال کر کے اس کے بارے میں بتا دیا۔ اس نے پوچھا۔ "تو کہاں جا رہا ہے؟"

"اپنے صابر بھائی کو ڈراپ کر کے بڑے گھر جاؤں گا اب اور کہیں ٹھکانا رہا ہے۔" میں نے صابر کی موجودگی میں حویلی کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

"تو خوش رہو میں اسٹیٹ ایجنٹ کو مطلع کرتا ہوں وہ خوش ہو جائے گا پورے سال کا کرایہ وصول کر چکا تھا اور اب فارم ہاؤس دوبارہ مل جائے گا وہ مالکوں کو بتائے بغیر کسی کو دے کر باقی کرایہ اپنی جیب میں ڈالے گا۔"

"ہماری بلا سے یار... ہمارا کام تو نکل گیا نا۔"

"یہاں اچھا وقت گزرا تھا۔"

"اچھا برا وقت انسانوں کے ساتھ گزرتا ہے جگہوں کے ساتھ نہیں اور اپنے سارے ہمارے پاس ہیں۔" میں نے کہا اور موبائل بند کر دیا۔ صابر خاموشی سے سن رہا تھا اس نے میری طرف دیکھا۔

"تم میری وجہ سے یہ ٹھکانا چھوڑ رہے ہو کہ میں نے اس جگہ کو دیکھ لیا ہے۔"

"یہ احتیاط کا تقاضا ہے، آزاد ہونے کے بعد ہو سکتا ہے کہ تمہاری نیت بدل جائے لیکن زیادہ امکان اس کا ہے کہ تم مرشد کے ہتھے چڑھ جاؤ اور ہمارے بارے میں سب بک دو۔ لیکن اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا تم شوق سے کسی کو بتاتے پھرو۔ ہم یہ جگہ خالی کر چکے ہیں اب یہاں کوئی نہیں ملے گا۔"

"میں کسی کو نہیں بتاؤں گا اور اب مرشد کے کتے بھی مجھ سے کچھ اگلوا نہیں سکتے ہیں۔"

"ایسا مت کہو..." آج کل تشدد کا فن سائنس کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ مضبوط سے مضبوط آدمی بھی ٹوٹ جاتا ہے۔" میں نے کہا تو مجھے فاضلی کا خیال آیا۔ اگر ہم اس پر تشدد کرتے تو شاید وہ مر جاتا لیکن ہمیں کچھ نہ بتاتا اور ہمیں بھی ذہنی کوفت سے گزرنا پڑتا۔ ظاہر ہے ہم درندے نہیں تھے جو کسی کو اذیت دے کر لطف اندوز ہوتے۔ ہیروئن والا طریقہ نہایت موثر رہا تھا اور فاضلی جیسا آدمی بھی ہمارے آگے جھک گیا تھا۔ "اب ایسے طریقے آ گئے ہیں کہ پوچھنے والے تمہیں انگلی بھی نہیں لگائیں گے اور تم فرفر سب اگلتے جاؤ گے۔"

"سنو تم لوگ شازیہ کا خیال رکھو گے نا؟" اس نے لجاجت سے کہا۔ "اگر میں ناکام رہا تو سزا صرف مجھے دینا۔"

"صابر، ہم لوگ انسان ہیں اور عورت کا احترام کرنا جانتے ہیں۔ ہمارے پاس تو شہلا جیسی عورت بھی بالکل محفوظ رہی تھی۔ تم شازیہ کے بارے میں بے فکر رہو۔ اسے ہم نے صرف ضمانت کے طور پر رکھا ہے۔ اگر تم نے کوئی غلط حرکت نہ کی تو وہ قطعی محفوظ رہے گی اور اگر تم نے ہمیں مجبور کیا تب بھی ہم خود کچھ نہیں کریں گے، اسے مرشد کے حوالے کر دیں گے اور تم اس کے ہاتھ سے اپنی سزا کو پہنچو گے۔"

"اس سے بہتر ہوگا تم اسے اپنے ہاتھ سے مار دو۔" صابر تلخی سے بولا۔ "کیا تم نہیں جانتے کہ مرشد اور اس کے آدمیوں کے لیے عورت کیا ہے۔"

میں نے ڈرائیو کرتے ہوئے اچانک ہی الٹا ہاتھ اس کے منہ پر مارا۔ "کیا یہ خیال تمہیں اس وقت نہیں آیا تھا جب تم شہلا کو اس کے حوالے کر رہے تھے۔"

اس نے اپنا منہ سہلایا۔ "شہلا کی بات اور تھی وہ پہلے ہی کون سی...."

"بکواس مت کرو وہ بہرحال عورت تھی، اس کے ساتھ جو ہوا اس کے اصل مجرم تم ہو اور میں نے تمہیں صرف

اس لیے رعایت دی کہ تم پہلے ہی اپنے کیے کی ٹھیک ٹھاک سزا بھگت چکے ہو۔" میں نے کہا، میرا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ صابر نے خاموش ہونے میں عافیت سمجھی تھی۔ میں نے اسے ایک ایسی جگہ اتارا جہاں سے وہ مظفر آباد جانے والی بس یا کوئی دوسری گاڑی حاصل کر سکتا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "یاد رکھنا آج کے دن سے تمہارے پاس ایک مہینے کی مہلت ہے۔ اگر تم اس دوران میں واپس نہ آئے یا تم نے رابطہ نہ کیا تو..."

"میں تم سے کیسے رابطہ کروں گا؟"

میں نے سوچا اور ایک مشہور اخبار کا نام لیا۔ "تم اس کے کلاسیفائیڈ میں صرف اپنے نام اور رابطے کے نمبر کے ساتھ اشتہار دو ہم خود تم سے رابطہ کر لیں گے اشتہار تم کسی بھی دن دے سکتے ہو۔"

"ٹھیک ہے۔"

میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ یہ سفیر کی سفاری تھی لیکن اس کی نمبر پلیٹ بدلی ہوئی تھی اس لیے اگر صابر نے نمبر نوٹ کر لیا تھا تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس ماڈل اور رنگ کی ہزاروں گاڑیاں راولپنڈی اسلام آباد میں گھوم رہی تھیں۔ گزشتہ روز سے واقعات میں بہت تیزی آئی تھی۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ افنان احمد کچھ اور نکلے گا۔ وہ اپنی شخصیت سے فائدہ اٹھاتا تھا اور لوگ آسانی سے دھوکا کھا جاتے تھے۔ وہ اور اس کا ساتھی منور مل کر نہ جانے کتنے لوگوں کے ساتھ اس طرح کے دھوکے کر چکے تھے۔ وہ ایسے دولت مندوں کو تاڑتے ہوں گے جو اکیلے ہیں اور جن کے رشتے دار ملک سے باہر ہیں پھر ان کو ٹریپ کر کے ان کی جائداد کو فروخت یا کرائے پر دینے کا چکر چلاتے تھے۔ رقم وصول کرتے تھے اور نو دو گیارہ ہو جاتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ وہ جائداد کے اصل مالکان کو قتل نہیں کرتے ہوں گے کیونکہ اس طرح بات پولیس تک جاتی۔ وہ انہیں آزاد کر دیتے ہوں گے۔ ان کا کوئی نقصان نہیں ہوتا ہو گا اس لیے وہ پولیس کے پاس جانے کی حماقت نہیں کرتے ہوں گے اور جو لٹتے ہوں گے وہ بھی زیادہ تر رو پیٹ کر صبر کر لیتے ہوں گے۔ جو چند ایک پولیس کے پاس جا کر شکایت کراتے ہوں گے ان کی کوئی سنتا نہیں ہو گا۔ اصل افنان احمد نے یقیناً کوئی ایسی حرکت کی ہو گی جس کی وجہ سے وہ اسے قتل کرنے پر مجبور ہوئے۔

میں نے ناشتے کی نیت سے راولپنڈی کے ایک مشہور ہوٹل کے سامنے گاڑی روکی اور ایک کونے کی میز سنبھال کر عبداللہ سے رابطہ کیا۔ "اشفاق کیسا ہے؟"

"آپریشن کامیاب رہا ہے لیکن ڈاکٹروں نے چوبیس گھنٹے اہم قرار دیے ہیں اگر رات بارہ بجے تک زندہ رہا تو پھر چانس زیادہ ہو جائے گا۔"

"اللہ خیر کرے! اس کے گھر والوں کو اطلاع کر دی؟"

"ہاں وہ میرپور کا رہنے والا ہے اس کے بھائی آ گئے ہیں۔ شادی شدہ ہے اور دو سال کا بیٹا بھی ہے۔"

میں نے ایک بار پھر دکھ محسوس کیا۔ بہر حال یہ اس کی تقدیر میں تھا۔ میں نے کہا۔ "مانی، بیتو اور ایاز میری حویلی کی طرف گئے ہیں۔"

"یہ آپ نے اچھا کیا کہ وہاں اسی سیکورٹی میں اضافہ کر رہے ہیں، اب وہ جگہ زیادہ محفوظ ہو جائے گی تو ہم خواتین کو منتقل کرنے کے پروگرام پر دوبارہ عمل کریں گے۔"

"ہیلی کاپٹر کریش کا معاملہ نمٹ گیا؟"

"ہاں ائر کلب کے مالکان اثر والے ہیں انہوں نے اصل بات دبا دی اور کریش کی وجہ فنی خرابی بیان کی تھی۔"

"اور وہاں جو دو بے گناہ سیکورٹی گارڈ مارے گئے۔"

"اس واقعے کو الگ سے ظاہر کیا گیا ہے اور ملبا نامعلوم افراد کے سر ڈال دیا گیا ہے۔ سمجھ لیں کہ معاملہ ختم کر دیا گیا ہے۔ گن میں اٹھوا چکا تھا اس لیے کوئی ثبوت بھی باقی نہیں رہا ہے۔"

"فاضلی کے بارے میں پتا چل گیا ہو گا اس کی ساری اکڑ فوں ختم ہو چکی ہے اور وہ سب بتانے کے لیے تیار ہے۔"

"ہاں لیکن اب آپ کے لیے خطرات بڑھ گئے ہیں، پولیس میں موجود میرے ایک واقف کار نے بتایا کہ پولیس پر دباؤ آ رہا ہے..... وہ ہر صورت آپ کو گرفتار کرے اور اس کے لیے ڈی آئی جی کے حکم سے ایک خصوصی ٹیم بھی تشکیل دی جا رہی ہے جس میں اکرم چشتی جیسے کرپٹ لوگ بھی شامل ہیں۔ آپ کو پتا ہے اسے ڈی ایس پی بنا دیا گیا ہے۔"

میں حیران ہوا۔ "وہ تو شاید اے ایس آئی تھا...؟"

"جی ہاں یہ ترقی اسے مرشد کی وجہ سے ملی ہے۔ اس نے جعلی تعلیمی سرٹیفکٹس جمع کرائے جن کی بنیاد پر اسے یہ ترقی ملی ہے اور وہ اب پہلے سے زیادہ خطرناک ہو جائے گا۔"

"اسے بھی دیکھ لیں گے یار جب مرشد اور فتح خان جیسے بڑے خطروں سے نمٹتے آئے ہیں۔" میں نے بے پروائی سے کہا اور پھر عبداللہ کو صابر کے بارے میں بتایا۔ "اس کے پاس ایک مہینے کی مہلت ہے تم اپنے کسی آدمی کی ڈیوٹی لگا دو اس اخبار کا کلاسیفائیڈ روز چیک کرے۔"

"یہ اخبار آتا ہے میں خود چیک کر لوں گا۔ آپ کہاں ہیں؟"

"فی الحال تو میں ناشتا کر رہا ہوں۔ مجھے حویلی جانا ہے لیکن میں سوچ رہا ہوں ایک چکر کوٹھی کا بھی لگا لوں۔"

عبداللہ خوش ہو گیا۔ "میں بھی آپ سے یہی کہنے والا تھا آپ بہت عرصے سے یہاں نہیں آئے ہیں۔ اگر آپ تیار ہیں تو میں گاڑی بھیجتا ہوں اس کے شیشے سیاہ ہیں آپ اس میں آئیں گے تو کسی کو پتا نہیں چلے گا۔"

"ٹھیک ہے تم اسی ہوٹل سے کچھ دور ایک مشہور حلوا پوری والا ہے اس کے پاس گاڑی بھیج دو ڈرائیور سے کہو کہ دروازہ ان لاک چھوڑ دے اور خود حلوا پوری لینے چلا جائے میں موقع دیکھ کر گاڑی میں بیٹھ جاؤں گا۔"

"میں ابھی روانہ کرتا ہوں۔"

اس دوران میں ناشتا آ گیا اور میں ناشتا کرنے میں لگ گیا۔ جب تک میں ناشتے سے فارغ ہوا عبداللہ کی کال آ گئی۔ "ڈرائیور پہنچنے والا ہے سیاہ رنگ کی ہیلکس ہے نمبر...."

"ٹھیک ہے میں پہنچ رہا ہوں۔"

اپنی سفاری ہوٹل کے باہر ہی چھوڑ دی تھی یہاں اسے کوئی نہیں چھیڑتا اور خود پیدل حلوا پوری کی دکان کی طرف روانہ ہو گیا۔ راولپنڈی کے اس علاقے میں بے پناہ رش تھا۔ سڑکوں پر ٹریفک کا ازدحام تھا اور فٹ پاتھوں پر لوگ چڑھے ہوئے تھے حلوا پوری کی دکان پر باقاعدہ جنگ کا سماں تھا۔ ہیلکس دکان سے ذرا دور کھڑی تھی اور اس کے آس پاس بھی متعدد گاڑیاں تھیں اگر کوئی ان لوگوں کا تعاقب کرتا ہوا آیا تھا تو اس رش میں اس کا پتا چلانا ناممکن تھا۔ بہر حال میں اللہ کا نام لے کر دیوار والی طرف سے ہیلکس کے پچھلے حصے میں گھس گیا وہاں عبداللہ کا ایک آدمی پہلے سے موجود تھا۔ اگلی اور پچھلی سیٹوں کے درمیان نیم شفاف پلاسٹک نما ربر جیسی چادر موجود تھی، اس کے ہوتے ہوئے کوئی ونڈ اسکرین سے اندر نہیں دیکھ سکتا تھا جب کہ آگے پیچھے کے شیشے ایسے تھے کہ باہر سے اندر کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ عبداللہ کے آدمی نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور بولا۔ "بس ہم ایک منٹ میں روانہ ہوتے ہیں۔"

"ڈرائیور کہاں ہے؟"

"حلوا پوری کی دکان پر گیا ہے لیکن وہ حلوا پوری لے گا نہیں ابھی واپس آ جائے گا۔"

دکان کے سامنے کوئی سو افراد موجود تھے اور اگر ڈرائیور حلوا پوری کے چکر میں پڑتا تو اس کا نمبر ایک ڈیڑھ گھنٹے سے پہلے نہیں آتا۔ وہ چند منٹ بعد ہی مایوسانہ انداز میں واپس آ گیا تھا۔ اس نے انجن اسٹارٹ کیا اور گاڑی نکالنے لگا لیکن وہاں خاصا ہجوم تھا۔ اسے دشواری پیش آ رہی تھی۔ لیکن کسی نہ کسی طرح اس نے ہیلکس نکال لی۔ رش سے نکلتے ہی اس نے ہیلکس کو ویران سڑکوں پر گھمانا شروع کر دیا۔ وہ تعاقب کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن جب کوئی گاڑی پیچھے آتی دکھائی نہیں دی تو اس نے کوٹھی کا رخ کیا۔ آدھے گھنٹے بعد ہم عبداللہ والی کوٹھی پر تھے۔ میں نے خاصے عرصے بعد کوٹھی دیکھی تھی اور اس کی صورت خاصی بدل گئی تھی۔ سب سے پہلے تو اس کی چار دیواری بارہ فٹ اونچی ہو گئی تھی اور اس پر مزید تین فٹ تک خاردار تاروں کی ایسی باڑھ تھی جس سے ٹینس کی گیند بھی گزر کر نہیں آ سکتی تھی۔ مین گیٹ بھی بدل گیا تھا اور اب پہلے سے کہیں زیادہ موٹی چادر کا بھاری بھر کم گیٹ تھا جو رولر پر پھسل کر کھلتا تھا۔ ورنہ صرف قبضے اس کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے تھے۔ ایک چیک پوسٹ جیسی جگہ کوٹھی کے اوپری حصے میں بھی بنا دی گئی تھی جہاں سے نگران چاروں طرف نظر رکھ سکتے تھے اور یہیں کیمرے بھی لگے تھے جن سے دور تک کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ مجھے مین گیٹ کے ساتھ ایک عجیب سی مشین دکھائی دی۔ میرے ساتھ بیٹھے آدمی نے کہا۔ "یہ بارود کی نشان دہی کرتی ہے۔ اگر کوٹھی کے سامنے سے کوئی ایسی گاڑی گزرے جس میں بارود ہو تو یہ الارم بجاتی ہے۔"

عبداللہ اپنا کام کر رہا تھا۔ وہ کوٹھی کو زیادہ سے زیادہ محفوظ بنا رہا تھا۔ ہیلکس پورچ میں رکی جو اوپر سے فائبر کی چھت کی وجہ سے کورڈ تھا اور ظاہر ہے آس پاس کی بلند عمارتوں سے بھی اس کے نیچے دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ یہ انتظام یقیناً اسی لیے کیا گیا تھا۔ میں گاڑی سے نکلا تو عبداللہ موجود تھا وہ مجھے اندر لے گیا۔ "آپ کو اتنے عرصے بعد یہاں دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے۔"

"اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے کہ تم نے کوٹھی کے حفاظتی انتظامات مزید بہتر کر لیے ہیں۔"

"جی میں ان دنوں اسی کام میں لگا رہا ہوں۔ یہ ہمارا مرکز ہے اور ہم اسے چھوڑ نہیں سکتے ہیں اس لیے اسے زیادہ سے زیادہ محفوظ بنا رہے ہیں بلکہ کچھ دن بعد ہم گلی کے دونوں سروں پر بیریئر لگا کر اسے بند کر دیں گے، میری محلے والوں سے بات ہوئی ہے ہم سیکورٹی گارڈز رکھیں گے اور اس کے اخراجات سب شیئر کریں گے۔ اس کے بعد گلی میں کوئی غیر متعلق فرد نہیں گھس سکے گا اور نہ ہی گاڑیاں آسکیں گی۔"

"لیکن عقبی گلی تو موجود ہے۔"

"یہی کام وہاں بھی کیا جائے گا۔ گلی کو عام لوگوں کی آمد و رفت کے لیے بند کر دیا جائے گا۔"

عبداللہ کا آئیڈیا اچھا تھا لیکن مجھے اچھا نہیں لگا اس میں راستے بند ہو رہے تھے اور راستے بند کرنا کسی صورت درست نہیں ہوتا ہے۔ بہر حال یہ گلی بند ہونے سے راستے بالکل ہی بند نہیں ہوتے گزرنے والے اگلی یا پچھلی گلی سے گزر سکتے تھے لیکن اگلی پچھلی گلی والوں کو بھی یہ خیال آجاتا تو ظاہر ہے لوگوں کے لیے راستے بالکل بند ہو جاتے اور انہیں بہت لمبا متبادل راستہ اختیار کرنا پڑتا۔ میں نے خیال آرائی سے گریز کرتے ہوئے سفیر مونا اور سعدیہ کے بارے میں پوچھا۔ عبداللہ نے کہا۔ "میرا خیال ہے وہ سو رہے ہیں، کل دیر تک جاگتے رہے تھے۔"

میں نے سفیر کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ کئی بار دستک کے جواب میں وہ بھنایا ہوا دروازے تک آیا۔ "کون ہے صبح صبح۔"

"باہر نکل جورو کے غلام۔"

"ابے تو۔" سفیر باہر نکل کر مجھ سے لپٹ گیا۔ "تو کیسے نازل ہو گیا۔"

"میں نے صبح کال کی تھی تو تُو جاگ رہا تھا۔"

"اسی وقت تو سویا تھا۔ کل رات دیر تک گپ شپ کرتے رہے۔ مونا ڈھیلے ڈھالے لباس میں جوڑا باندھتی ہوئی نمودار ہوئی۔ پہلے جھجکی جیسے اس کی سمجھ میں نہیں آرہا ہو کہ میرے ساتھ اپنا دکھ کس طرح شیئر کرے۔ اسے شرم بھی آرہی تھی پھر وہ میرے شانے سے چمٹ کر رونے لگی۔ میں نے اس کا سر تھپتھپایا۔

"بس اب رونے کی ضرورت نہیں ہے، یہ سب اللہ کے کام ہیں۔ اپنی حکمت وہی جانتا ہے۔ سوچو اگر تم میں سے کسی کو کچھ ہو جاتا تو...؟"

مونا نے خود پر قابو پا لیا۔ کچھ دیر بعد ہم اس کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ عبداللہ نے کچن کے لیے کل وقتی باورچی رکھ لیا تھا۔ وہ تینوں وقت کا کھانا بناتا تھا اور یہاں موجود تمام افراد کے لیے بناتا تھا اس طرح انہیں باہر سے کچھ منگوانا نہیں پڑتا تھا۔ سفیر نے کک کو ناشتے کا کہا اور میرے لیے کافی منگوائی۔ مونا کو دیکھ کر لگ رہا تھا کہ اس کی حالت خاصی حد تک بہتر ہو گئی تھی۔ سفیر نے سادگی میں بتایا کہ آج لیڈی ڈاکٹر چیک اپ کے لیے آئے گی تو مونا جھینپ گئی اور پھر گھور کر سفیر کو دیکھا۔ سادی کا کمرا برابر والا تھا اور شاید اس نے ہماری آوازیں سن لی تھیں وہ اٹھ کر آگئی۔ مجھے دیکھ کر وہ خوش ہو گئی اس نے جوش و خروش سے کہا۔ "اُف کتنے دن بعد دیکھ رہی ہوں آپ کو... میں تو آپ کی صورت ہی بھول گئی تھی۔"

"ہاں طوطا چشم لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔" سفیر نے تائید کی۔ "ادھر بندہ دو تین دن کے لیے غائب ہوا یہ اس کی شکل ہی بھول جاتے ہیں۔"

"آپ مت بولیں۔" سادی نے خفگی سے کہا۔

"تین دن سے آپ نے میرا دماغ خراب کر رکھا ہے۔"

"ٹھیک کہا تم نے، اصل میں یہ فارغ ہے نا اس لیے دوسروں کا دماغ خراب کرتا ہے۔" میں نے سادی کی تائید کی۔

"یہ الزام ہے۔" سفیر نے احتجاج کیا۔ "جو چیز سرے سے موجود ہی نہ ہو اسے میں کیسے خراب کر سکتا ہوں۔"

"دیکھا آپ نے شوبی۔" سادی نے فریاد کی۔

"یار تجھے کیا ہو گیا ہے وہاں ان بچوں کا ناطقہ بند کر کے رکھتا تھا اور یہاں ان معصوم بچیوں کے پیچھے پڑ گیا ہے۔"

"اتنی معصوم نہیں ہیں یہ بچیاں۔"

"کیوں کیا ہم مکار ہیں۔" مونا نے آنکھیں نکالیں۔

"اب دیکھ لو اپنی زبان سے خود اقرار کر رہی ہیں۔" سفیر بولا۔

یہ جھگڑا کافی کی آمد پر ختم ہوا۔ باورچی دیکھنے میں تازہ تازہ کسی پنڈ دادن خان سے نووارد لگتا تھا لیکن اس کے

جانے کے بعد مونا نے تصدیق کی کہ اپنے کام کا ماہر تھا۔ قدیم مغلئی و منگول کھانوں سے لے کر جدید ترین چینی اور اٹالین کھانے تک مہارت سے بناتا تھا۔ جس مقدار میں بناتا تب بھی ذائقے میں کوئی فرق نہیں آتا تھا۔ کافی بھی بہت اچھی بنائی تھی۔ جھگڑا ختم ہوا تو میں نے انہیں اپنی تین چار دن کی روداد سنائی۔ افنان احمد کے بارے میں جان کر سادی نے کہا۔ ''شوبی سمجھ میں نہیں آتا یہ سارے خاص قسم کے لوگ ہمارے مقدر میں لکھ دیے گئے ہیں۔ کبھی غلطی سے بھی کوئی عام آدمی نہیں ملتا ہے۔''

''یہ تو میری سمجھ میں بھی نہیں آتا۔ اب ضروری تھا کہ درجنوں اشتہارات میں سے میں جس کوٹھی کا انتخاب کرتا وہاں پہلے سے ڈراما تیار ہوتا۔ اس کا اصل مالک قتل کیا جا چکا تھا اور اس کی لاش اس کے اپنے ڈیپ فریزر میں پڑی تھی۔ بہر حال وہ فراڈیا ہمارے قبضے میں ہے اسے ہمارے دس لاکھ کے ساتھ پہلے کا کھایا پیا بھی اگلنا پڑے گا۔''

''ویسے یہ دھندا اچھا ہے۔'' سفیر نے کہا۔ ''جس غلط آدمی کو پکڑو اس سے اس کی ساری جمع پونجی ہتھیا لو سزا کی سزا اور ہمارا خرچ بھی نکلتا رہے گا۔''

''جیسے مرشد کے ساتھ کیا ہے۔'' سادی نے کہا۔

''نہیں ہم نے جان بوجھ کر یہ حرکت کبھی نہیں کی، ہم چور نہیں ہیں اور نہ ڈاکو ہیں جو دوسروں کے مال پر نظر رکھیں یہ تو اتفاق تھا کہ کالی کوٹھی میں رقم سے بھرا بریف کیس مل گیا اگر وسیم اسے نہ لاتا تو وہیں جل کر خاک ہو جاتا اور کسی کے کام نہ آتا۔'' میں نے وضاحت کی۔

''میں کون سا سچ مچ مشورہ دے رہا تھا۔'' سفیر نے کھسیا کر کہا۔

ناشتا آیا تو وہ سب ناشتا کرنے لگے۔ مونا اور سادی کے اصرار پر مجھے ان کا ساتھ دینا پڑا تھا۔ ناشتا جاری تھا کہ سادی کو وسیم کی کال آئی۔ اس نے بتایا کہ میں یہاں آیا ہوں۔ دوسری طرف کی سن کر اس نے موبائل میری طرف بڑھا دیا۔ ''وسیم آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

''شہباز صاحب...'' یہ غیاث الدین تو نہایت بودا نکلا میری مراد جعلی افنان احمد سے ہے۔ رات ہی میں اس نے منور کے بارے میں بتا دیا۔ ہم اسے پکڑ لائے ہیں اور دس لاکھ روپے مع سود کے وصول کر لیے ہیں۔''

''اس میں سود کتنا ہے؟''

''یہی کوئی چالیس لاکھ۔'' اس نے کہا۔ ''اب ان کا کیا کرنا ہے؟... کیا چھوڑ دیں؟''

''اتنی جلدی نہیں ہے' کچھ دن اور ان کی میزبانی کرو۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن ایک کام تو کرنا ہے' یہ اپنے چہرے سے دوسروں کو دھوکا دیتے ہیں ان کے چہرے ان کے اعمال کے مطابق کر دو تاکہ آئندہ کسی کو یہ دھوکا نہ دے سکیں۔''

''ہاں کم سے کم اتنی سزا تو ملنی چاہیے۔ عبداللہ کے آدمی کی حالت بہتر ہو رہی ہے۔''

''اللہ کرے وہ بچ جائے بیوی بچے والا ہے۔''

''میری کچھ دیر پہلے اس کے بھائی سے بات ہوئی ہے اس کی حالت میں بہتری آئی ہے اور اب ڈاکٹر زیادہ پر امید ہیں اسے میں نے ہی عبداللہ کے پاس بھیجا تھا۔''

''میں یہاں سے نمٹ کر تمہارے پاس آ رہا ہوں اس کے بعد آگے کا لائحہ عمل طے کریں گے۔''

میں نے موبائل واپس سادی کو دیا تو سفیر بولا۔ ''میں بھی ساتھ چلوں گا۔''

''نہیں تم فی الحال یہیں رکو گے' مونا کو تمہاری ضرورت ہے اور وہاں تمہاری خاص ضرورت نہیں ہے۔''

''شوبی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' سادی بولی۔ ''ابھی آپ یہیں رکیں۔''

''کیا ہو گیا ہے بی بی' کچھ دیر پہلے تو تم مجھ سے بیزار تھیں۔''

''وہ تو اب بھی ہوں لیکن مونا کی خاطر برداشت کر لوں گی۔''

مونا مسکرا رہی تھی۔ اسے معلوم تھا یہ سب چھیڑ چھاڑ ہے اس میں تلخی اور نفرت کے بجائے محبت اور خلوص کا رنگ ہے۔ سفیر کی ایسی باتوں کا کوئی برا نہیں مناتا تھا حالانکہ وہ مائی اور بیتو کو اس سے زیادہ چھیڑتا تھا۔ وہ بھی وقتی واویلا کرتے تھے اور پھر نارمل ہو جاتے۔ طے ہوا کہ میں دوپہر کے بعد جاؤں گا اور سفیر میرے ساتھ نہیں جائے گا۔ جیسے ہی ہم نشست گاہ میں آئے تو سفیر نے دوبارہ کوشش کی۔ ''یار میں یہاں خواتین میں رہ کر کیا کروں گا۔''

''وہی جو خواتین کرتی ہیں لگائی بجھائی اور دوسروں میں کیڑے نکالنا۔ باقی کاموں کے لیے عبداللہ کے ساتھ بھی شامل ہو سکتا ہے۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''تو نہیں جا سکتا ابھی مونا کے پاس تیرا ہونا ضروری ہے۔''

''وہ ٹھیک ہو گئی ہے۔''



''صرف جسمانی حد تک... ابھی روح کا زخم نہیں بھرا ہے۔ اسے تیری دل جوئی کی ضرورت ہے۔''

سفیر خاموش ہو گیا۔ مجھے لگا جیسے وہ یہاں سے فرار چاہتا ہو۔ اس بچے کے لیے وہ بھی مونا کی طرح بے تاب تھا۔ میں سفیر کی دلی کیفیت کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ مگر فرار اس مسئلے کا حل نہیں تھا۔ وہ مرد تھا اور اسے زیادہ ہمت کا ثبوت دینا تھا۔ مونا عورت تھی' اسے سنبھالنے کی ضرورت تھی۔ عبداللہ آیا تو مجھے راجا عمر دراز کا خیال آیا بہت عرصے سے اس کے بارے میں کوئی بات نہیں ہوئی تھی میں نے عبداللہ سے اس کی خیریت پوچھی۔ اس نے کہا۔ ''پچھلے دنوں ان کی طبیعت کچھ خراب رہی تھی لیکن اب بہتر ہے۔ ہر دوسرے تیسرے دن ان کی کال آتی ہے وہ آپ کی خیر خیریت پوچھتے ہیں۔''

''اچھا تم نے بتایا نہیں... انہیں میری طرف سے پوچھ لیا کرو۔''

عبداللہ مسکرایا۔ ''میں پوچھ لیتا ہوں۔''

میں نے سچ مچ خود کو عبداللہ کا شکر گزار محسوس کیا۔ اس کا اور میرا ساتھ زیادہ پرانا نہیں تھا۔ وہ راجا عمر دراز کا ملازم تھا مگر اس نے بہت جلد میرے ساتھیوں میں جگہ بنا لی تھی۔ اس نے میرے لیے وہ سب کچھ کیا تھا جو سفیر اور وسیم کر سکتے تھے یا بیتو کر سکتا تھا۔ ایاز بھی اس صف میں شامل تھا۔ یہ میرے وہ دست و بازو تھے جن پر میں اپنے جسم کی طرح بھروسا کر سکتا تھا۔ عبداللہ اور سفیر سے بات کرتے ہوئے اچانک مجھے خیال آیا۔

''میں تو بھول ہی گیا تھا کہ ہماری ساری پونجی سفاری میں ہے اور وہ ہوٹل کی پارکنگ میں کھڑی ہے۔''

''کوئی بات نہیں اسے وہاں کون چھیڑے گا یہ بتا کہ سوٹ کیس نمایاں تو نہیں ہے؟'' سفیر نے کہا۔

''نہیں وہ پچھلے حصے میں رکھا ہوا ہے اور شیشے اندھے ہیں' باہر سے جھانک کر کوئی نہیں دیکھ سکتا۔''

عبداللہ نے دوپہر کے کھانے میں خاصا اہتمام کرایا تھا اور وہ ڈشیں بنوائی تھیں جو مجھے پسند تھیں۔ خاصے عرصے بعد گھریلو ماحول میں گھر کا بنا کھانا کھا رہا تھا۔ کھانے کے بعد مونا اور سادی نے اصرار کیا کہ میں کچھ دیر اور رک جاؤں لیکن میں اب جلد از جلد وسیم کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ کھانے کے دوران ہی ایاز کی کال آئی تھی وہ سب حویلی پہنچ گئے تھے۔ سفیر اور عبداللہ متفق تھے کہ پہلے ہمیں فاضلی اور نادر سے مرشد کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنی چاہیے اور اس کے بعد کوئی لائحہ عمل طے کرنا چاہیے۔ سب سے مل کر میں دو بجے میں اسی ہیلکس میں پچھلے حصے میں روپوش ہو کر عبداللہ کی کوٹھی سے نکلا پہلے کی طرح گاڑی میں ایک ڈرائیور اور میرے ساتھ ایک مسلح گارڈ تھا۔ ہمارا رخ راولپنڈی کی طرف تھا۔

ڈرائیور حسب سابق تعاقب کے سلسلے میں پوری طرح محتاط تھا' اس نے پہلے گاڑی کو سنسان سڑکوں پر گھمایا۔ اس کے بعد منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ عبداللہ کی پولیس والی بات نے مجھے فکر مند کر دیا تھا۔ بہت عرصے سے میں نے ندیم بھٹی سے بات نہیں کی تھی میرے کیس وہی دیکھ رہا تھا۔ اس کے گھر کا نمبر مجھے یاد تھا وہاں کال کر کے میں نے اس کی بیوی سے موبائل نمبر لیا۔ ندیم کی بیوی شازیہ نے مجھے پہچان لیا تھا اور دماغ کھانے پر آمادہ تھی لیکن میں نے عجلت کا بہانہ کر کے اس سے جان چھڑائی اور ندیم کا نمبر ڈائل کیا۔ وہ عدالت سے فارغ ہو کر اپنے دفتر آ گیا تھا میری آواز سن کر بولا۔ ''ابے میری جان کے دشمن... تو ابھی تک زندہ ہے... اس منحوس مرشد نے تیرا کام تمام نہیں کیا؟''

''فی الحال میرے تمام دشمنوں کا منہ کالا ہے۔ یہ بتا میرے مقدمات کا کیا بنا... کیا وکیلوں کی روایت کے مطابق یہ میری وفات کے بعد جا کر ختم ہوں گے؟''

''لگتا تو ایسا ہی ہے۔ مگر تیری اور تیرے دشمنوں کی طرف سے خاموشی ہے۔''

''یہ خاموشی اوپری ہے اندرونِ خانہ بہت کچھ ہو رہا ہے۔ تو نے بتایا نہیں کیا ہوا ہے اب تک۔''

''راجا صاحب کے تعاون سے فقیر کے مرڈر والا کیس تو نمٹ گیا ہے بس تیرا انتظار ہے کہ تو آئے تو جج بری کرنے کا آرڈر جاری کرے۔''

''یہ کام میرے آئے بغیر نہیں ہو سکتا ہے؟''

''مشکل ہے لیکن اس کے بعد پولیس تجھے دوسرے مقدمات میں گرفتار کر لے گی۔ بہر حال اصل کیس یہی تھا جس سے تو نکل گیا ہے باقی کے معاملات طے کیے جا سکتے ہیں۔''

''پولیس اور انتظامیہ کا رویہ کیسا ہے؟''

''ویسا ہی ہے جیسا کہ تیرے جیسے شخص کے ساتھ ہونا چاہیے۔ سنا ہے ڈی آئی جی کی طرف سے تیری گرفتاری کے لیے خصوصی ٹیم تشکیل دی گئی ہے اس لیے بہت ضروری ہو گیا

ہے تو اپنی منحوس صورت لے کر کہیں غائب ہو جا۔''

''یہ مشکل ہے۔'' میں نے سرد آہ بھری۔

''تب گرفتار ہو جا... بھگتنے کے لیے ہم بیٹھے ہیں۔'' ندیم نے خفگی سے کہا اور کال بند کر دی۔ اس وقت ہم اسلام آباد سے گزر رہے تھے۔ جیسے ہی گاڑی اسلام آباد سے راولپنڈی کی حد میں داخل ہوئی۔ اچانک گاڑی کے آگے پیچھے دو گاڑیاں نمودار ہوئیں اور یہ پولیس کی گاڑیاں تھیں۔ ڈرائیور نے پیچھے منہ کر کے اطلاع دی۔

''پولیس کی دو گاڑیاں ہیں جی آگے پیچھے... انداز مشکوک لگ رہا ہے۔''

میں اور گارڈ مستعد ہو گئے۔ میں نے پوچھا۔ ''اسلام آباد پولیس کی گاڑیاں ہیں؟''

''نہیں جناب پنڈی پولیس ہے۔''

مجھے تشویش ہونے لگی۔ پنڈی پولیس نے ہی میرے خلاف تمام مقدمات درج کیے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ پولیس کے بھیس میں مرشد کے گرگے ہوں ہم دھوکا کھا گئے تھے وہ عبداللہ کی کوٹھی کی نگرانی کر رہے تھے اور انہوں نے کسی طریقے سے وہاں میری موجودگی کا پتا چلا لیا تھا وہ یہ بھی جان گئے تھے کہ مجھے کہاں جانا تھا اس لیے وہ متوقع راستے میں پہلے سے موجود تھے ہیلکس دیکھتے ہی وہ حرکت میں آ گئے تھے۔ میں تیزی سے سوچ رہا تھا اور میں نے ان دونوں سے کہا۔ ''اگر یہ پولیس ہوئی تو تم کوئی حرکت نہیں کرو گے' یہ بتاؤ تمہارا اسلحہ لائسنس یافتہ ہے؟''

''جی میری رائفل کا لائسنس ہے۔'' گارڈ نے کہا جب کہ ڈرائیور غیر مسلح تھا۔ میں نے کوشش کر کے دیکھا عقبی گاڑی کچھ فاصلے پر تھی جب کہ آگے والی گاڑی کوئی تیس گز آگے تھی۔ سڑک پر زیادہ ٹریفک نہیں تھا۔ اچانک آگے جانے والی گاڑی ایک تنگ سی جگہ گھوم کر رک گئی اور اس نے آگے نکلنے کا راستہ بلاک کر دیا تھا۔ ڈرائیور ہیلکس روکنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس دوران میں اگلی گاڑی سے پولیس والے کود کر پوزیشن لے رہے تھے۔ میں نے ان کے پاس ایس ایم جی کی جھلک دیکھی۔ پیچھے والی پولیس موبائل اس طرح رکی تھی کہ پیچھے کا راستہ بھی بند ہو گیا تھا۔ آج ہی عبداللہ نے مجھے خبردار کیا تھا کہ پولیس میرے خلاف سرگرم ہو گئی ہے لیکن یہ میں نے نہیں سوچا تھا کہ پولیس اتنی سرگرم ہو جائے گی اور اتنی مستعدی سے مجھے چھاپ لے گی۔ چند منٹ پہلے ندیم نے غائب ہونے کا مشورہ دیا تھا اور ابھی میں نے اس پر عمل کا سوچا بھی نہیں تھا کہ پولیس نازل ہو گئی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ پولیس میرے لیے آئی تھی۔ اگلی موبائل سے کوئی چار پولیس والے اترے تھے اور وہ سب ایس ایم جی سے مسلح تھے۔ پیچھے والی موبائل سے بھی اتنے ہی پولیس والے اترے تھے۔

''تم کوئی حرکت نہیں کرو گے۔'' میں نے گارڈ کی طرف دیکھا پھر ڈرائیور سے کہا۔ ''تم ہاتھ اوپر کر کے نیچے اترو اور پولیس والوں سے پوچھو کہ گاڑی کو کیوں روکا گیا ہے؟''

لیکن اس سے پہلے کہ ڈرائیور اترتا میں نے ایک جانی پہچانی آواز سنی جو کہہ رہی تھی۔ ''شہباز ملک' میں جانتا ہوں تم اس گاڑی میں ہو۔ شرافت سے ہاتھ اوپر کر کے نیچے اتر آؤ۔ تمہیں دس سیکنڈ کا وقت دیا جاتا ہے اس کے بعد پولیس فائر کھول دے گی۔''

آواز اکرم چشتی کی تھی اور میں اسے کیسے فراموش کر سکتا تھا۔ اس سفاک شخص سے کئی بار میرا واسطہ پڑ چکا تھا۔ جب اس نے دھمکی دی تو مجھے ذرا بھی شک نہیں رہا تھا کہ پولیس واقعی دس سیکنڈ بعد فائر کھول دے گی۔ مقابلے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اکرم چشتی گنتی گن رہا تھا۔ میں نے سوچا اور فوری فیصلہ کیا۔ میں نے اپنا موبائل اور پستول نکال کر گارڈ کے حوالے کیا۔ ''تم دونوں اندر ہی رہو اور جب تک پولیس والے نہ کہیں نیچے اترنے کی ضرورت نہیں ہے۔ شاید یہ صرف مجھے ہی لینے آئے ہیں۔''

اکرم کے دس کہنے سے پہلے میں نیچے اتر آیا تھا اور میرے دونوں ہاتھ سر پر تھے۔ فوراً ہی آگے پیچھے سے چار پولیس والوں نے مجھے گھیر لیا۔ ان میں سے ایک نے میرے ہاتھ پشت کی طرف کیے اور ان میں ہتھکڑی ڈال دی۔ مجھے باقاعدہ گرفتار کیا جا چکا تھا۔ اکرم چشتی اتنا بہادر تھا کہ جب تک اس کے آدمیوں نے مجھے مکمل بے بس نہیں کر دیا وہ گاڑی سے اتر کر آگے نہیں آیا تھا وہ پچھلی گاڑی میں تھا۔ میں نے اس کی منحوس صورت خاصے عرصے بعد دیکھی تھی' آخری بار میں نے اسے جناح مارکیٹ میں دیکھا تھا جب میں زرین کو شاپنگ کرانے وہاں لے گیا تھا اور اچانک ہی اکرم چشتی بھی وہاں آ گیا تھا۔ اگر زرین ڈرامانہ کرتی تو وہ مجھے دیکھ لیتا اور پھر مجھے مار دھاڑ کر کے نکلنا پڑتا۔ مگر اب تو مار دھاڑ کا موقع بھی نہیں تھا۔ اکرم چشتی مزید پھول گیا تھا اس کا چہرہ سؤر سے مشابہ ہو رہا تھا اور آنکھوں میں پرانا کینہ چمک



رہا تھا۔ اس نے سامنے آتے ہی اچانک مجھے تھپڑ مارا۔ اس کا ہاتھ بھاری تھا میرا سر ہلکا سا گھوما لیکن میں اپنی جگہ سے ہلا نہیں تھا۔

''شہباز ملک... یہ ایڈوانس ہے۔''

میں نے سر ہلایا۔ ''افسوس کہ تم صحیح سے ایڈوانس دینے کے قابل بھی نہیں رہے ہو۔ حرام خوری نے تمہیں کسی قابل نہیں چھوڑا ہے۔'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ اکرم چشتی کا سیاہی مائل چہرہ مزید سیاہ پڑ گیا تھا۔ مگر اس نے مزید کچھ کہنے سے گریز کیا اور اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا کہ مجھے موبائل میں بٹھائیں۔ اس نے گاڑی اور اس میں موجود افراد سے کوئی تعرض نہیں کیا تھا۔ اس نے اسے ہیلکس اور اس میں بیٹھے عبداللہ کے آدمیوں کو نظر انداز کر دیا تھا جیسے وہ وہاں تھے ہی نہیں۔ جیسے ہی میں اگلی موبائل میں بٹھایا گیا اور سپاہی اس میں چڑھے وہ حرکت میں آ گئی۔ پیچھے والی موبائل سیدھی ہوئی اور اس موبائل کے پیچھے آنے لگی اس سے زیادہ میں نہیں دیکھ سکا تھا کیونکہ ایک سپاہی نے میلا سا کپڑے کا غلاف میرے منہ پر چڑھا دیا تھا۔ اب میں کچھ دیکھنے سے قاصر تھا۔ بلکہ اس غلاف سے ایسی بو اٹھ رہی تھی کہ میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ میرے ساتھ کسی مستند دہشت گرد کا سا سلوک کیا جا رہا تھا۔ کیونکہ میں مرشد جیسے شخص کا دشمن تھا۔

جب اکرم چشتی نے مجھے تھپڑ مارا تو مجھے کوئی تعجب نہیں ہوا تھا۔ اس سے اسی رویّے کی توقع تھی۔ تعجب مجھے اس وقت ہوا جب موبائل میں پولیس نے حسبِ روایت مجھ پر تشدد شروع نہیں کیا جب کہ عام طور سے کسی مستند مجرم کو گرفتار کیا جاتا ہے تو جائے وقوع سے اس کی چھترکاری کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے بجائے پولیس والے سکون سے بیٹھے تھے حد یہ کہ انہوں نے گالی گلوچ سے بھی کام نہیں لیا۔ وہ آپس میں بھی بات نہیں کر رہے تھے۔ یہ جدید قسم کی طاقتور انجن والی پولیس موبائل تھی جو حال ہی میں پولیس کو دی گئی تھی۔ جب پولیس موبائلز نے ہیلکس کو روکا تو مجھے شبہ نہیں ہوا کہ یہ پولیس کے بجائے کوئی اور ہیں۔ مگر جب وہ مجھے اس طرح خاموشی سے گرفتار کر کے لے جانے لگے انہوں نے نہ تو عبداللہ کی گاڑی اور نہ اس کے آدمیوں سے تعرض کیا حتیٰ کہ ان سے پوچھ گچھ بھی نہیں کی کہ وہ پولیس کے مطلوب شخص کو اپنی گاڑی میں لیے کیوں پھر رہے ہیں۔ اصولاً تو میرے ساتھ انہیں بھی گرفتار کر لینا چاہیے تھا اور گاڑی بھی پولیس کی تحویل میں چلی جاتی۔ پھر انہوں نے میرے ساتھ نہایت شریفانہ سلوک رکھا تھا۔ اس سے مجھے شبہ ہونے لگا تھا کہ وہ پولیس والے نہیں تھے یا اگر سچ مچ پولیس تھی تب بھی وہ کسی کی ہدایت پر کام کر رہی تھی۔ شاید مجھے تھانے کے بجائے کہیں اور لے جایا جا رہا تھا۔

اگر مجھے کہیں اور لے جایا جا رہا تھا تو وہ یقیناً مرشد کا کوئی ٹھکانا ہو سکتا تھا۔ مرشد کے آدمی عبداللہ کی کوٹھی کی نگرانی کر رہے تھے اور انہوں نے کسی طرح مجھے دیکھ لیا تھا۔ فوری طور پر مجھے اٹھانے کا پلان بنایا گیا۔ مرشد نے چالاکی سے کام لیا اپنے آدمیوں کو بھیجنے کے بجائے اس نے اکرم چشتی سے کام لیا جو اس کا زرخرید تھا اور میرا دشمن بھی تھا اس نے خوشی سے یہ ٹاسک لیا اور اسے پورا بھی کر دیا۔ اگر پولیس کی جگہ مرشد کے گرگے ہمیں روکتے تو اتنی آسانی سے مجھے نہیں لے جا سکتے تھے۔ ہم مقابلہ اور مزاحمت کرتے اور ممکن ہے حملہ آوروں کو ان کے مقصد میں ناکام بنا دیتے۔ مگر پولیس کے خلاف مزاحمت مشکل تھی ان سے تو مقابلہ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ پولیس کے پاس گولی چلانے کا پورا اختیار ہوتا ہے۔ لیکن یہ میرا اندازہ تھا جو غلط بھی ہو سکتا تھا۔ اس کا بھی امکان تھا کہ پولیس نے سچ مچ مجھے گرفتار کر لیا تھا اور آغاز میں تعرض نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اب میں پولیس کے پاس تھا وہ آرام سے مجھ سے پوچھ گچھ کر سکتی تھی اور اکرم چشتی پرانے حساب برابر کر سکتا تھا۔ جلد مجھے معلوم ہو جاتا کہ میرا کون سا مفروضہ درست تھا مگر ایک بات یقینی تھی میں مشکل میں پڑ گیا تھا۔

اگر میرا پہلا خدشہ درست تھا تو میں زیادہ مشکل میں پڑنے والا تھا کیونکہ پولیس کا اختیار محدود تھا لیکن مرشد کا اختیار لامحدود تھا وہ میرے ساتھ کچھ بھی کرنے کے لیے آزاد تھا۔ وہ مجھے مار سکتا تھا اور مار کر غائب بھی کر سکتا تھا جب کہ پولیس مجھے عدالت کے سامنے پیش کرنے کی پابند تھی۔ اگرچہ اکرم چشتی کی موجودگی میں یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ میں تھا تو پولیس کی تحویل میں لیکن وہ مجھے غیر قانونی تفتیش کے لیے لے جا رہی تھی۔ اکثر پولیس والے جس ملزم کے لیے خدشہ محسوس کرتے ہیں کہ اسے چھڑانے والے فوراً آ جائیں گے اسے متعلقہ تھانے کے بجائے کہیں اور رکھتے ہیں اور وہیں اس سے ''تفتیش'' کرتے ہیں جب تک کہ مطلوبہ مقصد حاصل نہیں کر لیتے۔ اس تفتیش کے لیے انہیں کہیں جواب دہ نہیں ہونا پڑتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تفتیش میں بندہ جان سے گزر جاتا تو اسے خاموشی سے کہیں

پھینک دیا جاتا ہے۔ یوں پولیس بری الذمہ ہو جاتی ہے۔ اگر اکرم چشتی مجھے ایسی کسی جگہ لے جارہا تھا تو میری خیر نہیں تھی۔

اب مجھے افسوس ہونے لگا تھا کہ میں نے اتنے بڑے خطرے کو مسلسل کیوں نظر انداز کیا۔ پولیس کو میری تلاش تھی اگر چہ یہ تلاش ٹھنڈی پڑی ہوئی تھی لیکن ختم نہیں ہوئی تھی۔ بس اتفاق کی بات تھی کہ آج تک گرفتاری کی نوبت یوں نہیں آئی تھی کہ پولیس نے مجھے باقاعدہ گرفتار کرلیا ہو مگر اس کا خدشہ تو ہمیشہ موجود تھا۔ آج ہی عبداللہ اور پھر ندیم بھٹی نے اس خطرے سے خبردار کیا۔ میں اپنے دوسرے دشمنوں سے تو محتاط رہا لیکن پولیس کو نظر انداز کردیا اور بالآخر اپنی بے پروائی کا خمیازہ بھگتنے جارہا تھا۔ میں نے برابر میں موجود پولیس والے سے کہا۔ ”یہ تو بتادو کہ کہاں لے جارہے ہو؟“

”جلدی کیا ہے میاں جی۔“ پولیس والے نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”جلد پتا چل جائے گا۔“

”اسے چھتروں کی جلدی ہے۔“ کوئی دوسرا ہنس کر بولا۔

میرا شبہ یقین میں بدلنے لگا وہ پولیس والے نہیں تھے یا میرے معاملے میں ان کا کردار روایتی پولیس کا نہیں تھا کیونکہ ان کے لہجے میں میرے لیے بغض نہیں تھا۔ سمجھ میں آنے والی بات ہے نہ... آدمی جس کے خلاف کچھ کرنے کا ارادہ رکھتا ہو پہلے اس کے خلاف اپنے دل وزبان میں نفرت اور کینہ پیدا کرتا ہے۔ ان لوگوں کے انداز میں میرے لیے استہزا تھا لیکن نفرت اور کینہ نہیں تھا۔ موبائل تیزی سے جارہی تھی اور دس بارہ منٹ بعد باہر ٹریفک کا شور کم ہوگیا یعنی ہم کسی کم ٹریفک والی سڑک سے گزر رہے تھے جب کہ پنڈی میں ایسے علاقے بہت کم ہیں جہاں سڑک پر ٹریفک کم ہو۔ کیا یہ مجھے شہر سے باہر کہیں لے جارہے تھے۔ شروع میں میں نے اپنے ذہن میں سمتوں کا اندازہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن جلد موبائل نے اتنے موڑ کاٹے کہ سارے اندازے آپس میں گڈمڈ ہوکر رہ گئے تھے۔ شاید ایسا جان بوجھ کر کیا گیا تھا کہ میں اندازہ نہ کرسکوں کہ مجھے کہاں لے جایا جارہا تھا۔ سر پر غلاف بھی اسی مقصد سے پہنایا گیا تھا ورنہ یہ کام خفیہ ادارے والے کرتے ہیں۔ ہماری بادشاہ پولیس اس قسم کے فالتو تکلفات میں نہیں پڑتی ہے۔ تقریباً نصف گھنٹے بعد جب میں خدشات میں دبلا ہوگیا تھا موبائل ایک جھٹکے سے رکی اور پولیس والے نیچے اترے۔ یہاں بھی سناٹا تھا۔ کسی نے مجھے بازو سے پکڑ کر نیچے اتارا اور بولا۔

”لے بھئی آگئی تیری منزل بہت بے تاب تھا آنے کے لیے۔“

”بک بک نہ کر۔“ کسی نے اسے ڈانٹا۔ ”اسے لے جا... چشتی صاحب آگئے نا تو تیری...“ آگے کی [illegible] ناقابلِ اشاعت تھی لیکن مجھے اس سے یہ پتا چل گیا [illegible] صاحب بھی یہیں آرہے تھے۔ مجھے بازو سے پکڑ کر اندر لے جایا گیا اور پھر دھکیل کر کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ میرے [illegible] بدستور پشت پر بندھے تھے اور چہرے پر غلاف تھا۔ اندر سناٹا تھا جب کہ کسی تھانے میں ایسا سناٹا مشکل سے ملتا کیونکہ معمول کی تفتیش کا عمل تو دن میں بھی جاری رہتا۔ اس کے علاوہ لوگوں کی آمدورفت اور گاڑیوں کا شور ہوتا مگر یہاں ایسی آوازیں عنقا تھیں۔ ایسا سناٹا تھا جیسے عمارت میں ویرانی ہو۔ ہم احاطے میں داخل ہوئے تھے تو [illegible] گیٹ یقیناً کھلا تھا اور عمارت زیادہ بڑی تھی۔ مجھے سامنے والے حصے میں لایا گیا تھا۔ میرے کانوں نے کچھ دیر بعد ایک اور گاڑی کے انجن کی آواز سنی۔ شاید یہ اکرم چشتی کی موبائل تھی۔ اس کے چند منٹ بعد دونوں گاڑیوں کے انجن اسٹارٹ ہوئے اور وہ اس جگہ سے روانہ ہوگئیں۔

کیا پولیس والے یہاں سے واپس جارہے تھے؟ میرا پہلا مفروضہ درست تھا تو ان کا کام ختم ہوگیا تھا وہ اصل پولیس والے تھے لیکن اکرم چشتی انہیں جس کام کے لیے لایا تھا جب وہ کام ہوگیا تو اس نے انہیں رخصت کردیا تھا۔ اب میں اکرم چشتی یا مرشد کی تحویل میں تھا اور قانون کا اس معاملے سے تعلق نہیں تھا۔ چند منٹ بعد کسی کے بھاری قدموں کی آواز آئی اور میرے سر سے غلاف ایک جھٹکے سے اتار لیا گیا۔ سامنے اکرم چشتی اپنے منحوس چہرے پر خوشی سے بھرپور تاثرات سجائے موجود تھا۔ وہ اس بلی کی طرح مسکرا رہا تھا جس نے چوہے کو بے دست وپا کردیا ہو اور اب اسے کھانے سے پہلے اس خیال سے لطف اندوز ہو۔ اکرم چشتی کے بعد میں نے اس جگہ کو دیکھا اور محسوس کرلیا کہ یہ جگہ ویران تھی۔

میں جس جگہ موجود تھا یہ ترچھی لوہے کی چادر کی چھت والا کمرا تھا اور خاصا بڑا تھا بالکل کسی بیرک کی طرح۔ فرش پر مٹی اور پرندوں کی بیٹ کا ڈھیر تھا۔ کمرے کے ایک طرف بڑے سائز کی کھڑکیاں تھیں جن کے پٹ غائب ہوچکے تھے بلکہ یہاں سے ہر وہ چیز غائب ہوچکی تھی جو اکھاڑی جاسکتی تھی بس دیواریں تھیں اور اوپر سوراخوں والی ٹین کی چھت تھی۔ کھڑکیوں سے باہر درخت اور جھاڑیاں تھیں اور ان کے پاس کیا تھا یہ نظر نہیں آرہا تھا۔ اکرم چشتی کے عقب میں کمرے کا دروازہ تھا۔ میرا اندازہ درست تھا مجھے تھانے کے بجائے کہیں اور لایا گیا تھا۔ ”کیا حال ہیں اپنے ملک صاحب۔“ اس کی آواز میں بھی اتنی ہی خباثت تھی جتنی اس کی صورت پر تھی۔ ”بہت عرصے بعد ملاقات ہورہی ہے۔“

”میں نے بھی سؤر آخری بار نیشنل جیوگرافک میں دیکھا تھا مگر اس کے چہرے پر سؤرپن کم تھا۔“

میرے جواب پر اکرم چشتی کا چہرہ بگڑ کر سچ مچ کسی گندے سؤر جیسا ہوگیا وہ غرایا۔ ”بہت زبان چل رہی ہے ابھی ساری بکواس... سے نکل جائے گی۔“

میں ہنسا۔ ”میرا خیال ہے تمہاری بکواس اسی راستے سے نکلتی ہے۔ ویسے وہ کہاں ہیں تمہارے والدوں میں شامل... عزت مآب مرشد صاحب... انہی کے کہنے پر تم نے مجھے پکڑا ہے نا؟“

”میں نے تمہیں کسی کے کہنے پر نہیں پکڑا ہے۔“ اکرم چشتی.... ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔ ”تم سے پرانے حساب چکانے ہیں۔“

میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ ”ڈی ایس پی بن کر بھی تمہیں جھوٹ بولنا نہیں آیا۔ پرانے حساب چکاتے ہیں دشمنی نبھانے والے... تمہاری اتنی اوقات کہاں ہے تم مالک کے اشارے پر بھونکنے اور کاٹنے والے کتے ہو۔“

اس نے مشتعل ہوکر میرے منہ پر گھونسا مارا۔ یہ خاصا زوردار ہاتھ تھا اس کے پیچھے اس کی ساری قوت کے ساتھ اشتعال بھی تھا۔ میں نے بروقت اپنا منہ اس زاویے پر کرلیا کہ اس گھونسے کو جھیل سکوں ورنہ میرا جبڑا ابھی ٹوٹ سکتا تھا۔ مجھے اپنے منہ میں خون کا ذائقہ محسوس ہوا شاید گال اندر سے پھٹ گیا تھا۔ میں نے تھوکا تو اس میں خون بھی شامل تھا۔ تکلیف کو نظر انداز کرکے میں مسکرایا۔ ”میرا اندازہ غلط تھا تم اتنے ناکارہ بھی نہیں ہوئے ہو کم سے کم بندھے آدمی پر اپنا زورِ بازو آزما سکتے ہو۔“

اچانک کسی نے عقب سے میری گردن میں رسی ڈال کر اسے پیچھے کھینچ لیا۔ میرا سانس رکنے لگا تھا۔ رسی ڈالنے والے نے اسے اتنا سخت نہیں کیا تھا کہ میرا دم بالکل گھٹ جاتا مگر گرفت اتنی سخت ضرور تھی کہ میں مشکل سے سانس لے رہا تھا۔ اکرم چشتی نے لگاتار کئی گھونسے میرے سینے اور پیٹ میں مارے اور دانت نکوس کر بولا۔ ”شہباز ملک بہت جلد تمہیں اپنی بے قابو زبان پر افسوس ہوگا۔“

عقب میں موجود شخص نے مجھے زبان درازی کی سزا دی تھی۔ کچھ دیر وہ رسی کھینچتا رہا پھر اس نے اکرم چشتی کے اشارے پر رسی ڈھیلی کردی اور میری رکنے والی سانس بحال ہوگئی۔ میں نے چند گہرے سانس لینے کے بعد کہا۔ ”میں افسوس کرنے والوں میں سے نہیں ہوں اور اگر میں زبان بند رکھوں تو کیا تم وہ سب نہیں کروگے جس کی حسرتیں تمہارے دل میں مچل رہی ہیں۔ نہیں اکرم چشتی اگر تمہارا بس چلے تو میرے ساتھ بدترین سلوک کروگے لیکن مجھے لگ رہا ہے فی الحال مجھ پر تمہارا بس نہیں ہے۔“

اکرم چشتی کے چہرے پر آنے والے تاثرات نے میری بات کی تصدیق کردی تھی اس نے ایک گندی گالی کے ساتھ کہا۔ ”ایک بار تو پوری طرح میرے ہاتھ آجائے پھر دیکھنا۔“

میں مسکرانے لگا غالب نے کیا خوب کہا ہے کہ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے۔ انسان کی بے شمار خواہشیں ہوتی ہیں مگر افسوس ان میں سے بہت کم پوری ہوتی ہیں۔ پھر میں سنجیدہ ہوگیا۔ ”تم لوگوں نے میرا سراغ کیسے لگایا؟“

اکرم چشتی اب سگریٹ سلگا رہا تھا۔ اس نے اپنے اشتعال پر قابو پالیا تھا۔ ایک گہرا کش لے کر اس نے کہا۔ ”بہت آسانی سے... پولیس کے مخبر راجا عمر دراز کی کوٹھی کی نگرانی کررہے ہیں۔ جیسے ہی تم وہاں پہنچے ہمیں پتا چل گیا تھا۔“

”تب تم نے کوٹھی پر چھاپا کیوں نہیں مارا؟“

وہ عیاری سے مسکرایا۔ ”کیونکہ تمہاری گرفتاری ظاہر نہیں کرنی تھی۔ کوٹھی پر چھاپا مارتے تو کئی لوگ گواہ بن جاتے اس لیے تمہیں راستے سے اٹھایا گیا اب کوئی گواہ نہیں ہے کہ پولیس نے تمہیں گرفتار کیا ہے۔“

”تم راجا صاحب کے ملازموں کو بھول رہے ہو تم نے ان کے سامنے مجھے گرفتار کیا ہے۔“

”وہ کچھ بھی کہتے رہیں ان کی بات کون سنے گا۔“

اس کی یہ بات مجھے ہضم نہیں ہوئی تھی کہ پولیس کے مخبر عبداللہ والی کوٹھی کی نگرانی کررہے تھے اور انہوں نے مجھے کوٹھی میں دیکھ لیا تھا۔ عبداللہ نے اس قسم کے انتظامات کر رکھے تھے کہ میری آمد خفیہ رہے اور کوٹھی کے باہر سے اندر

دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے اکرم چشتی کی یہ بات جھوٹ تھی۔ ابھی پولیس کے مخبر اتنے تیز نہیں ہوئے تھے کہ وہ اندر کی بات جان جاتے‘ اس کے پیچھے کوئی اور چکر تھا۔ مجھے خیال آیا کہ پولیس کے لیے کوٹھی کے کسی ملازم کو توڑ لینا مشکل نہیں تھا۔ اسے ڈرا دھمکا کر اور لالچ دے کر اپنا آلہ کار بنایا جاسکتا تھا پولیس سے کون بیر لے سکتا ہے اس سے آسان تو دریا میں مگر مچھ سے بیر لینا ہے۔ یہ زیادہ آسان کام تھا مجھے دیکھتے ہی پولیس کے اس مخبر نے کال یا ایس ایم ایس سے اطلاع کردی ہوگی۔ تیس چالیس افراد میں سے کسی ایک کا بک جانا بعید نہیں تھا۔

”ٹھیک ہے پولیس کے مقابلے میں کسی عام فرد کی بات کون مانے گا لیکن جب راجا صاحب اس پولیس گردی کی رپورٹ کریں گے تب تو اعلیٰ حکام توجہ دیں گے۔“

”لیکن راجا صاحب یہ نہیں فرمائیں گے کہ ان کی گاڑی میں پولیس کو مطلوب مجرم موجود تھا ورنہ وہ اس کی کیا وضاحت کریں گے۔ وہ زیادہ سے زیادہ پولیس پر اپنے ملازموں کو ہراساں کرنے کا الزام لگا سکتے ہیں۔ مگر اسے کون تسلیم کرے گا جب کہ گاڑی اور ملازموں پر ایک نشان بھی نہیں پڑا ہے۔“

”ممکن ہے اس کے کچھ ثبوت جمع ہو گئے ہوں۔“ میں نے کہا۔

”کیا مطلب! کیسے ثبوت؟“ اس نے مشکوک نظروں سے میری طرف دیکھا تو میں معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

”اکرم چشتی تم ڈی ایس پی بن کر بھی احمق ہی رہے کیا تمہیں نہیں معلوم کہ آج کل کیمرے والے موبائل بچوں کے پاس بھی ہوتے ہیں۔ گاڑی کے ڈرائیور کے پاس بھی تھا اور اس نے میری گرفتاری کی تصاویر بنائی ہوں گی ان کے ہوتے ہوئے بھلا کون میری گرفتاری سے انکار کر سکے گا۔“ اگرچہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میرے موبائل میں کیمرا نہیں تھا اور مجھے گارڈ و ڈرائیور کا خیال نہیں آیا تھا۔ درحقیقت مجھے اس چیز کا ہی خیال نہیں آیا تھا۔ مگر یہ بات اکرم چشتی کیسے جان سکتا تھا۔ اب اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا تھا اور اس کے چہرے پر بارہ بج گئے اس نے کمزور لہجے میں کہا۔

”بکواس کرتے ہو۔“

”چلو جی بکواس ہی صحیح۔“

”یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ اچانک دروازے کی طرف سے آواز آئی اور میں نے وہاں مرشد علی کو کھڑے دیکھا۔ وہ کب خاموشی سے چلا آیا تھا ہمیں پتا ہی نہیں چلا۔ اکرم اسے دیکھ کر بوکھلا گیا تھا۔

”جناب... آپ۔“

مرشد نے سرد لہجے میں کہا۔ ”تم گدھے ہو... تمہیں گاڑی اور اس میں موجود افراد کی تلاشی لینی چاہیے تھی۔“

”دیکھا میں بھی یہی کہہ رہا تھا لیکن جعلی ڈگری والے ڈی ایس پی بن جانے سے عقل ڈی ایس پی والی نہیں آ جاتی۔“

اکرم چشتی نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور بولا۔ ”یہ بکواس کر رہا ہے جناب‘ ان لوگوں کے پاس کوئی کیمرے والا موبائل نہیں تھا ورنہ میرے آدمی لے لیتے۔“

”تمہارے آدمی...“ میں ہنسا تو اکرم چشتی کا غصے سے برا حال ہو گیا۔ اگر مرشد موجود نہ ہوتا تو شاید وہ مجھ پر پل پڑتا اور میرا حشر نشر کر دیتا۔ مرشد نے ناگواری سے میری طرف دیکھا۔

”شہباز اپنا جوکر پن ختم کرو اور سنجیدگی سے بات کرو۔“

”میں بالکل سنجیدہ ہوں لیکن یہ اکرم چشتی مجھے ہنسا رہا ہے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ میں اپنی ہنسی کا گلا گھونٹ لوں تو چلو یہ بھی کر لیتا ہوں۔“

مرشد اپنے مخصوص حلیے کے بجائے اس وقت پتلون اور ماؤ کوٹ میں تھا۔ اس کے پیروں میں بہترین اور چمکتے پمپی شوز تھے۔ یہ فرض تو مشکل تھا کہ وہ یہاں اکیلا آیا تھا اس کا محافظ ٹولا یقیناً کہیں آس پاس موجود تھا۔ ویسے اسے یہاں صرف مجھ سے خطرہ تھا اور میں بے بس اور بندھا ہوا تھا۔ مرشد نے خاص نظروں سے اکرم چشتی کی طرف دیکھا۔ اس نے کہا۔ ”جناب عالی یہ خطرناک آدمی ہے۔“

”میں اسے تم سے زیادہ جانتا ہوں۔“ مرشد نے سرد لہجے میں کہا۔ ”اب تم اپنے پلٹے سمیت یہاں سے دفع ہو جاؤ۔“

اکرم چشتی دم دبا کر اپنے آدمی سمیت باہر چلا گیا۔ وہ عزت بے عزتی سے بے نیاز تھا۔ اس کے نزدیک اہم وہ چیز تھی جو وہ بہر صورت حاصل کر لیتا تھا۔ اس کے جانے کے بعد مرشد نے کہا۔ ”شہباز میں نے تمہیں یہاں صرف بات کرنے کے لیے بلایا ہے۔“

”اکرم چشتی تو کہہ رہا تھا کہ مجھ سے پرانے حساب بے باق کرنے ہیں‘ یہ تم میرے منہ پر نشان دیکھ رہے ہو یہ اس کی طرف سے ایڈوانس تھا۔ ایسے میں تمہاری بات پر کیسے یقین کیا جاسکتا ہے؟“

”تم نے اسے اشتعال دلایا ہوگا۔ میں دیکھ رہا تھا تم مسلسل اسے مشتعل کر رہے تھے۔ دشمنوں کے ساتھ تمہارا یہی رویہ ہے جو مسائل کو حل ہونے نہیں دیتا ہے۔ میں نے پیشکش کی کوشش کی کہ مسائل...“

”مرشد یہ سب باتیں تم اس کے سامنے کیا کرو جو تمہیں جانتا نہ ہو۔“ میں نے تلخی سے کہا۔ ”پچھلے دنوں بھی تم نے مسائل حل کرنے کی کوشش کی تھی میرے ساتھیوں کی زندگی تھی جو وہ بچ گئے ورنہ تم نے انہیں مار دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔“

”میں کہہ چکا ہوں وہ فاضلی کی اپنی کوشش کی تھی‘ میں نے اسے ایسا کرنے کا حکم نہیں دیا تھا۔“

”خوب تم نے شکاری کتے کا پٹا ڈھیلا چھوڑ دیا اور جب کتے ہوا سے شکار کرنے کا حکم نہیں دیا تھا۔“

”دیکھو میں یہ مانتا ہوں میں نے اسے تمہارے خلاف کھلا چھوڑ دیا تھا لیکن یہ سب کرنے کا حکم نہیں دیا تھا یہ سب اس کی اپنی پلاننگ تھی۔“

میں نے محسوس کیا کہ اس بحث کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ مرشد نہیں مانے گا اور مجبور میں تھا۔ اس لیے میں نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے بات کو آگے بڑھانے کے لیے میں تمہاری بات مان لیتا ہوں۔“

اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ ”شہباز میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی کہتا ہوں۔ میں اس بلاوجہ کی جنگ سے باہر نکلنا چاہتا ہوں میرے سامنے اور مقاصد ہیں اور میں اب اس چکر میں اپنی توانائی ضائع کرنا نہیں چاہتا۔“

”چلو تمہاری یہ بات بھی مان لی جائے کہ تم اس جنگ کو ختم کرنا چاہتے ہو لیکن تمہارا طریقہ کار بتا رہا ہے تم اصل میں دشمن کو ختم کرنا چاہتے ہو۔ جب دشمن باقی نہیں رہے گا تو دشمنی خود بہ خود ختم ہو جائے گی۔“

خلاف توقع مرشد مشتعل ہونے کے بجائے مسکرایا۔ ”اگر ایسا ہوتا تو تم اس وقت زندہ نہ ہوتے۔ جو پولیس والے تمہیں میرے حکم پر گرفتار کر کے یہاں لا سکتے ہیں وہ تمہیں موقع پر چھلنی کر سکتے تھے اور کوئی ان پر انگلی بھی نہ اٹھاتا، تم پولیس کو مطلوب مجرم ہو اور مسلح حالت میں ایک گاڑی میں اپنے مسلح ساتھیوں کے ہمراہ گھوم رہے تھے۔ پولیس کے روکنے پر تم نے فائرنگ کی اور پولیس کی جوابی فائرنگ سے تم مارے گئے۔ اسے کون غلط کہتا؟“

”میرے ساتھی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”انہیں کوئی قائل نہیں کر سکتا اور وہ تمہیں نہیں چھوڑتے۔ مرشد مہربانی کر کے اصل موضوع پر آؤ، تمہاری مجبوری کی وجہ تمہاری شرافت یا اعلیٰ ظرفی نہیں ہے۔ بلکہ ہماری طرف سے طاقت کا وہ اظہار ہے جس نے تمہیں یقین دلایا ہے کہ مقابلہ اب برابری کا ہے۔ کالی کوٹھی کی تباہی نے تمہیں یہ بات سمجھا دی تھی لیکن افسوس تم نے ہٹ دھرمی نہیں چھوڑی۔“

مرشد کے سرخ چہرے پر غیظ کی سیاہی ایک لمحے کے لیے غالب آئی تھی مگر فوراً ہی اس نے خود پر قابو پا لیا۔ ”میرا خیال ہے ہمیں ان باتوں کو ماضی کا حصہ بنا دینا چاہیے۔“

”ٹھیک ہے اگر تم چاہتے ہو تو میں مستقبل کی بات کرتا ہوں۔“

”پہلے تم اپنے مطالبات سامنے رکھو، تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“

”میں تم سے صرف یہ چاہتا ہوں کہ میری اور میرے ساتھیوں کی جان چھوڑ دو۔ اپنے شکاری کتوں کو پیچھے ہٹا لو اور مجھے ہمیشہ کے لیے بھول جاؤ۔ اپنے باقی مسائل سے میں خود نمٹ لوں گا۔“

”مجھے منظور ہے۔“ اس نے کہا۔ ”جواب میں میرا ایک... بلکہ دو مطالبے ہیں۔ پہلا تم فاضلی کو چھوڑ دو۔“

”ٹھیک ہے چھوڑ دیں گے ویسے بھی وہ اب کسی کام کا نہیں رہا ہے۔“

مرشد کے چہرے پر تشویش نظر آئی تھی۔ ”کیا مطلب؟“

”جب وہ تمہارے پاس پہنچے گا تو اسے دیکھ لینا۔“

”دیکھو شہباز اسے کچھ ہوا تو......“

”تو تم مجھے توپ دم کر دو گے۔“ میں نے ہنس کر طنز کیا۔ ”ابھی تو تم تنازعات کو ماضی کا حصہ بنانے کا بھاشن دے رہے تھے۔“

مرشد نے گہری سانس لے کر خود پر قابو پایا ویسے فاضلی کے لیے اس کی تشویش دیکھ کر مجھے فاضلی کی بات درست لگی تھی کہ وہ اس کا فطری بیٹا تھا (انگریز حرامی اولاد کو

فطری اولاد کہتے ہیں)۔ مرشد خود ڈیوڈ شا کا پیروکار تھا اس لیے فاضلی کو اس کی فطری اولاد کہا جا سکتا تھا۔ مگر فاضلی کا یہ اندازہ غلط تھا کہ مرشد کو اس بارے میں علم نہیں ہے۔ اسے فاضلی سے انسیت ہو سکتی تھی لیکن یہ اتنی بھی نہیں تھی کہ وہ اس کی فکر میں گھلا جاتا اور میری ہر بات مان لیتا۔ میں نے کہا۔ ''اپنا دوسرا مطالبہ بتاؤ۔''

''میں نادر کی واپسی بھی چاہتا ہوں۔''

''نادر میرے پاس نہیں ہے۔''

''شہباز جھوٹ مت بولو... میں جانتا ہوں اور تم بھی جانتے ہو نادر کہاں ہے۔ اس کے حوالے سے مجھ پر خاندان والوں کا بہت دباؤ آ رہا ہے۔ میں نے اب تک اس بات کو گھر سے باہر نکلنے سے روکا ہے۔ کیونکہ مجھے یقین ہے نادر کو کسی ایجنسی نے نہیں بلکہ تم نے اٹھایا ہے۔''

''نہ مانو۔'' میں بے پروائی سے کہا۔ ''جو حقیقت ہے وہ میں نے بتا دی ہے۔''

مرشد مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ''شہباز حقیقت میں دوسرے طریقے سے بھی معلوم کر سکتا ہوں۔''

''تو معلوم کر لو تمہیں کس نے روکا ہے؟ میں تو ویسے ہی بے بس اور تمہارے قبضے میں ہوں۔''

''میں تمہیں اپنے جلادوں کے حوالے نہیں کرنا چاہتا ورنہ وہ تمہاری ساری خوش فہمی دور کر دیں گے۔''

''مجھے کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔ مجھے وہ منظر آج بھی یاد ہے جب تمہارے جلادوں نے مجھے ڈرانے کے لیے ایک مظلوم لڑکے کو ڈنڈے مار مار کر ہلاک کر دیا تھا جس نے اپنی ماں کے غائب ہونے پر احتجاج کیا تھا۔ صرف مجھے ذہنی اذیت دینے کے لیے وہ اس لڑکے کی لاش پر بھی ڈنڈے برساتے رہے تھے حتیٰ کہ اس کی ساری ہڈیاں توڑ کر اسے گوشت کے ایک لوتھڑے میں بدل دیا تھا۔''

مرشد اب کمرے میں ٹہلنے لگا تھا۔ ''تمہارے ساتھ اس سے بھی زیادہ ہو سکتا ہے۔''

''میں نے کہا نا تم آزاد ہو اپنی مرضی کرنے کے لیے... ظاہر ہے تم نے صرف مذاکرات کے لیے تو اتنی زحمت نہیں کی ہوگی۔''

''میں چاہتا ہوں معاملہ خراب ہوئے بغیر نمٹ جائے۔''

''اگر تمہارا مطالبہ نادر ہے تو میں پہلے ہی بتا چکا ہوں وہ میرے پاس نہیں ہے ہاں فاضلی کو حوالے کرنے پر بات ہو سکتی ہے وہ ویسے بھی ہمارے لیے بیکار ہو گیا ہے۔''

''اسے کیا ہوا ہے؟''

''پکڑنے کی کوشش میں اس کے سر پر چوٹ [illegible] وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ [illegible] باتیں کرتا رہا اور تمہیں اپنا والد ماجد قرار دیتا رہا۔'' [illegible] روانی سے جھوٹ میں سچ ملایا اور مرشد کے چہرے [illegible] اثر دیکھ کر مجھے دلی مسرت ہوئی تھی۔ ''ہم نے ایک [illegible] بلا کر دکھایا۔ اس نے اسے چوٹ کا صدمہ قرار دیا [illegible] کہنا تھا کہ یہ کیفیت عارضی بھی ہو سکتی ہے اور مستقل [illegible] ابھی اس بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے ویسے اس کی جان کو خطرہ نہیں ہے۔''

''اسے میرے حوالے کر دو، میں اسے بہتر ڈاکٹروں کو دکھاؤں گا۔''

میں نے تعجب سے مرشد کی طرف دیکھا۔ ''اتنا [illegible] اپنے بھائی کے لیے بھی پریشان نہیں ہو جتنا فاضلی کے [illegible] ہو رہے ہو کہیں اس نے سچ تو نہیں کہا تھا۔''

''کیا کہا تھا؟'' مرشد نے بے خیالی میں پوچھا۔

''یہ کہ تم ہی اس کے والد ماجد ہو۔''

''احمقانہ باتیں مت کرو۔'' مرشد نے اپنی کیفیت چھپاتے ہوئے کہا۔ ''تم خود بتا رہے ہو کہ وہ بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔''

''ہاں لیکن بعض اوقات انسان اس کیفیت میں [illegible] بھی تو بول دیتا ہے جیسے نشے میں انسان بہکتا ہے اور [illegible] بول دیتا ہے۔ بہرحال حقیقت جو بھی ہو اگر تم فاضلی کو [illegible] چاہتے ہو تو تمہیں مجھے چھوڑنا ہوگا۔''

''ایسے نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ [illegible] فاضلی کو چھوڑا جائے گا اس کے بعد ہی تمہاری رہائی عمل میں آئے گی۔''

''اس کے لیے تمہیں میرے ساتھیوں سے بات کرنی ہو گی، مجھ سے کچھ کہنا بیکار ہے۔ وہی فیصلہ کر سکتے ہیں [illegible] فاضلی کو چھوڑنا ہے یا نہیں۔''

مرشد کی آنکھوں میں خطرناک چمک نمودار [illegible]

''انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''اس کا پتا تو اس وقت چلے گا جب تم ان سے [illegible] کرو گے۔ ویسے کیا نادر سچ مچ غائب ہے؟''

وہ چونکا۔ ''کیا مطلب؟''

''مرشد تم بہت بڑے ڈرامے باز ہو۔ کیا اس کا امکان نہیں ہے کہ نادر کو تم نے خود غائب کر دیا ہو اور دکھاوے کے لیے واویلا کر رہے ہو؟''

''میں اسے کیوں غائب کرنے لگا؟''

''کیونکہ نادر اور تمہارے درمیان اختلافات پیدا ہو چکے تھے۔ میرا خیال ہے وہ گدی نشینی کے اس کاروبار میں اپنا برابر کا حصہ مانگ رہا ہوگا لیکن تم یہ حصہ دینے کے لیے تیار نہیں ہو گے۔''

''یہ بکواس ہے اس کے اور میرے درمیان اختلاف کی اصل وجہ تم ہو۔ وہ تم سے انتقام کے لیے پاگل ہوا جا رہا تھا اور میں اس سے متفق نہیں تھا جب اس نے میرے علم میں لائے بغیر تمہارے بھائی کا قتل کروایا تب سے میرے اور اس کے درمیان اختلاف آ گیا تھا۔ میں نے اسے محدود کر دیا اور اس کے گرد اپنے آدمی لگا دیے تاکہ وہ میرے علم میں لائے بغیر کوئی حرکت نہ کر سکے۔ میں نے اسے سمجھایا کہ اب یہ چکر ختم کرے لیکن وہ میری ایک سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ مجبوراً مجھے اس کی کفالت سے بھی ہاتھ اٹھانا پڑا۔ مجھے معلوم ہے دولت کے بغیر وہ اتنا ہی بیکار ہے جتنا سانپ زہر کے بغیر ہو سکتا ہے۔''

''تمہارے خاندان کے دوسرے لوگ اس کی مدد نہیں کرتے تھے؟''

''نہیں وہ تو خود میرے ٹکڑوں پر پلتے ہیں وہ نادر کی کیا مدد کرتے۔ نادر جس کوٹھی میں رہ رہا تھا وہ اس کے نام ہے اور کچھ جمع پونجی اس کے پاس ہو گی لیکن مجموعی طور پر وہ خالی ہاتھ تھا۔ مجھے امید تھی کہ چند دنوں میں اس کا دماغ ٹھکانے آ جائے گا لیکن وہ اس سے پہلے ہی غائب ہو گیا یا اسے اٹھا لیا گیا۔''

''تم ایک بار پھر سارا الزام نادر پر لگا رہے ہو کیا یہ غلط ہے کہ اسے اصل میں تمہاری شہ حاصل رہی ہے۔''

''کبھی تھی۔'' اس نے اعتراف کیا۔ ''لیکن جب میں نے محسوس کیا کہ یہ دشمنی میرے لیے نقصان دہ ہے تو میں نے اس سے ہاتھ کھینچ لیا اور اسے بھی سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ سمجھنے کے لیے تیار نہیں، عمر بھر کی معذوری نے اس کا دماغ الٹ دیا تھا۔''

''تم شاید جانتے نہیں ہو ایک بار نادر نے مجھ سے ملاقات کی تھی اس وقت بھی میں اسی طرح بے بس تھا اور اس نے بھی دشمنی ختم کرنے کی بات کی تھی اور الزام تم پر لگایا تھا۔''

مرشد غالباً دم بہ خود رہ گیا تھا۔ ''مجھ پر... کیا مجھ سے تمہاری دشمنی براہ راست ہے۔ یہ سارا کھیل تو اسی کا تھا۔''

''وہ بھی یہی بات کہہ رہا تھا وہ اب دشمنی ختم کرنا چاہتا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''تم دونوں بھائی ایک ہی زبان بول رہے ہو۔ لیکن تم ایک چیز فراموش کر رہے ہو، وہ ہے میرے بے گناہ بھائی کا خون۔''

''مجھے اس کا احساس ہے اور میں براہ راست اس میں ملوث نہیں ہوں لیکن تم چاہو تو میں اس کا خون بہا ادا کرنے کو تیار ہوں۔ ہمارا دین اس کی اجازت...''

''مرشد دین کی باتیں تم جیسے شخص کے منہ سے اچھی نہیں لگتی ہیں، دین سے تمہارا اتنا ہی واسطہ ہو سکتا ہے جتنا گٹر میں رہنے والے چوہے کا صفائی ستھرائی سے ہو سکتا ہے اس لیے تم دنیا کے لحاظ سے بات کرو۔''

مرشد نے اس مثال پر برا نہیں منایا۔ ''جیسی مرضی تمہاری، لیکن اب میں کیا کر سکتا ہوں اگر نادر تمہارے قبضے میں ہے تو تم اس سے معلوم کر سکتے ہو کہ تمہارے بھائی کا قتل اس کے اشارے پر ہوا تھا یا نہیں۔ میں یہ کر سکتا ہوں تمہارے مقدمات ختم کرا دوں اور تمہارا جو مالی نقصان ہوا ہے اس کی تلافی کر دوں۔''

''اس کے بدلے تم چاہتے ہو کہ میں فاضلی کو تمہارے حوالے کر دوں۔''

''ہاں۔''

''ٹھیک ہے تب مجھے آزاد کر دو اور اپنا وعدہ پورا کرو جیسے ہی میرے خلاف مقدمات ختم ہوں گے میں فاضلی کو تمہارے حوالے کر دوں گا۔''

''مقدمات اتنی جلدی ختم نہیں ہوں گے۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کروں گا۔ انتظامیہ، پولیس اور سماعت کرنے والی عدالت پر دباؤ ڈالنا ہوگا تب کہیں جا کر یہ کام کئی مہینوں میں ہوگا تم جانتے ہو اب میں اس حکومت میں شامل نہیں رہا ہوں اس لیے میرا اثر بھی پہلے جیسا نہیں ہے۔''

''اس پر بھی تم دن دہاڑے پولیس کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کر سکتے ہو۔'' میں نے طنز کیا۔

''اکرم چشتی میرا خاص آدمی ہے لیکن باقی پولیس میری زرخرید نہیں ہے۔ جب تک میرا سرکاری اختیار تھا وہ میری بات ماننے پر مجبور تھے اب ایسی کوئی مجبوری نہیں ہے۔''

وہ اپنی مجبوری بڑھا چڑھا کر بیان کر رہا تھا۔ اصل میں یہی مقدمات میرے لیے مسئلہ تھے۔ اگر میں اس پھندے سے نکل جاتا تو مرشد مجھ پر دباؤ نہیں رکھ سکتا تھا کیونکہ طاقت کا توازن اب برابر تھا۔ لیکن قانون کے سامنے وہ معزز تھا اور میں ایک مجرم۔ میں نے سوچ کر کہا۔ ''تمہارا مطلب ہے پہلے فاضلی کو تمہارے حوالے کر دیا جائے اس کے بعد تم کچھ کرو گے اگر تمہیں اس چیز کا احساس تھا تو تم نے پہلے ہی میرے خلاف مقدمات کیوں نہیں ختم کرا دیے۔''

وہ چونکا۔ ''میں... ایسا کیسے کرسکتا تھا۔ اپنے دشمن کو جان بوجھ کر کون رعایت دیتا ہے، یہ تو لو اور دو کا معاملہ ہے۔ اگر تمہارے پاس جواب میں دینے کے لیے کچھ نہیں ہے تو میں تمہیں کیوں دوں؟''

میں نے محسوس کیا کہ میں لاجواب ہو رہا تھا۔ مرشد میں حیرت انگیز تبدیلی آئی تھی پہلے وہ مجھ سے بدمعاشوں والے انداز میں پیش آتا تھا۔ مجھے اپنی طاقت اور فرعونیت سے مرعوب کرنے کی کوشش کرتا تھا لیکن اب وہ مجھ سے برابری کی سطح پر دلائل سے بات کر رہا تھا اور میرے لیے پہلے سے زیادہ مشکل ثابت ہو رہا تھا۔ ''پھر تم کیا چاہتے ہو؟''

''میں چاہتا ہوں تم اپنے ساتھیوں سے رابطہ کرو اور ان سے کہو فاضلی کو رہا کر دیں اس کے بعد میں اور تم مل کر طے کریں گے کہ اس جنگ کو ختم کرنے کے لیے ہمیں کیا کرنا ہے۔''

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا تم مجھے احمق سمجھتے ہو کہ میں ایسا کروں گا۔ تم پر بھروسا کسی صورت ممکن نہیں ہے۔ اگر فاضلی کی رہائی کے بعد بھی تم نے مجھے چھوڑنے سے انکار کیا یا اس جہان سے کوچ کرا دیا تو میں کیا کرلوں گا۔ ابھی تم ہی نے تو کہا تھا کہ یہ اس ہاتھ لو اور اس ہاتھ دو والا کھیل ہے۔''

''بالکل ممکن ہے تم اپنی پوزیشن پر غور کرو تو تمہیں یہ ممکن نظر آئے گا۔'' اس نے اصرار کیا۔ ''مجھے بہر صورت فاضلی واپس چاہیے اور اگر مجھے اس کے لیے کسی حد سے گزرنا پڑے تو میں گزر جاؤں گا۔''

اس کے الفاظ میں واضح دھمکی تھی۔ میں اپنی پوزیشن پر پہلے ہی غور فرما چکا تھا اور میں نے تسلیم کرلیا تھا کہ میں بہت بڑی مشکل میں پڑ گیا ہوں۔ مرشد مجبور تھا لیکن اتنا بھی نہیں تھا کہ اسے میری کھال اتروانی پڑتی یا دو چار [illegible] تڑوانی پڑتیں تو وہ زیادہ تامل کرے۔ مگر ضروری نہیں [illegible] میں مرشد کے سامنے اپنی کمزوری کا اقرار کرتا۔ اس لیے [illegible] نے اوپری بے پروائی سے کہا۔ ''ٹھیک ہے تم چاہو تو میرے ساتھ پرانا والا سلوک کر سکتے ہو یقیناً تمہارے دل کی [illegible] ساری حسرتیں نکلی ہوں گی تو بہت ساری رہ گئی [illegible] چاہو تو باقی حسرتیں بھی نکال سکتے ہو۔''

مرشد کسی قدر مایوس ہوا تھا۔ ''شہباز تم کیوں خود کو مشکل میں ڈال رہے ہو، فاضلی کو میں بہر صورت [illegible] حاصل کرلوں گا۔ اگر تم بات نہیں کرو گے تو میں براہ راست تمہارے ساتھیوں سے بات کروں گا اور وہ تمہیں بچانے کے لیے میری بات ماننے پر مجبور ہو جائیں گے۔''

''اگر تمہارا یہ خیال ہے تو ایسا بھی کر کے دیکھ لو۔ لیکن یاد رکھنا حالات خراب کرنے کی ذمے داری بھی تم پر آئے گی۔ ابھی تو تمہیں ہیلی کاپٹر والی حرکت کا حساب [illegible] ہے۔''

وہ چوکنا ہو گیا۔ ''کیا کرو گے تم؟''

''جب کروں گا تب تمہیں خود پتا چل جائے گا [illegible] سے کیا کہہ سکتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''مگر ایک بات اپنے ذہن میں اچھی طرح بٹھا لو مرشد کہ ہماری طرف سے [illegible] حرکت کا بھرپور جواب دیا جائے گا۔''

اچانک اکرم چشتی اندر آیا۔ اس نے مرشد سے کہا۔ ''جناب عالی میں نے کہا تھا، یہ کتے کی دم ہے ایسے نہیں مانے گا اسے میرے حوالے کریں اور دیکھیں اس کا باپ بھی بتائے گا۔''

وہ چھپ کر ہماری گفتگو سن رہا تھا۔ مرشد نے اسے ناپسندیدہ انداز میں دیکھا لیکن اسے پہلے کی طرح جھڑکا نہیں تھا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا اور غالباً یہی سوچ رہا تھا کہ مجھے چشتی کے حوالے کرے یا نہ کرے۔ اس کا کچھ دیر پہلے [illegible] مفاہمانہ رویہ ایک دھوکا تھا اور شاید وہ جانچ رہا تھا کہ [illegible] کتنے پانی میں ہوں۔ دوسری طرف وہ ڈر رہا تھا کہ میرے اغوا کا نہ جانے کیا ردعمل سامنے آئے۔ کالی کوٹھی کی تباہی نے اسے سمجھا دیا تھا کہ جوابی کارروائی میں ہم اس سے کسی طرح کم نہیں تھے۔ میں نے ہیلی کاپٹر والے واقعے کا حساب کا بھی کہا تھا۔ وہ بجا طور پر مشکل میں تھا کہ میرے ساتھ کیا سلوک کرے۔ اگر وہ مجھے اکرم چشتی کے حوالے کر دیتا تو اس کا خمیازہ بھی اسے بھگتنا پڑتا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ فاضلی کو واپس حاصل کرنے کے لیے بے تاب تھا۔ سوال تھا کہ وہ فاضلی کے لیے اتنا بے تاب کیوں ہو رہا تھا؟ فاضلی ایسی کوئی بات جانتا تھا جو ہم اس سے اگلوا لیتے تو یہ مرشد کے لیے اچھا نہیں ہوتا؟ یقیناً ایسی ہی کوئی بات تھی ورنہ مرشد کی اس طرح اپنے کسی آدمی کے لیے بے چینی میرے لیے نئی چیز تھی۔ آدمی اس کے لیے استعمال کی چیز تھے وہ ان کو ٹشو پیپر سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔ جہاں تک فاضلی کا اس کے نطفے سے ہونے کا تعلق تھا تو مرشد جیسے عیاش آدمی کی ایسی نہ جانے کتنی اولادیں کہاں کہاں موجود تھیں۔ ظاہر ہے وہ ان کی پروا کرنے والا بھی نہیں تھا۔ مجھے اپنا یہی خیال درست لگا تھا کہ فاضلی کسی ایسی بات سے واقف تھا جو مرشد ہر صورت ہم سے چھپانا چاہتا تھا۔ اس کی واپسی کے لیے وہ اس حد تک چلا گیا کہ اس نے مجھے پکڑوا لیا۔ جب کہ وہ جانتا تھا اس کا ردعمل آئے گا۔ مرشد کی آواز سن کر میں سوچ کی دنیا سے باہر آیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''شہباز تمہارے لیے یہ آخری موقع ہے اپنے آدمیوں سے بات کرو اور ان سے فاضلی کو چھوڑنے کو کہو، میں وعدہ کرتا ہوں جیسے ہی فاضلی میرے پاس آیا میں تمہیں رہا کر دوں گا۔''

''خوشی سے مر نہ جاتے جو اگر اعتبار ہوتا۔'' میں نے تلخی سے کہا۔ ''مرشد مجھے بے وقوف سمجھنا چھوڑ دو۔''

اس نے گہری سانس لی۔ ''تو تم یوں نہیں مانو گے۔ ٹھیک ہے اکرم یہ اب تمہارے حوالے ہے۔''

اس دوران میں اکرم چشتی ٹہلتا ہوا میری پشت کی طرف آ گیا تھا اور پوری طرح تیار تھا۔ مرشد کی بات سنتے ہی میں نے کرسی سے اٹھنے کی کوشش کی تھی کہ میرے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ اکرم چشتی نے کسی سخت چیز سے بڑا سخت وار کیا تھا۔ میں نیچے گر گیا اور ذہن پر کسی آکٹوپس کی طرح چھائی تاریکی سے لڑنے لگا۔ اسی تاریکی میں مجھے مرشد کی آواز سنائی دی۔ ''یاد رہے اسے بہ ظاہر کچھ نہیں ہونا چاہیے۔''

''فکر نہ کریں جناب عالی۔'' اکرم چشتی نے کہا۔ ''اسے خراش بھی نہیں آئے گی اور آپ کا مقصد بھی پورا ہو جائے گا۔''

یہ آخری الفاظ تھے جو میں نے سنے اور اس کے بعد میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا تھا۔ بہت عرصے بعد میں اپنے بدترین دشمنوں کے قبضے میں آیا تھا اور آنے والا وقت میرے لیے نہ جانے کون سی مصیبتیں لانے والا تھا۔

☆☆☆

مجھے ہوش آیا تو میں ایک غلیظ قسم کی کوٹھری کے گندے فرش پر یوں پڑا تھا کہ میرے جسم پر سوائے ایک انڈرویئر کے اور کچھ نہیں تھا۔ رات ہو چکی تھی کیونکہ میں سردی محسوس کر رہا تھا۔ دن میں موسم خوشگوار ہوتا تھا لیکن رات کو کسی قدر خنکی ہو جاتی تھی۔ میرا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا اور جب میں نے سر اٹھانے کی کوشش کی تو اندر یوں جھکڑ سے چلنے لگے کہ کوٹھری میری نظروں کے سامنے گھوم کر رہ گئی۔ اس کے ایک طرف لوہے کی سلاخوں والا دروازہ لگا تھا اور باہر سے کسی مدقوق سے بلب کی پیلی بیمار روشنی اندر آ رہی تھی۔ پہلی کوشش کے بعد میں نے سر کوٹھری کے سرد اور نم فرش پر رکھ دیا اس سرد نمی سے مجھے بہت سکون ملا تھا۔ چند منٹ بعد میں نے دوبارہ کوشش کی اور اٹھ بیٹھا۔ کوٹھری مشکل سے آٹھ بائی آٹھ فٹ کی تھی اور اس کی دیواریں سرخ اینٹوں سے بنی تھیں، اوپر پکی چھت تھی۔ یعنی میں اس جگہ نہیں تھا جہاں مرشد نے مجھ سے ملاقات کی تھی۔

یہ شاید مرشد کا کوئی عقوبت خانہ تھا، کم سے کم اس کوٹھری سے تو ایسا ہی لگ رہا تھا۔ میں ایک طرف دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور دل میں سوچا کہ برے پھنسے۔ مرشد نے اکرم چشتی کے حوالے کر دیا تھا۔ پولیس والے ویسے ہی ایسے تشدد کے ماہر ہوتے ہیں جس میں بندہ مرنے کے قریب ہو جاتا ہے لیکن اس کے جسم پر کوئی نشان نہیں آتا ہے۔ مرشد فاضلی کے لیے بے چین تھا اور میں اپنے ساتھیوں سے رابطہ کر کے اسے کمزوری کا تاثر دینا نہیں چاہتا تھا۔ کم سے کم میں اتنی آسانی سے مرشد کی فرمائش پوری نہیں کرسکتا تھا۔ اس کوٹھری میں وقت کا اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا۔ بہ ظاہر یہ جگہ ہمہ وقت تاریک رہنے والی لگ رہی تھی۔ کوٹھری میں کوئی روشن دان نہیں تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ رات ہو چکی تھی اور مجھے تقریباً پانچ چھ گھنٹے بعد ہوش آیا تھا۔ میری حالت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اکرم چشتی نے تیاری کر لی تھی اور بس میرے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرے سر کا درد کم ہو رہا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد متلی کی سی کیفیت بھی ہو رہی تھی مگر کچھ دیر بعد یہ کیفیت ختم ہو گئی۔ اب میں بہتر محسوس کر رہا تھا۔ پولیس کے ہاتھوں اغوا کی خبر فوراً ہی میرے ساتھیوں تک پہنچ گئی ہوگی اور ندیم کے توسط سے انہوں نے معلوم کر

لیا ہوگا کہ میں پولیس کی تحویل میں نہیں ہوں۔ اس کے بعد صرف مرشد رہ جاتا ہوگا اگر عبداللہ کے ساتھیوں کو اکرم چشتی کا پتا چل جاتا تو پھر وہ جان جاتے کہ یہ کارروائی مرشد کی ہے۔ ویسے پولیس کی موجودگی ہی یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہوتی۔ میں نے مرشد سے جھوٹ کہا تھا کہ فاضلی ذہنی لحاظ سے معطل ہوگیا ہے۔ اگرچہ اس کا امکان کم تھا کہ وہ اس بات کی تصدیق کرسکتا۔ براہِ راست وہ میرے ساتھیوں سے نہیں پوچھ سکتا تھا اور اگر پوچھ لیتا تو وہ کون سا ٹھیک جواب دیتے۔ پھر مرشد نے اس اطلاع پر کسی خاص ردِعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اسے فاضلی کی دماغی حالت سے زیادہ اس کی ہماری تحویل میں موجودگی کی فکر تھی۔ اسے نکالنے کے لیے وہ اس حد تک چلا گیا تھا کہ مجھے اٹھوا لیا تھا۔

جب میں نے مرشد سے پہلے فاضلی کے حوالے سے بات کی تو اس نے بے پرائی ظاہر کی تھی۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے فاضلی اس کا ایک عام کرگا ہو جس کے ہونے یا نہ ہونے سے اسے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا ہے۔ اس کے بعد شاید حالات میں کوئی تبدیلی آئی اور مرشد فاضلی کو واپس حاصل کرنے کے لیے بے تاب ہوگیا۔ میں سوچ میں گم تھا کہ کوٹھری کا دروازہ کھلا۔ سامنے ایک تنومند شخص موجود تھا۔ اس نے پرانے زمانے کے حبشی غلاموں کی طرح صرف شلوار پہن رکھی تھی اور اس کا اوپری جسم ننگا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ حبشی نہیں تھا۔ "باہر آ..." اس نے گالی دے کر کہا۔

"تمہاری والدہ نے بلایا ہوگا، مگر ابھی موڈ نہیں ہے۔" میں نے اپنی جگہ سے ہلے بغیر کہا۔ "کسی اور کو لے جاؤ۔"

ظاہر ہے اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور وہ غراتا ہوا اندر آیا۔ جیسے ہی وہ نزدیک آیا میں نے دونوں ہاتھ زمین پر ٹیکتے ہوئے دونوں پاؤں بیک وقت اٹھا کر اس کی رانوں کے درمیان مارے۔ وار سخت اور نازک جگہ پر تھا اس کی غراہٹ دہاڑ میں بدل گئی اور پیٹ پکڑ کر واپس کوٹھری کے دروازے سے باہر جا گرا۔ لیکن اس سے پہلے میں اٹھتا اکرم چشتی نمودار ہوا اور اس نے اپنے ہاتھ میں موجود عجیب سے پستول کا رخ میری طرف کردیا۔ "مجھے پتا تھا تم ضرور حرامی پن کرو گے اس لیے میں تمہارا علاج بھی ساتھ لایا ہوں۔"

اس نے پستول کا ٹریگر دبایا تو میں بدک کر پیچھے ہوا۔ فطری طور پر مجھے خیال آیا کہ اکرم چشتی مجھے گولی مار رہا ہے لیکن اس پستول سے پن سی نکل کر میرے سینے میں اتر گئی اس سے ایک باریک تار منسلک تھا۔ اگلے ہی لمحے میں جیسے زلزلے کی زد میں آگیا اور میں اپنی جگہ گر کر بے بسی سے لرزنے لگا۔ خبیث اکرم چشتی نے مجھ پر کرنٹ مارنے والا آلہ آزمایا تھا۔ باہر ملکوں میں پولیس کے پاس اس طرح کے کرنٹ مارنے والے آلے موجود ہوتے ہیں لیکن پاکستان میں ابھی یہ پولیس کو مہیا نہیں کیا گیا ہے۔ وہ ویسے بھی کرنٹ لگانے کے ماہر ہوتے ہیں۔ اکرم چشتی نے اسے کہاں سے حاصل کیا تھا یا مرشد نے اسے مہیا کیا تھا۔ فاضلی کے کیس کے بعد سے مرشد کے آدمیوں کے پاس بھی جدید قسم کے غیر روایتی ہتھیار نظر آنے لگے تھے۔ مشتعل جلاد نے کوٹھری میں ہی میری گوشمالی کی کوشش کی لیکن اکرم چشتی نے اسے روک دیا۔ "اسے ہاتھ لگانے کی کوشش مت کرنا ورنہ کرنٹ کا اثر ختم ہوجائے گا اور یہ اپنی جگہ تمہیں لٹا دے گا۔"

"اس کی تو..." جلاد نے کہا لیکن اس نے اکرم چشتی کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے مجھ پر تشدد سے گریز کیا اور جھک کر مجھے اٹھا کر آٹے کی بوری کی طرح شانے پر لاد لیا۔ اس سے پہلے اکرم چشتی نے تار کھینچ لیا تھا میرے سینے سے پن نکل گئی۔ ان دونوں کے علاوہ ایک شخص اور تھا اور وہ شاید اس جیل کا نگراں تھا کیونکہ اس نے کوٹھری کے دروازے بند کرکے تالا لگایا تھا۔ ویسے وہ صرف نگراں تھا۔ مجہول سا اور شاید چرسی تھا۔ اپنا کام کرکے وہ کسی روبوٹ کی طرح چلتا ہوا مخالف سمت چلا گیا۔ جلاد مجھے ایک ہال نما کمرے میں لایا جس کا فرش کچا تھا۔ اس نے مجھے پٹخنے کے انداز میں زمین پر ڈال دیا۔ پھر لوہے کا ایک کڑا میرے دائیں ہاتھ میں اور دوسرا کڑا بائیں ہاتھ میں ڈال دیا۔ درمیان میں زنجیر منسلک تھی لیکن یہ بھی اتنی مضبوط تھی کہ میں کسی صورت اسے نہیں توڑ سکتا تھا۔ پھر اس نے ایک کونے میں جا کر کچھ کیا تو کسی مشین کی گڑگڑاہٹ کی آواز آئی اور زنجیر اوپر کھنچنے لگیں۔ ساتھ ہی میں بھی کھنچنے لگا اور اوپر اٹھتا چلا گیا۔ میرا جسم شاک کے اثر سے نکل کر کسی حد تک میرے قابو میں آگیا تھا لیکن میں مزاحمت کے قابل نہیں تھا اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ آنے والے لمحات میں مجھے بہت کچھ برداشت کرنا تھا اور میں ابھی سے خود کو اس کے لیے تیار کررہا تھا۔ ذرا دیر میں مشین نے زنجیروں کو اتنا کھینچ لیا کہ میں ہوا میں معلق ہوگیا اور میرے دونوں پاؤں بہ مشکل ہی زمین کو چھو رہے تھے۔ جلاد نے مشین بند کردی اور واپس آیا۔ اکرم چشتی اس دوران میں بڑے اسٹائل سے سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کا رویّہ اس مافیا باس کا سا تھا جس نے سب کچھ اپنے گرگوں پر چھوڑ دیا ہو اور اب اس کے پاس فراغت ہی فراغت ہو۔ میں زنجیروں سے لٹکا ڈھیلے ڈھالے انداز میں جھول رہا تھا اس لیے اکرم چشتی بے خطر میرے پاس چلا آیا اس نے دھواں میرے منہ پر چھوڑا اور استہزائیہ انداز میں بولا۔ "اور ملک صاحب کیسا لگ رہا ہے۔"

اس کا جواب میں نے عملاً دیا اور اچانک ہی دونوں پاؤں اوپر کرتے ہوئے انہیں اکرم چشتی کی گردن میں ڈال دیا۔ وہ اس حملے کے لیے قطعی تیار نہیں تھا ورنہ میرے پیروں کو بھی کوئی بندوبست کراکے میرے پاس آتا۔ گردن میں قینچی لگاتے ہی میں نے اسے جھٹکا دینے کی کوشش کی لیکن اتنی دیر میں وہ ہوشیار ہوگیا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ سے میرے پاؤں پکڑ لیے اور گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔ "مجھے... چھڑاؤ۔"

جلاد لپک کر آیا اور اس نے عقب سے میری کمر پر گردے والی جگہ پوری قوت سے مکے مارے۔ اس کے ہاتھوں میں واقعی بہت جان تھی دوسرے مکے پر میرا سانس رکنے لگا اور چوتھے مکے پر میں نے مجبوراً اکرم چشتی کو چھوڑ دیا۔ اسے بس ایک دو لمحے کی مہلت مل گئی تھی ورنہ میں اس کی گردن توڑنے یا اسے ایسا جھٹکا دینے میں کامیاب ہوجاتا کہ اسے قبر میں نہیں تو پھر اسپتال میں ہی ہوش آتا۔ مگر اس کی قسمت اچھی تھی۔ آزاد ہوتے ہی وہ جلاد پر برس پڑا تھا حالانکہ اس نے عقل سے کام لے کر اکرم چشتی کی جان بچائی تھی اگر وہ اسے احمقانہ انداز میں آزاد کرانے کی کوشش کرتا تو اس کا پورا امکان تھا کہ اکرم چشتی کی لاش ہی میرے پیروں سے آزاد ہو پاتی لیکن اس نے بالکل صحیح جگہ وار کرکے مجھے مجبور کردیا کہ میں اسے چھوڑ دوں۔ مگر اکرم چشتی نے اپنی فطرت کے مطابق اچھائی کا صلہ برائی سے دیا۔ وہ اس کی خاندان کی عورتوں کو بگھارتے ہوئے چلّا رہا تھا۔ "الو کے... کتے کی اولاد... اتنی دیر کی... ابھی یہ تیرا باپ میری گردن توڑ دیتا۔"

جلاد اب پچھتا رہا تھا کہ اس نے مجھے اکرم چشتی کی گردن کیوں توڑنے نہیں دی۔ وہ ایک معمولی ملازم تھا اس لیے سر جھکائے اکرم چشتی کی گالیاں سنتا رہا۔ جب اس کی بھڑاس نکلی تو اس نے روئے سخن میری طرف کیا اور ناقابلِ اشاعت الفاظ میں بتانے لگا کہ وہ اب میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ وہ سخت مشتعل تھا۔ اس نے جلاد کو حکم دیا۔

"اس... کے پیر باندھ دو۔"

وہ دو عدد زنجیروں سے منسلک کڑے لایا اور انہیں میرے پیروں میں ڈال دیا۔ یہ لاک نہیں ہوتے تھے بلکہ ہک تھے جنہیں دبا کر کھولا اور بند کیا جا سکتا تھا البتہ جسے پہنائے جاتے تھے وہ کسی صورت ہک نہیں دبا سکتا تھا۔ پھر اس نے کوئی دوسری مشین چلائی اور پاؤں والی زنجیریں پیچھے کی طرف کھنچنے لگیں اور میرا جسم کمان کی طرح مڑنے لگا۔ جب اس نے موٹر روکی تو میرے دونوں پاؤں تقریباً میری کمر تک آچکے تھے۔ ریڑھ کی ہڈی کمان بن چکی تھی اور پیٹ کے عضلات بری طرح کھنچ رہے تھے۔ اکرم چشتی میرے پاس آیا اور اس نے انتقامی طاقت سے بھرپور کئی گھونسے مسلسل میرے تنے پیٹ پر مارے اور یہ قیامت گھونسے تھے۔ عام حالات میں مجھ پر ان کا خاص اثر نہیں ہوتا لیکن اس حالت میں یہ بہت زیادہ لگ رہے تھے۔ میرے لیے سانس لینا بھی محال ہوگیا تھا۔ تکلیف سے میری آنکھوں میں پانی آگیا تھا۔

"کیسا لگ رہا ہے؟" اکرم چشتی نے شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔ "مزہ آرہا ہے نا۔" اس نے کہا اور پھر تین چار گھونسے مارے۔

"بہت۔" میں نے بہ مشکل کہا۔ "میری جگہ آکر دیکھو۔"

"تمہاری زبان اب بھی چل رہی ہے۔" وہ بولا اور پھر مجھ پر ٹوٹ پڑا تھا۔ اس بار وہ اس وقت رکا جب خود کی حالت بری ہوگئی تھی۔ وہ کتے کی طرح ہانپ رہا تھا۔ خود میری حالت یہ تھی کہ ہانپنا تو ایک طرف رہا مجھ سے سانس ہی نہیں لیا جارہا تھا۔ اس بار سچ مچ مجھ پر قیامت گزر گئی تھی۔ درد کے گولے تھے جو پیٹ سے اٹھ کر پورے جسم میں دوڑ رہے تھے۔ جب اکرم چشتی کا سانس قابو میں آیا تو اس نے چیخ کر کہا۔ "زنجیر اور اوپر کرو۔"

حکم کے غلام نے فوراً موٹر چلادی اور میرے پاؤں والی زنجیر مزید اوپر کی طرف کھنچنے لگی۔ میرا جسم مزید کمان ہونے لگا۔ اب جسم کا سارا زور ریڑھ کی ہڈی پر تھا اور دباؤ ناقابلِ برداشت ہوتا جارہا تھا۔ اس دباؤ کو کم کرنے کے لیے میں نے ہاتھوں کے بل اوپر ہونا چاہا تو یہ بھی ناممکن ثابت ہوا کیونکہ دونوں ہاتھوں میں کوئی چار فٹ کا فاصلہ تھا جسے کسی صورت کم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کڑے اس طرح سے کلائی میں فٹ تھے کہ میں ہاتھ گھما کر زنجیر بھی نہیں پکڑ سکتا تھا۔ ورنہ

زنجیر پکڑ کر خود کو تھوڑا اوپر کر کے کمر کو آرام دے سکتا تھا۔ اکرم چشتی آگے آیا اور مجھے تھپڑ مارتے ہوئے بولا۔
"کیسا لگ رہا ہے مزہ آرہا ہے نا؟"
مرشد کی ہدایت کے برعکس وہ مجھے فاضلی کی رہائی پر آمادہ کرنے کے بجائے تشدد کا نشانہ بنا رہا تھا۔ اس نے اب تک ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جس سے پتا چلے کہ اسے فاضلی کی رہائی سے کوئی دلچسپی ہے۔ اگر میرے ہاتھ پاؤں کھلے ہوتے تو اس وقت میرا اکرم چشتی کی گردن مروڑنے کو دل چاہ رہا تھا۔ میں اس آدمی پر اپنے الفاظ بھی ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے میں نے وہ کیا جو میرے بس میں تھا۔ میں نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ اس نے مشتعل ہو کر مجھے اتنی قوت سے تھپڑ مارے کہ ہر تھپڑ پر میرا منہ گھوم جاتا تھا۔ پھر اس نے اچانک میرے جسم کے زیرِ ناف حصے کو جکڑ لیا اور میں تڑپ کر رہ گیا۔ وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ "اب بول... کیسا لگ رہا ہے... مزہ آیا... بول... بولتا کیوں نہیں ہے۔"
میں کیا بولتا میں تو تڑپ بھی نہیں سکتا تھا۔ مگر درد کا مرکز بدل گیا تھا۔ مجھے ذہنی اذیت دینے کے لیے وہ مونا اور سویرا کے بارے میں بکواس کرنے لگا۔ وہ بتا رہا کہ میرے بعد وہ بھی یہاں آئیں گی اور وہ ان کے ساتھ میرے سامنے کیا سلوک کرے گا۔ میں درد برداشت کرتے ہوئے اس کی بکواس بھی نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ خود کو صبر کی تلقین کر رہا تھا اور سمجھا رہا تھا کہ کتا بھونک رہا ہے کیونکہ اس کا کام ہی بھونکنا ہے۔ وہ اپنے ہاتھ کا دباؤ کبھی کم کر دیتا تھا اور کبھی اچانک بڑھا دیتا۔ خدا خدا کر کے اس کی یہ اذیت رسانی ختم ہوئی۔ اس کا گندہ منہ بھی بند ہو گیا۔ میرے جسم پر پسینا پانی کی طرح بہہ رہا تھا اور اذیت سے بار بار میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ چند منٹ میں میرا اگلا اور زبان خشک چمڑے جیسے ہو گئے تھے۔ مگر یہاں پانی ملنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ یہ تو اذیتوں کا آغاز تھا آگے مجھے اس سے کہیں زیادہ برداشت کرنا پڑاتا۔
اکرم چشتی ایک کرسی پر ڈھیر ہو کر سستا رہا تھا اور ساتھ ہی سگریٹ کے گہرے کش لے رہا تھا۔ پیٹ پر لگنے والی ضربوں کی وجہ سے مجھے متلی کی کیفیت ہونے لگی اور جب دھواں مجھ تک آیا تو یہ کیفیت مزید بڑھ گئی اور میں نے الٹی کر دی۔ مجھے کھانا کھائے ہوئے آٹھ نو گھنٹے ہو چکے تھے اس لیے معدہ تقریباً خالی تھا۔ میں ابکائیاں لیتا رہا اور کچھ نکلا نہیں۔ جب میری حالت کسی قدر سنبھل گئی تو وہ اٹھ کر پاس آیا لیکن اتنا قریب نہیں آیا کہ میں اس پر تھوک سکتا حالانکہ اب اس پر تھوکنے کے لیے میرے منہ میں لعاب تو تھا نہیں بالکل خشک ہو رہا تھا میرا منہ۔ اس نے وہی بات کی جو میرے ذہن میں تھی۔ "یہ آغاز ہے... بہتر ہے مرشد بادشاہ کی بات مان لو۔"
"کون سی بات مان لوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے معلوم ہے میرے ساتھی صرف میرے کہنے سے فاضلی کو نہیں چھوڑیں گے وہ خود مرشد سے سودا کریں گے اور اپنی شرائط پر فاضلی کو اس کے حوالے کریں گے۔"
"بکواس مت کرو تم ان کے سرغنہ ہو وہ تمہاری بات کیسے ٹال سکتے ہیں؟"
"ہم میں کوئی کسی کا سرغنہ نہیں ہے ہم سب ساتھی ہیں اور سارے فیصلے مل کر کرتے ہیں۔"
اس نے میرے بال مٹھی میں جکڑے۔ "اگر تمہاری جان خطرے میں ہو تو وہ تب بھی نہیں مانیں گے؟"
"میں کیا کہہ سکتا ہوں وہ کیا فیصلہ کریں گے۔ مرشد سے کہو اُن سے براہِ راست بات کرلے۔ مجھ پر تشدد کرنے کا اسے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"
جلاد ایک کونے میں کھڑا تھا۔ اکرم چشتی نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور میرے کان کے پاس منہ لا کر بولا۔ "اسے ہو یا نا ہو مجھے تو ہوگا کب سے میری خواہش تھی تم میرے ہاتھ آؤ اور میں تمہیں تڑپا تڑپا کر ماروں۔"
"تو تم اپنی خواہش پوری کر رہے ہو اور مرشد کے حکم کی تمہارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے۔" میں نے جان بوجھ کر بلند آواز سے کہا۔ اکرم چشتی کے رویے نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ جلاد اصل میں مرشد کا آدمی ہے اور یقیناً یہ جگہ بھی مرشد کی تھی۔ مجھے یاد ہے ایک بار میں مرشد ہاؤس یا اس کے کسی اور ٹھکانے کے نیچے موجود مرشد کی نجی جیل میں رہ چکا تھا۔ لیکن وہ جگہ دوسری تھی۔ اس بار مجھے کہیں اور لایا گیا تھا۔ میری بات سن کر جلاد چونکا تھا۔ مگر اس نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی تھی۔ اکرم چشتی نے دانت پیسے۔
"تم اس حالت میں بھی اپنی حرامزدگی سے باز نہیں آرہے ہو۔"
"تم مرشد کو دھوکا دے رہے اس نے تمہیں یہ سب کرنے کا حکم نہیں دیا تھا۔ اگر مجھے نقصان ہوا تو مرشد کو بھی نقصان ہوگا اور یہ تمہاری وجہ سے ہوگا۔"
"اس کتے کا منہ بند کرو۔" اکرم چشتی نے



غضبناک ہو کر جلاد کو حکم دیا اور اس نے تعمیل کرتے ہوئے ٹاٹ کا ایک ٹکڑا زبردستی میرے منہ میں ٹھونس دیا اس سے نہایت ناگوار بُو اٹھ رہی تھی۔ پھر اکرم چشتی نے اس سے کہا۔ "اسے تار لگاؤ۔"
تار لگانے کا مطلب میں اس وقت سمجھا جب جلاد نے میرے پیروں پر بجلی کی ننگی تار لپیٹ دی۔ میرے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی تھی وہ مجھے کرنٹ سے اذیت دینے جا رہے تھے۔ میں کچھ کہہ نہیں سکتا تھا اور اگر کہہ سکتا تب بھی کوئی فائدہ نہیں تھا اکرم چشتی وہی کرتا جو اس کے دل میں تھا۔ میں خود کو اس اذیت کے لیے تیار کرنے لگا۔ اس نے جلاد کی طرف دیکھ کر سر ہلایا اور اس نے بجلی کا سوئچ آن کر دیا میرے جسم کو شدید جھٹکا لگا اور بجلی میرے جسم میں جیسے آگ اور تیزاب بن کر دوڑنے لگی۔ میں مستقل جھٹکے کھا رہا تھا اور ہر جھٹکے پر جیسے جان نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ دنیا کی کوئی اذیت ایسی جان لیوا نہیں ہوتی ہے جو بجلی کی اذیت سے بڑھ کر ہو۔ آدمی کے جسم کا ایک ایک ریشہ جیسے ہل جاتا ہے اور ہر رگ اور پٹھا کھنچ کر تڑخ جاتا ہے۔ نہ جانے یہ دورانیہ کتنا طویل تھا ایک منٹ یا ایک گھنٹا لیکن جب اکرم چشتی کے اشارے پر جلاد نے سوئچ آف کیا تو مجھے لگا نہ جانے کتنے عرصے بعد مجھے اس اذیت سے نجات ملی تھی۔ اس بار پسینا یوں بہہ رہا تھا کہ باقاعدہ نیچے پکی زمین پر گر رہا تھا اور میرے جسم سے جیسے آگ نکل رہی تھی۔ گلا اور منہ پہلے بہت بہتر حالت میں تھا لیکن اب لگ رہا تھا اس میں جلتی ہوئی خشک ریت بھر دی گئی ہو۔ میں مردہ حالت میں زنجیروں سے بندھا جھول رہا تھا۔ اکرم چشتی میری حالت سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور غالباً سوچ رہا تھا کہ اب میری اذیت کا نیا سامان کرے۔ مجھ میں بولنے تو کیا سوچنے کی ہمت بھی نہیں رہی تھی۔
"کیا خیال ہے شہباز مرشد بادشاہ کی بات مانو گے یا..."
میں نے نفی میں سر ہلایا۔ اس نے پھر جلاد کو اشارہ کیا اور اس بار بے ہوشی نے مجھے اذیت سے بچا لیا تھا۔ جھٹکوں کا آغاز ہوتے ہی میں ہوش وحواس سے بیگانہ ہو گیا تھا۔ مجھے ہوش آیا تو میں کچے فرش پر پڑا تھا۔ زنجیریں اس حد تک ڈھیلی کر دی گئی تھیں کہ میں زمین پر آ گیا تھا۔ اکرم چشتی ایک طرف کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور جلاد غائب تھا۔ میرا چہرہ گیلا تھا

## زیلم خاں

(1952ء سے 2004ء) چیچنیا کے سابق صدر۔ وہ سرائے آتفی (گروزنی) میں پیدا ہوئے۔ 1981ء میں چیچن انگش اسٹیٹ یونیورسٹی سے چیچن اور روسی ادب میں ماسٹرز کی ڈگری لی۔ اس کے بعد ماسکو لٹریچر انسٹی ٹیوٹ سے پوسٹ گریجوایشن میں ڈپلوما لیا۔ ایک سیاسی رہنما ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ادیب اور شاعر بھی تھے، ان کی شاعری کے پانچ مجموعے شائع ہوئے۔ وہ چیچن انگش روسی کے علاوہ عربی زبان بھی جانتے تھے۔ 1989ء میں انہوں نے ایک سیاسی جماعت وائی نخ ڈیموکریٹک پارٹی تشکیل دی۔ انہوں نے ابخازیہ کے دارالحکومت نحومی میں قفقاز کی مظلوم قوموں کا کنونشن بھی بلایا، جس میں پورے قفقاز سے لوگ شریک ہوئے۔ اکتوبر 1991 کے انتخابات میں جوہر دودائف صدر منتخب ہوئے تو انہیں وزیر اعظم کے عہدے پر فائز کر دیا گیا۔ سوویت یونین کے آخری دور میں روس میں بغاوت کے دوران چیچنیا کی آزادی کا اعلان کر دیا۔ اپریل 1996ء میں صدر جوہر دودائف شہید کر دیا گیا تو انہیں ملک کا صدر بنا دیا گیا۔ مئی 1996ء میں روسی صدر یلسن اور ان کے مابین اندر بے کے درمیان جنگ بندی اور جنگی قیدیوں کے تبادلے کا معاہدہ ہوا۔ اگست 1996ء کو روس کی قومی سلامتی کے چیف الیگزنڈر لیبڈ اور اسلان مسخادوف کے مابین معاہدۂ امن طے پایا۔

مرسلہ: محمد تقی، جھنگ صدر

شاید ہوش میں لانے کے لیے میرے منہ پر پانی پھینکا گیا تھا۔ میں نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر نمی کے چند قطرے جذب کر لیے۔ یہ چند قطرے ہی اس وقت نعمتِ عظیم سے کم نہیں تھے۔ جو میرے منہ کے پیاسے صحرا میں یوں غائب ہو گئے جیسے بارش کے چند چھینٹے صحرائے اعظم میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے ہیں۔ اکرم چشتی مجھے ہوش میں آتے دیکھ رہا تھا لیکن وہ سکون سے اپنی جگہ بیٹھا رہا تھا اسے معلوم تھا اول تو مجھ میں کچھ کرنے کی ہمت نہیں تھی دوسرے زنجیریں بس اس حد تک ڈھیلی کی گئی تھیں کہ میں زمین پر آ گیا تھا اگر میں کھڑا ہو جاتا تب بھی چند قدم سے زیادہ حرکت نہیں کر سکتا تھا۔

جلاد کہیں گیا ہوا تھا وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ربر چڑھے مضبوط فولادی پائپ تھے۔ اس نے پائپ ایک طرف رکھے اور مجھے کڑوں سے آزاد کرا کے گھسیٹ کر ایک لکڑی کے تخت پر لٹا دیا۔ اس میں ہاتھ اور پیروں کو پھنسانے والے کلپس کڑے تھے اس نے میرے ہاتھ پاؤں ان میں پھنسا کر مجھے بالکل بے دست و پا کر دیا تھا۔ اب شاید مجھے ربر چڑھے فولادی پائپوں سے پیٹا جاتا۔ اپنا کام کر کے اس نے پائپ اٹھائے اور اکرم چشتی کی طرف دیکھا جو سگریٹ کے کش لیتا ہوا میری طرف آیا اور اس نے اچانک ہی سگریٹ کا جلتا سرا میرے سینے سے لگا دیا اور اس وقت تک لگائے رکھا جب تک وہ بجھ نہیں گیا۔ جسم ویسے ہی درد کا سمندر بنا ہوا تھا اس لیے اس سمندر میں ایک چھوٹا دریا اور گرتا تو اس سے کیا فرق پڑتا اسی طرح مجھے سگریٹ سے جلنے کی اذیت کا پتا بھی نہیں چلا تھا۔

”پانی ڈالو اس پر۔“ اکرم نے حکم دیا۔ ”لیکن منہ پر مت ڈالنا... اس کے منہ کے لیے میں نے خاص پانی رکھا ہے۔“

معروف مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی نے خون کے اس قطرۂ فساد کے لیے جو انسان کو مقتل کی طرف لے جاتا ہے فرمایا ہے کہ وہ ان کی زبان میں تھا تو کچھ ایسا ہی معاملہ میرے ساتھ بھی تھا۔ تکلیف کے باوجود میں بولنے سے باز نہیں آیا تھا۔ ”تم خود بھی شاید اسی خاص پانی کے عادی ہو۔“

اکرم چشتی سفاکی سے مسکرایا۔ ”مجھے معلوم ہے تم میں بہت دم خم ہے اور مجھے اس کی خوشی ہے اگر تم جلدی ہار مان جاتے تو مجھے مایوسی ہوتی۔ اب میں اپنے دل کی حسرتیں نکال سکوں گا۔“

نہ جانے کتنی دیر کمر کے بل لٹکے رہنے اور بجلی کے جھٹکے کھانے کے بعد اب مجھے ذرا سکون تھا لیکن میں جانتا تھا یہ سکون عارضی تھا۔ عذاب کا نیا دور شروع ہونے والا تھا۔ اس تختے پر باندھ کر کسی نئے مشقِ ستم کا نشانہ بنایا جانا تھا۔ جب جلاد اور اکرم چشتی نے ربر چڑھے لوہے کے پائپ سنبھالے تو میں تیار تھا۔ اکرم چشتی نے گھٹنے پر ہلکی سی ضرب لگائی۔ ”اب مزہ آئے گا جب میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے تکلیف دوں گا۔“

اس کے اشارے پر جلاد نے پہلے ضرب [illegible] اور اس کا نشانہ میرے بائیں پاؤں کا تلوا تھا۔ میں تڑپنا چاہتا تھا لیکن تڑپ نہیں سکا تھا۔ کڑوں نے پوری طرح جکڑ رکھا تھا۔ فوراً ہی اکرم چشتی نے دوسری ضرب لگائی۔ اس نے زیادہ قوت استعمال کی تھی۔ پھر ان دونوں کے ہاتھ مشینی انداز میں چلنے لگے۔ پاؤں کے تلوے پر لگنے والی ضرب کا اثر میرے دماغ تک آتا تھا۔ میرے اعصاب تڑخنے لگے۔ کچھ دیر تو میں برداشت کرتا رہا پھر تکلیف میری برداشت سے باہر ہوئی تو میں چلّانے لگا۔ اکرم چشتی ہنسا۔

”تمہاری چیخیں سن کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔“

اس کی بات سن کر میرا دماغ الٹ گیا تھا۔ میں اسے ماں بہن کی گالیاں دینے لگا اور ایسی دھمکیاں دینے لگا جن پر عمل کرنا فی الحال میرے بس کی بات نہیں تھی۔ اسی طرح چلّاتے اور بولتے ہوئے نہ جانے کب مہربان بے ہوشی نے اپنے قبضے میں لے لیا۔ یہ لمبی بے ہوشی نہیں تھی جلاد نے پانی کا گلاس میرے منہ پر ڈالا تو میں جھرجھری لے کر ہوش میں آ گیا اور بے اختیار کراہنے لگا۔ پیروں میں قیامت کا درد ہو رہا تھا۔ لیکن جلاد اور اکرم چشتی نے اس کی پروا کیے بغیر مجھے زبردستی اٹھایا اور چلانے لگے۔ میں انہیں برا بھلا کہہ رہا تھا۔ میں جانتا تھا یہ ضروری تھا اس طرح چلنے سے میرے پیروں میں جم جانے والا خون پھر سے رواں ہو جاتا ورنہ یہ خون مستقل جم جاتا تو میں چلنے سے معذور بھی ہو سکتا تھا۔ وہ دس پندرہ منٹ مجھے اسی طرح چلاتے رہے حتیٰ کہ تلووں کی تکلیف کم ہونے لگی۔ پھر جلاد ایک بالٹی میں گرم پانی لے آیا اور مجھے اس میں پیر رکھنے کو کہا تو میں نے لات مار کر بالٹی الٹ دی۔ ”اپنی مہربانیاں اپنے پاس رکھو۔“

پانی کے چھینٹے اڑ کر اکرم چشتی تک گئے تھے اس نے پولیس نصاب کی چند منتخب گالیاں دیں اور جلاد کو حکم دیا۔



”اسے زنجیروں سے باندھ دو۔“

میں نے مزاحمت کی واجبی سی کوشش کی مگر جلاد نے نہایت آسانی سے میرے ہاتھ کڑوں سے باندھ دیے اور پھر موٹر چلا کر زنجیر کو کھینچ لیا۔ اب میں کھڑا ہوا تھا اور اگلے مرحلے کا سوچ کر میری روح فنا ہو رہی تھی جب وہ میرے پیر بھی باندھتے اور مجھے پھر سے کڑی کمان بنا دیتے۔ مگر جلاد نے صرف ہاتھوں میں کڑے ڈالے تھے۔ اکرم چشتی نے اسے تار لگانے کو کہا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے اب تک میں... تکلیفیں برداشت کی تھیں ان میں کرنٹ سب سے زیادہ اذیت ناک تھا۔ جیسے ہی جلاد نے سوئچ آن کیا میں جاڑے کے بخار کے مریض کی طرح لرزنے لگا تھا۔

☆☆☆

مجھے ہوش آیا تو میں کوٹھری میں پڑا ہوا تھا۔ میرا جسم ایسا ہو رہا تھا جیسے اس میں ہڈیاں باقی نہ ہوں اور میں صرف نرم گوشت کی کوئی جیلی فش قسم کی مخلوق بن کر رہ گیا ہوں۔ اس نرم گوشت میں تکلیف لہروں کی طرح دوڑ رہی تھی۔ درد جیسے ریشے ریشے میں سرایت کر گیا تھا۔ میں نے سنا ہے کہ موت کی تکلیف کچھ ایسی ہوتی ہے جیسے کانٹے دار جھاڑی میں الجھ جانے والے نازک کپڑے کو یک دم کھینچ لیا جائے اور وہ لیر لیر ہو جائے۔ اگرچہ یہ موت کی تکلیف نہیں تھی لیکن میں کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا تھا۔ اس عقوبت خانے میں آج مجھے دو دن ہو گئے تھے لیکن یہ دو دن دو صدیاں بن کر گزرے تھے جب میں نے سوائے اکرم چشتی اور مرشد کے جلاد کے... کسی کو نہیں دیکھا تھا اور انہوں نے مجھ پر ہر وہ مشقِ ستم توڑا تھا جس کا نشان میرے جسم پر نہ آئے لیکن وہ آزار بن کر میرے رگ و پے میں اتر جائے۔

ان دو دنوں میں اکرم چشتی نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا اسے صرف اذیت دینے سے غرض تھی۔ بعض اوقات وہ اتنی کامل بے حسی سے مجھ پر تشدد کرتا تھا جیسے میں انسان نہیں کوئی پتھر یا کسی درخت کا بے جان تنا ہوں جس میں درد محسوس کرنے کی حس نہیں ہوتی ہے۔ میرا چیخنا اور کراہنا اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ لیکن نہیں معنی رکھتا تھا میری چیخیں اور کراہیں اس کے لیے اضافی انعام ہوتی تھیں۔ مجھ پر مشقِ ستم کر کے اسے جو خوشی ملتی تھی وہ دوگنی ہو جاتی تھی۔ ان دو دنوں میں تکلیف برداشت کرنے کے علاوہ میں نے جو واحد کام کیا تھا وہ دل میں کیا جانے والا عہد تھا جسے میں نے بار بار دہرایا کہ اگر مجھے موقع ملا تو میں اکرم چشتی کو اتنی ہی اذیت دوں گا۔ یہ بات میں نے اسے بتا بھی دی تھی لیکن اس کے لیے اس دھمکی کی بھی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

پہلے دن کئی گھنٹے بعد جب مجھے کوٹھری میں واپس لایا گیا تو میں اپنے پیروں پر چل بھی نہیں پا رہا تھا اور جلاد مجھے کھینچتا ہوا لایا تھا۔ میں کچے فرش پر پڑتے ہی ایسا غافل ہوا کہ مجھے سولہ گھنٹے بعد ہوش آیا۔ یہ بات مجھے جلاد نے بتائی ورنہ یہاں وقت کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ اس نے مجھے اٹھا کر دال چاول کا ایسا آمیزہ کھانے کو دیا جسے شاید جانور بھی کھانے سے انکار کر دیں لیکن میں نے بے تابی سے کھایا کیونکہ جسم کی تکلیفوں کے ساتھ اب بھوک بھی اذیت دینے لگی تھی۔ چوبیس گھنٹے بعد مجھے صرف ایک گلاس پانی دیا گیا تھا۔ مسلسل پسینا بہنے سے میں ڈی ہائیڈریشن کا شکار ہو گیا تھا۔ میری جلد سکڑ گئی تھی اور یہ خشک کاغذ جیسی ہو رہی تھی۔ کھانے کے چند گھنٹے بعد جلاد مجھے دوبارہ اسی جگہ لایا۔ اس بار اکرم چشتی نے ایک کیمرے کا بندوبست بھی کیا تھا جو مجھ پر کیے جانے والے تشدد کو ریکارڈ کرتا اور یہ ریکارڈنگ یقیناً میرے ساتھیوں کے لیے تھی۔ دوسرے دن بھی وہی سب دہرایا گیا۔ پانچ چھ گھنٹے میں نے طویل ترین عذاب میں گزارے۔ جب میں آخری بار بے ہوش ہوا تو پھر مجھے کوٹھری میں ہوش آیا تھا نہ جانے کس وقت مجھے لا کر یہاں پھینک دیا گیا تھا۔

کوٹھری کے باہر وہی پیلا منحوس روشنی والا بلب جل رہا تھا۔ میں نے سر گھما کر دیکھا تو ایک کونے میں دو پیالے رکھے نظر آئے۔ ان میں سے ایک میں پانی تھا۔ میں بے تابی سے اٹھا اور اس وقت اپنی تکلیف بھول کر پیالے کی طرف بڑھا۔ لیکن پانی پینے سے پہلے مجھے خیال آیا اور میں نے پورا پیالہ خالی کرنے کی خواہش پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے پانی گھونٹ گھونٹ کر کے پینا شروع کیا۔ یہ خاصا بڑا پیالہ تھا نصف پیالہ پی کر میں نے دوسرے پیالے کی طرف توجہ دی اس میں دلیا تھا۔ اپنی تمام تر شکستہ حالی کے باوجود میں اس پر ٹوٹ پڑا تھا۔ دلیا کھا کر میں نے باقی نصف پیالہ بھی پی لیا اور پھر یک لخت نقاہت کا شدید حملہ ہوا تھا۔ یہ بہت دیر بعد پیٹ میں کچھ جانے کا فطری ردِّعمل تھا۔ میں نڈھال ہو کر لیٹ گیا۔ کچھ دیر جاگنے کی کوشش کرتا رہا لیکن پھر نیند نے مجھے شکست دے دی نہ جانے میں کتنی دیر سوتا رہا پھر اچانک کسی نے میرے پیر پر ٹھوکر ماری۔ ”اٹھ نواب صاحب کی اولاد کیسے مزے سے پڑا سو رہا ہے۔“

میں نے آنکھ کھول کر ٹھوکر مارنے والے کو دیکھا۔ وہ جلاد تھا۔ میں نے کہا۔ ”اگر تمہیں اعتراض ہے تو آکر میری جگہ سو جاؤ تمہیں پتا چل جائے گا کہ کتنے مزے سے سو رہا ہوں۔“

پانی اور خوراک کے ساتھ آرام نے میری جسمانی حالت کو پہلے سے بہتر کر دیا تھا۔ تکلیف اب بھی تھی لیکن یہ قابلِ برداشت تھی۔ میرے جواب پر اس کے تاثرات بگڑ گئے تھے۔ ”اٹھ جا... آج تیرے ساتھ تیسرا راؤنڈ ہوگا۔“

”تیسرا راؤنڈ۔“ میں نے سوچا۔ ”یعنی آج تیسرا دن ہو گیا تھا۔“

میں نے اپنی جگہ سے حرکت کیے بغیر کہا۔ ”تم لوگ قسطوں میں مارنے کے بجائے ایک ہی بار میرا خاتمہ کیوں نہیں کر دیتے ہو؟“

”وہ بھی کریں گے جب مرشد بادشاہ کا حکم ہوگا۔ ابھی تو اتنا ہی کرنا ہے جتنا اس نے حکم دیا ہے۔“

بہ ظاہر یہ تشدد میری سمجھ سے باہر تھا۔ اگر انہوں نے یہ کام اس لیے کیا تھا کہ مجھے فاضلی کی رہائی کے لیے اپنے ساتھیوں سے بات پر آمادہ کر سکیں تو اس کی انہوں نے خاص کوشش نہیں کی تھی۔ اکرم چشتی اور اس جلاد کا سارا زور مجھے زیادہ سے زیادہ تکلیف دینے پر تھا۔ اگرچہ اکرم چشتی نے کہا تھا کہ وہ اپنی تسکین کے لیے مجھے تکلیف دے رہا ہے لیکن اس کی یہ وضاحت میرے دل کو زیادہ نہیں لگی تھی وہ اس کھیل کو اتنا لمبا نہیں کرتا اور جلد از جلد مجھے زیادہ سے زیادہ عذاب کے ساتھ مار دیتا۔ تو کیا یہ مرشد کا کھیل تھا اس کی خواہش تھی کہ مجھ پر اس طرح سے تشدد کیا جائے جس کا بہ ظاہر تو کوئی فائدہ نہیں تھا لیکن مکار مرشد اس سے کوئی فائدہ اٹھا رہا تھا۔ فی الحال میرا ذہن اس معاملے کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ گزشتہ روز میری وڈیو بنی تھی۔ اگر مرشد نے وہ وڈیو میرے ساتھیوں کو بھیجی تھی تو وہ ان سے کچھ بھی منوا سکتا تھا۔ وہ فاضلی کو رہا کرا سکتا تھا اور چالاکی سے کام لیتا تو نادر کو بھی حاصل کر لیتا۔ یقیناً اس نے کوشش کی ہوگی۔ مگر اب تو اس کھیل کو ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ یہ منحوس صورت جلاد کہہ رہا تھا آج تیسرا راؤنڈ تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے اٹھائے گا۔ لیکن اس نے چالاکی سے کام لیا اور پیچھے ہٹ کر وہی کرنٹ مارنے والا پستول نما آلہ نکال لیا۔ ”اٹھ جاؤ ورنہ پہلے یہیں کرنٹ کھانا پڑے گا۔“

میں کرنٹ کھانے کے لیے بالکل بھی تیار نہیں تھا اس لیے بادلِ ناخواستہ کراہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور بیچ بچ مجھے چکر آ گیا تھا۔ میں دیوار سے ٹک گیا ورنہ شاید گر جاتا۔ جب نظر کے آگے سے دھند ہٹی تو میں لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھا۔ جلاد نے مجھ سے فاصلہ رکھا تھا وہ پیچھے ہٹا اور کوٹھری سے نکل گیا۔ میری خواہش تھی کہ اس کے اور میرے درمیان فاصلہ کم ہو تو میں اپنی ناتوانی کے باوجود اسے دبوچنے کی کوشش کروں چاہے اس کوشش میں وہ مجھے کرنٹ ہی کیوں نہ لگا دے۔ مگر اس نے اس کا موقع ہی نہیں دیا۔ آج اکرم چشتی نہیں تھا۔ شاید اسے فرصت نہیں ملی تھی یا وہ کسی اور ضروری کام میں مصروف تھا۔ اس لیے صرف جلاد آیا تھا۔ مگر خلافِ توقع اس نے مجھے عقوبت خانے کی طرف لے جانے کے بجائے راہداری میں مخالف سمت چلنے کو کہا۔ میرے جسم پر بدستور وہی انڈر ویئر تھا اور یہ بھی اب نہایت میلا ہو گیا تھا۔ جلاد مجھے ایک کمرے میں لایا۔ یہ پکی اینٹوں والے فرش کا غسل خانہ تھا کیونکہ وہاں نہانے دھونے کا مکمل انتظام تھا۔ وہاں گرم اور ٹھنڈے پانی کی لائنیں تھیں۔ ایک طرف کھونٹی پر تولیا اور صاف ستھرا شلوار قمیص ٹنگا ہوا تھا۔

”لے بھئی اپنا آخری غسل خود کر کے یہ کفن پہن کر تیار ہو جا، ہم نے بس مٹی ڈالنی ہے اپنے لیے دعا بھی خود کر لینا۔“ جلاد نے اپنی طرف سے مذاق کیا تھا۔

”تم جس طرح میرے ساتھ ساتھ پھر رہے ہو لگتا ہے مرشد قبر میں بھی میرے ساتھ ہی ڈالے گا۔ میں بہت گناہ گار ہوں لیکن اتنے بڑے عذاب کا مستحق نہیں ہوں کہ تم وہاں بھی میرے ساتھ ہی رہو۔“

میرا مذاق اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اس نے غرا کر کہا۔ ”بکواس نہ کر جلدی نہا دھو لے ورنہ ایسے ہی لے جاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے لیکن اب تم تو دفع ہو۔ کیا مجھے غسل بھی دو گے۔“

وہ مجھے گھورتا ہوا باہر چلا گیا۔ دروازے میں معمولی سی چٹخنی تھی جسے ایک دھکے میں توڑا جا سکتا تھا اس کا صرف یہ فائدہ تھا کہ کوئی اچانک اندر نہیں آ سکتا تھا۔ میں اپنا واحد لباس اتار کر حالتِ فطرت میں آیا اور گرم پانی والا وال کھول کر شاور کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ گرم پانی نے میرے جسم کے درد پر جیسے جادو اثر کیا تھا۔ جسم سے میل کے ساتھ ساتھ درد بھی نچڑ کر نکلنے لگا۔ پندرہ منٹ بعد میں نہا دھو کر تازہ دم ہو گیا تھا۔ شلوار قمیص پرانا لیکن صاف ستھرا تھا۔ اسے پہن کر میں نے خود کو دوبارہ سے انسان محسوس کیا تھا جب تک انسان کے جسم پر لباس ہوتا ہے اس کی عزتِ نفس اس کی اپنی نظروں میں برقرار رہتی ہے لیکن جب لباس اتار لیا جاتا ہے تو انسان سب سے پہلے اپنی نظروں میں ذلیل ہو جاتا ہے۔ میں باہر آیا تو جلاد غائب تھا اور اس کی جگہ ایک اسمارٹ اور خوش شکل نوجوان کھڑا تھا لیکن اس کے ہاتھ میں وہی کرنٹ مارنے والا پستول تھا۔ میں اسے دیکھ کر ٹھٹکا۔

”غالباً تم نئے جلاد ہو؟“

وہ مسکرایا۔ ”نہیں جناب، میں مرشد صاحب کا سکریٹری ہوں۔“

اس کے شائستہ لہجے نے مجھے چونکا دیا کیونکہ یہ لہجہ اور آواز میرے لیے ناآشنا نہیں تھیں، میں نے کہا۔ ”تم وہ ٹیلی فون آپریٹر ہو جو مرشد ہاؤس میں کال ریسیو کرتے تھے۔“

”آپ نے خوب پہچانا... اس طرف آیئے۔“ اس نے راہداری میں مزید آگے کی طرف اشارہ کیا اور خود میرے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ صاف ظاہر تھا وہ کوئی رسک لینے کو تیار نہیں تھا۔ ایک جگہ سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں اور یہاں ایک بھیانک قسم کا گوریلا نما آدمی موجود تھا اس نے بہت بڑی سی رائفل اٹھا رکھی تھی۔ نوجوان کو وہ پہچانتا تھا لیکن میں اس کے لیے اجنبی تھا اس نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں پوچھا۔ ”یہ کون ہے؟“

”مرشد کا قیدی ہے اس نے طلب کیا ہے۔“ مجھے آپ جناب کرنے والے نوجوان نے خلافِ توقع مرشد کا ذکر یوں کیا جیسے وہ آپس میں لنگوٹیے یار رہے ہوں۔ مگر گوریلے نے اس کا برا نہیں منایا اور مرشد کا نام سن کر اس نے راستہ چھوڑ دیا تھا۔ ہم اوپر آئے۔ ایک ایسی راہداری میں نکلے جس کے دونوں طرف کمرے تھے اور ان کمروں کے بند دروازوں کے پیچھے جو کھیل کھیلا جا رہا تھا اسے سوائے گندگی کے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ نشے میں ڈوبی نسوانیت سے بھرپور آوازیں باہر تک آ رہی تھی۔ سچ یہ ہے کہ مجھے اس جگہ سے گزرتے ہوئے یوں پسینا آ گیا جیسے میں خود کسی غلط ارادے سے یہاں آیا ہوں اور مجھے خوف ہے کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے۔ نوجوان نے ان آوازوں کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ وہ ان کا عادی تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ خود بھی یہاں آتا ہو۔ ظاہر ہے یہ مرشد کے غلام تھے جو فارغ اوقات میں عیش کرتے تھے۔

میرا اندازہ تھا کہ ہم مرشد ہاؤس میں تھے اس کا مطلب تھا تہ خانے کے بارے میں میرا اندازہ غلط تھا کہ وہ کہیں اور تھا۔ شاید پہلے مجھے تہ خانے کے کسی اور حصے میں رکھا گیا تھا۔ مرشد کی یہ جیل بھی بہت بڑی تھی۔ اگرچہ میں نے اپنے سوا وہاں کسی کو نہیں دیکھا تھا لیکن یہ بات یقینی تھی کہ وہاں مرشد کے اور معتوب بھی موجود تھے۔ مرشد اپنی مخصوص شاہانہ نشست گاہ میں میرا منتظر تھا۔ خلافِ توقع وہ بہت سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے مجھے اپنے سامنے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جب میں بیٹھ گیا تو اس کے نوجوان سکریٹری نے عقب میں پوزیشن سنبھال لی۔ وہ پوری طرح چوکنا تھا کہ میں کوئی حرکت کروں اور وہ پستول استعمال کر سکے۔ مرشد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”شہباز مجھے افسوس ہے...“

میں نے اس کی بات کاٹی۔ ”اس میں افسوس کی کوئی بات نہیں ہے افسوس تو تم کرو گے جب میرا وقت ہوگا اور اکرم چشتی اپنے پیدا ہونے پر پچھتائے گا۔“

”اسے میں سزا دوں گا اس نے میرے حکم کے خلاف...“

”تمہارا حکم۔“ میں نے تلخی سے کہا۔ ”مرشد تم صاف کیوں نہیں کہتے کہ یہ سب تمہارے حکم پر ہوا ہے۔ میں نے تمہیں اتنا بزدل کبھی نہیں دیکھا۔“

اس نے ڈھٹائی سے کہا۔ ”اس نے میرے حکم سے تجاوز کیا۔ میں نے اسے یہ سب کرنے کو نہیں کہا تھا۔“

میں نے گہری سانس لی۔ ”ٹھیک ہے جو مجھ پر گزرنا تھی وہ میں نے بھگت لی۔ اب تم کیا چاہتے ہو، میں اپنے ساتھیوں سے اب بھی بات نہیں کروں گا۔“

”تمہاری بچت کی ایک ہی صورت ہے مجھے فاضلی واپس مل جائے زندہ سلامت اور ٹھیک ٹھاک۔“

”فرض کرو ایسا نہ ہوا تو...؟“

”ایسا مت کہو۔“ وہ مضطرب ہو گیا۔ ”شہباز ملک تم بہت مشکل میں پڑ جاؤ گے۔“

”فاضلی کے لیے تمہارا یہ اضطراب سمجھ میں نہیں آتا ہے، ٹھیک ہے وہ تمہارے لیے اہم ہے لیکن ہے تو ایک ملازم اور میں نے کبھی تمہیں رشتوں کی پروا کرتے نہیں دیکھا۔“

”تم اس بات کو نہیں سمجھو گے۔“ مرشد نے مبہم انداز میں کہا۔ ”اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے تم فاضلی کو واپس کر

دو۔ میں قسم کھانے کو تیار ہوں تمہیں چھوڑ دوں گا اور کوئی مطالبہ نہیں کروں گا۔ مجھے یقین ہے نادر تمہارے پاس ہے لیکن میں اس کا بھی مطالبہ نہیں کروں گا۔“

میں سوچ میں پڑ گیا۔ میں جس مصیبت میں پھنس چکا تھا اس سے نکلنا اہم تھا۔ فاضلی سمیت باقی سب باتیں ثانوی تھیں۔ اگر میں اسے ایک بار پکڑ سکتا تھا تو دوبارہ بھی پکڑ سکتا تھا۔ لیکن میرا مرشد کے چنگل سے نکلنا ضروری تھا۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ میں مرشد پر اعتماد نہیں کر سکتا تھا وہ وعدہ کر رہا تھا کہ فاضلی کو حاصل کرتے ہی وہ مجھے چھوڑ دے گا لیکن میرے اس وعدے کی اتنی اہمیت بھی نہیں تھی جتنی بھیڑ کے نزدیک بھیڑیے کے وعدے کی ہو سکتی ہے۔ اگر میں اس پر بھروسا کرتے ہوئے فاضلی کو رہا کرنے کا کہہ دیتا اور میرے ساتھی اسے چھوڑ بھی دیتے تب بھی مجھے ایک فیصد بھی یقین نہیں تھا کہ مرشد اپنے وعدے پر عمل کرے گا اور مجھے جانے دے گا۔ وہ غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ ”غالباً تمہارے دل میں میری طرف سے شک ہے؟“

”لازمی بات ہے۔“ میں نے صاف گوئی سے کہا۔

”کیا شک ہونا نہیں چاہیے۔ میں نے کبھی تمہیں اپنے قول و فعل کا پاس کرتے نہیں دیکھا۔ اس لیے تم مجھ سے توقع بھی مت رکھو کہ میں تم پر اعتماد کروں گا۔“

”تب یہ مسئلہ کس طرح حل ہوگا؟“

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ”آخر تم اتنا کیوں مُصر ہو کہ فاضلی کو پہلے رہا کیا جائے اور پھر تم مجھے چھوڑو گے۔ تم یہ تبادلہ ہاتھ کے ہاتھ کیوں نہیں کر لیتے۔“

”یہ ممکن نہیں ہے۔“ اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

مرشد جس طرح اصرار کر رہا تھا اس کا مطلب تھا کہ فاضلی کی واپسی کے بعد وہ اس سے کوئی خاص بات کرتا اور اس خاص بات پر ہی میری رہائی کا انحصار تھا۔ یہ خیال تو پہلے بھی آیا تھا کہ فاضلی کچھ خاص جانتا ہے جو مرشد نہیں چاہتا کہ کسی صورت ہمارے علم میں آئے۔ اس لیے وہ فاضلی کی پہلے واپسی چاہتا تھا اگر فاضلی وہ خاص بات ہمارے سامنے اگل چکا ہوتا تو مرشد میری رہائی ملتوی کر دیتا اور میرے ذریعے میرے ساتھیوں پر دباؤ بڑھاتا۔ اس نے مجھ پر تشدد کی وڈیو بھی اسی لیے تیار کرائی تھی۔ میں نے اچانک پوچھا۔ ”میری وڈیو دیکھ کر میرے ساتھیوں کا کیا ردِعمل تھا؟“

مرشد مسکرایا۔ ”ان کا کیا ردِعمل ہونا چاہیے۔

”وہ دکھی ہو گئے ہوں گے تمہیں گالیاں اور دھمکیاں بھی دی ہوں گی لیکن جہاں تک تمہارے مطالبے کا تعلق ہے اس پر انہوں نے کوئی خاص ردِعمل ظاہر نہیں کیا ہوگا۔“

”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟“

”اس کا ثبوت اس وقت یہاں میری موجودگی ہے اگر میرے ساتھی تمہاری بات مان چکے ہوتے تو تم میرے ساتھ مغزماری نہ کر رہے ہوتے۔“

وہ کھسیا گیا تھا۔ ”ٹھیک ہے انہوں نے انکار کیا ہے ان کا کہنا ہے جب تک وہ تم سے بات نہیں کر لیں گے مجھ سے مزید کوئی بات نہیں ہوگی۔“

میں نے دل ہی دل میں وسیم کی ذہانت کی داد دی۔ وڈیو دیکھ کر یقیناً باقی جذباتی ہو گئے ہوں گے لیکن اس نے خود پر قابو رکھا اور وہی فیصلہ کیا جو ان حالات میں، میں کر سکتا تھا۔ یہ طے تھا میری عدم موجودگی میں فیصلے کا اختیار وسیم کو ہوتا ہے اور اس نے بالکل مناسب فیصلہ کیا تھا۔ میں نے سر ہلایا۔ ”اس نے ٹھیک کیا۔“

”اس نے حماقت کی ہے۔“ مرشد مشتعل ہونے لگا۔ ”جب میں دوسری وڈیو بھیجوں گا تب ان کے ہوش ٹھکانے آئیں گے۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں تمہیں کوئی ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا دوں۔“

”تم ایسی کوئی حماقت نہیں کرو گے۔“ میں نے سر گھما کر عقب میں کھڑے سکریٹری کو دیکھا۔ وہ پوری طرح مستعد تھا اور کرنٹ والا پستول اس کے ہاتھ میں تھا وہ ایک لمحے میں مجھ پر فائر کر سکتا تھا۔ ”مرشد تمہارا سکریٹری اتنا مہذب اور نستعلیق ہے کہ یقین نہیں آتا کہ یہ تمہارا سکریٹری ہے۔“

سکریٹری نے کہا۔ ”میں نے اردو ادب میں ایم اے کیا اور گولڈ میڈلسٹ ہوں۔“

”اس کے بعد تم نوکری کی تلاش میں دربدر پھرتے رہے ہو گے لیکن اپنے مقدر کا رزق ہاتھوں سے کمانے کی کوشش نہیں کی ہوگی اور بزعم خود ساری دنیا سے مایوس ہو کر بالآخر مرشد کے دامن میں پناہ لی ہوگی.... ہے نا؟“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ ”میں نے اعلیٰ تعلیم مرشد صاحب کی مدد سے حاصل کی ہے اور یہ طے تھا کہ میں ان کا سکریٹری بنوں گا۔ اب میں ان کا سیاسی مشیر بھی ہوں۔“

”تب تمہیں پولیٹیکل سائنس کی ڈگری لینی چاہیے



تھی۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے میرا باپ پنڈی کا ایک درمیانے درجے کا سیاست دان تھا۔ وہ کونسلر تو ہمیشہ بنتا تھا ایک بار ایم پی اے بھی بن گیا تھا لیکن اسے تھا ایمان داری کا مرض، میں نے سیاسی تربیت اسی سے حاصل کی ہے۔“

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”کاش کہ تم نے اپنے باپ کے نظریات سے بھی کچھ حاصل کیا ہوتا۔“

”وہ بہت برے حال میں سرکاری اسپتال میں کینسر سے لڑتا ہوا مرا تھا اس کے حال سے مجھ سمیت بہت سارے لوگوں نے عبرت حاصل کی تھی۔“

”میرا خیال ہے تم مرشد کے باڈی گارڈ بھی ہو؟“

”ہاں تمہیں اس سلسلے میں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ میں خالی ہاتھوں سے بھی تمہیں زیر کر سکتا ہوں میں نے جوڈو میں بلیک بیلٹ لی ہے۔“

کہاں تو وہ نہایت شرافت سے کھڑا تھا اور کہاں اس نے بولنا شروع کیا تو مجھے اپنے بارے میں سب بتانے پر تل گیا تھا میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”بس... بس اتنا کافی ہے میں کافی ڈر گیا ہوں ویسے ہی بہت برے حالوں سے گزر کر آ رہا ہوں۔ بائی دی وے تمہارے پاس اتنی زیادہ صلاحیتیں ہیں تو مرشد کو چاہیے باقی لوگوں کی چھٹی کر دے اور صرف تمہیں رکھے۔“

سکریٹری کھسیا گیا۔ ہر سکریٹری کی طرح اپنے باس کے معاملات کو اپنے ذاتی معاملات سمجھتا تھا۔ مرشد نے مجھے ٹوکا۔ ”تم موضوع سے ہٹ رہے ہو۔“

”سوری مجھے میٹنگ کے ایجنڈے کا خیال نہیں رہا۔“ میں نے معذرت کی۔ ”ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا؟“

”تم کہہ نہیں رہے ہو بلکہ مان نہیں رہے ہو، نہ صرف اپنے لیے بلکہ میرے لیے بھی مشکلات کھڑی کر رہے ہو۔“ مرشد پہلو بدل کر بولا۔ ”یہ مت سمجھنا کہ مرشد ڈر گیا ہے یا اس میں ہمت نہیں رہی ہے میں ڈرتا تو خدا سے بھی نہیں ہوں۔“

”تمہارا یہ پہلا سچ ہے جس پر میں صدقِ دل سے یقین کر سکتا ہوں۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

”اور مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ تم سمیت تمہارے سارے چمچوں کا نام و نشان مٹا دوں۔“ مرشد اب مشتعل ہو گیا تھا۔ ”اس کوٹھی کو تم کیا سمجھتے ہو تمہارے آدمی دور سے چند بم پھینکیں گے اور کوٹھی خود اپنے مکینوں کا مقبرہ بن جائے گی۔“

”افسوس کہ ہمارے ہاں گدی نشینی کے بزنس کا

## راغب احسن

(1905ء_ 1975) تحریک پاکستان کے ممتاز رہنما اور قائد کے معتمدِ خصوصی، وہ ضلع ”گیا“ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے کلکتہ میں تعلیم حاصل کی، اپنی سیاسی زندگی کا آغاز خلافت کمیٹی میں شمولیت اختیار کر کے کیا اس پاداش میں جیل بھی کاٹی، جیل سے رہائی کے بعد ایم، اے کیا اور اخبار ”اسٹار آف انڈیا“ کے ادارۂ تحریر میں شامل ہو گئے۔ جب سر شفاعت احمد نے الٰہ آباد سے انگریزی ہفت روزہ اسٹار جاری کیا تو وہ اس کے ادارہ تحریر میں شامل ہو گئے۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور انہیں اقوام عالم میں صحیح مقام دلانے میں صرف کی۔ تقسیم سے پہلے وہ ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کے رکن تھے، جہاں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے ہمیشہ سینہ سپر رہے اور قائد اعظمؒ کے ساتھ مل کر انہیں انگریز کی غلامی سے نجات دلانے کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔ 1931ء میں آل انڈیا یوتھ لیگ بنائی اور اسی اثنا میں میثاق فکر اسلامیت و استقلال ملت کے نام سے ایک فکر انگیز دستاویز مرتب کی۔ 1932ء میں کلکتہ میں مسلم لیگ کی بنیاد رکھی۔ علامہ شبیر احمد عثمانی نے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے۔ انہیں سیف الملت کا لقب دیا۔ 1964-1965ء میں مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح کے صدارتی انتخاب میں مشرقی پاکستان میں بہت کام کیا۔ لاء کمیشن کے رکن کے علاوہ سنٹرل اقبال کمیٹی کے نائب صدر اور سلیمان ندوی اکیڈمی آف اسلام کے بنیادی رکن تھے۔

مرسلہ: نوید صدیقی، کراچی

رواج نہیں ہے ورنہ اس مقبرے کو مزار میں بدل دیتا۔ کبھی کبھی تو مجھے تم پر رشک آتا ہے۔'' میں بدستور سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔

''شہباز...!'' مرشد کی قوتِ برداشت جواب دینے لگی تھی۔ ''یہ مت سمجھو کہ میرے پاس دوسرے طریقے نہیں ہیں۔ میں چاہوں تو یوں چٹکی بجاتے ہی معاملہ نمٹا سکتا ہوں کوئی مائی کا باپ مجھ پر انگلی نہیں اٹھا سکتا ہے۔''

''تم چٹکی بجا سکتے ہو میں نے نہیں روکا ہے۔''

وہ میری بات ان سنی کر کے بولتا رہا۔ ''لیکن میں سمجھتا ہوں تم سے الجھ کر میں اپنے دوسرے معاملات میں نقصان اٹھا رہا ہوں۔''

''یعنی گدی اور ملک کی سیاست پر پوری توجہ نہیں دے پا رہے ہو۔''

''شہباز یہ دیکھو۔'' اس نے اپنی نشست کے برابر میں رکھا ہوا ایک چھوٹا اور لمبا سلینڈر اٹھایا۔ اس نے اس کا اوپری حصہ ڈھکن گھما کر کھولا اندر سے ہلکی سی بھاپ نکلی تھی جیسے سرد کنٹینرز کھولنے پر نکلتی ہے اس میں سے ایک جدید ہائپوڈرمک سرنج نکالی جس میں نیلے رنگ کا سیال بھرا ہوا تھا۔ مرشد نے اسے سامنے کیا۔ ''دیکھو یہ ایک انجکشن تم سے وابستہ میرے اکثر مسائل حل کر سکتا ہے۔''

''اس میں کیا ہے کوئی مہلک زہر جیسے سانائڈ... ؟''

''نہیں زہر دینے سے زیادہ آسان تو ایک گولی مارنا ہے بلاوجہ اتنی زحمت کون کرے۔''

''پھر کیا ہے اس میں؟''

''یہ ایک جدید ایجاد ہے۔ اسے کسی شخص کو لگا دیا جائے تو مشکل سے دس منٹ کے بعد وہ شخص ہمیشہ کے لیے اپنی شخصیت سے محروم ہو جائے گا۔''

''کیا مطلب... یہ پاگل بنانے والا انجکشن ہے؟''

''نہیں آدمی اپنی تمام حسیات اور سوچوں سے محروم ہو جاتا ہے۔ یوں سمجھ لو کہ اس کی شخصیت روزِ اول والی بن جاتی ہے۔ وہ کسی نومولود کی طرح معصوم ہو جاتا ہے۔''

میرے جسم میں سرد سی لہر دوڑ گئی تھی۔ کیا واقعی یہ انجکشن اتنا خطرناک تھا یا مرشد اس کی خصوصیات بڑھا چڑھا کر بیان کر رہا تھا صرف مجھے دہشت زدہ کرنے کے لیے، ظاہر ہے یہ انجکشن میرے لیے تھا۔ اپنی شخصیت سے محروم ہو کر ایک روبوٹ بن جاتا۔ نہیں روبوٹ کا بھی ایک پروگرام ہوتا ہے وہ اس کے تحت فنکشن کرتا ہے۔ میں تو پودا بن جاتا۔ جو سانس لیتا ہے، زمین سے پانی اور خوراک حاصل کرتا ہے، وہ بڑھتا ہے اور اپنی نسل بھی بڑھاتا ہے لیکن وہ شعور اور احساس سے عاری ہوتا ہے۔ شاید میں کسی پودے سے بھی گیا گزرا ہو جاتا۔ مرشد میرے ردِعمل کا منتظر تھا میں نے اچانک اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ''ذرا دکھانا... تم پر آزما کر دیکھوں اگر کامیاب رہا تو اس ملک کے تمام شیطان صفت لوگوں کو اس انجکشن کی اشد ضرورت ہے۔ میں ان سب کو لگاؤں گا چاہے اس کے لیے مجھے چندہ جمع کرنا پڑے یا کسی بنک میں ڈاکا مارنا پڑے۔''

مرشد مجھ سے دور محفوظ فاصلے پر تھا۔ اس نے ردِعمل ظاہر نہیں کیا اور سرنج دوبارہ سلینڈر میں رکھ کر اس کا ڈھکن بند کر دیا۔ ''ذرا سوچو تم اپنے ساتھیوں کو اس حالت میں ملو کہ تم ایک پالتو بلی سے زیادہ مختلف نہیں ہو گے۔ تم بھوک لگنے پر رو گے اور ضرورت پڑنے پر بلاتکلف اسی جگہ رفع حاجت کر لو گے جہاں موجود ہو گے۔ تم کپڑے پہنو یا نہ پہنو تمہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ انسان اور انسانوں سے وابستہ رشتے تمہارے لیے بے معنی ہو جائیں گے۔''

''او کے۔'' میں نے ہاتھ اوپر کیا۔ ''میں دہشت زدہ ہو گیا۔ مگر ایک سوال ہے۔''

''یہی کہ میں نے اسے استعمال کیوں نہیں کیا؟''

''ہاں تم دو دن تک اکرم چشتی اور اپنے جلادوں کو زحمت دینے کے بجائے پہلے ہی دن یہ انجکشن استعمال کر لیتے۔''

''لیکن اس صورت میں فاضلی کو کیسے واپس حاصل کرتا؟'' اس نے روانی سے کہا تو مجھے لگا جیسے اس کے منہ سے سچ نکل گیا ہے۔ اسے اصل فکر فاضلی کی تھی اور جب اس نے یہ کہا تو مجھے لگا کہ اسے مجھے انجکشن لگانے پر کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ شاید اس نے انجکشن حاصل اسی مقصد کے لیے کیا تھا تو وہ پہلے فاضلی کو حاصل کرتا اور اس کے بعد مجھے انجکشن لگا کر میرے ساتھیوں کے حوالے کر دیتا۔ میں جیسے جیسے اس بات پر غور کر رہا تھا مجھے لگ رہا تھا یہی درست ہے۔ مرشد کا منصوبہ یہی تھا جو اب میری ہٹ دھرمی کی وجہ سے ناکام رہا تھا۔ اس نے مجھ پر تشدد کرایا تھا۔ میں نے سوچا تو اچانک ہی ایک اور خیال ذہن میں جگنو کی طرح چمکا تھا۔ مجھ پر تشدد کا مقصد ویڈیو بنا کر میرے ساتھیوں کو یقین دلانا تھا کہ اس تشدد کی وجہ سے میں اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا تھا اور اس میں مرشد کی کوئی سازش شامل نہیں تھی۔ میں نے سرسری سے انداز میں مرشد سے سوال کیا۔ ''میرا خیال ہے اس دوا کا نروس سسٹم پر کوئی سراغ



بھی باقی نہیں رہتا ہو گا؟''

''ہاں ایک بار جسم میں جانے کے چند گھنٹوں بعد اس کا نشان مٹ جاتا ہے اور پھر دنیا کا کوئی ٹیسٹ یہ نہیں بتا سکتا ہے کہ آدمی کے ساتھ اصل میں ہوا کیا ہے۔''

''اس لیے کوئی نہیں جان سکے گا کہ میں کیسے پاگل ہوا۔'' میں نے کہا۔ ''یہ منصوبہ ہے نا تمہارا... اسی لیے تم پہلے فاضلی کو حاصل کرنے کے لیے بے چین تھے۔''

مرشد کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی تھی۔ ''تم بہت چالاک آدمی ہو بالآخر صحیح بات تک پہنچ گئے۔''

''اسی لیے تم نے مجھ پر تشدد کی ویڈیو بنائی اور میرے ساتھیوں تک پہنچائی تا کہ وہ یہ سمجھیں کہ تشدد نے میرا دماغ ماؤف کر دیا ہے۔''

مرشد نے اس بار کچھ نہیں کہا لیکن اس کے چہرے پر اقرار تھا کہ اس کا یہی ارادہ تھا۔ اسے اطمینان تھا کہ بدلا تو کچھ بھی نہیں تھا میں اس کے قبضے میں تھا۔ وہ اب بھی اپنے منصوبے پر عمل کر سکتا تھا۔ اگر میں جان بھی گیا تھا تو اس سے کیا فرق پڑتا تھا؟ اس نے سکریٹری کی طرف دیکھا۔ ''اسے لے جاؤ اور بند کر دو۔''

''ضرور۔'' میں نے آہستگی سے اٹھتے ہوئے کہا اور اچانک ہی مرشد کی طرف جھپٹا۔ میرے عقب میں سکریٹری پوری طرح چوکنا تھا جیسے ہی میں نے حرکت کی اس نے پستول سیدھا کر لیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ میں اسے نہیں دیکھ رہا ہوں لیکن میں اسے دیکھ رہا تھا۔ مرشد کے عقب میں ایک بڑی دیوار گیر الماری تھی جس کے شیشے چمکیلی سطح والے تھے اور ان پر عکس واضح دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے سکریٹری واضح نظر آ رہا تھا۔ جیسے ہی اس نے پستول سیدھا کیا میں یک دم فرش پر گرا جس پر دبیز قالین تھا۔ میں گرتے ہی چاروں ہاتھوں پیروں پر آگے بڑھا اور میری نظر مرشد پر مرکوز تھی۔ وہ گھبرا کر نشست سے اٹھ رہا تھا۔ جب سکریٹری کا فائر کیا ہوا پن اس کے جسم میں اتر گیا اسے جھٹکا لگا اور وہ دوبارہ نشست پر گر کر لرزنے لگا۔ پن کے ساتھ بہت باریک تار منسلک تھا جس سے کرنٹ گزر کر مرشد کو لگ رہا تھا۔ میں نے تار پر ہاتھ مار کر اس کے جسم سے پن نکال دی اور اس سے پہلے سکریٹری حرکت میں آتا میں نے مرشد کو ٹانگ سے پکڑ کر نیچے کھینچ لیا۔ اسے اپنے جسم پر قابو نہیں رہا تھا۔ میرے ہاتھ بے تابی سے مرشد کا لباس ٹٹول رہے تھے۔ اس کے لباس میں کسی ہتھیار کی موجودگی لازمی تھی۔

## مکروفریب

ایک دفعہ حکیم لقمان کاغذوں کا گٹھر ایک اونٹ پر لاد کر کہیں جا رہے تھے۔ راستے میں ایک عورت نے پوچھا۔ ''حکیم صاحب! کہاں جا رہے ہیں اور اونٹ پر کیا لادا ہوا ہے؟''

حکیم صاحب گویا ہوئے۔ ''یہ عورتوں کے مکروفریب ہیں، ان کو دریا برد کرنے جا رہا ہوں۔''

عورت نے کہا۔ ''آپ کے خیال میں پھر عورتیں مکر کرنا چھوڑ دیں گی؟''

حکیم صاحب نے فرمایا۔ ''میرا تو یہی خیال ہے۔''

اس کے بعد عورت نے کہا۔ ''چلو پھر میں ایک نیا مکر کرتی ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے شور مچایا کہ حکیم صاحب نے مجھ سے دست درازی کی ہے۔

یہ سن کر حکیم صاحب بہت پریشان ہوئے اور بولے۔ ''واقعی یہ مکر کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔''

مرسلہ: راحیل نواب......ملتان

## سیاست

☆ جو بات اخلاقی طور پر غلط ہے، وہ سیاسی طور پر کبھی درست نہیں ہوتی۔

☆ ہر سیاسی پارٹی بالآخر اپنے جھوٹ اگل کر ختم ہو جاتی ہے۔

☆ مدبر بھیڑیں مونڈتے ہیں اور سیاستدان ان کی کھال کھینچتے ہیں۔

☆ سیاستدان، آنے والے الیکشن اور مدبر آنے والی نسلوں کے بارے میں سوچتے ہیں۔

مرسلہ: محمد فائز......اردو بازار، کراچی

## سنہری موقع

ایک آدمی کو پاگل کتے نے کاٹ لیا۔ وہ ڈاکٹر کے پاس گیا تو اس نے کہا۔ ''آپ فوراً ٹیکے لگوا لیں ورنہ آپ پاگل ہو جائیں گے، لوگوں کو کاٹیں گے اور وہ مر جائیں گے۔''

آدمی نے کہا۔ ''مجھے کاغذ اور قلم دیجیے۔''

ڈاکٹر نے پوچھا۔ ''کیا آپ وصیت لکھنا چاہتے ہیں؟''

آدمی نے جواب دیا۔ ''جی نہیں! میں ان لوگوں کی فہرست بنانا چاہتا ہوں، جنہیں میں کاٹوں گا۔''

مرسلہ: اسماعیل نوید......کراچی

پھر میں نے اس کی شیروانی کی جیب میں پستول محسوس کرلیا لیکن اس سے پہلے میں اسے نکالتا سکریٹری عقب سے مجھ پر آپڑا تھا۔ دیکھنے میں عام جسامت کے سکریٹری کا وزن اچھا خاصا تھا۔ مجھے لگا جیسے مجھ پر کوئی وزنی جسم گرا ہو۔ میں نے اسے جھٹکنا چاہا لیکن ایک تو وہ مجھ سے چمٹ گیا تھا دوسرے مجھ میں اتنی توانائی نہیں تھی کہ اسے جھٹک سکوں۔ میں نے مرشد کو چھوڑ کر اسے خود سے گرانے کی کوشش کی لیکن وہ بری طرح مجھ سے چمٹا ہوا تھا۔ وہ کسی صورت مجھے چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے غلط بیانی کی تھی کہ اسے جوڈو آتا تھا اگر ایسا تھا تو وہ عقب سے ایک ہی وار کرکے مجھے بے ہوش کرسکتا تھا لیکن اس کے بجائے وہ مجھے قابو کرنے کی کوشش کررہا تھا اور وہ بھی خاصے اناڑی انداز میں۔ اگر میں فٹ ہوتا تو اب تک اس سے نمٹ چکا ہوتا۔ اس کی کوشش تھی کہ مرشد کے دوسرے محافظوں کے آنے تک مجھے کسی حرکت سے روکے۔

جب میں نے محسوس کیا کہ میں خود کو اس سے چھڑا نہیں سکوں گا تو میں نے دوبارہ مرشد کی جیب ٹٹولی مگر سکریٹری نے بھانپ لیا اور اس نے مجھے کسی قدر پیچھے کھینچ لیا۔ اب مرشد کی شیروانی کی جیب میری پہنچ سے دور ہوگئی تھی۔ مجھے قابو کرنے کی کوشش کے ساتھ سکریٹری چیخ چیخ کر مرشد کے دوسرے محافظوں کو بلا رہا تھا اور اس وقت اپنا نستعلیق لہجہ اور زبان بھول کر نہایت روانی سے ناقابلِ بیان القابات کے ساتھ مرشد کے آدمیوں کو پکار رہا تھا۔ میں مرشد کی طرف بڑھنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ قسمت بھی آدمی کو کہاں لاکر بے بس کرتی ہے۔ ایک عام سا نوجوان اس وقت میرے لیے بلائے جان بن گیا تھا اور کسی صورت جان نہیں چھوڑ رہا تھا۔ اس نے میرے گلے میں ہاتھوں سے پھندا ڈال دیا تھا اور پورے جوش سے گلا دبا رہا تھا۔ ہاتھ مارتے ہوئے اچانک کوئی چیز میرے ہاتھ میں آئی اور میں نے اسے اٹھایا تو یہ وہی دھاتی سلینڈر نکلا جس میں انجکشن تھا۔ میں نے سلینڈر سکریٹری کے سر پر مارا اور دوسری ضرب میں اس نے کراہ کر والدہ محترمہ کو یاد کیا اور میرا گلا چھوڑ دیا۔ اسے پرے جھٹک کر میں اٹھ بیٹھا۔ وقت بالکل نہیں تھا۔ مرشد کے آدمیوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ اندر آتے میں نے تیزی سے سلینڈر سے انجکشن نکال کر اس کی سرنج بے بس پڑے مرشد کی گردن میں داخل کردی۔ اسی لمحے کئی مسلح افراد نشست گاہ میں گھس آئے۔

”خبردار...!“ میں نے للکار کر کہا۔ ”کسی نے حرکت کی تو میں تمہارے آقا کو یہ انجکشن لگادوں گا۔“

”کوئی حرکت نہ کرے۔“ سکریٹری نے بوکھلا کر کہا۔ ”پیچھے ہوجاؤ۔“

ایک جاہل گارڈ نے اپنی خوفناک شاٹ گن کا رخ میری طرف کیا اور گالی دے کر بولا۔ ”...چھوڑ دے مرشد بادشاہ کو۔“

”سکریٹری اسے بتاؤ کہ یہ کیسا انجکشن ہے۔“ میں نے خود پر قابو پالیا تھا ورنہ پہلے میرا ہاتھ لرز رہا تھا۔ سکریٹری گارڈز پر برس پڑا اور ان کے خاندان سے اپنے نہایت غلط قسم کے تعلقات جوڑتے ہوئے اس نے انہیں یہاں سے دفع ہوجانے کا حکم دیا۔ صورتِ حال کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے وہ دفع ہوگئے۔ سکریٹری نے میری طرف دیکھا اور لرزتی آواز میں بولا۔

”سرنج ہٹالو ایسا نہ ہو کہ دوا انجیکٹ ہوجائے۔“

”دل تو میرا چاہ رہا ہے کہ انجیکٹ کردوں لیکن مجھے زندہ رہنا ہے اس لیے مجبوراً اس وقت تک انجیکٹ نہیں کروں گا جب تک مجھے اس کے لیے مجبور نہ کیا جائے۔“

”لیکن تم کب تک اس طرح سرنج رکھو گے؟“

”زیادہ دیر نہیں لگے گی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”جیسے ہی مرشد چلنے پھرنے کے قابل ہوا میں اسے لے کر یہاں سے نکل جاؤں گا۔“

مرشد کی شیروانی کی جیب سے چھوٹا لیکن جدید قسم کا پستول نکال لیا اب میں نہتا نہیں تھا۔ میں نے خود کو کسی قدر پُراعتماد محسوس کیا اور یہ بھول گیا کہ جال وہیں ہوتے ہیں جہاں پر سمٹتے ہیں۔ بالکل آخری لمحے میں سکریٹری کے تاثرات نے مجھے خبردار کیا اور میں نے پلٹ کر دیکھنا چاہا لیکن اس سے پہلے کوئی چیز میرے سر پر لگی اور میں چکرا کر گر پڑا۔ ضرب ایسی تھی کہ نشست گاہ میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگی اور جب ذرا قابو میں آئی تو مجھے لگا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ میرے سامنے فاضلی تھا۔ لیکن یہ کیسے ممکن تھا فاضلی تو حویلی میں قید تھا۔ وہ یہاں کیسے آگیا؟ فاضلی نے مرشد کی گردن میں گھسی سرنج نکالی اور میرے بازو میں گھونپ دی۔ اس نے میری آنکھوں میں جھانکا اور بولا۔ ”گڈبائی شہباز ملک...!“

اس نے سرنج کا پسٹن دبادیا تھا۔

جاری ہے





# بیت بازی

قارئین

(محمد سعید قاسمی ڈلوالی کا جواب)

اختر حسین..........میانوالی

خندہ لبی ایک اعجاز ہے
یقینِ وفا دل کو آجائے ہے

نادر ملک..........سیالکوٹ

یاد آئے ہیں تم کو ہم شاید
پھیکا پھیکا ہے رنگ کاجل کا

فرحت مصطفیٰ..........کوئٹہ

یوں تری یاد مرے چاک جگر سے گزرے
جس طرح تند ہوا غنچ شجر سے گزرے

افتخار سعید..........لاڑکانہ

یہ اور بات کہ تقدیر ہوگئی قابل
وگرنہ دیدۂ بیدار ہم بھی رکھتے ہیں

(شہناز شیخ کا جواب)

تنویر آصف چوہدری..........دینہ جہلم

پاس و امید نے یک عربدہ میداں مانگا
عجز ہمت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا

(منظر علی خان لاہور کا جواب)

بھگوان داس گوتم ل..........سکرنڈ

یاس احساس کے دامن سے لپٹ جاتی ہے
ضبط کی ڈور مرے ہاتھ سے کٹ جاتی ہے

نیلوفر یاسمین..........کوٹری

یہ زخمِ عشق ہے کوشش کرو ہرا ہی رہے
کسک تو جا نہ سکے گی اگر یہ بھر بھی گیا

نثار حسن..........لاہور

یوں ہی تنہائی میں ہم دل کو سزا دیتے ہیں
نام لکھتے ہیں ترا لکھ کے مٹا دیتے ہیں

(اجمال سلیم حیدرآباد کا جواب)

نوشین اظفر..........وہاڑی

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشہ میں ہے
آبگینہ تندی صہبا سے پگھلا جائے ہے

نصرت اعجاز..........لاہور

ہر ایک چہرے کو زخموں کا آئینہ نہ کہو
یہ زندگی ہے رحمت اسے سزا نہ کہو

ناہید عمر..........بکھر

ہم تو سمجھے تھے کہ دشمن پہ اٹھایا خنجر
تم نے جانا کہ ہمی تم میں ہیں مرنے والے

(مہناز اسد کاموکی کا جواب)

سلیم کامریڈ..........کھاتاں

میں نے دیکھا ہے شکستِ سازِ الفت کا سماں
اب کسی تحریک پر بربط اٹھا سکتا نہیں

زاہد خان خٹک..........راولپنڈی

مے کشی کی بھی سزا ہے خودکشی کی بھی سزا ہے
کون کس مشکل میں ہے یہ دیکھتا کوئی نہیں

فیض عالم..........لاہور

میں نے جھیلا ہے گلے مل کے بچھڑنے کا عذاب
میرے معبود کسی کو یہ سزا مت دینا

نگہت حسنین..........کاموکی

ماند پڑ جائے گی رونق بزم کی
رنج و غم دکھ درد کے اظہار سے

(سلیم کامریڈ کھاتاں کا جواب)

منان مصطفیٰ..........کوئٹہ

مانا کوئی ہنگامہ نہیں ان کے مقدر میں
تھرا اک گونج سناٹوں کی ویرانوں کے ہاتھ آئی

ارتضیٰ حسین..........میرپورخاص

یہ محبت یہ محبت کا زوال
دیکھ دریا ہے کنارے کو سنبھال

خلیل نواز..........منکیرہ

یہ کس خلش نے پھر دل میں آشیانہ کیا
پھر آج کس نے سخن ہم سے غائبانہ کیا

نوشین سید..........کراچی

یہ صورتیں بڑی سوہان روح ہوتی ہیں
زوال دن نہ دکھائے خدا کمالوں کو

عرفان خان..........چنیوٹ
یہ سانحہ بھی محبت میں بارہا گزرا
کہ اس نے حال بھی پوچھا تو آنکھ بھر آئی
(عاصی اختر کا جواب)

قاضی شرف معروف حمیدی........کراچی
اب تو سب رازداں ہمنوا نامہ بر
کوئے جاناں کے سب آشنا جا چکے
(سعید احمد چاند کراچی کا جواب)

ابریز علی تیموری..........العین
نہ جانے کون سا آنسو کسی سے کیا کہہ دے
ہم اس خیال سے نظریں جھکائے بیٹھے ہیں

احمد حسن..........کراچی
نیند بھی تیرے بنا اب تو سزا لگتی ہے
چونک پڑتا ہوں اگر آنکھ ذرا لگتی ہے

یوسف گردیزی..........ملتان
نہ کچھ جمال کی باتیں نہ کچھ کمال کا ذکر
تمام عمر ہی ہوتا رہا ملال کا ذکر
(ممتاز اسد، کاموکی کا جواب)

نادیہ گبول..........کراچی
اے ساکنانِ کوچہ دلدار دیکھنا
تم کو کہیں جو غالب آشفتہ سر ملے

نازش سحر..........کراچی
ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

مسرور حیدر..........شیخوپورہ
اس نزاکت کا برا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا
ہاتھ آ جائیں اگر ہاتھ لگائے نہ بنے

نوشین ممتاز..........حاصل پور
آسمانِ زندگی پہ عمر بھر
روز سورج کی طرح ڈھلتا رہا
(فرحت اسلم لاہور کا جواب)

ناز اختر ناز..........حیدر آباد
دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

تسنیم ضیا..........کراچی
داستانِ عشق کی باتیں ادھوری رہ گئیں
دفترِ دل کا مرے کوئی ورق سادہ نہ تھا
(ڈاکٹر محمود فیضانی ایبٹ آباد کا جواب)

نصرت شاہ..........کوئٹہ
اب تک ندامت ہے مجھے ترکِ محبت پر
ذرا سا جرم کرکے پچھتا رہا ہوں میں

انعم سعید بخاری،..........سکھر
امیرِ شہر کی مسند کو غور سے دیکھو
کسی غریب کی بیٹی کا پیرہن ہی نہ ہو

عاشق حسین..........چنیوٹ
آسمان چھت ہے تو بستر فٹ پاتھ
کون کہہ سکتا ہے بے گھر ہم کو

منہال حیدر..........جھنگ
ابھریں گے چمن راہ میں صحرائی صحرا
کچھ اور بھی بادیہ پیمائی صحرا

فرقان ترمذی..........ملتان
اک شور و غا ہے بستی میں اک حشر بپا ہے بستی میں
اب شام غریباں گھر گھر ہے تم شام غریباں رہنے دو

شاہد حفیظ..........سرائے عالمگیر
اس کا اندازہ مجھے ہجر کی تلخی سے ہوا
تشنگی اوج پہ آ جائے تو کیا لگتا ہے

انعم سعید..........کراچی
اجالوں کی کمندیں پھینکتا ہوں
اندھیری رات میں تنہا رہا ہوں

☆☆☆

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

# علمی آزمائش۔ 87

ادارہ

**ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ**

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوایئے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماھنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماھنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک صفحی سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 جنوری 2013ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

## اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

**14** اکتوبر **1938** کی شب ساڑھے دس بجے پیدا ہونے والی اس لڑکی کے والد سہراب دیبا ایرانی افواج میں افسر تھے۔ اس لڑکی کی ایک دوست تھی شہناز۔ اس نے دوستی کو مستحکم کرنے کے لیے اس کی شادی اپنے باپ سے کرادی تاکہ وہ اس سے بھائی حاصل کرلے۔ اس لڑکی نے اس گھر کے لیے چراغ تو دیا مگر خود اس کی زندگی اندھیرے میں گم ہوگئی۔ اس کی اور اس کے شوہر کی موت ملک سے باہر ہوئی۔

## علمی آزمائش 85 کا جواب

کنہیالال کپور **27** جون **1910**ء کو لالہ ہری رام کپور کے گھر ضلع لائل پور میں کمالیہ سے **12** میل دور کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ اردو ادب میں اپنی مثال آپ تھے۔ آج بھی ان کی تحریر ذوق وشوق سے پڑھی جاتی ہے۔

## انعام یافتگان

**1-(زاھد سلیم، حیدرآباد) 2-(نعمان اختر، راولپنڈی) 3-(امجد شریف جھنگ)**
**4-(مہ جبیں ملک، سیالکوٹ) 5- (فدا حسین طوری بنگش، پشاور)**

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

لاہور سے تابش عطاری، ناصر حسین، زبیر اسلم، ممتاز الحسن، نعمان بٹ، ارشاد علی، حمیرا خاتون، ہما جبیں، نازش خان، ابرار احمد، انعام الحق، احمد علی مشرقی، نثار اختر، نعمان اشرف، ملک واحد الحق، پروین ضیا، نیاز احمد ملک، اکرم صدیقی، گل زیب، حدیقہ اشرف، ارباز خان، ممتاز الحسن، فہیم مرزا، نعمان اشرف، احمد بشیر بٹ، عقیل سندھو، خالد علی، برق ضیائی۔ راولپنڈی سے زویا بخاری، نرجس علی، کائنات بانو، زبیر شاہ اشرفی، خاقان خان، زاہد عباسی، بخت خان، سید محمد تقی، تنویر الحسن، رانا فتح یاب، صفدر شیرازی، نسرین اشرف۔ کراچی سے نذر علی برمانی، کائنات فاطمہ، ناظم پاشا، قائم علی، افتخار احسان، مظفر محسن، خالد مظفر، انصار حسین، خلش مظفر، جاوید علی، وجیہ الحسن، ناصر افروز، ملک سرفراز گوندل، نصرت فاروقی، فہیم احمد، وجاہت وکیل، عثمان خان، تنویر حسین زیدی، رجب علی مرزا، کلیم اللہ فہمی، نوازش علی شاہ، نوازش مہر، منور علی، نجم الدین حیدر، علی احمد، کاوش اختر، عنایت مسیح، ابرار احمد، کہکشاں تسنیم، عارفہ سلطان، بختاور شاہ، نگار پیائی۔ اسلام آباد سے سعید اختر، روا ممتاز، شہناز فیضی، محمد شہزاد، ثمین جاوید، احمد خالد، نصرت حیات عباسی، محمد متین، شاہین اشفاق، بشیرہ فاروقی، انور یوسف زئی، انور یوسف زئی۔ میرپور خاص سے طاہر الدین بیگ، صنوبر یز اختر۔ چکوال سے نذر خان، ممتاز احسن ملک۔ کوئٹہ سے تقی چنگیزی، راؤ رشید، ضمیرا چکزئی، نگار بٹ، نصرت چنگیزی، خاقان عمران، صالح بشیر، قتیل سعید پوری، فیض اللہ خان، ارباز خان۔ سرگودھا سے خضر حیات، خلیق الحق، عظمیٰ اکمل ٹوانہ، حیات خان، فصیح الزمان، نادر ریاض۔ ملتان سے نبی ظہیر، رضوانہ اختر، اللہ دتہ، محمد عتیق، فرزانہ ملک، زینت چوہان، فاضل خان اچکزئی، سعیدہ جلال، قدوس بخش، محمد عتیق، فرزانہ ملک، نیاز احمد ملتانی، نشاط جہاں، بیگم احمد دین، بڈا یونس، عزادار حسین، مہوش زرولی خان، جنید اشرف، توفیق سلطان، اشرف علی شیروانی، دبیر شاہ، نگار سلطانہ، ابریز بشیر، عبدالنعیم، فضل الحق، جمیل ملک، بہادر خان، کوکب جہاں، فہیم اللہ فاروق، خالد ڈار۔ جہلم سے شاور ترمذی، عثمان علی شاہ، ملک شاعت، کمال احسن کمال، ارباز خان اچکزئی، اقبال حسن سید، کمال احسن کمال، ملک شفاعت۔ ڈی جی خان سے محمد سہیل انجم، نصیر الدین، رانا وجدانی، زبیر ملک، کاشف زیدی۔ بہاولپور سے نوازش علی، ابرار صدیقی، مسرت اسلم ملک۔ جہانیاں سے خضر حیات، زبیر خان، صالح احمد، انیق احمد، خوش حال خان، وزیر حسن، رفیق حسن۔ کوٹ ادو سے نعمان بشیر، ممتاز احمد، فرخ بشیر، ناصر رند، الہ ڈینو، آفاق سعید، محمد ارشد۔ حسن ابدال سے کرم الٰہی، سید محمد رضا، نیاز احسن، ارشاد خان۔ چونالہ سے ثنا احمد، رفیق احمد مغل، چوہدری بشیر ملک افتخار مضطر، احمد سلیم۔ پاک پتن سے سدرہ شفیق، نرجس زیدی، نواب علی، زریاب خان۔ جھنگ سے امتیاز حسن، زاہد ملک، زویا رفیق، عجب گل، ملک سرفراز، احباب زیدی۔ سکھر سے نعمان شیخ، خالد مغل، ارشاد بھٹو، رام جیٹھ ملکانی۔ ایبٹ آباد سے قیصر نظامانی، رفیق بھٹو، فاخر حسن، دیو پرشا جیٹھلانی۔ مانسہرہ سے زاہد خان، رفیق لاہوری، عباس خان، تسنیم ارشاد۔ پاراچنار سے حسن بنگش، زاہد علی طوری، فائق مانسہروی۔ اوکاڑہ سے سید احسن محمود، راجا احسن، اظہر الدین، ملک صفدر، نعمان بشیر۔ سیالکوٹ سے نوید شہزاد خواجہ، مہ جبیں فلک، محمد رضا، اسلام الدین، نصیر حسن، فراصت اللہ، ام حبیبہ، ناصر خان، جاوید محمود ملک، فیض الحسن۔ شجاع آباد سے زوار حسین زیدی، سید عباس علی، ارباز خان، ساہیوال سے بدیع الزماں، عثمان احمد، عزادار حسین۔ اٹک سے زبیر اللہ خان، شاہ جبران، خالد چوہدری، فیض اختر، خورشید اختر، صالمہ ملک، زبیر اللہ مروت، سرفراز گل، فرحت بابر زمان۔ حافظ آباد سے خالد جاوید، نعمان حسن خان۔ کھاناں سے سلیم کامریڈ۔ نواب شاہ سے ارحم شاہ، عزیز حسن، عزیز الدین، سکندر پاشا، ملک سلطان۔ شہر سلطان سے نوید انصاری، سنجیدہ احمد، ارباب خان۔ میرپور آزاد کشمیر سے نصرت رند، کاشف حسین، نصرت خان۔ میانوالی سے توشین احمد، احمد لی علی فوقی۔ بھکر سے غازی شاہ، نیاز احسن، زبیر شاہ، تقی بنگش، حسن چنگیزی۔ ٹنڈو آدم سے ناصر بگھیو، فاطمہ عباسی، خالد خان چونالہ۔ کمالیہ سے ناصر ملک، فہیم عثمان، ابرار الحق، فردوس بشیر، خان اعظم، ظہیر الدین، محمد کمال۔ لیہ سے راجا ابرار، شباب الاسلام، سردار توفیق، زاہد اسلم چٹھہ۔ گولارچی سے ارشد خان۔ شاہ جمال سے نواز ملک۔ ناروال سے انعام احسن۔ مردان سے ابرار خان۔ تربیلہ ڈیم سے متیم الحسن، حسن بیگ۔ چھچھ برہ زئی سے یوسف علی۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے صفدر حسن، سرفراز احسن، ناصر انعم، خالد خان، ابرار حسن زئی۔ چشتیاں سے نوید ملک، خالد کنول، غازی توفیق، نسیم نیاز احمد، مانک اسلم۔ پشاور سے سید علی خورشید، مسلم اختر مسلم، خاقان خان، یوسف عطاری، افضل میو، منہال زیدی، نعیم شیرازی، فرقان اختر، سردار علی مینگل، نسیم اچکزئی، نسیم فردوس، جویریہ، شیر نواز، اطہر نواز، شمیم فاروقی، ضیا الحق، جمال شاہ، نوید نعیم، محمود اچکزئی، دردانہ شاہ، نسیم نیازی۔ حافظ آباد سے خالد جاوید، خالد جاوید ٹیچر، محمد عقیل چٹھہ، محمد ابراہیم، محمد صدیق مستری۔ نواب شاہ سے ارحم شاہ، عزیز حسن، عزیز الدین۔ شہر سلطان سے سنجیدہ احمد، نوید انصاری۔ میرپور آزاد کشمیر سے نصرت رند، کاشف حسین۔ میاں والی سے توشین احمد، حکیم سید، محمود رضا شاہ نورنگ، نعمان نیازی۔ بھکر سے غازی شاہ، حافظ گل عمر۔ ٹنڈو آدم سے ناصر بگھیو، فاطمہ عباسی، خالد خان چونالہ۔ کمالیہ سے ناصر ملک۔ لیہ سے خالد یوسفی، راجا ابرار۔ گولارچی سے سید ایس ڈی ساغر، فتح آباد، ایس صارم آرائیں (توحید آباد)۔ نارروال سے محمد عدیل اختر (موٹے کلاں) انعام احسن، شاہ جمال سے رانا محمد سجاد۔ ایبٹ آباد سے محمد خورشید جدون، میاں احسن۔ مردان سے محمد انور (باڑی چم ہوتی) معراج الدین۔ تربیلہ ڈیم سے صفدر حسین جعفری۔ چھچھ برہ زئی سے ملک جاوید، محمد خان سرکانی درانی، محمد ایاز ایاز (چھچھ کونکے)

بیرونِ ملک سے شیزا موسیٰ زبیری، احسن فاروقی (العین یو اے ای) نصیر خان ناصری (جدہ سعودیہ) حافظ تصدیق بشیر الہندی (سلطنت اومان) سلمیٰ فاروقی (جدہ سعودیہ) نگار جعفری (ڈیرا دبئی) ذہیب عثمانی (جرمنی)

# میں زخم ہوں

محترم معراج رسول
السلام علیکم!
میری زندگی ایسی تلاطم خیز ہے کہ جب میں ماضی کے دریچے میں جھانکتا ہوں تو مجھے خود اپنی زندگی کسی مہماتی فلم جیسی لگتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے میں بھی کسی ناول یا فلم کا کردار ہوں۔ اپنی خود نوشت بھیج رہا ہوں۔ اگر سرگزشت کے معیار کی ہو تو شائع کرکے شکریہ کا موقع دیں۔
ظفر
(کراچی)

میں ضلعی حکومت کا بہت بڑا افسر ہوں۔ میرے پاس سب کچھ ہے، ہر عیش و آرام مجھے میسر ہے لیکن اس کے حصول کے لیے مجھے کن کن دشوار گزار راہوں سے گزرنا پڑا۔ پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو یقین نہیں آتا۔

میں نے انتہائی کٹھن حالات میں تعلیم حاصل کی تھی۔ میرے والد ٹیکسی ڈرائیور تھے۔ وہ صبح گھر سے نکلتے تو پھر رات گئے ہی تھکے ہارے گھر میں داخل ہوتے۔ عام لوگوں کا خیال ہے کہ ٹیکسی ڈرائیور خوب کماتے ہیں، سواریوں کو خوب لوٹتے ہیں لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔

ابو صبح سے شام تک شدید محنت کرتے تھے۔ تب کہیں جا کر ہمارے اخراجات پورے ہوتے تھے۔

انہوں نے خود تو صرف میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی لیکن وہ چاہتے تھے کہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کروں۔ وہ اپنی محرومیاں میرے ذریعے دور کرنا چاہتے تھے۔

"اماں بہت صابر و شاکر اور سلیقہ مند تھیں۔ اسی وجہ سے ہمارا چھوٹا سا گھر آئینے کی طرح چمکتا رہتا تھا۔ یہ ہمارا آبائی مکان نہیں تھا کیونکہ دادا جان کی اتنی حیثیت ہی نہیں تھی کہ وہ اپنا ذاتی مکان تعمیر کر سکتے۔ ہم لوگ کرائے کے ایک مکان میں رہتے تھے۔

اماں اکثر کہتی تھیں کہ کسی نہ کسی طرح کوشش کر کے اپنا مکان بنا لیں، مالک مکان کو ہر مہینے مٹھی بھر کرائے کی رقم دی جاتی ہے تو میرا دل بہت دکھتا ہے۔

ابو ہنس کر کہتے۔ "زینت! مجھے خود بھی اس بات کا احساس ہے، میں کوشش کر رہا ہوں کہ کسی اچھے علاقے میں پلاٹ لے کر اس پر فی الحال کچے پکے دو کمرے بناؤں، پھر آہستہ آہستہ مکان بھی بن جائے گا۔"

میں ابھی ساڑھے تین سال ہی کا تھا کہ ابو نے مجھے شہر کے ایک بہترین اسکول میں داخل کرا دیا۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس اسکول میں داخلہ اتنی آسانی سے نہیں ملتا ہے لیکن ابو کی ٹیکسی میں ایک محکمۂ تعلیم کے کوئی اعلیٰ افسر سفر کر رہے تھے۔

ابو اپنی باتوں سے بہت مہذب اور پڑھے لکھے لگتے تھے۔ تمام ٹیکسی ڈرائیوروں کے برعکس وہ اپنے لباس کا بھی خیال رکھتے تھے۔ ابو نے باتوں ہی باتوں میں ان صاحب سے میرے داخلہ کرانے کا وعدہ لے لیا۔ وہ صاحب بھی وعدے کے سچے نکلے۔ یوں میرا داخلہ اس اسکول میں ہو گیا جس کا کبھی ابو نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

میں جب اسکول کے یونیفارم میں اپنا بیگ لے کر تیار ہوتا تو ابو کی آنکھوں میں عجیب سی چمک نمودار ہو جاتی۔ وہ خود مجھے اسکول چھوڑنے جاتے اور چھٹی کے وقت بھی واپس لے کر آتے۔

وہاں بڑے بڑے لوگوں کے بچے پڑھتے تھے۔ کسی کا باپ صنعت کار تھا، کسی کا باپ زمیندار! کوئی کسٹم یا پولیس کے اعلیٰ عہدے دار کا بیٹا تھا تو کوئی بزنس مین کا! ابو نے مجھے سختی سے منع کر دیا تھا کہ میں کسی کو یہ نہ بتاؤں کہ میں ایک ٹیکسی ڈرائیور کا بیٹا ہوں۔

مجھے اس وقت ابو کی اس بات پر بہت حیرت ہوئی تھی۔ بھلا میں کیوں نہ بتاؤں کہ میرے ابو ٹیکسی چلاتے ہیں؟

وقت گزرتا رہا اور میرے تعلیمی اخراجات بڑھتے رہے۔

اب ابو مزید محنت کرنے لگے۔ وہ کہتے تھے کہ ظفر پڑھ لکھ جائے گا تو ہمارے سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔ ارے اس اسکول کے پڑھے ہوئے بچوں کو ملازمت کے لیے کہیں بھاگنا نہیں پڑتا ہے بلکہ ملازمت خود چل کر ان تک پہنچتی ہے۔

میں بھی خوب دل لگا کر پڑھ رہا تھا اور اپنی کلاس کے نمایاں اسٹوڈنٹس میں میرا شمار ہوتا تھا۔ ساری ٹیچرز اور اساتذہ مجھ سے بہت خوش تھے۔ ان کا خیال تھا کہ میں ان کے اسکول کا نام مزید روشن کروں گا کیوں کہ تعلیم کے ساتھ ساتھ میں غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی پیش پیش رہتا تھا۔ تقریری مقابلوں میں حصہ لے کر میری انگلش بولنے کی صلاحیت تو بڑھ رہی تھی، مجھ میں بلا کا اعتماد بھی پیدا ہو گیا تھا۔

شدید محنت اور مشقت سے ابو وقت سے پہلے ہی بوڑھے سے لگنے لگے تھے۔ میں اکثر سوچتا تھا کہ جب میں تعلیم سے فارغ ہو جاؤں گا تو ابو کو کوئی کام نہیں کرنے دوں گا۔

میں ان دنوں اولیول کے امتحانات کی تیاریوں میں مصروف تھا۔

ابو اب منہ اندھیرے ٹیکسی لے کر نکل جاتے تھے اور سات بجے تک گھر آ کر ناشتا کرتے پھر مجھے اسکول چھوڑتے۔

اس دن بھی ابو منہ اندھیرے نکل گئے تھے۔ میں پرچے کی تیاری میں مصروف تھا۔

پھر سات بج گئے لیکن ابو نہیں آئے۔ مجھے شدید کوفت ہو رہی تھی کہ ابو کو آج ہی لیٹ ہونا تھا۔

"ارے بیٹا! پریشان کیوں ہوتے ہو؟" اماں نے کہا۔ "تمہارے ابو کو تم سے زیادہ تمہاری فکر ہے۔ بس آ ہی رہے ہوں گے۔"

"میں نے سیل فون پر ابو کو کال کر دی۔ چند گھنٹیوں کے بعد دوسری طرف سے کوئی اجنبی نسوانی آواز سنائی دی۔ "ہیلو!"

"آپ...... آپ کون بول رہی ہیں؟" میں نے عورت سے پوچھا۔ میرا خیال تھا کہ ابو کا سیل فون کہیں گر گیا ہوگا۔

"دیکھیے، میں لیاقت نیشنل ہاسپٹل سے ڈاکٹر فائزہ

بول رہی ہوں۔ جن صاحب کا یہ سیل فون ہے، وہ ایک حادثے میں شدید زخمی ہیں۔ ان کے ساتھ جو آدمی تھے، وہ ایکسپائر ہو چکے ہیں۔ آپ فوراً اسپتال پہنچیں۔"

میری آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا۔ ایسا لگا جیسے چھت میری طرف آرہی ہو۔ میں دھڑام سے فرش پر گر پڑا۔

یہ خبر سن کر امی بھی سکتے میں رہ گئیں۔ پھر ہم دونوں بہت عجلت میں اسپتال پہنچے۔

ابو کا جسم زخموں سے چُور چُور تھا۔ وہ شاید مجھے اور اماں کو آخری نظر دیکھنے کے لیے زندہ تھے۔

انہوں نے مجھے دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کی، اماں کو حسرت بھری نظروں سے دیکھا اور ان کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ ایک نرس نے آگے بڑھ کر ابو کا چہرہ سفید چادر سے ڈھک دیا۔

کارساز کے پاس ابو کی ٹیکسی ایک تیز رفتار کوچ سے ٹکرا گئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ غلطی کوچ والے کے ساتھ ساتھ ابو کی بھی ہوگی۔ وہ میری وجہ سے بہت تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کررہے ہوں گے تاکہ وقت پر گھر پہنچ سکیں۔

ہمارا تو دور و نزدیک کا کوئی رشتے دار بھی نہ تھا۔ سب کچھ محلے والوں نے کیا۔

ابو کی ٹیکسی اس بری طرح سے تباہ ہوئی تھی کہ اب اسے کوئی کباڑی ہی لے سکتا تھا۔

گھر میں عجیب سی ویرانی اور سناٹا تھا۔ ابو تو پہلے بھی گھر میں موجود نہیں ہوتے تھے لیکن میرے لیے یہ احساس ہی کافی تھا کہ وہ موجود ہیں اور رات گئے لوٹیں گے تو میرے لیے کوئی کتاب، کوئی پین یا کوئی کپڑا لے کر آئیں گے۔

میرا دوسرا پیپر چار دن بعد تھا۔ میں جانے کی تیاری کرنے لگا تو اماں بے اختیار سسک اٹھیں۔ وہ میری وجہ سے بہت ضبط کررہی تھیں۔ وہ مجھ سے بولیں۔ "ظفر! بیٹا، اب تجھے وہ اسکول چھوڑنا پڑے گا۔ تیرے تعلیمی اخراجات اب کون برداشت کرے گا؟"

"اماں!" میرے حلق میں آنسوؤں کا گولا سا اٹک گیا۔ "میں اس امتحان سے تو فارغ ہولوں، پھر کچھ سوچوں گا۔" یہ کہہ کر میں پیدل ہی امتحانی مرکز کی طرف چل دیا۔

اس وقت میری عمر ہی کیا تھی؟ صرف چودہ سال! میں بھلا کیا سوچ سکتا تھا مگر میں یہ امتحان ضرور دینا چاہتا تھا۔ اس کی فیس تو ابو نے بہت پہلے جمع کروادی تھی۔

پھر سارے اسکول میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ ظفر کے ابو کا ایکسی ڈنٹ میں انتقال ہوگیا۔ ہر شخص مجھ سے ہمدردی کررہا تھا۔

میں اس امتحان میں پہلی دفعہ فیل ہوگیا تھا۔ ابو کے حادثے کی وجہ سے میرا ایک پرچہ رہ گیا تھا، پھر میں دوسرے پرچوں کی بھی خاطر خواہ تیاری نہ کرسکا۔

میں جانتا تھا کہ اب میں اس اسکول میں نہیں پڑھ سکتا۔ میں نے خاموشی سے اسکول چھوڑنے کا سرٹیفکیٹ لیا اور اسکول چھوڑ دیا لیکن میں نے عہد کرلیا تھا کہ میں اپنی تعلیم ہر حال میں جاری رکھوں گا۔ یہ میرے ابو کا خواب تھا۔ اب اس خواب ہی کو پورا کرنا میری زندگی کا مصرف تھا۔

جس دن میں نے اسکول چھوڑا اس دن اماں یوں بلک بلک کر روئیں جیسے ابو کا آج ہی انتقال ہوا ہو۔ میں نے ان کے آنسو پونچھے اور ان سے وعدہ کیا کہ میں ابو کے خواب کو ضرور پورا کروں گا۔ میں پرائیویٹ طور پر اپنی تعلیم جاری رکھوں گا۔

میں پڑھائی میں اچھا تھا اس لیے محلے کے بچوں کو ٹیوشن پڑھانے لگا۔ اماں نے بھی مشین سنبھال لی اور سلائی کڑھائی کا کام کرنے لگیں۔ یوں زندگی کی گاڑی ایک مرتبہ پھر گھسٹنے لگی۔ میں نے نویں کلاس کے امتحان کا پرائیوٹ فارم بھر دیا تھا۔

اماں کچھ دنوں سے بیمار رہنے لگی تھیں۔ انہوں نے ابتدا میں تو اپنی بیماری پر توجہ نہ دی لیکن جب ایک دفعہ وہ چکر کھا کر گریں تو میں انہیں لے کر جناح اسپتال دوڑا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ اماں کو دل کا دورہ پڑا ہے۔ دل کا دورہ اتنا شدید تھا کہ دو دن تک زندگی اور موت کی کشمکش میں رہنے کے بعد اماں بھی مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئیں۔ انہوں نے ابو کے غم کو ایسا دل سے لگایا تھا کہ آخر وہ غم ان کی جان ہی لے کر ٹلا۔

میں اب اس بھری دنیا میں بالکل اکیلا رہ گیا۔ اب مجھے احساس ہوا کہ والدین اولاد کے لیے کتنا بڑا سائبان ہوتے ہیں۔ میں اکیلے گھر میں گھنٹوں روتا رہتا لیکن کوئی میرے آنسو خشک نہ کرتا۔

مہینے کی پہلی تاریخ کو مالک مکان کرایہ لینے آیا تو مجھے احساس ہوا کہ میرے سر پر تو چھت بھی میری اپنی نہیں ہے۔ اس نے مجھ سے انتہائی تلخ لہجے میں کہا۔ "ظفر میاں! تمہاری اماں نے پچھلے چار مہینے سے مکان کا کرایہ نہیں دیا ہے۔ تم



نے اگر پندرہ دن کے اندر اندر میرا حساب بے باق نہیں کیا تو میں تمہارا سامان اٹھا کر سڑک پر رکھوا دوں گا۔"

ابو اس سے کرائے کی رسید تو لیتے نہیں تھے۔ میں جانتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اماں نے پچھلے مہینے میرے سامنے مکان کے کرائے کے پیسے الگ کیے تھے۔ وہ ایسا آدمی تھا کہ ایک ایک پیسے پر جان دیتا تھا۔ وہ بھلا چار مہینے تک رک سکتا تھا؟

میں نے کہا۔ "ظہور چاچا آپ .... بھول رہے ہیں، اماں نے پچھلے مہینے آپ کو کرایہ دیا تھا۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔" ظہور آپے سے باہر ہوگیا۔ "جب تک تمہارا باپ زندہ رہا، مجھے وقت پر کرایہ ملتا رہا۔"

"آپ کوئی رسید تو دیتے نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "اب یہ فیصلہ کون کرے گا کہ اماں نے آپ کو کرایہ دیا ہے یا نہیں؟" میرے اسکول کی خود اعتمادی میرے کام آرہی تھی۔

"یہ فیصلہ تو اب پولیس ہی کرے گی۔" ظہور چاچا نے کہا۔

مجھے بھی غصہ آگیا اور میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "تو پھر پولیس کے پاس جاؤ۔"

"تو مجھ سے زبان درازی کررہا ہے؟" ظہور چاچا نے بپھر کر کہا۔ "تجھے بڑوں سے بات کرنے کی بالکل تمیز نہیں ہے۔"

"میں نے ایسی کیا بات کہہ دی چاچا!" میں نے کہا۔ "آپ ہی تو کہہ رہے ہیں کہ پولیس فیصلہ کرے گی تو پھر کرنے دیں پولیس کو فیصلہ!"

"میں تجھے دس دن کی مہلت دے رہا ہوں...... اگر تو نے میرا سارا کرایہ ادا نہ کیا تو میں تجھے کان پکڑ کر اس مکان سے نکال دوں گا اور جب تک کرایہ نہیں دے گا، اس مکان سے ایک تنکا بھی نہیں لے جانے دوں گا، سمجھا۔" یہ کہہ کر وہ دھم دھم کرتا ہوا سیڑھیاں اتر کر نیچے چلا گیا۔

یہ ایک نئی افتاد آپڑی تھی۔ میں نے اٹھ کر الماری سے لے کر کچن تک کی تلاشی لے ڈالی لیکن مجھے امی کی الماری سے صرف دو ہزار روپے ملے۔ ان کے ساتھ ہی ایک کاپی ملی جس پر ہر مہینے کا حساب درج تھا۔ امی نے ظہور کو باقاعدگی سے کرایہ ادا کیا تھا۔ میرا خون کھولنے لگا لیکن ایک پندرہ سال کا بچہ ایسے جھوٹے اور مکار آدمی کا کر بھی کیا سکتا ہے؟

اچانک مجھے اپنے اسکول کے ایک دوست سہیل کا خیال آیا۔ اس کے ابو بیرسٹر تھے اور شہر میں ان کا خاصا نام تھا۔ میرے پاس سہیل کا سیل نمبر موجود تھا۔

میں نے اسی وقت اسے ٹیلی فون کردیا۔

وہ میری آواز سنتے ہی بولا۔ "یار ظفر! تُو تو بہت بے مروت نکلا۔ ارے یار تُو نے اسکول کیا چھوڑا، اپنے دوستوں کو بھی چھوڑ دیا۔ سبھی تیرے بارے میں پوچھتے رہتے ہیں۔ تُو نے اپنا پرانا نمبر شاید آف کردیا ہے؟"

"میں ایسی مصیبتوں اور پریشانیوں میں گھرا ہوا ہوں کہ کسی سے رابطہ کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔" میں نے جواب دیا۔ پھر اس سے ٹیلی فون ہی پر اس کا پتا پوچھا اور اسی وقت روانہ ہوگیا۔

وہ ڈیفنس میں رہتا تھا۔

میں نے شروع سے لے کر آخر تک اسے سب کچھ بتا دیا۔ "یار ظفر بہت افسوس ہوا یہ سب سن کر۔" اس نے افسردہ لہجے میں کہا۔

میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "یار سہیل...... وہ...... مجھے ...... کچھ پیسوں...... کی ضرورت ہے...... میں......"

"ہاں، بول کتنے پیسے چاہئیں تمہیں۔" اس نے اپنا پرس جیب سے نکالتے ہوئے کہا۔ "میرے پاس اس وقت چار ہزار روپے ہیں دو ہزار تم لے لو۔" اس نے ہزار ہزار روپے کے دو نوٹ نکالتے ہوئے کہا۔

"نہیں یار، ان پیسوں سے میرا کام نہیں چلے گا۔" میں نے کہا۔ "مجھے کم سے کم اس وقت بیس ہزار روپے کی ضرورت ہے۔"

"بیس ہزار!" سہیل نے تشویش سے کہا۔ "یار، اتنے پیسے تو میرے پاس نہیں ہیں، ہاں، میں کوشش کرتا ہوں کہ ڈیڈی سے لے سکوں۔"

"نہیں سہیل!" میں نے کہا۔ "تم رہنے دو، میں کہیں اور سے بندوبست کرلوں گا۔"

اچانک سہیل کے سیل فون کی بیل بجی، اس نے سیل فون جیب سے نکالا اور اسکرین پر نام دیکھ کر بولا۔ "جی شکیل صاحب، آپ تو دو گھنٹے پہلے مجھے کال کرنے والے تھے، خیر یہ بتائیے کہ آپ لیپ ٹاپ کی ڈلیوری کب دے رہے ہیں؟ تمہیں کیش نہیں چیک دوں گا۔ ڈیڈی کہتے ہیں کہ پے منٹ ہمیشہ کراس چیک کے ذریعے کیا کرو اور آپ کیا سمجھتے ہیں کہ میرے اکاؤنٹ میں ستر ہزار نہیں ہوں گے...... او شیور،

چیک تو آپ کو ابھی بھجوا دیتا ہوں۔" پھر اس نے رسمی طور کی ادائیگی کے بعد رابطہ منقطع کر دیا۔

ہر چند کہ وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر چلا گیا تھا اور بہت دھیمے لہجے میں بول رہا تھا لیکن میں نے اس کی گفتگو سن لی۔

میرے دل میں نفرت کی ایک لہر سی اٹھی۔ سہیل کے اکاؤنٹ میں ستر اسی ہزار روپے موجود تھے لیکن وہ مجھے دیتے ہوئے ڈر رہا تھا کہ میں اتنی بڑی رقم واپس کیسے کروں گا؟

میں وہاں سے اٹھا اور سہیل سے بغیر کچھ کہے وہاں سے آ گیا۔ ابو ٹھیک ہی کہتے تھے۔ ان دولت مندوں کو اگر تمہاری حقیقت معلوم ہو جائے تو یہ تمہیں منہ لگانا بھی پسند نہیں کریں گے۔ ہاں اگر میں اس سے جھوٹ بولتا کہ ابو کے بعد تمام زمین کی ذمے داری مجھ پر آ گئی ہے۔ اماں کے انتقال کی وجہ سے بھی ابھی تک گھر سے باہر نہیں نکلا تو شاید کیا یقیناً وہ مجھے بیس ہزار روپے دے دیتا۔

پھر میں نے بہت کوشش کی کہ کہیں سے رقم کا بندوبست ہو جائے لیکن ایسا نہ ہوا۔

دس دن بعد ظہور چاچا پھر آ موجود ہوا۔ اس کے ساتھ پولیس کا ایک مریل سا سپاہی بھی تھا۔

"اوئے، تم ہو ظفر؟" پولیس والے نے اکھڑ۔۔۔ لہجے میں پوچھا۔

"ہاں، میں ہی ظفر ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"اوئے ظہور کو پیسے دے رہے ہو یا میں تمہارا سامان اٹھا کر باہر پھینکوں؟"

اسی وقت ساجد بھائی وہاں سے گزرے، پولیس والے کو چیخ پکار کرتے دیکھ کر وہ رک گئے۔ وہ وکیل تھے اور ایک بہت بڑے وکیل کے اسسٹنٹ تھے۔ "کیا بات ہے ظفر؟"

انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ "یہ اتنا شور کیوں کر رہا ہے؟"

"شور تو اس وقت ہوگا باؤ جب میں اسے دھکے مار کے یہاں سے نکالوں گا؟"

"پولیس ان معاملات میں دخل نہیں دیتی۔" ساجد بھائی نے سرد لہجے میں کہا۔

"او بس اوئے، کیے قانون دان دا پتر!" سپاہی نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔ "تو آخر ہے کون؟"

میں ایڈووکیٹ ساجد علی ہوں، بیرسٹر ارشاد کاظمی کا اسسٹنٹ ہوں، ویسے تم کس تھانے سے آئے ہو؟" انہوں نے جیب سے سیل فون نکالتے ہوئے کہا۔ "میں ابھی تمہارے انچارج سے بات کرتا ہوں۔ اس نے تمہیں کس قانون کے تحت یہاں بھیجا ہے۔"

پولیس والے کا لہجہ ایک دم بدل گیا اور بولا۔ "وکیل صاحب......! اصل میں ظہور صاحب سے میری دوستی ہے۔ میں اسی وجہ سے چلا آیا۔"

"تم جانتے ہو کہ یہ بھی جرم ہے۔" ساجد بھائی نے کہا۔

"غلطی ہو گئی وکیل صاحب...... میں..."

"یہ غلطی آئندہ نہ ہو۔" ساجد بھائی نے کہا۔

پولیس والا ظہور چاچا سے کچھ کہے بغیر ہی تیزی سے چلا گیا۔

"یہ مسائل پولیس تھانوں میں نہیں بلکہ ...... عدالت میں حل ہوتے ہیں ظہور چاچا۔" ساجد بھائی نے کہا۔

"اس کام کے راستے اور بھی ہے۔" ظہور چاچا مسکرایا پھر مجھ سے بولا۔ "تجھے ایک ہفتے کی مہلت اور دے دیتا ہوں۔"

ساجد بھائی مسکرا کر وہاں سے چلے گئے۔ میں نے سوچا کہ یہ تو روز کا عذاب ہوگا۔ میرے امتحان بھی نزدیک تھے۔ میں کسی بھی قسم کی رنجش نہیں چاہتا تھا۔ میں نے کہا "ظہور چاچا! اگر آپ مجھ سے ہر ماہ تھوڑے تھوڑے کر کے پیسے لے لیں تو آپ کا بہت احسان ہوگا۔"

"تمہاری اماں بھی یہی کہتی تھی۔" ظہور چاچا نے سرد لہجے میں کہا۔ "میں تمہیں ایک ہفتے سے زیادہ کی مہلت نہیں دے سکتا۔"

"ٹھیک ہے چاچا۔" میں نے شکستہ لہجے میں کہا اور گھر کے اندر چلا گیا۔

گھر میں اتنا سامان تھا کہ وہ کم سے کم پچاس ساٹھ ہزار روپے کا تو ہوگا۔ میں نے بڑے بڑے دو سوٹ کیس نکالے۔ ان میں اپنا تمام سامان اور ابو اور امی کا کچھ ضروری سامان بھر لیا کہ مجھے گھر خالی کرنا پڑے تو کم از کم میں یہ ضروری سامان لے کر تو جا سکوں۔

ایک ہفتہ گویا پلک جھپکتے بیت گیا۔

ایک ہفتے بعد ظہور چاچا آیا تو میں نے اپنے دونوں سوٹ کیس اٹھائے اور مکان کی چابی ظہور چاچا کے ہاتھ پر رکھ دی۔

ظہور چاچا نے حیرت سے مجھے دیکھا، پھر مکان میں تالا ڈال کر بولا۔ "اگر تم نے تین مہینے کے اندر اندر رقم ادا کر دی تو تمہیں اپنا سامان واپس مل جائے گا۔"

میں گزشتہ ایک ہفتے سے اپنے رہنے کے لیے کوئی ٹھکانا تلاش کر رہا تھا لیکن مجھے کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اب کہاں جاؤں؟ شدید گرمیوں کا موسم تھا اور اس وقت بھی سورج گرم آگ برسا رہا تھا۔ میں اپنے دونوں سوٹ کیس لیے ابھی تک مکان کی سیڑھیوں پر بیٹھا تھا۔

اچانک مجھے صائمہ دکھائی دی۔ وہ دبے پاؤں زینہ اتر رہی تھی۔ آتے جاتے اکثر اس سے ٹکراؤ ہوتا تھا لیکن میں نے کبھی توجہ سے اسے نہیں دیکھا تھا۔ وہ عمر میں مجھ سے تین چار سال بڑی ہی ہوگی۔ صائمہ خاصی قبول صورت بھولی بھالی لڑکی تھی۔ میں اب تک مخلوط تعلیمی ادارے میں پڑھتا رہا تھا۔ اس لیے لڑکیوں سے بات کرنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی۔

"ظفر! مجھے معلوم ہوا ہے کہ ابو نے تمہیں مکان سے نکال دیا ہے؟" اس نے اتنے دھیمے لہجے میں پوچھا کہ مجھے سرگوشی کا گمان ہوا۔

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ صائمہ سے میں کبھی کبھار بات چیت بھی کر لیتا تھا۔ وہ اکثر مجھ سے کتابیں اور رسالے منگوایا کرتی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ ظہور چاچا جیسے دھوکے باز اور گھٹیا آدمی کی بیٹی ہے۔

"تو پھر، اب تم کہاں جاؤ گے؟" اس نے پھر سرگوشی کی۔ وہ بھی میرے ساتھ ہی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی تھی۔

"اللہ کی دنیا بہت بڑی ہے صائمہ باجی!" میں نے کہا۔ "مجھے کہیں نہ کہیں تو سر چھپانے کا ٹھکانا مل ہی جائے گا۔"

"ابو تم سے کتنے پیسے مانگ رہے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"تقریباً بیس ہزار روپے۔" میں نے جواب دیا۔ "ان کا کہنا یہ ہے کہ اماں نے انہیں چار مہینے سے کرایہ نہیں دیا تھا۔"

"اگر تمہیں یہ رقم ادھار مل جائے تو؟"

"اتنی بڑی رقم مجھے کون ادھار دے گا؟" میں نے کہا۔

"تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لو کہ تمہیں پیسے مل گئے ہیں۔" صائمہ مسکرائی تو اس کے گالوں میں ڈمپل سے پڑنے لگے۔

"فرض کرنے کو تو میں یہ بھی فرض کر سکتا ہوں کہ مجھے دس لاکھ مل گئے ہیں۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"ظفر!" صائمہ نے آہستہ سے کہا۔ "اگر...... وہ بیس ہزار میں تمہیں دے دوں تو؟"

"نہیں صائمہ باجی؟" میں نے کہا۔ "آپ اتنی بڑی رقم مجھے کہاں سے دیں گی اور میں اسے کیسے لوٹاؤں گا؟"

"تم اسے قرضِ حسنہ سمجھ لو، جب تمہارے پاس ہوں، مجھے لوٹا دینا۔"

"نہیں صائمہ باجی، میں آپ سے پیسے نہیں لے سکتا۔" میں نے سختی سے انکار کر دیا۔

"وہ میرے اپنے پیسے ہیں بدھو! میں نے اپنے جیب خرچ سے جمع کئے ہیں۔"

"پھر تو میں بالکل بھی نہیں لوں گا۔ آپ نے ایک ایک پیسا کر کے یہ رقم جمع کی ہوگی۔ یوں بھی اب میں اس مکان میں رہنا نہیں چاہتا۔ یہاں تو قدم قدم پر اماں اور ابو کی یادیں بکھری ہوئی ہیں۔ میں یہ گھر یوں بھی چھوڑنا چاہ رہا تھا۔"

"اچھا، پھر ایسا کرو، انکل ابو الحسن کے مکان کا اوپر والا کمرا کرائے پر لے لو۔ اس کمرے کا کرایہ بھی بہت کم ہوگا اور تمہیں در در بھٹکنے سے بھی نجات مل جائے گی۔"

"لیکن وہ اپنا کمرا کرائے پر کیوں دیں گے؟" میں نے کہا۔

"وہ دے دیں گے۔ تم ان سے بات تو کر کے دیکھو، اچھا تم رہنے دو، میں ان کی بیٹی بشریٰ سے بات کرتی ہوں۔ انکل اس کی بات نہیں ٹالتے... اور بشریٰ کبھی میری بات نہیں ٹالتی۔"

مجھے یہ سب کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ بشریٰ بھلا میری سفارش کیوں کرتی، وہ کرتی بھی تو انکل اسے کیا سمجھتے؟

یہی سوچ کر میں نے کہا۔ "صائمہ باجی! انکل ابو الحسن مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔ انہیں کمرا کرائے پر دینا ہوگا تو وہ کبھی انکار نہیں کریں گے۔ میں آج شام کو ان سے خود ہی بات کر لوں گا۔" پھر میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں اب جا رہا ہوں لیکن میرے دونوں سوٹ کیس یہیں رکھے ہیں۔"

"ان کی تم فکر مت کرو۔ میں زینے کا دروازہ نیچے سے بند کر دوں گی۔" پھر وہ کچھ سوچ کر بولی۔ "ہاں، میں تمہارے اس سامان کے بھی ایک ایک تنکے کی حفاظت کروں گی جو گھر میں موجود ہے۔"

صائمہ..... کا رویہ میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ وہ مجھ پر کیوں اتنی مہربان ہو رہی تھی حالانکہ اس سے پہلے تو کبھی میں نے رسمی باتوں کے علاوہ اس سے کوئی بات بھی نہیں کی تھی۔

ساڑھے تین بج رہے تھے۔ میں چار بجے گلشن اقبال

میں دو بچوں کو ٹیوشن پڑھاتا تھا۔

میں ٹیوشن پڑھا کر لوٹا تو شام ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ اب تک انکل ابوالحسن آفس سے آ چکے ہوں گے۔

میں نے ڈرتے ڈرتے اطلاعی گھنٹی بجادی۔

فوراً ہی اندر سے انکل کی چھوٹی بیٹی یسریٰ باہر نکلی اور حیرت سے بولی۔ ''ظفر بھائی، آپ؟''

''ہاں، مجھے انکل سے کچھ کام ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ فوراً ہی اندر غائب ہوگئی۔ کچھ دیر بعد انکل باہر نکلے۔ میں نے انہیں سلام کیا تو وہ سلام کا جواب دے کر بولے۔ ''ظفر بیٹا! خیریت تو ہے؟'' پھر وہ چونک کر بولے۔ ''آؤ، اندر آ جاؤ۔''

وہ مجھے ڈرائنگ روم میں لے گئے۔ وہ پڑھے لکھے معقول انسان تھے اور میرے ساتھ بہت شفقت سے پیش آتے تھے۔

میں نے جھجکتے ہوئے انہیں بتایا کہ ظہور چچا نے مجھے گھر سے بے گھر کردیا ہے۔ مجھے فوری طور پر سر چھپانے کو کسی ٹھکانے کی تلاش ہے۔ آپ کا دوسری منزل کا ایک کمرا خالی ہے۔ اگر آپ وہ کمرا مجھے کرائے پر دے دیں تو......''

''نہیں میاں، میں وہ کمرا کرائے پر نہیں دوں گا۔'' انکل نے صاف انکار کردیا۔

''انکل، وہ کمرا آپ کے گھر سے بالکل علیحدہ ہے، اس کا زینہ بھی الگ ہے۔ آپ کو کسی بھی قسم کی کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔''

''بھئی ظفر میاں، میں نے کہا نہ کہ میں وہ کمرا کرائے پر نہیں دوں گا۔''

''جیسے آپ کی مرضی انکل؟'' میں نے مایوسی سے کہا اور اٹھتے ہوئے بولا۔ ''زحمت کے لیے معذرت چاہتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔

''ٹھہرو بیٹا!'' انکل نے کہا۔ ''میں نے شربت بنوادیا ہے، اسے پی لو۔''

''آپ کا بہت شکریہ انکل!'' میں نے کہا۔ ''رات ہونے والی ہے اور مجھے کسی ٹھکانے کا بندوبست بھی کرنا ہے ورنہ یہ رات مجھے فٹ پاتھ پر گزارنا پڑے گی۔''

''تمہارا سامان کہاں ہے؟'' انکل نے پوچھا۔

''''سامان کیا، صرف دو سوٹ کیس ہیں، باقی سامان تو ظہور چچا نے قبضہ کرلیا ہے۔''

''یہ ظہور نے اچھا نہیں کیا۔'' انکل نے کہا۔

''انہوں نے اچھا ہی کیا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ورنہ اس سامان کو لے کر میں کہاں بھٹکتا۔ ویسے بھی وہ مکان مجھے بہت مہنگا پڑ رہا تھا۔ جب میرا گزارہ ایک کمرے میں ہوسکتا ہے تو پھر پورا مکان لینے کی کیا ضرورت ہے؟''

''اچھا، تم ایسا کرو، اپنے سوٹ کیس لے کر یہاں آ جاؤ، لیکن وہ کمرا میں تمہیں کرائے پر نہیں دے رہا ہوں۔ تمہارا کرایہ بس یہ ہوگا کہ تم میرے بچوں کو ٹیوشن پڑھادو۔ تم کراچی کے اتنے بڑے اسکول میں پڑھتے رہے ہو۔ ساتویں اور آٹھویں کے بچوں کو تو پڑھا ہی سکتے ہو؟''

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ میں حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''ارے بھئی، سوچ کیا رہے ہو؟ جاؤ اپنا سامان لے آؤ۔'' انکل نے مجھے چونکا دیا۔

''میں اسی وقت اپنے گھر پہنچا، وہ گھر جہاں میں نے اماں اور ابو کے ساتھ زندگی کے خوبصورت ترین دن بتائے تھے۔

صائمہ نے شاید مجھے انکل ابوالحسن کے گھر جاتے دیکھ لیا تھا۔ وہ زینے ہی کے پاس کھڑی تھی۔

''کیا ہوا ظفر؟ انکل سے بات ہوئی؟''

''جی صائمہ باجی؟'' میں نے جواب دیا۔ ''انکل سے بات بھی ہوگئی اور وہ راضی بھی ہوگئے۔ میں اپنے سوٹ کیس لینے آیا ہوں۔''

''ارے، یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' صائمہ نے کہا، پھر وہ کچھ سوچ کر بولی۔ ''ظفر، وہاں تمہیں بستر اور دوسری چیزوں کی ضرورت تو پڑے گی۔''

''جب اتنا بڑا مسئلہ حل ہوگیا ہے تو یہ تو چھوٹے چھوٹے مسئلے ہیں'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''یہ بھی اللہ نے چاہا تو حل ہوجائیں گے۔''

میں نے اپنے دونوں سوٹ کیس اٹھائے، صائمہ کا شکریہ ادا کیا اور انہیں لے کر گلی میں آگیا۔ وہ خاصے بڑے اور بھاری سوٹ کیس تھے۔ انہیں اٹھانے میں مجھے بہت دقت ہو رہی تھی لیکن غنیمت یہ تھا کہ انکل کا گھر اسی گلی کے نکڑ پر تھا۔

میں نے دونوں سوٹ کیس اوپر پہنچائے تو میں پسینے پسینے ہوگیا۔ میں نے سوچا کہ پہلے کمرے کی صفائی کرلوں، پھر کوئی دوسرا کام کروں گا لیکن کمرا تو آئینے کی طرح چمک رہا تھا۔ شاید انکل نے پہلے ہی اس کی صفائی کرادی تھی۔ کمرے کے ساتھ ہی اٹیچ باتھ روم تھا۔ اس کے باہر خاصا بڑا صحن تھا، صحن کیا پوری چھت ہی تھی۔ کمرے کے باہر چھوٹا سا ایک برآمدہ بھی تھا۔ اس میں ایک طرف چھوٹا سا گیس کا ایک چولہا بھی لگا ہوا تھا۔

میں دوبارہ کمرے میں آیا اور سوچا کہ کم سے کم ہاتھ منہ ہی دھولوں۔ میں باتھ روم کی طرف بڑھا تو وہاں سے پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔ شاید کوئی نل کھلا رہ گیا تھا۔

یہی سوچ کر میں باتھ روم میں داخل ہوا تو اچھل پڑا۔ کوئی لڑکی بہت انہماک سے باتھ روم کی صفائی کر رہی تھی۔ اس کی پشت میری جانب تھی۔ اس نے شلوار کے پائنچے چڑھا رکھے تھے اس لئے اس کی گوری گوری سڈول پنڈلیاں نظر آرہی تھیں۔ اس کے بال براؤن تھے جو اس کی پشت پر پھیلے ہوئے تھے اور کچھ آگے کی طرف جھول رہے تھے۔

''سنیے!'' میں نے آہستہ سے کہا۔

وہ بری طرح اچھل کر میری طرف پلٹی اور چکنے فرش پر اس کا پیر پھسل گیا۔ میں اگر فوراً ہی آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ نہ پکڑ لیتا تو وہ بری طرح گر جاتی۔

وہ جونہی سنبھلی میں نے اس کا نرم گداز ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ بلا کی حسین لڑکی تھی۔ میں نے ایک آدھ دفعہ اس سے پہلے بھی اسے دیکھا تھا لیکن اس وقت اس کے سر پر اور جسم پر خاصا بڑا دوپٹا ہوتا تھا۔

وہ شرم سے پلکیں جھکائے کھڑی تھی۔ اس کا رنگ سرخ و سفید تھا اور جلد کی رنگت ایسی تھی جیسے اندر بہت سے بلب جل رہے ہوں۔ پلکیں بھی بہت گھنی اور بالوں کی طرح براؤن تھیں۔ اس کا دوپٹا بھی اس وقت کھونٹی پر لٹکا ہوا تھا اور کپڑے پانی سے گیلے ہوکر جسم سے چپک سے گئے تھے۔

اس سے پہلے بہت سی لڑکیوں سے میرا واسطہ پڑا تھا لیکن اتنا مکمل حسن میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ باہر بھاگنے کے لیے بے تاب تھی لیکن راستے میں تو میں کھڑا ہوا تھا۔

اس نے کچھ کہنے کو منہ کھولا ہی تھا کہ اچانک کمرے میں آہٹ ہوئی اور انکل کی آواز سنائی دی۔ ''ظفر بیٹا! تم اپنا سامان لے آئے؟''

''جی انکل!'' میں نے جلدی سے جواب دیا۔

''اچھا نہا دھو کر کہیں نکل مت جانا، میں نیچے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔''

''جی انکل!'' میں نے جواب دیا۔

بشریٰ کا رنگ اس وقت ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ابھی بے ہوش ہوکر گر پڑے گی۔ پھر مجھے سیڑھیاں اترنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے بہت آہستگی سے دروازہ کھولا اور کمرے میں جھانکا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔

اس دوران میں بشریٰ اپنا دوپٹا اوڑھ چکی تھی اور شلوار کے پائنچے بھی نیچے کرلیے تھے۔ میں نے اسے راستہ دے دیا۔ وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

میں نے بھی سکون کا سانس لیا۔ انکل کی آواز سن کر میں بھی بری طرح بوکھلا گیا تھا۔ اگر وہ باتھ روم کے اندر جھانک لیتے تو میرے بارے میں کیا سوچتے؟

میں نے باتھ روم پر نظر ڈالی، وہاں سامنے تولیا، ٹوتھ پیسٹ، سبھی کچھ موجود تھا۔ نہانے سے میں تروتازہ ہوگیا۔

میں نیچے پہنچا تو انکل میرے انتظار میں بیٹھے تھے۔

''آؤ بھئی ظفر!'' انہوں نے خوش دلی سے کہا۔ ''تمہیں کمرا پسند آیا؟''

''انکل کمرا تو ضرورت سے کچھ زیادہ ہی اچھا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے تو سر چھپانے کا ایک ٹھکانا چاہیے تھا۔''

''ہاں، وہ ظہور کے گھر سے تمہارا بستر آگیا ہے۔ آج تو بیٹا تمہیں زمین ہی پر سونا پڑے گا۔ میرے پاس ایک بیڈ فالتو پڑا ہے۔ کل وہی بیڈ اوپر لے جا کر رکھ لینا۔''

''انکل، مجھے یوں بھی زمین پر سونے کی عادت ہے۔'' میں نے کہا۔ ''پھر زمین پر اتنا دبیز قالین ہے کہ مجھے بستر کی ضرورت بھی نہیں ہے۔''

پھر وہ دیر تک مجھ سے میری پڑھائی کے بارے میں باتیں کرتے رہے، وہ میری تعلیمی قابلیت سے بہت متاثر تھے۔ وہی کیا، محلے کا ہر فرد مجھ پر رشک کرتا تھا کہ میں کراچی کے اس اسکول میں پڑھتا ہوں جہاں داخلے کے لیے بچوں کی پیدائش سے پہلے ہی رجسٹریشن ہوجاتی ہے۔ وہ نہ جانے محکمہ تعلیم کا کون سا افسر تھا جس کے صرف ایک ٹیلی فون پر میرا ایڈمیشن ہوگیا تھا، میرے پاس تو ان کا کوئی پتا اور فون نمبر بھی موجود نہیں تھا ورنہ میں ان سے ضرور رابطہ کرتا۔

''بیٹا، مجھے افسوس ہے کہ تمہیں اولیول چھوڑ کر میٹرک کرنا پڑ رہا ہے۔ یقین مانو، اگر میری اتنی استطاعت ہوتی تو تمہارے تعلیمی اخراجات میں برداشت کرلیتا۔ تمہارے ابو بہت حوصلہ مند انسان تھے۔ وہ نہ جانے کس طرح تمہارے اخراجات پورے کر رہے تھے؟''

اسی وقت یسریٰ نے آکر بتایا کہ کھانا تیار ہے۔

''تم دسترخوان بچھاؤ، ہم آرہے ہیں۔'' انکل نے کہا، پھر مجھ سے بولے۔ ''آؤ یار ظفر، پہلے کھانا کھالیں،

باقی باتیں بعد میں کریں گے۔"

"انکل! میری ایک بات مانیں گے؟" میں نے کہا۔ "میں مزید آپ پر بوجھ نہیں بننا چاہتا۔ آپ نے سر چھپانے کو ٹھکانا دے دیا، میرے لیے آپ کا یہی احسان بہت ہے۔ اب میری خودداری کو مزید مجروح نہ کریں۔ میں اپنے کھانے کا بندوبست خود ہی کرلوں گا۔"

میرے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ انکل نے مزید کچھ نہیں کہا، پھر کچھ توقف کے بعد بولے۔ "یار، آج تو کھانا کھالو پھر اپنا بندوبست کرلینا۔ میں تمہاری خودداری کو مجروح نہیں کرنا چاہتا۔"

دسترخوان پر آنٹی اور ان کے دونوں بیٹے بھی موجود تھے۔ ان کا چھوٹا بیٹا یاسر پانچویں کلاس میں پڑھتا تھا اور بڑا بیٹا عامر آٹھویں میں۔ دسترخوان پر یسریٰ اور بشریٰ موجود نہیں تھیں۔

کھانے کے بعد میں اوپر گیا تو کمرے میں نہ صرف اسپرنگ والا میٹرس (گدا) موجود تھا بلکہ ایک کونے میں مجھے چھوٹی سی ایک میز اور کرسی بھی نظر آئی۔ میز پر ایک ٹیبل لیمپ بھی موجود تھا۔ میرے بستر کے ساتھ ایک چھوٹی میز بھی موجود تھی جس پر پانی کا جگ اور گلاس رکھا تھا۔

مجھے یقین تھا کہ بستر تو صائمہ .... نے بھجوایا ہوگا۔ اسپرنگ کا دبیز گدا اور میز وغیرہ انکل نے رکھوائی ہوگی۔

میں اس پریشانی سے آزاد ہوا تو مجھے کئی ہفتے بعد سکون سے سونا نصیب ہوا۔

مجھے اسکول تو جانا نہیں تھا۔ اس کے باوجود علی الصباح اٹھنے کی ایسی عادت پڑی تھی کہ میری آنکھ ساڑھے چھ بجے خود ہی کھل گئی۔

میں نے اپنا سوٹ کیس کھول کر اس میں سے اپنی کتابیں نکالیں۔ انہیں سلیقے سے میز پر رکھا۔ پھر میں نے سوچا کہ میں پہلے ضروری چیزوں کی لسٹ بنالوں، پھر اپنا ٹائم ٹیبل بناؤں گا۔

چھت کی طرف کا دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا۔ وہاں سے بہت ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کمرے میں آرہے تھے۔ میں بے اختیار دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ کھلی فضا میں دو چار گہرے گہرے سانس لیے تو مجھے تازگی کا احساس ہوا۔

اچانک میری نظر برآمدے کے اس کونے پر پڑی جہاں گیس کا چولہا لگا ہوا تھا۔ یہاں دائیں طرف بھی ایک سلیب لگا ہوا تھا۔ اس پر مجھے مختلف چیزیں نظر آرہی تھیں۔

میں نے نزدیک جا کر دیکھا، اس میں چینی کا مرتبان، چائے کی پتی، چائے بنانے کی ایک کیتلی، دو کپ، دو تین چمچے، سبزی کاٹنے کی ایک چھری اور دو تین پلیٹیں تھیں۔ یعنی کچن کا سبھی سامان موجود تھا۔ میں انکل کی عنایتوں تلے دبا جارہا تھا۔ یہ سب شاید اس وقت کیا گیا تھا، جب میں رات کو نیچے کھانا کھا رہا تھا۔

میں نے سوچا تھا کہ صبح سات بجے سے لے کر گیارہ بجے تک پڑھائی کروں گا، پھر ڈبل روٹی وغیرہ لا کر اپنے لیے چائے بناؤں گا۔ اس کے بعد پھر کسی کام کی تلاش میں نکل جاؤں گا۔ میرے پاس صرف چار ٹیوشنز تھیں جن سے مجھے اتنے پیسے نہیں ملتے تھے کہ میرے اخراجات پورے ہوسکتے۔ محلے کے دو چار بچے تھے۔ ان سے میں برائے نام پیسے لیتا تھا۔

میں نے اپنی کتابیں اٹھائیں اور پنکھا بند کر کے دوبارہ کھلی چھت پر آگیا۔ وہاں بیٹھ کر میں دو گھنٹے تک پڑھتا رہا۔ میں اولیول کر رہا تھا اس لیے یہ پڑھائی تو میرے لیے بہت آسان تھی۔ میں اگر اسی طرح دو گھنٹے روز بھی پڑھتا تو اچھے خاصے نمبر لے سکتا تھا۔

اچانک دروازے پر بہت آہستگی سے دستک دی گئی۔

میں نے دروازہ کھولا تو صائمہ کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ بے تکلفی سے اندر آگئی اور بولی۔ "رات کو میں نے تمہارا بستر بھجوادیا تھا۔ میں تمہارے لیے ناشتا لے کر آئی ہوں۔"

"صائمہ باجی پلیز!" میں نے کہا۔ "میری انا اور خودداری کو اتنی ٹھیس نہ پہنچائیں کہ میں خود بھی اپنے آپ پر ترس کھانے لگوں۔"

"اچھا بابا، ابھی تو ناشتا کرلو۔ آئندہ نہیں لاؤں گی۔" صائمہ نے افسردگی سے کہا۔

پھر اس شاپر سے پلاسٹک کے دو تین ڈبے نکالے۔ ناشتا کیا وہ کھانا تھا۔

وہ کھانے پینے کی چیزیں میرے آگے رکھ کر بولی۔ "تم ناشتا کرو، میں تمہارے لیے چائے بناتی ہوں۔" وہ اپنے ساتھ دودھ، چینی اور چائے کی پتی بھی لائی تھی۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، وہ تیزی سے باہر نکل گئی، ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے اس گھر کا چپا چپا دیکھا ہوا ہے۔

وہ چائے بنا کر لائی اور مسکرا کر بولی۔ "بھئی ظفر، تم تو بہت سگھڑ ہو۔ راتوں رات اپنا کچن بھی سیٹ کرلیا۔"

میں اس کی بات کے جواب میں صرف مسکرا کر رہ گیا۔ وہ اس کے بعد تھوڑی دیر بیٹھ کر چلی گئی۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ یہ سب کچھ کیوں کررہی ہے؟ میں برسوں اس کے گھر میں کرایہ دار کی حیثیت سے رہا تھا لیکن کبھی اس سے زیادہ بات نہیں ہوئی تھی۔ وہ ماں کے پاس البتہ کبھی کبھی آجاتی تھی۔ ممکن ہے روز آتی ہو لیکن میں نے اپنی موجودگی میں اسے کم ہی گھر میں دیکھا تھا۔

میں کچھ دیر پڑھنے کے بعد پڑھانے کے لیے نکل گیا۔ پڑھا کر فارغ ہوا تو میں نے سوچا کہ یا تو میں مزید ٹیوشنز کا بندوبست کرلوں یا کہیں چھوٹی موٹی کوئی ملازمت کرلوں۔

اچانک میری نظر کپڑے کی ایک بہت بڑی دکان پر پڑی۔ میں نے سوچا شاید اس میں کوئی کام مل جائے۔ میں بلا جھجک دکان میں داخل ہوگیا۔

وہاں کئی سیلز مین موجود تھے۔ دکان میں آتے ہی بائیں جانب ایک کاؤنٹر بنا ہوا تھا۔ اس پر ایک صاحب موجود تھے۔ گھنی سیاہ شرعی داڑھی ان کے چہرے پر اچھی لگ رہی تھی۔ انہوں نے بہت نفیس شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔

میں بلا جھجک ان کے پاس چلا گیا اور بولا۔ "جناب، مجھے یہاں کوئی کام مل سکتا ہے؟"

انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر بولے۔ "کام؟ تم کیا کام کرسکتے ہو؟"

"میں ہر قسم کا کام کرسکتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"میرے پاس ایسا کوئی کام نہیں ہے جو تم کرسکو۔" انہوں نے کہا۔ "ویسے شکل و صورت اور لباس سے تو مجھے کسی اچھے خاندان کے لگتے ہو۔"

"کیا اچھے خاندان کے لوگ کام نہیں کرسکتے؟" میں نے کہا۔

"لیکن بیٹا، تم ابھی بہت چھوٹے ہو۔" انہوں نے کہا، پھر وہ کچھ سوچ کر بولے۔ "تمہاری تعلیم کیا ہے؟"

"میں اولیول کر رہا تھا لیکن حالات کی وجہ سے مجھے اسکول چھوڑنا پڑا۔"

میں نے اسکول کا نام بتایا تو وہ چونک اٹھے اور بولے۔ "تم وہاں پڑھتے ہو؟"

"جی وہاں پڑھتا تھا۔" میں نے افسردگی سے کہا۔ "لیکن جب سے ابو اور امی کا انتقال ہوا ہے، میں نے

## راغب مرادآبادی

مرادآباد (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ اصل نام سید جعفر حسین تھا۔ بچپن اور لڑکپن کا زمانہ مرادآباد، شملہ اور دہلی میں گزارہ۔ انہوں نے بی اے، ادیب فاضل اور منشی فاضل کے امتحانات طبیہ کالج دہلی سے پاس کیے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد سپلائی کے محکمے میں ملازم ہوگئے۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی چلے آئے اور محکمۂ محنت حکومت پاکستان کی ملازمت اختیار کرلی۔ 1980ء میں جب ریٹائر ہوئے تو وہ حکومت سندھ میں افسر تعلقات عامہ تھے۔ وہ مسلم لیگ کے فعال رکن تھے۔ انہوں نے شملہ ڈسٹرکٹ مسلم لیگ کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ان دنوں میں انہیں حضرت قائداعظم محمد علی جناح کو دیکھنے اور ان کی تقاریر سننے کا موقع ملا۔ قیام پاکستان کے بعد وزیراعظم لیاقت علی خاں نے وفاقی حکومت کے ملازمین کو منظم کرنے کا فریضہ سونپا۔ اس کے ساتھ ساتھ شاعری بھی کرتے رہے۔ انہوں نے کم و بیش پچیس کتابیں لکھیں جن کے موضوعات نعت، نظم، غزل اور رباعیات پر مشتمل ہیں۔ شاعری میں وہ شاعرِ مشرق علامہ اقبال اور جوش ملیح آبادی سے متاثر نظر آتے ہیں۔ دیگر تصانیف میں شامل ہیں۔ (1) گل صد برگ (1942ء) (2) عزم و ایثار (3) ہمارا کشمیر (4 نذر شہدائے کربلا (5 تحریک (6 ترغیب (7 مدحت خیر البشر (8 محنت کی ریت۔ جون 1996ء میں انہیں پاکستان آرٹس کونسل کی پہلی کیشن کمیٹی نے ان کی خدمات کو سراہتے ہوئے نشان سپاس پیش کیا۔ ان کا تخلص ان کے ایک دوست بھنا گر نے تجویز کیا تھا۔

مرسلہ: زاہد سلیم، کراچی

وہ اسکول چھوڑ دیا ہے اور اب میٹرک کروں گا۔''
''تم ٹیوشن پڑھا سکتے ہو؟''
''جی ہاں، میں اب بھی آٹھویں کلاس تک کے بچوں کو پڑھاتا ہوں۔''
''تو پھر ایسا کرو، میرے بچوں کو ٹیوشن پڑھا دو، ایک بیٹا تھری کلاس میں ہے اور بیٹی پانچویں میں ہے، دونوں انگلش میڈیم اسکول میں پڑھتے ہیں۔''
''کوئی مسئلہ نہیں ہے سر!'' میں نے کہا۔
''تم کسی کا حوالہ دے سکتے ہو؟'' انہوں نے کہا۔ ''دیکھو بیٹا، برا مت ماننا لیکن آج کا دور ایسا ہے کہ......''
''میں سمجھتا ہوں سر!'' میں نے کہا۔ ''میرا شناختی کارڈ تو ابھی نہیں بنا لیکن آپ اسکول سے میرے بارے میں معلوم کر سکتے ہیں۔ اسکول کے پرنسپل صاحب سے صرف یہ پوچھ لیجیے گا ظفر حسن کیسا لڑکا ہے؟ اس کے علاوہ میں سندھ سیکریٹریٹ کے ایک سپرنٹنڈنٹ ابوالحسن صاحب کا حوالہ بھی دے سکتا ہوں۔ میں کرائے دار کی حیثیت سے ان ہی کے گھر میں رہ رہا ہوں۔''
میں نے ان کی اجازت سے بال پوائنٹ اور رائٹنگ پیڈ اٹھایا اور اپنا نام اور ولدیت لکھ کر حوالے کے طور پر اسکول کے پرنسپل صاحب اور انکل ابوالحسن کا نام، آفس اور گھر کا پتا اور اپنا سیل نمبر لکھ کر انہیں دے دیا۔
''آپ میرے بارے میں اپنا اطمینان کر لیں، پھر اگر مناسب سمجھیں تو مجھے بلا بھیجیے گا۔ میں نے اپنا سیل نمبر بھی لکھ دیا ہے۔'' میں نے کہا اور انہیں سلام کر کے باہر آ گیا۔
چلتے چلتے انہوں نے مجھے اپنا تعارفی کارڈ بھی دے دیا۔ ان کا نام نثار احمد تھا اور وہ محمد علی سوسائٹی کے علاقے میں رہتے تھے۔

☆☆☆

پھر نثار صاحب کے توسط سے مجھے کئی ٹیوشنز مزید مل گئیں۔
اب میں صبح سے شام تک ٹیوشن پڑھاتا تھا۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد میں انکل ابوالحسن کے بچوں کو پڑھاتا تھا۔ پھر کبھی کھانا ہوٹل سے لے آتا کبھی خود پکا لیتا۔
یوں زندگی ایک ڈگر پر چلنے لگی۔ صائمہ کی مہربانیاں اب مزید بڑھ گئی تھیں اور مجھے اس سے الجھن ہونے لگی تھی۔
ایک رات میں یاسر اور عامر کو پڑھا رہا تھا کہ انکل اوپر آ گئے۔ میں نے انہیں سلام کیا تو وہ سلام کا جواب دیتے ہوئے بولے۔ ''بیٹھے رہو، کھڑے ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔''
میں اُن کے احترام میں کھڑا ہو جاتا تھا۔
وہ بھی میرے نزدیک ہی گدے پر بیٹھ گئے اور بولے۔ ''کیسا پڑھ رہے ہیں یہ دونوں؟''
''پڑھنے میں تو خیر ٹھیک ہیں، بس کبھی کبھی ہوم ورک نہیں کرتے، لیکن آپ فکر مت کریں۔ میں نے بھی انہیں وارننگ دے دی ہے کہ اب اگر ہوم ورک نہیں کیا تو میں کوئی رعایت نہیں کروں گا۔''
انکل نے قہر آلود نظروں سے ان دونوں کو گھورا اور بولے۔ ''میری طرف سے تمہیں پوری اجازت ہے۔ تم چاہو تو انہیں الٹا لٹکا دو۔''
وہ دونوں بھی پڑھ ہی چکے تھے اور اپنی چیزیں سمیٹ رہے تھے۔
''کل اگر تم دونوں نے اچھی طرح یاد نہیں کیا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔'' میں نے کہا۔
وہ دونوں سر جھکا کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد انکل بولے۔ ''ظفر بیٹے تم سے ایک بات اور کرنا تھی۔ ویسے یہ ہمارے معاہدے کی خلاف ورزی ہے لیکن کیا کروں اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔''
''کیسا معاہدہ انکل؟'' میں الجھ کر بولا۔ ''میں کچھ سمجھا نہیں۔''
''بھئی ہمارا یہی تو معاہدہ ہوا تھا کہ تم میرے دونوں بیٹوں کو پڑھاؤ گے اور میں تم سے کرایہ نہیں لوں گا۔''
''انکل، یہ معاہدہ نہیں بلکہ آپ کی ضد تھی۔ میں تو اب بھی کرایہ دینے کو تیار ہوں۔ مجھے خود احساس ہے کہ اگر آپ یہ کمرا کسی کو کرائے پر دیتے تو...... اور کمرا کیا یہاں تو ایک چھوٹی فیملی آرام سے رہ سکتی ہے۔ آپ کہیے کیا کہنا چاہتے ہیں؟''
''مجھے کچھ کہنے دو گے تو میں کہوں گا۔'' انکل نے مسکرا کر کہا۔ ''بھئی بات یہ ہے کہ بشریٰ اور یسریٰ کو بھی ٹیوشن کی ضرورت ہے۔ یسریٰ تو خیر چھوٹی ہے لیکن بشریٰ اب ماشاءاللہ جوان ہو گئی ہے۔ میں کسی دوسرے پر اعتبار بھی نہیں کر سکتا۔ ہاں، تم پر مجھے پورا اعتماد ہے۔''



''انکل، انہیں پڑھانے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن میں تو خود ابھی میٹرک کر رہا ہوں، میرا خیال ہے کہ بشریٰ بھی میٹرک ہی میں ہیں۔''
''بیٹا! تم نے جس اسکول میں تعلیم حاصل کی ہے اس کا معیار بہت بلند ہے۔ میٹرک کیا، تم تو فرسٹ ایئر کو بھی پڑھا سکتے ہو۔''
''انکل......؟ یہ بہت بڑی ذمے داری ہے اور میں......''
''مجھے یقین ہے کہ تم بشریٰ کو آسانی سے پڑھا لو گے۔'' انکل نے کہا۔ ''ہاں، اگر تم سمجھتے ہو کہ میں تمہیں ٹیوشن فیس نہیں دوں گا تو......''
''انکل پلیز!'' میں نے ان کی بات کاٹ دی۔ ''ایسی باتیں مت کریں۔''
''تو ٹھیک ہے، کل سے میں بشریٰ اور یسریٰ کو بھی بھیج دوں گا۔''
''لیکن یاسر اور عامر کے بعد'' میں نے کہا۔ ''ورنہ میں ان پر توجہ نہیں دے سکوں گا۔''
دوسرے دن یاسر اور عامر کے جانے کے بعد پہلے یسریٰ کمرے میں داخل ہوئی، اس کے پیچھے پیچھے بشریٰ تھی۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور چہرے پر دبی دبی مسکراہٹ تھی۔
جلد ہی مجھے احساس ہوا کہ یسریٰ انتہائی ذہین بچی ہے۔ وہ بات کو فوراً سمجھ لیتی تھی لیکن بشریٰ کو ایک ایک بات کئی کئی بار سمجھانا پڑتی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کا ذہن کہیں اور بھٹک رہا ہو۔ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مجھے تکتی رہتی تھی۔ وہ بلا کی حسین تھی لیکن اتنی بھولی اور معصوم نہیں تھی جتنی نظر آتی تھی۔
کچھ دن بعد وہ مجھ سے بہت بے تکلف ہو گئی۔ اس کے باوجود میں اس سے ایک فاصلہ رکھتا تھا۔
پڑھائی سے زیادہ اسے نئے فیشن کے کپڑوں اور شوبز کے بارے میں معلومات تھی۔ وہ جانتی تھی کہ سلمان خان اور کرینہ کپور کا افیئر چل رہا ہے یا یہ کہ ایشوریا رائے کی شادی کب ہو رہی ہے، وغیرہ وغیرہ۔
میں اسے سختی سے ٹوک دیتا تھا تو وہ منہ پھلا کر بیٹھ جاتی تھی۔ مجھے اس کی بھی پروا نہیں تھی۔
ایک دن اس نے ہوم ورک نہیں کیا۔ میں نے پوچھا تو بولی۔ ''اوہو، تم پر تو ہر وقت پڑھائی کا بھوت سوار رہتا ہے۔ کبھی کوئی اور بات بھی کر لیا کرو۔''
''دیکھو بشریٰ! انکل نے تمہیں پڑھنے کے لیے یہاں بھیجا ہے، کوئی اور بات کرنے کے لیے نہیں۔ اگر آئندہ تم نے کام نہیں کیا تو میں تمہیں نہیں پڑھاؤں گا۔ لوگ تو یہی سمجھیں گے کہ میں نے تمہیں نہیں پڑھایا اس لیے تم فیل ہو گئیں۔ یسریٰ بھی ہے۔ ہر ٹیسٹ میں اس کے نمبر بہترین ہوتے ہیں۔''
''وہ تو کتابی کیڑا ہے۔ اسے نہ ٹی وی سے دلچسپی ہے، نہ کسی اور چیز سے، بس ہر وقت پڑھتی ہی رہتی ہے۔''
''مجھ سے اگر پڑھنا ہے تو تمہیں بھی کتابی کیڑا بننا پڑے گا۔ چلو، اب کام کرو، میں اس وقت تک تمہیں چھٹی نہیں دوں گا، جب تک تم کام مکمل نہیں کر لیتیں۔''
پھر مارے باندھے وہ بھی پڑھنے لگی۔ اسے یہ خوف تھا کہ میں انکل سے اس کی شکایت کر دوں گا۔''
اس دن بہت گرمی اور حبس تھا لیکن شام کو اچانک آسمان پر بادل چھا گئے۔ یاسر اور عامر پڑھ کر گئے تو بشریٰ آ گئی۔
''یسریٰ کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''آج اسے بخار ہے۔'' بشریٰ نے جواب دیا۔ ''وہ تو آنا چاہ رہی تھی لیکن امی نے اسے روک۔''
''اچھا، چلو تم کتابیں نکالو۔'' میں نے کہا۔
اسی وقت بادل زور سے گرجا اور موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ بشریٰ اپنی کتابیں چھوڑ کر کھلی چھت کی طرف بھاگ گئی۔ میں اسے آوازیں ہی دیتا رہ گیا۔ وہ شوخ لہجے میں بولی۔ ''تم کیسے آدمی ہو ظفر، اتنے اچھے موسم میں بھی پڑھائی کی باتیں کر رہے ہو، میں تو بارش میں پاگل ہو جاتی ہوں۔''
بارش مزید تیز ہو گئی۔ میں دل ہی دل میں کھولتا رہا۔
اچانک بجلی چمکنے کا کڑاکا ہوا تو بشریٰ بھاگتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے کپڑے جسم سے چپکے ہوئے تھے لون کے باریک کپڑے جسم پر بری طرح چپک جاتے ہیں، پھر بشریٰ تو یوں بھی جسم سے چپکے ہوئے کپڑے پہنتی تھی، اس کے جسم سے پانی ٹپک رہا تھا اور وہ نیم برہنہ حالت میں میرے سامنے کھڑی تھی۔
''اب جا کر کپڑے تو بدلو۔'' میں نے چڑ کر کہا۔
''ظفر! مجھے بجلی کی خطرناک آواز سے بہت ڈر لگتا ہے۔''
اچانک لائٹ چلی گئی۔ کمرے میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ بجلی ایک مرتبہ پھر بہت زور سے کڑکی تو بشریٰ خوف

زدہ ہو کر مجھ سے لپٹ گئی۔

اس کے جسم سے گویا آنچ سی اٹھ رہی تھی۔ وہ پوری قوت سے مجھ سے چمٹی ہوئی تھی۔

مجھے زندگی میں پہلی دفعہ احساس ہوا کہ میں بھی گوشت پوست کا انسان ہوں۔ کوئی روبوٹ نہیں ہوں۔ مجھے اس لمحے نہ جانے کیا ہوا کہ میں نے بھی بشریٰ کو پوری قوت سے جکڑ لیا۔

پھر سب کچھ اس لمحے... کی نذر ہو جاتا کہ اچانک میرے کانوں میں انکل کی آواز گونجی۔ ''ظفر بیٹا! تم پر تو مجھے اعتماد ہے اور یقین ہے کہ تم کبھی میرے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤ گے۔''

میرے جذبات سرد پڑ گئے تو میں نے اسے آہستگی سے علیحدہ کر دیا اور بولا۔ ''میں نے موم بتی اور ماچس نہ جانے کہاں رکھ دی ہے۔''

مجھے اپنی آواز خود اجنبی لگی۔ میرا سانس بری طرح پھولا ہوا تھا اور میرا پورا جسم لرز رہا تھا۔

بشریٰ نے پھر میرا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی لیکن میں نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ اندازے سے موم بتی اور ماچس تلاش کی اس سے پہلے کہ میں موم بتی جلاتا، لائٹ اچانک آ گئی۔ بشریٰ کی حالت دیکھ کر میری آنکھیں شرم سے جھک گئیں۔ وہ خود بھی بوکھلا کر باتھ روم میں گھس گئی۔

نیچے سے اچانک آنٹی کی آواز سنائی دی۔ ''بشریٰ!''....

میرے ہاتھ پیر پھول گئے۔ میں نے جلدی سے اپنا حلیہ درست کیا۔ کسی کے سیڑھیاں چڑھنے کی آواز آ رہی تھی۔ بشریٰ اپنا حلیہ درست کر کے تیزی سے چھت پر نکل گئی۔

اسی وقت آنٹی کمرے میں داخل ہوئیں اور بولیں۔ ''ظفر بیٹا! بشریٰ کہاں ہے؟'' پھر وہ خود ہی بولیں ''وہ ضرور بارش میں نہا رہی ہوگی۔ بارش دیکھ کر تو یہ لڑکی دیوانی ہو جاتی ہے پھر لاکھ منع کرو لیکن بارش میں بھیگنے سے باز ہی نہیں آتی۔ اس وقت بھی وہ یقیناً بارش میں بھیگ رہی ہوگی۔''

''جی آنٹی!'' میں نے سنبھل کر کہا۔ ''میرے منع کرنے کے باوجود وہ بارش میں بھیگنے چلی گئی۔''

''بشریٰ!'' آنٹی نے سخت لہجے میں کہا۔ ''چلو نیچے آؤ ورنہ تمہاری طبیعت خراب ہو جائے گی۔''

بشریٰ پانی میں بھیگی ہوئی آئی۔ اس مرتبہ فرق صرف اتنا تھا کہ اس نے اپنا لمبا چوڑا دوپٹا جسم کے گرد لپیٹ لیا تھا۔ وہ فرش پر پانی ٹپکاتی ہوئی تیزی سے نیچے چلی گئی۔

''بے ہودہ لڑکی!'' آنٹی چیخیں' سارا کارپیٹ خراب کر دیا۔''

یہ تو شکر ہے کہ ان کی نظر اس گیلے کارپیٹ پر نہیں پڑی تھی جہاں میں اور بشریٰ کھڑے تھے۔

میں بارش سے بچتا ہوا کچن میں گیا۔ اپنے لیے ایک کپ چائے بنائی اور سر درد کی دو گولیاں کھانے کے بعد گرم گرم چائے پی لی۔ پھر میں کچھ کھائے پیے بغیر ہی سو گیا۔

صبح سو کر اٹھا تو پورا جسم ٹوٹ رہا تھا اور مجھے ہلکا ہلکا بخار بھی محسوس ہو رہا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ پانی میں بشریٰ بھیگی تھی اور بخار مجھے آ گیا تھا۔ یہ شاید میرے جذبات کی حدت تھی یا کیا تھا؟ زندگی میں پہلی دفعہ کوئی لڑکی میرے اتنے قریب آئی تھی۔ وہ تو شکر ہے کہ عین وقت پر آنٹی آ گئیں ورنہ نہ جانے کیا ہو جاتا؟

دوسرے دن تک میری طبیعت کچھ بحال ہو گئی۔ بشریٰ اور یسریٰ پڑھنے آئیں تو بشریٰ مجھ سے نظریں نہیں ملا رہی تھی۔ میں نے اسے جس حالت میں دیکھا تھا، میں خود بھی اس پر نادم تھا۔

جب وہ جانے لگیں تو بشریٰ نے جلدی سے ایک خط نکالا اور میری طرف پھینک کر چلی گئی۔ یسریٰ پہلے ہی جا چکی تھی۔ میں نے وہ خط اٹھا کر تکیے کے نیچے رکھ دیا اور کھانا کھانے چلا گیا۔

واپسی پر مجھے اس خط کا خیال آیا۔ میں نے خط نکالا اور کاغذ کی تہیں کھولیں تو معلوم ہوا کہ وہ کاپی کے پانچ چھ صفحات ہیں۔

بشریٰ نے لکھا تھا۔

ظفر! میں بہت ڈرتے ڈرتے تمہیں خط لکھ رہی ہوں۔ تم نے نہ جانے مجھے کیا کر دیا ہے۔ میں تمہاری عزت کرتی ہوں کیونکہ تم قابلیت میں مجھ سے کہیں زیادہ ہو۔ تم میرے اس خط کا بھی مذاق اڑاؤ گے، اسے کسی ڈرامے یا ہندی فلم کا کوئی سین سمجھو گے لیکن سچ تو یہ ہے ظفر کہ میں تمہاری محبت میں گرفتار ہو گئی ہوں۔ تم ہی میری زندگی میں آنے والے پہلے شخص ہو۔ تمہیں تو شاید احساس بھی نہ ہو لیکن مجھے آج بھی تم سے پہلی ملاقات یاد ہے جب تم نے مجھے گرنے سے بچایا تھا۔ میرے دل میں عجیب سی خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی اور تمام رات میں نے آنکھوں میں کاٹ دی تھی۔ میں نے بہت مشکل سے



اپنے بے لگام جذبوں پر بند باندھا تھا لیکن اس روز بارش، اندھیرے اور بجلی کی گرج نے اس بند کو پھر توڑ دیا۔ میں اب تمہارے بغیر رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ میرے پاس تمہارا سیل نمبر بھی ہے لیکن میں اپنے منہ سے یہ باتیں نہیں کر سکتی۔ اسی لیے اپنی عزت داؤ پر لگا کر اس خط کا سہارا لے رہی ہوں۔ بس اتنا سمجھ لو ظفر کہ میں محبت بھی ٹوٹ کر کرتی ہوں اور نفرت میں بھی اتنی ہی شدت ہوتی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ تم اس وقت حالات کے بھنور میں پھنسے ہوئے ہو لیکن صرف اقرار کر لو، میں زندگی بھر تمہارا انتظار کرنے کو تیار ہوں۔ میں اپنا سیل نمبر بھی لکھ رہی ہوں۔ اگر صرف.... فون ہی پر ''ہاں'' کہہ کر ایک لفظ ادا کر دو تو میری بے چین روح کو قرار آ جائے گا۔ ہمیشہ کے لیے تمہاری بشریٰ۔''

بشریٰ کا خط پڑھ کر میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ میں ابھی ان فضول کاموں میں کیسے پڑ سکتا تھا اور بشریٰ کے ساتھ تو کبھی بھی نہیں۔ انکل کو مجھ پر کتنا اعتماد ہے۔ انہیں بھنک بھی مل گئی تو ان کا اعتماد چور چور ہو جائے گا۔ مجھے پریشانی یہ نہیں تھی کہ سر چھپانے کا ایک ٹھکانا مجھ سے چھن جائے گا بلکہ پریشانی یہ تھی کہ انکل اور آنٹی کے ساتھ صائمہ باجی کی نظروں میں بھی میری عزت دو کوڑی کی ہو جائے گی۔

میں نے سوچ لیا کہ کل بشریٰ کو اطمینان سے سمجھاؤں گا۔ وہ جذباتی لڑکی اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی بدنامی کے گڑھے میں پھینک سکتی تھی۔

دوسرے دن بشریٰ آئی تو اس کے چہرے پر ایک اضطراب اور بے چینی تھی۔ اس نے کچھ یاد بھی نہیں کیا تھا۔ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''بشریٰ! ایسے کب تک کام چلے گا؟ اگر تم نے اب اپنی پڑھائی پر توجہ نہیں دی تو تمہیں نہیں پڑھاؤں گا۔ اسے میری طرف سے آخری وارننگ سمجھ لو۔''

بشریٰ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ یسریٰ اسے دیکھ کر ہنسنے لگی۔

میں نے اسے بری طرح جھڑک دیا ''یسریٰ اپنا کام کرو، میں نے کوئی لطیفہ نہیں سنایا ہے جو تمہارے دانت نکل رہے ہیں۔'' پھر میں بشریٰ سے مخاطب ہوا۔ ''آج تم جب تک کام نہیں کر لو گی، میں تمہیں چھٹی نہیں دوں گا۔ اب یہ رونا دھونا بند کرو اور کام کرو۔''

اس نے زخمی نظروں سے مجھے دیکھا اور آنسو پونچھ کے کام کرنے میں مصروف ہو گئی۔ میں نے جان بوجھ کر یسریٰ کو جلدی چھٹی دے دی اور بشریٰ کو روک لیا۔

یسریٰ کے جانے کے بعد میں نے بشریٰ سے کہا۔ ''خط میں تم نے کیا خرافات لکھی تھی؟ فلمیں اور ڈرامے دیکھ دیکھ کر تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ تم کیا چاہتی ہو کہ میں گھر چھوڑ کر چلا جاؤں؟''

اس کی بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں میں حیرت اور صدمے کے تاثرات تھے۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''میں بھلا ایسا کیوں چاہوں گی؟''

''تو پھر اس خط کا کیا مطلب تھا؟'' میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔

''تم تو مجھ سے کہیں زیادہ قابل ہو ظفر!'' اس نے کہا۔ ''اس میں نہ سمجھ میں آنے والی کون سی بات تھی؟''

''دیکھو بشریٰ!'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ''جذبات سے نہیں عقل سے کام لو۔ اول تو میں نے ابھی ایسا کچھ سوچا ہی نہیں ہے۔ حالات نے موقع ہی نہیں دیا، پھر یہ کہ میں تمہارے ابو کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچا سکتا۔ میں تمہیں کسی دھوکے میں رکھنا نہیں چاہتا۔ میں......''

''پھر وہ سب کچھ کیا تھا؟'' وہ بپھر کر بولی۔ ''کیا تم نے مجھے کوئی راہ چلتی، آوارہ لڑکی سمجھ لیا تھا۔ تم نے میرے جسم کو ہاتھ ہی کیوں لگایا؟'' اس کی آواز اتنی بلند تھی کہ کوئی بھی سن سکتا تھا۔

''اپنی آواز نیچی رکھو۔'' میں نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا اس دن پہل میری طرف سے ہوئی تھی؟'' میں بھی بپھر گیا لیکن اپنی آواز دھیمی ہی رکھی۔

''تمہیں اس وقت اس نام نہاد اعتماد اور عزت کا خیال کیوں نہیں آیا؟'' وہ تلخ لہجے میں بولی۔ ''میں بجلی کی چمک سے واقعی ڈر گئی تھی۔ تم کیوں آپے سے باہر ہو گئے۔ اگر امی نہ آتیں تو کہاں جاتا تمہارا وہ اعتماد اور کہاں رہتی یہ عزت؟ بتاؤ، جواب دو۔ تم نے کیا سمجھ کے حد سے گزرنے کی کوشش کی؟'' وہ بری طرح چیخ رہی تھی۔ ''تم پہلے اور آخری مرد ہو جس نے میرے جسم کو چھوا ہے، میرے سوئے ہوئے جذبات کو بیدار کیا ہے۔ میں تمہیں اتنی آسانی سے نہیں جانے دوں گی۔'' اس کی آواز مزید بلند ہو گئی۔

میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ میں نے بوکھلا کر کہا۔ ''اچھا تم ابھی تو جاؤ، ہم اس موضوع پر پھر کبھی بات کریں گے۔''

''پھر کبھی نہیں، ابھی اور اسی وقت؟'' وہ بھڑک کر بولی۔ ''میری بات کا جواب دو ظفر؟'' وہ پھر چیخی۔ ''ہاں یا نہ؟''

”بشریٰ!“ نیچے سے انکل کی آواز آئی۔
میری جان نکل گئی۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ”بشریٰ، تمہیں اللہ کا واسطہ! ابھی تو جاؤ...... میں......“
”ہاں یا نہ؟“ اس نے جنونی انداز میں کہا۔ آواز اب بھی بلند تھی۔
”ہاں...... ہاں“ میں نے جلدی سے کہا کیونکہ مجھے سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔
اس نے فاتحانہ انداز میں میری طرف دیکھا۔ اسی وقت انکل کمرے میں داخل ہوئے اور حیرت سے بولے۔ ”بشریٰ! تم نے ظفر سے بھی اسی انداز میں گفتگو شروع کردی جیسے عامر، یاسر اور یسریٰ سے کرتی ہو؟“ پھر وہ میری طرف مڑے۔ ”ظفر بیٹا! اس کی بات کا برا مت ماننا۔ یہ بس یونہی جذباتی ہوجاتی ہے۔“
میرا چہرہ پسینے سے تر ہو رہا تھا۔ میں نے تولیا سے منہ صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے بالکل برا نہیں مانا انکل! میں جانتا ہوں کہ یہ بہت جذباتی ہیں۔“
”یہ ہاں اور نہ، کیا چیخ رہی تھی؟“ میری توقع کے عین مطابق انکل نے بشریٰ کی آواز سن لی تھی۔
”انکل؟“ میں نے بات بنانے کو جلدی سے کہا۔ ”میں نے ان سے کہا تھا کہ اگر اب انہوں نے پڑھائی پر توجہ نہیں دی تو میں نہیں پڑھاؤں گا۔ انہوں نے کہا کہ آئندہ میں پڑھائی پر پوری توجہ دوں گی، میں نے انکار کردیا کہ ایسے آئندہ پہلے بھی بہت آئے ہیں۔ میرے مسلسل انکار پر یہ چیخنے لگیں کہ میں کل سے پڑھنے آؤں یا نہیں؟ میری بات کا جواب ہاں یا نہ میں دیں، جب یہ دو تین دفعہ چیخیں تو میں نے انہیں پڑھانے کی ہامی بھرلی۔“
”یہ ایسی ہی ہے بیٹا!“ انکل نے بشریٰ کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اگر تمہیں پڑھانے میں تکلیف یا ذہنی اذیت ہوتی ہے تو بشریٰ کل سے نہیں آئے گی۔“
”نہیں انکل، انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ اب یہ اپنی پڑھائی پر توجہ دیں گی۔“ پھر میں بشریٰ سے مخاطب ہوا۔ ”آئندہ مجھے ایسی کوئی شکایت پیدا نہ ہو۔“
بشریٰ کے چہرے پر ایک مسکراہٹ تھی۔ وہ اپنی چیزیں سمیٹنے لگی، پھر مسکراتے ہوئے چلی گئی۔
کاش میں نے اسی وقت انکل سے کہہ دیا ہوتا کہ جی ہاں، بشریٰ کو کل سے مت بھیجیں۔
میں دوسرے دن باہر جانے کی تیاری ہی کر رہا تھا کہ صائمہ آگئی۔ ایک تو یہ صائمہ اب تک میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اس کی یوں آزادانہ آمد ورفت بھی میرے لیے پریشانی کا باعث بن سکتی تھی۔ وہ کوئی ایسا علاقہ نہیں تھا جہاں کسی کو کسی سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ وہاں لوگ ایک دوسرے کی ٹوہ میں رہتے تھے۔ صائمہ کی آمد ورفت کا شاید ابھی تک کسی نے نوٹس نہیں لیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ انکل ابوالحسن کے گھر آتی تھی۔ انکل کے داخلی دروازے کے ساتھ اندر ایک بڑی سی گیلری تھی۔ سامنے کے رخ پر انکل کے گھر کا اندرونی دروازہ تھا۔ وہ گیلری دائیں جانب انگریزی کے حرف ”L“ کی شکل میں گھوم گئی تھی جس طرف میرے کمرے کا زینہ تھا۔ انکل کے علم میں لائے بغیر کوئی بھی آزادی سے میرے کمرے میں آسکتا تھا۔ زینے کا ایک دروازہ انکل کے گھر میں بھی تھا جو عموماً بند رہتا تھا۔
”کیا بہت جلدی میں ہو؟“ صائمہ نے پوچھا۔
”جی ہاں، صائمہ باجی!“ میں نے کہا۔ ”مجھے دو نئی ٹیوشنز ملی ہیں۔ دونوں بچے سیکنڈ شفٹ میں پڑھتے ہیں۔ انہیں گیارہ بجے تک پڑھا کر فارغ کرنا پڑتا ہے۔“
صائمہ نے اپنے دوپٹے میں بندھی ہوئی پرفیوم کی ایک بوتل نکالی اور بولی۔ ”یہ پرفیوم کل میرا کزن دبئی سے لایا ہے۔“
میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ میرے سیل فون کی بیل بجی۔ اسکرین پر کوئی اجنبی نمبر تھا لیکن مجھے لگ رہا تھا کہ یہ نمبر میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ میں نے سیل فون کان سے لگالیا اور بولا۔ ”ہیلو؟“
”یہ صائمہ یہاں کیا کر رہی ہے؟“ دوسری طرف سے بشریٰ کی مترنم آواز سنائی دی جو اس وقت مجھے زہر لگ رہی تھی۔
”ہاں، میں نکل ہی رہا ہوں۔“ میں نے کہا کیونکہ صائمہ بھی میری بات سن رہی تھی۔ ”اور تم نے آج چھٹی کرلی؟“
”میری بات کا جواب دو۔“ وہ اکھڑ لہجے میں بولی۔
”جی ہاں، میں ٹھیک وقت پر پہنچ جاؤں گا۔“ یہ کہہ کر میں نے رابطہ منقطع کردیا۔ صائمہ بھی جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر وہ مجھ سے پہلے ہی باہر نکل گئی۔
ٹیلی فون کی گھنٹی پھر بجی۔ اس مرتبہ بھی بشریٰ کی کال تھی۔
”آخر تم چاہتی کیا ہو؟“ میں نے کال ریسیو کرنے کے بعد جھنجلا کر کہا۔ ”تم اب میرے پاس آنے جانے



...وں پر بھی پابندی لگاؤ گی۔“
بشریٰ نے سلسلہ منقطع کردیا۔ میں نے بھی سکون کا ...نس لیا۔
میں نکلنے ہی والا تھا کہ بشریٰ دھڑ دھڑ کرتی ہوئی اوپر ...گئی۔
”تم اسکول کیوں نہیں گئیں؟“ میں نے پوچھا۔ مجھے ...س کا یہ رویہ بہت شاق گزر رہا تھا۔
”میری بات کا جواب دو۔“ وہ بلند لہجے میں ...بولی۔ ”یہ صائمہ یہاں کیوں آتی ہے؟“
”اس کا جواب تو صائمہ ہی دے سکتی ہے۔ میں ...رہوں ان کے مکان میں رہا ہوں، ہم دونوں ساتھ کھیل کر ...بڑے ہوئے ہیں۔“
”کیا، کہا؟“ وہ تحیّر آمیز لہجے میں بولی۔ ”وہ مجھ سے ...بھی تین سال بڑی ہے۔ وہ بڈھی گھوڑی تمہارے ساتھ کب کھیلتی تھی؟“
”بشریٰ!“ میں نے چیخ کر کہا۔ ”اپنی زبان کو لگام دو۔“
”آئندہ مجھے صائمہ یہاں دکھائی نہ دے۔“ اس نے ...یوں مجھے حکم دیا جیسے میں کوئی چھوٹا سا بچہ ہوں اور وہ میری ...سرپرست ہے۔
”یہ بات تم خود ہی صائمہ سے کہہ دینا۔“ میں نے کہا۔
”میں اس سے ڈرتی نہیں ہوں۔“ بشریٰ نے تلخ ...لہجے میں کہا، پھر...... دھپ دھپ کرتی سیڑھیاں اتر گئی۔
میرا دماغ ماؤف ہوکر رہ گیا تھا۔ بشریٰ کا وہ حسین ...چہرہ جو کبھی مجھے اچھا لگتا تھا، اب اسے دیکھ کر مجھے گھبراہٹ ...ہوتی تھی، غصہ آتا تھا۔
میں وقت سے پہلے ہی گھر سے نکل آیا تھا اس لیے ...ایک ہوٹل میں جا کر بیٹھ گیا۔ میں سنجیدگی سے اس بات پر ...غور کر رہا تھا کہ اب مجھے انکل کا گھر چھوڑنا پڑے گا۔ بشریٰ ...نے مجھے ایک ذہنی عذاب میں مبتلا کردیا تھا۔
اسی وقت مجھے اقبال نظر آیا۔ وہ اپنی گاڑی سے اتر کر ...سامنے والے سپر اسٹور میں گیا تھا۔ اقبال بھی میرے ساتھ ...پڑھتا تھا۔ وہ ڈی آئی جی کا بیٹا تھا اس لیے اس عمر میں بھی ...گاڑی لیے پھرتا تھا۔ اس سے ڈرائیونگ لائسنس کے ...بارے میں کون پوچھ سکتا تھا۔
میں نے اپنے لباس پر نظر ڈالی۔ لباس معقول تھا، ...جوتے بھی چمک رہے تھے۔ میں نے ہوٹل والے کو چائے ...کے پیسے دیے اور خود بھی اس سپر اسٹور میں چلا گیا۔
اقبال نے مجھے دیکھا تو تیر کی طرح میری طرف آیا اور والہانہ انداز میں لپٹ گیا۔ ”ارے یار تو کہاں غائب ہوگیا؟“
”بس یار“ میں نے کہا۔ ”ابو اور امی کے انتقال کے بعد حالات ہی کچھ ایسے ہوگئے کہ مجھے اسکول چھوڑنا پڑا۔“
”تجھے کوئی کام تو نہیں ہے نا؟“
”فی الحال تو نہیں ہے۔“
”چل، پھر گھر چلتے ہیں، وہاں بیٹھ کر اطمینان سے گپ شپ کریں گے۔“
اقبال نے سپر اسٹور سے کچھ فلموں کی ڈی وی ڈیز لی تھیں، پھر وہ اپنی گاڑی میں مجھے گھر لے گیا۔
میں نے اسے بتایا کہ ابو کویت میں جاب کرتے تھے، وہ انجینئر تھے، ان کے انتقال کے بعد امی کا بھی انتقال ہوگیا۔ ابو نے ڈیفنس میں مکان بھی ہاؤس بلڈنگ سے قرض لے کر بنایا تھا۔ میں نے وہ بنگلا اونے پونے بیچ دیا اور وہ رقم بھی خرچ کر ڈالی۔ بیٹھے بیٹھے کھانے سے تو قارون کا خزانہ بھی ختم ہوجاتا ہے یار، آج کل میں کرائے کے ایک پورشن میں رہتا ہوں، اور ٹیوشنز پڑھاتا ہوں۔
”ویری سیڈ یار!“ اقبال نے کہا۔ ”تو ایسا کر، وہ مکان چھوڑ اور یہاں شفٹ ہوجا۔ ہمارے بنگلے میں بہت گنجائش ہے۔“
”شکریہ اقبال!“ میں نے کہا۔ ”مجھے ابھی ایسی کوئی پریشانی نہیں ہے۔ ضرورت سمجھوں گا تو تجھ سے ضرور کہوں گا۔“
”اچھا، تو مجھے اپنا ایڈریس تو دے بلکہ ایڈریس کیا، میں تجھے ابھی ڈراپ کرنے جاؤں گا تو تیرا گھر دیکھ لوں گا۔“
اس دن اقبال سے باتوں میں کافی دیر ہوگئی تھی۔ میں جن بچوں کو ٹیوشنز پڑھاتا تھا، ان سے کہہ دیا تھا کہ آج میں نہیں آسکوں گا۔ میں شام تک اقبال کے ساتھ ہی رہا۔
شام کی چائے کے وقت اس کے ڈیڈی سے بھی ملاقات ہوئی۔ انہوں نے اقبال سے میرے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا، وہ مسکرا کر بولے۔ ”اچھا تو تم ہو ظفر جو ہمیشہ کلاس میں پوزیشن لیتا ہے، جو اردو اور انگلش تقریری مقابلوں میں ٹرافیاں جیتتا ہے، جو باسکٹ بال اور سوئمنگ کا چیمپئن ہے اور......“
”بس انکل“ میں نے انکل رحمان سے کہا۔ ”میں تو کچھ بھی نہیں ہوں۔ یہ سارے کام تو مجھ سے ہوجاتے ہیں۔

ان میں میری محنت کا بالکل دخل نہیں ہے۔"

"تم سے مل کر بہت اچھا لگا۔" ڈی آئی جی صاحب نے کہا۔ "کبھی کبھی آجایا کرو۔"

"جی انکل!" میں نے کہا۔ "میں ضرور آؤں گا۔"

پھر اقبال مجھے ڈراپ کرنے گیا تو حیرت سے بولا۔ "ظفر، تم اس علاقے میں رہتے ہو؟ تم ابھی اپنا سامان اٹھاؤ اور میرے ساتھ چلو۔"

"نہیں اقبال!" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں نے حالات سے سمجھوتا کرلیا ہے اور میں یہاں بہت خوش ہوں۔"

"ذرا میں بھی تو دیکھوں کہ تو کتنا خوش ہے؟" اقبال نے کہا۔ "اب آیا ہوں تو تیرا گھر بھی دیکھ لوں گا اور ایک کپ چائے بھی پی لوں گا۔"

میں گھبرا گیا، پھر سوچا کہ اب اقبال سے یا کسی اور سے کیا چھپانا۔ ایک جھوٹ بولوں گا تو اسے نبھانے کے لیے سو جھوٹ بولنا پڑیں گے۔ میں اقبال کو اپنے ساتھ اوپر لے گیا۔

کمرا دیکھ کر اس کے چہرے پر... حیرت اور تاسف نظر آیا۔ میں نے کہا۔ "تو بیٹھ، میں تیرے لیے چائے بناتا ہوں۔"

اسی وقت سیڑھیوں پر آہٹ سنائی دی اور اچانک بشریٰ اوپر آگئی۔ اس کی نظر اقبال پر نہیں پڑی۔ وہ مجھ سے بولی۔ "یہ تمہارے آنے کا وقت ہے۔ میں کب سے تمہارا انتظار کررہی تھی ظفر! تمہیں اس بات کا ذرا بھی احساس نہیں ہے کہ کوئی تمہارا انتظار کررہا ہوگا۔"

میں نے اشاروں سے اسے خاموش رہنے کو کہا لیکن وہ تو کچھ سمجھ ہی نہیں رہی تھی۔ میں نے اچانک بشریٰ سے کہا۔ "بشریٰ یہ میرے دوست اقبال ہیں، میرے ساتھ اسکول میں پڑھتے تھے۔"

بشریٰ نے چونک کر اقبال کو دیکھا۔ اقبال بھی اسے دیکھتا رہ گیا۔ بشریٰ اسے سلام کرکے تیزی سے باہر بھاگ گئی۔

"اوہ، اب میں سمجھا کہ تو اس غلیظ علاقے اور ہمارے سرونٹ کوارٹر سے بھی بدتر گھر کیوں چھوڑنا نہیں چاہتا۔ کنول کا پھول تو غلاظت میں ہی کھلتا ہے، ہیرا تو کوئلوں ہی کے درمیان ہوتا ہے۔"

"تو سر راشد کی بتائی ہوئی ساری باتیں کیا ابھی دہرادے گا؟" میں نے موضوع بدلنے کو کہا۔

"بات کو ٹالنے کی کوشش مت کر ظفر!" اقبال نے کہا۔ "سچ سچ بتا، یہ چکر کیا ہے؟"

"یار، ویسا نہیں ہے جو تو سمجھ رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"بات تو وہ تجھ سے یوں کررہی تھی جیسے تیری شادی کو ایک سال گزر گیا ہے۔ مجھ سے جھوٹ مت بول ظفر! اس لہجے میں تو کوئی بیوی ہی بات کرسکتی ہے۔"

"تو غلط سمجھ رہا ہے اقبال!" میں نے منہ بنا کر کہا۔

"ٹھیک ہے یار مت بتا۔" اقبال نے ہنس کر کہا۔ "لیکن اپنی شادی میں تو بلائے گا نا؟"

"شیور!" میں نے کہا "ارے، میں تیرے لیے چائے بنانے جارہا تھا۔"

اسی وقت یاسر چائے کے دو مگ اور کچھ بسکٹ وغیرہ لے کر آگیا اور بولا۔ "ظفر بھائی! بشریٰ باجی نے مہمان کے لیے چائے بھجوائی ہے۔"

چائے پینے کے بعد اقبال رخصت ہوگیا۔ میں اسے چھوڑ کر واپس آیا تو بشریٰ پہلے سے کمرے میں موجود تھی۔

اسے دیکھ کر میرا پارا ایک دم چڑھ گیا۔ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "تم موقع بے موقع اپنی بکواس شروع کردیتی ہو۔ اقبال نہ جانے کیا سوچ رہا ہوگا؟"

"یہی سوچے گا کہ تمہارے ساتھ میرا افیئر ہے، سوچنے دو۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔" وہ دھم سے اسپرنگ کے گدے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"لیکن مجھے پڑتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اور تمہیں اپنی اور اپنے والدین کی عزت کا ذرا بھی خیال نہیں ہے۔"

"کسی سے محبت کرنا کوئی جرم تو نہیں ہے۔" اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "اب یہ مت پوچھنا کہ یہ کس فلم کا ڈائیلاگ ہے؟ جب پیار کیا تو ڈرنا کیا؟" وہ گنگنا کر بولی۔

"اچھا، اب یہاں سے جاؤ، میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ ہنستی ہوئی چلی گئی۔ مجھے اب بشریٰ سے خوف آنے لگا تھا۔ اس کی ذہنی حالت مجھے نارمل نہیں لگ رہی تھی۔ وہ تو مجھ سے بالکل ایسا سلوک کررہی تھی جیسے بیویاں شوہروں کے ساتھ کرتی ہیں۔ میں نے سنجیدگی سے سوچا کہ اب مجھے یہ گھر چھوڑ دینا چاہیے۔ میں کل ہی کوئی اور کمرا تلاش کرلوں گا۔ مجھے ٹیوشنز سے اب اتنی آمدنی ہوجاتی تھی کہ میں پے انگ گیسٹ کے طور پر بھی رہ سکتا تھا۔

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ صائمہ آگئی۔

وہ ابھی بیٹھی بھی نہ تھی کہ بشریٰ غصے میں بھری ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور صائمہ سے بولی۔ "تم کیوں بار بار یہاں آتی ہو؟"

صائمہ نے حیرت سے اسے دیکھا اور کہا۔ "بشریٰ بات کیا ہے؟ کیا کسی کو میرے یہاں آنے پر اعتراض ہے؟"

"ہاں، مجھے اعتراض ہے۔" بشریٰ نے کہا۔ "چلو نکلو یہاں سے؟"

"بشریٰ!" میں چیخ کر بولا۔ "تم ہوتی کون ہو صائمہ کو یہاں سے نکالنے والی۔ صائمہ میرے پاس آتی ہے اور میرے پاس کوئی بھی آسکتا ہے۔ تمہیں یا انکل کو اس پر اعتراض ہے تو میں یہ کمرا ہی چھوڑ دوں گا۔ اب دفع ہوجاؤ یہاں سے ورنہ میں ابھی اور اسی وقت چلا جاؤں گا۔"

بشریٰ نے شکایت آمیز نظروں سے مجھے دیکھا، آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو خشک کیے اور بغیر کچھ کہے باہر نکل گئی۔

"اسے ہوا کیا ہے؟" صائمہ نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ میری محبت میں پاگل ہورہی ہے صائمہ باجی!" میں نے صائمہ سے کچھ چھپانا فضول سمجھا۔ "اسی لیے آپ کے یہاں آنے پر اسے اعتراض ہے۔"

"یہ صورتِ حال تو اچھی نہیں ہے ظفر!" صائمہ نے بتشویش لہجے میں کہا۔ "تم تو فوری طور پر اور ممکن ہو تو آج ہی یہ کمرا چھوڑ دو۔"

"آج ہی چھوڑ دوں؟" میں نے کہا۔ "لیکن اتنی جلدی یہ ممکن نہیں ہے صائمہ باجی!" میں نے کہا۔ "ہاں، میں کوشش کروں گا کہ جتنی جلدی ممکن ہو، یہ گھر چھوڑ دوں اور یہاں سے دور کہیں چلا جاؤں۔"

صائمہ کچھ دیر میرے پاس بیٹھ کر چلی گئی۔

رات کو یاسر اور عامر پڑھنے آئے تو میں نے ان سے کہہ دیا کہ آج میری طبیعت خراب ہے۔ میں تم لوگوں کو آج نہیں پڑھا سکوں گا۔ بشریٰ اور یسریٰ کو بھی بتادینا۔

"ظفر بھائی!" عامر نے کہا۔ "طبیعت زیادہ خراب ہے تو آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے چلیں؟"

"نہیں یار، بس سر میں شدید درد ہے اور کچھ بخار کی کیفیت ہے۔ میں نے ٹیبلیٹ لے لی ہے۔ ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ دونوں خاموشی سے چلے گئے۔

فوراً ہی انکل اور آنٹی آگئے۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"لیٹے رہو ظفر!" آنٹی نے کہا۔ "عامر نے بتایا کہ تمہاری طبیعت خراب ہے۔ آج کل موسم اچھا نہیں ہے بیٹا! ڈاکٹر کو دکھادو۔"

"ارے نہیں آنٹی، بس تھکن اور سر درد ہے، آرام کروں گا تو صبح تک ٹھیک ہوجاؤں گا، میں نے ٹیبلٹ کھالی ہے۔"

"احتیاط کرو بیٹا۔" انکل نے کہا۔

"جی انکل، میں احتیاط تو بہت کرتا ہوں۔"

ان لوگوں کی اپنائیت اور شفقت دیکھ کر مجھے ایک دفعہ پھر شرمندگی محسوس ہوئی۔

بشریٰ کے معاملے میں قصوروار تو میں بھی تھا۔ میں یہ سوچ کر ہی کانپ گیا کہ اگر اس دن عین وقت پر آنٹی نہ آجاتیں تو کیا ہوتا؟

وہ لوگ تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے دروازہ اندر سے بند کیا اور اپنی کتابیں لے کر پڑھنے بیٹھ گیا۔ شام کو چائے کے ساتھ اقبال نے اتنا کھلا دیا تھا کہ اب کھانے کی خواہش ہی نہیں رہی تھی۔

دروازے پر دستک ہوئی تو بے اختیار میری نظر اپنی کلائی کی گھڑی پر گئی۔ اس وقت دو بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ آنے والی بشریٰ ہے۔ میں خاموشی سے لیٹا رہا۔ دوسری مرتبہ دستک زیادہ زور سے ہوئی تو میں بوکھلا کر کھڑا ہوگیا۔ میں اب بھی دروازہ نہ کھولتا تو یقیناً وہ دروازہ پیٹ کر رکھ دیتی۔ اس جنونی لڑکی سے کچھ بھی بعید نہ تھی۔

میں نے دروازہ کھولا تو وہ غصے میں تنتناتی ہوئی اندر آگئی اور بولی۔ "تم دروازہ کیوں نہیں کھول رہے تھے؟ اب یہ مت کہنا کہ تم سو رہے تھے۔ اگر تم اب بھی دروازہ نہ کھولتے تو میں زوردار انداز میں دروازہ پیٹتی۔"

"تم اس وقت آئی ہی کیوں ہو؟" میں نے جھنجلا کر کہا۔

"تم نے صائمہ سے میرے بارے میں کیا کہا ہے؟" اس نے بلند آواز میں کہا۔

"آہستہ بولو بشریٰ! صائمہ سے تو جو کچھ کہا ہے تم ہی نے کہا ہے۔"

"زیادہ جھوٹ مت بولو ظفر!" اس نے کہا۔ "میں تم دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔ میں تمہاری محبت میں گرفتار ہوگئی ہوں، میں پاگل ہوگئی ہوں۔ یہی کہا تھا نا تم نے؟ تم خود کو سمجھتے کیا ہو؟"

"کیا ہم یہ باتیں صبح نہیں کرسکتے؟" میں نے گھبرا کر کہا۔

"میری ایک بات یاد رکھنا ظفر! میں صائمہ کیا، اس کے باپ سے بھی نہیں ڈرتی۔ تم کہو تو میں کل خود سب کو بتادوں کہ میں تم پر مرمٹی ہوں، تمہارے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔"

"تم کیا چاہتی ہو بشریٰ؟ میں ابھی اور اسی وقت یہ گھر چھوڑ کر چلا جاؤں؟"

"جا کر دکھاؤ۔" وہ چیلنج کرنے والے انداز میں بولی۔ "اگر میں ابھی اپنے کپڑے پھاڑ لوں اور شور مچا دوں کہ تم نے دھوکے سے مجھے کمرے میں بلایا اور میری عزت لوٹنا چاہتے ہو تو؟"

"یہ بھی کر دیکھو۔" میرا دماغ بھی ایک دم گھوم گیا۔ "تم کیا سمجھتی ہو کہ مجھے بلیک میل کرتی رہو گی۔ ایسا کرنے میں بدنامی کس کی ہوئی؟"

میں نے اپنی کتابیں سمیٹ کر ایک بیگ میں ڈالیں اور جانے کو تیار ہو گیا۔

"ظفر!" بشریٰ نے قدرے بلند لہجے میں کہا۔ "بیگ رکھ دو اور آرام سے لیٹ جاؤ۔"

"میرا راستہ چھوڑو بشریٰ!" میں دروازے کی طرف بڑھا۔

بشریٰ نے اچانک اپنی قمیص کا گریبان پکڑا اور جنونی انداز میں اسے پھاڑ دیا۔ اس نے میری طرف قہر آلود نظروں سے دیکھا اور اپنی قمیص کندھے کے پاس سے ایسی پھاڑی کہ اس کی آستین ہی علیحدہ ہو گئی۔

"اب جا کر دکھاؤ۔ اب میں شور مچانا شروع کر دوں گی کہ......"

میں شکستہ انداز میں بستر پر ڈھے سا گیا۔ وہ اسی حالت میں میرے سامنے کھڑی تھی، اس کا دوپٹا فرش پر پڑا تھا۔

میں نے اٹھ کر اس کا دوپٹا اٹھایا اور اس کے جسم کے گرد لپیٹ دیا اور کہا۔ "اچھا بابا، میں کہیں نہیں جا رہا، اب تو جاؤ۔ اس وقت اگر کسی نے تمہیں یہاں اس حالت میں دیکھ لیا تو......"

وہ بے اختیار میری طرف بڑھی اور مجھ سے لپٹ کر رونے لگی۔ وہ اس بری طرح رو رہی تھی کہ مجھے خدشہ تھا کہ وہ بے ہوش نہ ہو جائے۔

"بشریٰ پلیز! بس کرو۔ آئی ایم سوری بشریٰ!" میں نے گلاس میں پانی بھر کے اسے پلایا اور کہا۔ "میں کہیں بھی نہیں جا رہا ہوں۔ بس مجھے غصہ آ گیا تھا۔"

"ظفر، آئندہ مذاق میں بھی ایسی بات نہ کرنا۔ میں محبت میں جان دے بھی سکتی ہوں اور تمہاری جان لے بھی سکتی ہوں۔"

میں نے بہت مشکل سے سمجھا بجھا کر اسے وہاں سے بھیجا۔ پھر میں ساری رات جاگتا رہا اور اس صورت حال پر غور کرتا رہا۔ میرا دماغ پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا اور رات بھر جاگنے سے جسم بری طرح ٹوٹ رہا تھا۔ مجھے رات تو بخار نہیں تھا لیکن صبح ہوتے ہوتے مجھے بخار بھی آ گیا۔

دفتر جانے سے پہلے انکل میری طبیعت پوچھنے آئے تو میں بخار میں پھنک رہا تھا۔ وہ تشویش سے بولے۔ "ارے بیٹا! تمہیں تو بہت تیز بخار ہے۔ اگر رات ہی ڈاکٹر کو دکھا دیتے تو اب تک طبیعت ٹھیک ہو گئی ہوتی۔"

"میں ابھی تھوڑی دیر میں ڈاکٹر کے پاس چلا جاؤں گا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ میری طبیعت اتنی خراب نہیں ہے۔"

"بیٹا! ڈاکٹر کے پاس ضرور چلے جانا۔ میں تمہیں خود لے جاتا لیکن، اتنی جلدی کوئی بھی ڈاکٹر نہیں آتا۔"

"آپ پریشان نہ ہوں، میں چلا جاؤں گا۔" میں نے کہا۔

بستر سے اٹھنے کو میرا دل تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن مجھے اب اس گھر سے وحشت ہو رہی تھی جہاں ایک جنونی لڑکی رہتی تھی۔ رات مجھے اس کے جنون کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اس جنون میں کچھ بھی کر سکتی تھی۔

میں بہ مشکل بستر سے اٹھ کر باتھ روم میں گیا اور ہاتھ منہ دھو کر واپس آ گیا۔

میں تیار ہو کر باہر نکلنے ہی والا تھا کہ بشریٰ آ گئی۔ اس کے چہرے پر اس وقت وہی معصومیت تھی جسے دیکھ کر کوئی اس کی خواہش کر سکتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی۔

"ارے، تم تو واقعی بیمار ہو گئے ہو؟" اس نے ہنس کر کہا۔ "چلو ناشتا کر لو، میں انکل سلمان کو بلاتی ہوں۔ ابھی اسپتال کے لیے نکلے نہیں ہوں گے۔"

اس نے زبردستی مجھے ڈبل روٹی کے سلائس اور ابلا ایک انڈا کھلایا اور باہر نکل گئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ ڈاکٹر سلمان کو لے کر آ گئی۔ انہوں نے میری نبض دیکھی، بخار چیک کیا، پھر انجکشن لگایا اور بولے۔ "وقتی تھکن اور بے سکونی کی وجہ سے آپ کو بخار آیا ہے۔ میں کچھ دوائیں بھی لکھ دیتا ہوں وہ ایک ایک گولی کھا لیں۔ شام تک بخار اتر جائے گا۔"

دوپہر تک میرا بخار بالکل اتر گیا۔ میں تیار ہو کر جلدی سے باہر نکل گیا۔ اگر بشریٰ دیکھ لیتی تو مجھے ہرگز نہ جانے دیتی۔ میں نے پہلے تو ایک ہوٹل میں کھانا کھایا کیونکہ بخار اترنے کے بعد شدید بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ پھر پڑھانے نکل گیا۔



اسی دوران میں بشریٰ کا فون موصول ہوا۔ وہ فکرمندی سے کہہ رہی تھی۔ "ظفر! تمہیں بھی سکون نہیں ہے۔ تمہاری اتنی طبیعت خراب تھی اور تم گھر سے نکل لیے۔"

"میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے کہا۔

"اللہ تمہیں ہمیشہ ٹھیک رکھے۔" بشریٰ نے محبت بھرے انداز میں کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

اس دن میں نے دو چار جگہ کرائے کے مکان کی بات کی۔ دو کمروں کا ایک مکان مجھے پسند بھی آ گیا۔ اس کا کرایہ بھی معقول تھا لیکن جب مالک مکان کو یہ معلوم ہوا کہ میں اکیلا اس مکان میں رہوں گا تو اس نے معذرت کر لی۔

میں شام کو تھکا ہارا واپس آیا تو بشریٰ چائے اور دوسرے لوازمات لے کر آ گئی۔ اس نے زبردستی مجھے کھلایا، پلایا، پھر وہ گولی کھلائی جو ڈاکٹر نے دی تھی اور بولی۔ "تم آج بھی آرام کرو۔ میں یاسر اور عامر کو منع کر دوں گی۔" پھر وہ اچانک موضوع بدل کر بولی۔ "ظفر، تم پڑھائی سے فارغ ہو کر کون سی جاب کرو گے؟"

"میرا ارادہ ہے کہ میں سی ایس ایس کا امتحان دوں۔ ابو کی بھی یہی خواہش تھی کہ میں پڑھ لکھ کر بہت بڑا افسر بنوں۔"

"میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں ظفر!" بشریٰ نے کہا۔ "تم انشاءاللہ ایک دن اسی شہر کے ڈپٹی کمشنر بنو گے۔"

وہ جب نارمل ہوتی تھی تو بہت پیارے انداز میں بات کرتی تھی۔ اسے دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ اس معصوم اور بھولی بھالی لڑکی نے عالم جنون میں اپنے کپڑے پھاڑ لیے ہوں گے۔

اس رات میں بہت سکون سے سویا۔ صبح میں نے بشریٰ کو اسکول جاتے دیکھا تو سکون کا سانس لیا۔

میں جب گیارہ بجے کے قریب گھر سے نکلا تو صائمہ نے آواز دے کر مجھے روک لیا اور بولی۔ "ظفر، اندر آ جاؤ۔ اس وقت گھر میں کوئی نہیں ہے۔"

بشریٰ کے ساتھ ساتھ اب مجھے صائمہ سے بھی الجھن ہونے لگی تھی۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اندر چلا گیا۔

"کیا ہوا ظفر! کوئی مکان ملا؟" صائمہ نے پوچھا۔

میں نہ جانے کیوں جھنجلا گیا اور تلخ لہجے میں بولا۔ "صائمہ باجی! آپ دونوں نے مل کر میری زندگی اجیرن کر دی ہے۔ آپ کی وجہ سے بشریٰ کل پھر پاگل ہو گئی۔ آپ دونوں کا تو کچھ نہیں بگڑے گا، میں ریل کی پٹڑی پر لیٹ جاؤں گا یا پھر پاگل ہو جاؤں گا۔"

"تم...... تم...... مجھے الزام دے رہے ہو ظفر؟" صائمہ نے افسردگی سے پوچھا۔

"تو پھر اور کیا کروں؟" میں نے جھنجلا کر کہا۔ "چلیے آپ ہی بتا دیجیے کہ آپ کی اس غیر متوقع عنایت اور مہربانی کا سبب کیا ہے؟ میں تو آپ دونوں کے درمیان سینڈوچ بن کر رہ گیا ہوں۔"

صائمہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے روتے ہوئے کہا۔ "ظفر! تم میرا موازنہ بشریٰ سے کر رہے ہو؟" اس کی آنکھوں سے بری طرح آنسو بہنے لگے۔ "میرا کوئی

## کمپیوٹر پر مسلسل کام

### گردن کا درد بے لگام

جدید طبی تحقیق کے مطابق کمپیوٹر پر مسلسل کئی گھنٹے کام کرنے والے بچوں اور بڑوں میں گردن کے درد اور اکڑاؤ کی شکایت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ طبی ماہرین نے اسکول جانے والے بچوں کے لیے اس مرض کو خطرناک قرار دیا ہے۔ اس سے قبل ہونے والی تحقیق میں کمپیوٹر کے استعمال اور سر درد، قے اور جسم میں درد کی علامات سامنے آ چکی ہیں۔ طبی ماہرین نے کہا ہے کہ کمپیوٹر پر کام کرنے والے افراد کو ہر ایک گھنٹے بعد کم از کم 10 منٹ کا وقفہ ضرور کرنا چاہیے۔ اس تحقیق میں ایک ہزار سے زائد اسکول جانے والے بچوں اور بڑوں کو شامل کیا گیا تھا۔ اسکول جانے والے بچوں میں گردن درد کی شرح 43 فیصد جبکہ بڑوں میں 65 فیصد تھی۔ طبی ماہرین نے کہا ہے کہ کمپیوٹر استعمال کرتے ہوئے کمرے میں تازہ ہوا کا گزر ضرور ہونا چاہیے کیونکہ کمپیوٹر استعمال کرتے ہوئے تمام حسیات کام کرتی ہیں جس سے جسم کو زیادہ آکسیجن کی ضرورت ہوتی ہے۔

مرسلہ: نادیہ احسن، حاصل پور

بھائی نہیں ہے۔ میں نے ہمیشہ تمہیں اسی نظر سے دیکھا۔ خالہ کے انتقال کے بعد تمہارا حسرت زدہ چہرہ دیکھ کر مجھے تمہاری تنہائی پر رحم آگیا۔ بس اسی دن سے میرے دل میں تمہاری محبت مزید بڑھ گئی۔ جب ابو نے تمہارے ساتھ زیادتی کی تو مجھے تمہاری حالت پر مزید ترس آیا۔ میں نے تو ہمیشہ تمہیں اپنا چھوٹا بھائی سمجھا۔ تم بھی تو مجھے صائمہ باجی کہتے ہو...... اور دل میں میرے لیے ایسے خیالات رکھتے ہو۔ لوگ سچ ہی کہتے ہیں۔ اپنا خون، اپنا ہی ہوتا ہے۔" وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔

"صائمہ باجی! مجھے معاف کردیں، مجھ سے غلطی ہوگئی۔ بڑی بہنیں تو بھائیوں کی بڑی سے بڑی غلطی کو بھلا دیتی ہیں۔"

اس نے پیار سے میرے سر پر ایک چپت لگائی اور روتے روتے مسکرانے لگی، پھر بولی "اتنے بڑے ہوگئے، ابھی تک بچوں کی طرح روتے ہو۔"

اس کے کہنے پر مجھے احساس ہوا کہ میرے بھی آنسو بہہ رہے ہیں۔

"میں تو تمہارے ہی بھلے کو کہہ رہی ہوں کہ وہ گھر چھوڑ دو۔"

"آپ واقعی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" پھر میں نے انہیں گزشتہ رات والا واقعہ بتایا تو وہ سناٹے میں رہ گئیں۔

"ظفر، میرے بھائی! تم آج ہی وہ گھر چھوڑ دو ورنہ وہ پاگل لڑکی تمہیں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑے گی۔"

مجھے اچانک اقبال کا خیال آیا۔ میں نے سوچا کہ میں اس کی آفر قبول کرلوں گا۔ مجھے بشریٰ کے عذاب سے تو نجات ملے گی۔

میں شام کو اقبال سے ملا اور اسے سب کچھ تفصیل سے بتادیا۔

اقبال ہنس کر بولا۔ "تُو تو قسمت کا دھنی ہے یار، اتنی خوبصورت لڑکی تیرے لیے پاگل ہو رہی ہے۔"

"مجھے پاگلوں کے ساتھ رہنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔"

"یار، میں نے تو تجھ سے پہلے بھی کہا تھا تو یہیں شفٹ ہوجا۔ تو وہ کونے والا کمرا لے لے۔ وہاں تیری پرائیویسی میں بھی کوئی خلل نہیں پڑے گا۔"

"ہاں، ایک بات اور!" میں نے کہا۔ "بشریٰ اتنی آسانی سے میرا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ وہ یہاں بھی آنے کی کوشش کرے گی۔"

"اس کی تُو فکر مت کر!" اقبال نے کہا۔ "یہ ڈی آئی جی آفتاب ملک کا گھر ہے۔ یہاں صرف وہی لوگ آسکتے ہیں جنہیں ہم آنے کی اجازت دیں۔ گیٹ پر کھڑے ہوئے سنتری اسے اندر پھٹکنے بھی نہیں دیں گے۔ اور تو سامان کی بھی فکر مت کر۔ بس اپنا ضروری سامان لے آ۔"

☆☆☆

میں اقبال کے ساتھ راتوں رات اس کے بنگلے میں شفٹ ہوگیا۔ میں نے سوچا کہ صبح انکل کے دفتر جاکر ان سے معذرت کرلوں گا۔

دوسرے دن میں نے سب سے پہلا کام یہی کیا۔ میں انکل کے دفتر پہنچ گیا۔ وہ مجھے وہاں دیکھ کر گھبرا سے گئے اور بولے۔ "ظفر بیٹا! سب خیریت تو ہے؟"

"جی انکل، سب خیریت ہے۔" میں نے کہا۔ "میرے اسکول کا ایک دوست مجھے مل گیا ہے۔ اس کے والد ڈی آئی جی ہیں وہ بہ ضد ہے کہ میں اس کے بنگلے میں شفٹ ہوجاؤں۔ میں آپ کو یہی بتانے آیا تھا کہ میں آج وہاں شفٹ ہو رہا ہوں۔"

"بیٹا! بچوں کو پڑھانے تو آؤ گے نا؟" انکل نے پوچھا۔

"مشکل ہوگا انکل!" میں نے سر جھکا کر کہا۔

"چلو بیٹا، جیسے تمہاری خوشی، بس تم جہاں بھی رہو، خوش رہو۔ ہاں کبھی کبھی آتے رہنا۔"

میرے ذہن سے ایک بوجھ سا ہٹ گیا۔

میں نے سب سے پہلے تو اپنے سیل فون کی سم تبدیل کی تاکہ بشریٰ مجھ سے رابطہ نہ کرسکے۔

پھر میں اپنی ٹیوشنز اور پڑھائی میں مصروف ہوگیا۔ میٹرک میں کراچی بورڈ میں پہلی پوزیشن تھی۔ میری تصویریں اخبار میں چھپی تھیں۔ میں نے اس موقع پر بھی انکل یا صائمہ باجی سے کوئی رابطہ نہیں کیا۔

آفتاب انکل کے مشورے پر میں نے شہر کے ایک بہترین کالج میں داخلہ لے لیا۔ میرے پاس اب اتنی ٹیوشنز تھیں کہ میں اپنے اخراجات آسانی سے برداشت کرسکتا تھا۔ مگر مجھے اس کے لیے سخت محنت کرنا پڑتی تھی۔ میں صبح سے رات کے دس بجے تک مصروف رہتا تھا۔

ایک دن میں کالج سے باہر نکلا تو میری نظر بشریٰ پر پڑی۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ میں بوکھلا کر ایک منی بس میں سوار ہوگیا۔ میرا ارادہ تھا کہ میں اگلے اسٹاپ پر اتر کر

اپنے روٹ کی بس میں بیٹھ جاؤں گا۔ اگلے اسٹاپ پر بشریٰ مجھ سے پہلے موجود تھی۔

میرے اترتے ہی وہ میرے نزدیک آگئی اور بولی۔ ”مجھ سے کہاں تک بھاگو گے ظفر! میرے ساتھ چلو، مجھے تم سے کچھ بات کرنا ہے۔“

”تمہیں جو کچھ کہنا ہے، یہیں کہو۔“

”ظفر!“ مجھے اس کی آنکھوں میں وہی جنون نظر آیا۔ ”تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو، میں اگر ابھی چپل اتار کر تمہاری پٹائی شروع کردوں تو سوچ لو تمہارا کیا حشر ہوگا؟“

”چلو، کہاں چلنا ہے؟“ میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

پھر ہم لوگ ایک ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے۔

”میں نے کہا تھا نا ظفر کہ مجھے دھوکا دینے کی کوشش مت کرنا۔“ وہ بلند آواز میں بولی۔

”میں نے کب تمہیں دھوکا دیا ہے بشریٰ؟“ میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ”تم میری آنکھوں کے سامنے رہتیں تو میری پڑھائی متاثر ہوتی۔ بس اس لیے میں وہاں سے چپ چاپ چلا آیا۔“

اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ میں نے فوری اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اس دو سال کے عرصے میں اس کا چہرہ مرجھا کر رہ گیا تھا۔ رنگ وروپ بھی وہ نہیں رہا تھا، آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے تھے لیکن اب بھی اس کے چہرے میں ایک کشش تھی، اس وقت وہ ایک نوخیز لڑکی تھی، اب وہ ایک بھرپور جوان لڑکی تھی اور اس کا جسم پہلے سے بھی زیادہ پرکشش ہوگیا تھا۔

وہ مسکرا کر بولی۔ ”ظفر! مجھ سے وعدہ کرو کہ تم ہفتے میں ایک دفعہ مجھ سے ضرور ملو گے۔“

”اچھا یار وعدہ کرتا ہوں۔“ میں نے جان چھڑانے کو کہا ورنہ کیا تعجب تھا کہ وہ سرِعام مجھے بھی تماشا بنا دیتی اور خود بھی تماشا بن جاتی۔

بہ مشکل تمام میں نے اسے دو گھنٹے بعد رخصت کیا۔ اس کا ملنا اتفاق نہیں تھا بلکہ وہ خاص طور پر مجھ سے ملنے آئی تھی بلکہ کئی دن سے آرہی تھی۔ میں کالج بھی کبھار ہی جاتا تھا۔ وہ کئی دفعہ اقبال کے بنگلے پر بھی آچکی تھی لیکن سنتری نے اسے اندر نہیں گھسنے دیا۔

میرا سکون ایک مرتبہ پھر تباہ ہوگیا۔

میں نے کالج جانا مزید کم کردیا۔ جاتا بھی تھا تو کالج کے پچھلے حصے سے نکل جاتا تھا۔

☆☆☆

میں نے اس بے سکونی میں بی اے کرلیا۔ اس مرتبہ بھی میری دوسری پوزیشن تھی۔

میں نے مقابلے کے امتحان کی تیاری شروع کردی اور یونیورسٹی میں داخلہ بھی لے لیا۔

مجھے وہ دن اور تاریخ آج بھی یاد ہے۔ اس دن بدھ تھا اور اپریل کی دس تاریخ تھی۔ میں سی ایس ایس کے امتحان کا آخری پیپر دے کر باہر نکلا تو پھر بشریٰ سے ٹکراؤ ہوگیا۔

”تم انتہائی جھوٹے اور دھوکے باز ہو ظفر!“ وہ بلند آواز میں بولی۔ ”کیوں نہیں آئے تم“ وہ چیخ کر بولی۔ ”تم نے مجھ سے کیا کہا تھا کہ ہر ہفتے ملو گے، بولو کہا تھا یا نہیں؟“

”ہاں کہا تھا لیکن مجھے وقت نہیں مل سکا۔ مجھے زندگی میں اور بھی کام ہیں بشریٰ!“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

”تو تم ڈپٹی کمشنر بننے جا رہے ہو؟“ وہ تلخ لہجے میں بولی۔ ”کیسا عجیب تماشا ہوگا جب ڈی سی صاحب کو سرِعام جوتے پڑیں گے؟“ اس نے کہا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں وہی جنون دکھائی دیا۔

”بکواس بند کرو اور دفع ہوجاؤ یہاں سے؟“ میں بپھر کر بولا۔

بشریٰ نے اچانک میرا گریبان پکڑ لیا اور میرے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کرکے بولی۔ ”دھوکے باز، مجھ پہ آنکھیں نکالتا ہے۔ تو نے کیا سوچ کر مجھے ہاتھ لگایا تھا۔“ اس نے دوسرا تھپڑ مارا۔ میرا گریبان تار تار ہوگیا تھا۔

پھر اس نے چپل اتاری اور تڑاتڑ میرے سر پر رسید کردی۔ دو تین لوگ اس کی ہمدردی میں آگے بڑھے تو وہ چیخ کر بولی۔ ”کوئی بیچ میں نہ آئے، یہ میرا ذاتی مسئلہ ہے۔“

”بی بی، ذاتی مسئلہ ہے تو اسے گھر جا کر حل کرو۔ یوں سرِعام کیوں تماشا بن رہی ہو۔“ ایک آدمی نے کہا۔

بشریٰ نے اس شخص کو گھور کر دیکھا تو وہ جلدی سے آگے بڑھ گیا۔

توہین اور ذلت کے احساس سے میرا دماغ خراب ہو رہا تھا۔ میرا بس چلتا تو میں اسے گلا گھونٹ کر مار دیتا۔

میرا گریبان ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے میرے سر پر چپل کی ایک زوردار ضرب ماری اور بولی۔ ”آج کے لیے اتنا سبق کافی ہے ڈی سی صاحب! آیندہ اگر ملے نہیں



آئے تو اس سے زیادہ برا حشر کروں گی۔“

میرا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ میں سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا۔ وہاں موجود لوگ میری مدد کرنے کی بجائے مجھ پر ہنس رہے تھے، آوازے کس رہے تھے۔

”ابے، لڑکیوں کو چھیڑنے میں یہ تو ہوتا ہے۔ بھائی میاں، اس طرح تو ہوتا ہے، اس طرح کے کاموں میں! ابے لڑکی سے مار کھا کے بیٹھا ہے سر پکڑے۔“ جتنے منہ تھے اتنی ہی باتیں تھیں۔

میں بہ مشکل تمام اٹھا، سامنے سے آتی ہوئی ٹیکسی روکی اور سیدھا گھر پہنچ گیا۔ اس کم بخت بشریٰ نے اسٹیل کی ہیل والی چپل پہن رکھی تھی۔ میرے سر پر جگہ جگہ گومڑے سے پڑ گئے تھے۔ ایک چپل پیشانی پر بھی لگی تھی، وہاں سے خون بہہ رہا تھا۔ پھر اس نے تھپڑ اتنا زبردست مارا تھا کہ میرے سفید رنگ پر اس کی انگلیوں کے واضح نشانات نظر آرہے تھے۔

اسی وقت اقبال آگیا، میرا حلیہ دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ جب میں نے اسے یہ بتایا کہ میرا یہ حال سرِعام بشریٰ نے کیا ہے تو وہ غصے سے پاگل ہوگیا۔

وہ پہلے تو مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گیا، وہاں سے فارغ ہوکر وہ سیدھا اس علاقے کے تھانے میں پہنچا جہاں انکل ابوالحسن کا گھر تھا۔

جب اس نے اپنا تعارف کرایا تو تھانے کا انچارج اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا اور بولا۔ ”حکم کریں سر، کیسے زحمت کی؟“

اقبال نے مجھ سے انکل ابوالحسن کا ایڈریس پوچھا اور انچارج کو بتاتے ہوئے بولا۔ ”اس گھر کے ہر فرد کو اٹھا کر یہاں لے آؤ۔“

”لیکن سر! وہ......“

اقبال نے جیب سے سیل فون نکالا اور بولا۔ ”میں ابھی ڈیڈی سے آپ کی بات کروا دیتا ہوں۔“

”ڈی آئی جی صاحب کو تکلیف کیوں دیتے ہیں سر!“ انسپکٹر نے کہا۔ پھر ایک سب انسپکٹر کو بلا کر کہا۔ ”عبدالرحمٰن صاحب! اس ایڈریس پر جتنے بھی بندے ہیں، سب کو اٹھا کر لائیں۔“

”ان کا جرم کیا ہے سر؟“ سب انسپکٹر نے پوچھا۔

”آپ سے جتنا کہا جارہا ہے، اتنا کریں۔“ انچارج نے آنکھیں نکالیں۔

سب انسپکٹر اسی وقت روانہ ہوگیا۔ انچارج نے اقبال سے پوچھا۔ ”ویسے سر ان پر کس دفعہ کے تحت پرچہ درج کروں؟“

”ان کی ایک پاگل بیٹی نے میرے دوست کو سرِعام بے عزت کیا ہے، اس پر ہاتھ اٹھایا ہے لیکن آپ ان سے یہی کہیے گا کہ ہمیں اطلاع ملی ہے کہ آپ کے گھر میں انڈیا سے آئے ہوئے کچھ لوگ غیر قانونی طور پر مقیم ہیں۔“

اقبال، میری بات تو سن!“ میں نے کہا۔ ”میں......“

”تو خاموش رہ!“ اقبال نے مجھے بھی جھڑک دیا۔ مجھ سے زیادہ غصے میں وہ پاگل ہو رہا تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں تھانے میں انکل اور آنٹی کا سامنا کیسے کروں گا؟

دس منٹ بعد ہی پولیس کی موبائل وین واپس آگئی لیکن وہ لوگ اپنے ساتھ کسی کو نہیں لائے تھے۔

”ملزمان کہاں ہیں؟“ تھانہ انچارج غرا کر بولا۔ ”کیا سب فرار ہوگئے؟“

”سب موجود ہیں سر!“ سب انسپکٹر نے کہا۔ ”اس گھر میں ایک جوان العمر لڑکی بشریٰ نے خودکشی کرلی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے گھر کے پنکھے سے لٹک کر جان دی ہے۔ میں نے لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے لانے کا حکم دے دیا ہے۔“

میرے کانوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھی، دماغ ماؤف ہوکر رہ گیا تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ بشریٰ اس حد تک بھی جاسکتی ہے۔ وہ میری جان لے تو سکتی تھی لیکن میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اپنی جان دے دے گی۔

”اس پوسٹ مارٹم کو رکوا دو اقبال!“ میں نے آہستہ سے کہا۔ مجھے اپنی آواز خود بھی اجنبی لگ رہی تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ بشریٰ کا قاتل میں ہی ہوں۔

اقبال کی ہدایت پر تھانہ انچارج نے کہا۔ ”سب انسپکٹر صاحب! یہ پوسٹ مارٹم نہیں ہوگا۔ موت کا سبب بجلی کا کرنٹ ہے۔“

پھر میں کیسے وہاں سے اٹھا، کیسے گھر تک پہنچا، مجھے نہیں معلوم۔ سارا دن میں نے کچھ بھی نہیں کھایا۔

میں شام تک انکل کے گھر پہنچا تو بشریٰ کا جنازہ تیار تھا۔ میں اسے کفن میں لپٹا دیکھ کر بے اختیار رونے لگا۔ پھر انکل نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ ان کے سینے سے لگ کر روتے روتے میری ہچکی بندھ گئی۔

میں بشریٰ کو مٹی دے کر لٹا پٹا گھر پہنچا تو سنتری نے

مجھے ایک خط تھما دیا۔ وہ بشریٰ کی تحریر تھی۔ میں نے کمرے میں آکر بے تابی سے لفافہ چاک کیا اور خط نکال لیا۔ اس نے لکھا تھا۔

پیارے ظفر! میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں تم سے کیسے اور کن الفاظ میں معافی مانگوں؟ مجھے غصے میں پتا نہیں کیا ہو جاتا ہے۔ خاص طور پر تم پہ تو جتنا پیار آتا تھا، اتنا ہی غصہ بھی آتا تھا۔ میں نے تمہیں بہت ستایا ہے، بہت اذیت پہنچائی ہے۔ اس کی تلافی کی صورت یہی ہے کہ میں اس دنیا میں ہی نہ رہوں۔ جب تمہیں میرا یہ خط ملے گا تو میں تم سے بہت دور جا چکی ہوں گی۔ ہاں مرنے سے پہلے میں اپنا یہ ہاتھ کسی پتھر یا سل سے کچلوں گی جو تم پر اٹھا تھا۔ ہوسکے تو مجھے معاف کر دینا۔ بشریٰ، جو کبھی تمہاری نہ ہو سکی۔"

خط پڑھ کر میری آنکھیں پھر بھیگ گئیں۔

☆☆☆

میں اب ڈپٹی کمشنر ہوں اور میری تعیناتی کراچی کے اسی ضلع میں ہوگئی ہے جہاں کبھی میں رہتا تھا، بشریٰ رہتی تھی۔

میں صائمہ باجی کو تو بھول ہی گیا تھا۔ ڈی سی بننے کے بعد میں سب سے پہلے انکل ابوالحسن کے گھر گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ پھر میں صائمہ باجی کے گھر گیا۔ معلوم ہوا کہ ظہور چاچا کا انتقال ہو چکا ہے۔ صائمہ باجی کی شادی ہو گئی تھی لیکن وہ بیوہ ہو کر ایک مرتبہ پھر اپنے گھر لوٹ آئی ہیں۔

مجھے دیکھ کر وہ والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گئیں اور بولیں "تم تو بہت بے مروت بھائی ہو ظفر!"

"میں واقعی بہت برا ہوں صائمہ باجی!" میں نے افسردگی سے کہا۔

"ارے، میں نے تو یونہی ایک بات کہہ دی تھی۔" صائمہ نے ہنس کر کہا۔

"میں واقعی بہت برا ہوں صائمہ باجی!" میں نے اپنی بات دہرائی۔ "میں نے یہاں سے جانے کے بعد مڑ کر آپ کی خبر نہیں لی۔ آپ اتنے صدموں سے گزریں اور میں بے خبر رہا۔ کیا بھائی ایسے ہی ہوتے ہیں؟"

"اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔" صائمہ باجی نے کہا۔ "میں تمہارے لیے گاجر کا حلوہ بناتی ہوں۔"

"آپ کو یاد ہے صائمہ باجی کہ......"

"تمہیں گاجر کا حلوا بہت پسند ہے۔" انہوں نے میرا جملہ پورا کر دیا۔ "آنٹی اکثر مجھی سے تو تمہارے لیے حلوہ بنوایا کرتی تھیں۔" پھر وہ چونک کر بولیں۔ "ہاں، وہ تمہاری امانت جوں کی توں رکھی ہے۔"

"میری امانت؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"ارے بھئی، تمہارا سامان!" صائمہ باجی نے ہنس کر کہا۔ "تمہارے بعد پھر وہ گھر میں نے کرائے پر اٹھنے نہیں دیا۔"

"صائمہ باجی! وہ سامان آپ غریبوں میں بانٹ دیں۔" میں نے کہا۔

"بھئی، جو کچھ کرنا ہے اب تم ہی کرو۔ میں نے تو تمہاری امانت تمہارے حوالے کر دی۔" پھر وہ چونک کر بولیں۔ "ہاں، تمہیں معلوم ہے کہ بشریٰ نے خودکشی کر لی تھی؟"

"بشریٰ نے خودکشی کر لی، کیوں؟"

"وہ مرنے سے چند منٹ پہلے مجھ سے ملنے آئی تھی اور کہہ رہی تھی کہ میں نے آج خواہ مخواہ ایک شریف لڑکے کو سرِعام ذلیل کر دیا۔ میں جانتی ہوں وہ مجھے معاف نہیں کرے گا لیکن گناہوں کی تلافی کے بعد شاید وہ مجھے معاف کر دے۔"

صائمہ باجی نے چند لمحے توقف کے بعد کہا۔ "سچ بتاؤ ظفر، کیا وہ لڑکے تم تو نہیں ہو؟ کیونکہ وہ تمہارے ہی لیے اتنی جنونی تھی۔"

"آپ کا اندازہ درست ہے صائمہ باجی!" میں نے کہا۔ "وہ لڑکا میں ہی ہوں۔" پھر میں نے آہستہ سے کہا۔ "صائمہ باجی میری ایک بات مانیں گی؟"

"کون سی بات؟"

"پہلے آپ وعدہ کریں کہ مانیں گی؟"

"اچھا بابا، وعدہ کرتی ہوں۔ اب تو بتاؤ۔"

"صائمہ باجی، کیا آپ میرے ساتھ رہ سکتی ہیں۔ ہم دونوں بہن بھائی تنہائی کے مارے ہوئے ہیں۔"

صائمہ باجی کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور انہوں نے روتے روتے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

میں نے اپنے ابو کے خوابوں کو تعبیر تو دے دی لیکن ایک پاگل سی، معصوم لڑکی کے نہ صرف خوابوں کو چکنا چور کیا بلکہ اس کی جان بھی لے لی۔ آج میرے پاس سب کچھ ہے لیکن اس کے باوجود بشریٰ کی یاد پھانس بن کر میرے دل میں چبھتی رہتی ہے اور خون رستا رہتا ہے۔ لگتا ہے، اندر سے میرا پورا وجود زخم زخم ہے۔



# قربانی

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم!
لوگ دوسروں کی حالات زندگی لکھتے ہیں لیکن میں... اپنی زندگی کے حالات کو احاطۂ تحریر میں لائی ہوں میری زندگی میں کیسے کیسے نشیب وفراز آئے آپ بھی ملاحظہ کریں۔

سیما فاروقی
(کراچی)

میرا نام سیما فاروقی ہے چند سال پہلے میں اپنے شوہر کے ساتھ سیر و تفریح کے لیے انگلینڈ گئی تھی۔ لندن میں ہمارے کچھ قریبی عزیز اور دوست احباب رہتے تھے۔ اس لیے مرکزی قیام وہیں رہا۔ ہم تین چار دن کے ٹور کا پروگرام بنا کر مختلف شہروں اور تفریحی مقامات پر جاتے تھے اور پھر واپس لندن آجاتے تھے۔ ایک ٹور کے دوران میں دیر تک بارش میں بھیگتی رہی۔ گلے میں خراش اور ہلکا زکام پہلے سے تھا۔ لندن واپس آتے آتے میں بری طرح انفلوئنزا میں

مبتلا ہوگئی۔ لندن پہنچے تو رات ہوچکی تھی۔ میری کیفیت ایسی تھی کہ فوراً کسی ڈاکٹر کو دکھانا ضروری تھا۔ ہماری میزبان نے مشورہ دیا کہ اسی بلڈنگ میں اوپر والے فلیٹ میں ایک خاتون مس سائرہ دستگیر رہتی ہیں۔ بہت تجربہ کار ریٹائرڈ نرس ہیں۔ کئی بڑے ہسپتالوں میں قابل ڈاکٹروں اور سرجنوں کے ساتھ کام کرتی رہی ہیں۔ ان کی تشخیص کسی اچھے ڈاکٹر سے کم نہیں۔ انہیں دکھا لیا جائے۔ اول تو ان ہی علاج سے آرام آجائے گا۔ نہیں تو پھر کل پرسوں کسی ڈاکٹر سے کنسلٹ کرلینا۔ ایسا ہی کیا گیا، اور پھر ایسا ہوا کہ جو دوا انہوں نے اپنے پاس سے مجھے دی تھی اس کی تین خوراکوں نے ہی جادو جیسا اثر دکھایا۔ دو دن کے اندر میں تقریباً بالکل ٹھیک ہوگئی۔ اگرچہ دوا مزید تین دن تک کھانا پڑی۔

جب میری میزبان نے مس سائرہ دستگیر کا نام لیا تو ذہن میں کسی جوان شخصیت کا تصور ابھرا مگر جب انہوں نے ریٹائرڈ نرس کہا تو خیال آیا کہ شاید چالیس پینتالیس سال کی ہوں اور کسی وجہ سے کام کرنا چھوڑ دیا ہو۔ پھر بھی یہ تعجب ضرور تھا کہ ابھی تک مس کیوں ہیں۔ شادی کیوں نہیں کی۔ لیکن جب ان سے ملاقات ہوئی تو تمام اندازے غلط ثابت ہوئے۔ خود ان کے بقول وہ زندگی کے اٹھاون بہار و خزاں دیکھ چکی تھیں۔ اب سے پینتیس سال پہلے انگلینڈ آئی تھیں۔ اپنے وطن میں اور پھر لندن میں بھی کئی اچھے گھرانوں سے رشتے آئے مگر انہوں نے زندگی دکھی انسانیت کی خدمت میں گزارنے کا فیصلہ کرلیا تھا چنانچہ شادی نہیں کی۔ والد کے ساتھ آئی تھیں۔ جو ایک کامیاب بیرسٹر تھے۔ تقریباً چار سال پہلے ان کا انتقال ہوگیا۔ تب سے تنہا زندگی گزار رہی ہیں۔

بیماری کے دوران دن میں دو تین مرتبہ ضرور ملاقات ہوتی رہی۔ کبھی میں کوئی بات پوچھنے ان کے پاس چلی جاتی تھی اور کبھی وہ مجھے دیکھنے ہمارے فلیٹ میں آجاتی تھیں۔ اس عمر میں بھی بڑی دلکش شخصیت کی مالک تھیں۔ سرخ و سفید رنگ، لمبی قامت، چھریرا جسم۔ اگرچہ چہرے پر جھریاں پڑنے لگی تھیں مگر خدوخال کی موزونیت سے اندازہ ہوتا تھا کہ اپنی جوانی میں بے حد حسین رہی ہوں گی۔ مزاج میں بے حد سادگی، خلوص، ہمدردی، تحمل اور بردباری تھی۔ باتوں میں جاذبیت اور کچھ ایسی دلکشی تھی کہ ملنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔ ان تمام باتوں کے ساتھ ان کے چہرے اور عمومی طرزِ عمل سے ایک نامعلوم سی یاسیت کا احساس ہوتا تھا۔ دو چار دن کی ملاقاتوں میں ہی میرے دل میں ان کے لیے بے حد عقیدت و احترام پیدا ہوگیا اور نامعلوم کیوں وہ بھی مجھ سے غیر معمولی انسیت اور اپنایت کا برتاؤ کرنے لگیں۔ تب نہ انہیں معلوم تھا اور نہ مجھے کہ اس یگانگت کے پس پردہ کوئی ایسا جذباتی تعلق بھی ہوسکتا ہے جو برسوں پہلے ماضی کی یادوں میں کہیں گم ہوچکا ہے۔

ان کے بارے میں مختلف لوگوں سے مختلف باتیں سننے میں آئیں جنہیں سننے کے بعد سے تجسس اتنا بڑھ گیا کہ ایک دن میں براہِ راست ان سے ان کی سابقہ زندگی کے بارے میں سوال کر بیٹھی۔ ظاہر ہے کہ اس کی ابتدا اسی سوال سے ہوئی تھی کہ انہوں نے شادی کیوں نہیں کی کہ زندگی کا یہ آخری دور۔ انہیں تنہائی میں گزارنا پڑ رہا ہے۔ جواب میں ان کے ہونٹوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ ابھری۔ وہ چند لمحے کچھ سوچتی رہیں اور پھر ایک گہری سانس لے کر بولیں۔

"گزشتہ برسوں میں میرے قریب ترین دوستوں نے نہ جانے کتنی بار مجھ سے یہی سوال کیا مگر میں یا تو بات ٹال گئی یا مبہم سا جواب دے کر انہیں خاموش کردیا۔ لیکن خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ تم سے مل کر نہ جانے کیوں اس قدر اپنے پن کا احساس پیدا ہوا کہ میں تمہیں اپنی بیٹی کی طرح سمجھنے لگی۔ پھر کچھ ایسا بھی لگ رہا ہے کہ اب شاید زندگی میں کسی دوسرے فرد سے اتنی قربت کا احساس اجاگر نہ ہو کہ دل بے اختیار خود اس سے اپنی بات کہہ کر مدتوں کی گھٹن دور کرنا چاہے۔ اپنا دکھ درد بانٹنے کی آرزو کرے اور اس بوجھ سے آزاد ہونا چاہے جو ایک طویل عرصے سے میرے دل و دماغ پر حاوی ہے۔"

اس کے بعد انہوں نے مجھے اپنی زندگی کی کہانی سنائی۔ اگرچہ افراد و مقامات کے بارے میں پھر بھی اتنی راز داری رکھی کہ میں اس داستان کے حقیقی افراد سے انجان رہی۔ تب میرا کوئی ارادہ کیا خیال تک نہیں تھا کہ میں کبھی اس سچی کہانی کو قلم بند بھی کروں گی۔ میں مزید کچھ روز قیام کے بعد اپنے وطن واپس آگئی۔ میں انہیں آنٹی سائرہ کہنے لگی تھی۔ واپسی کے بعد آنٹی سائرہ کے دو تین خط بھی ملے۔ جن کا جواب میں نے دیا پھر تقریباً سال بھر کے بعد لندن والی میزبان کا ایک خط موصول ہوا جس سے یہ دکھ بھری خبر معلوم ہوئی کہ ایک رات سوتے ہوئے آنٹی سائرہ چپ چاپ اسی طرح دوسری دنیا کو روانہ ہوگئیں جس طرح خاموشی سے انہوں نے اپنا وطن چھوڑا تھا۔ اس حادثہ کو بھی تین چار برس بیت گئے کہ ایک دن اچانک میرے ابو دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔ امی میری شادی کے کچھ عرصہ بعد ہی رخصت ہوچکی تھیں۔ مجھے ابو کی وفات کا بے حد صدمہ ہوا۔ ان کی یاد سے دل بہلانے کے لیے ایک روز میں ان کی پرائیوٹ الماری میں رکھے ہوئے کاغذات ڈائریاں اور یادداشتیں دیکھ رہی تھی کہ دفعتاً ایک ڈائری سے مجھے کئی چونکا دینے والے حقائق ملے تب پہلی مرتبہ مجھے یہ خیال آیا کہ آنٹی سائرہ نے جو اپنی زندگی کی کہانی مجھے سنائی تھی وہ کئی پہلوؤں کی وجہ سے ایسی ہے کہ ایک سبق آموز داستان کی حیثیت سے سرگزشت کے قارئین کی خدمت میں پیش کی جاسکتی ہے۔

چنانچہ اب میں وہ سچی کہانی سپردِ قلم کررہی ہوں۔ میں اس داستان کا کردار نہیں ہوں اس لیے اسے آپ بیتی کے انداز میں تحریر نہیں کرسکتی۔ آنٹی سائرہ نے یہ مجھے سنائی ضرور تھی لیکن واقعات کی نوعیت کے اعتبار سے میں راوی کی حیثیت بھی اختیار نہیں کرسکتی۔ اس لیے میں نے اسے ایسے سیدھے سادے سے انداز میں لکھنے کی کوشش کی ہے جس سے واقعات کی ترتیب بھی نہ بدلے اور میں ان تمام حالات کو قارئین تک پہنچا بھی دوں جو آنٹی سائرہ کی زبانی مجھے معلوم ہوئے تھے۔ آغاز کرنے سے پہلے یہ بتادینا ضروری ہے کہ یہ واقعات کم و بیش چالیس پینتالیس سال قبل وقوع پذیر ہوئے اس لیے پڑھتے وقت اس زمانے کے ماحول اور عام معاشرتی حالات کو بھی پیشِ نظر رکھنے گا۔

☆☆☆

ظہیر احمد اور برکت اللہ اپنے زمانۂ طالب علمی سے ہی اتنے گہرے اور قریبی دوست تھے کہ ان پر بجا طور سے ایک جان دو قالب کا محاورہ صادق آتا تھا۔ اگرچہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد حالات نے دونوں کو الگ الگ ذریعۂ معاش سے وابستہ کردیا تھا۔ مگر اس کے باوجود ان کے باہمی تعلقات بدستور قائم رہے۔ ظہیر احمد کے خاندان کے بیشتر افراد کسی نہ کسی سروس اور ملازمت سے وابستہ تھے اس لیے انہوں نے بھی ایک سرکاری ادارے میں سروس کرلی۔ برکت اللہ کے والد کپڑے کی تجارت کرتے تھے۔ بیٹا جوان اور تعلیم سے فارغ ہوا تو انہوں نے رفتہ رفتہ اپنا کاروبار اس کے حوالے کردیا اور خود عملی زندگی سے تقریباً ریٹائر ہوگئے۔ مناسب وقت آنے پر یکے بعد دیگرے دونوں کی شادیاں بھی ہوگئیں۔ ظہیر احمد کو خدا نے دو بیٹے اور دو ہی بیٹیاں عطا کیں۔ برکت اللہ کے یہاں بھی چار ہی بچے ہوئے مگر ان میں صرف ایک بیٹا اور تین بیٹیاں تھیں اور یہ بیٹا بھی بڑی منتوں اور مرادوں سے تین لڑکیوں کے بعد پیدا ہوا تھا۔ تعلقات کو رشتے داری میں بدلنے کے لیے ظہیر احمد نے اپنے بڑے بیٹے منیر احمد کی شادی برکت اللہ کی دوسری بیٹی حمیرا سے کرنے کا فیصلہ کیا جسے برکت اللہ نے بڑی خوشی سے منظور کرلیا۔ یہ بات اگرچہ حمیرا کی پیدائش سے سال بھر کے اندر ہی طے ہوگئی تھی۔ تب منیر کی عمر تقریباً چھ سال تھی۔ لیکن باقاعدہ منگنی کی رسم اس وقت ادا کی گئی جب منیر نے میٹرک کا امتحان پاس کرلیا۔ اس وقت منیر کی عمر سترہ برس تھی اور حمیرا صرف بارہ سال کی تھی۔ دونوں خاندانوں میں بہت قریبی تعلقات تھے آنا جانا تھا۔ لیکن چونکہ منیر اور حمیرا کے بارے میں ایک فیصلہ کیا چکا تھا۔ اس لیے بچپن سے ہی سے احتیاط کی گئی کہ ان کا عام طور پر ایک دوسرے سے آمنا سامنا نہ ہو۔ پھر منگنی کے بعد تو باقاعدہ پردہ کرادیا گیا۔

منیر انجینئر بننا چاہتا تھا۔ منگنی کے وقت عمر کے ساتھ اس کے خیالات بھی ناپختہ تھے۔ اس نے والدین کے اس فیصلے کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی اور پوری یکسوئی کے ساتھ اپنی تعلیم میں مصروف رہا۔ لڑکوں کے معاملے میں ایسی باتوں کا چرچا بھی زیادہ نہیں ہوتا۔ اور کبھی گھر میں کوئی ذکر ہوتا بھی ہے تو وہ اسے سننے کے لیے عموماً موجود بھی نہیں ہوتے۔ جبکہ لڑکیوں کے سلسلے میں کسی نہ کسی بہانے اگر روز نہیں تو ہفتہ عشرے میں ایک دو بار ضرور ایسا ذکر چھڑتا رہتا ہے۔ یہ ہی وجہ ہوتی ہے کہ شادی ہونے تک لڑکیاں جس حد تک جذباتی طور پر اپنے منگیتر سے خود کو وابستہ کرلیتی ہیں لڑکے عام طور پر اس جذباتی اپنائیت کے نقطۂ عروج پر نہیں پہنچتے۔

حمیرا نے بی اے پاس کیا تو منیر مکینیکل میں انجینئرنگ کی ڈگری لے کر ایک بڑی کمپنی میں ملازم بھی ہوچکا تھا۔ دونوں جانب سے اس بات کا انتظار کیا جارہا تھا کہ حمیرا گریجویشن کرلے تو شادی کی تاریخ مقرر کردی جائے۔ اس زمانے میں لڑکیوں کی تعلیم کا چرچا اتنا عام نہیں تھا اس لیے برکت اللہ تو بیٹی کو میٹرک سے زیادہ پڑھانا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن منیر نے یہ شرط عائد کردی کہ وہ بی اے پاس سے کم تعلیم یافتہ لڑکی سے شادی نہیں کرے گا۔ تب بھی اس نے حمیرا سے اپنی شادی کے بارے میں زیادہ سنجیدگی سے نہیں

سوچا تھا اور نہ ہی اس کے خیالات وجذبات میں کوئی ایسا تغیر آیا تھا جس کا اظہار بعد میں ہوا۔ ظہیر صاحب کے کانوں تک بیٹے کی یہ بات پہنچی تو انہوں نے اپنے دوست پر زور دیا کہ وہ حمیرا کو کالج کی تعلیم بھی ضرور دلائیں۔ یوں حمیرا اپنے خاندان میں واحد لڑکی بن گئی جو اسکول سے نکل کر کالج تک پہنچی ہو۔ مگر اس کی پرورش تو اسی ماحول میں ہوئی تھی جہاں لڑکیاں کسی سے منسوب ہوجانے کے بعد سے دن و رات بس اسی کے خواب دیکھتی ہیں۔ اس نے دو تین مرتبہ پردے کی اوٹ سے منیر کو دیکھا تھا اور وہ اسے پہلے سے موجود جذباتی وابستگی کے سبب بیحد پسند آیا تھا۔ یوں تو بارہ سال کی عمر سے وہ اس کے نام سے خود کو وابستہ سنتی چلی آرہی تھی مگر میٹرک اور پھر کالج کی تعلیم مکمل کرنے تک اس کی پسندیدگی ایک شدید چاہت میں تبدیل ہوگئی تھی۔

دوسری طرف منیر نے ملازمت ملنے کے بعد پہلی مرتبہ سنجیدگی سے رفیقۂ حیات کے بارے میں اس وقت سے سوچنا شروع کیا جب اس نے اپنی کمپنی کے شعبۂ پبلک ریلیشن میں ایک حسین لڑکی سائرہ کو کام کرتے دیکھا۔ اس نے اب تک کبھی حمیرا کو نہیں دیکھا تھا۔ اور اگر بچپن یا لڑکپن میں کبھی دیکھا بھی ہو تو اب اس کی یادداشت میں اس کے خدوخال محفوظ نہیں تھے۔ کیمرے اور فوٹو اس زمانے میں اتنے رائج نہیں ہوئے تھے کہ گھروں میں تصویریں اتروانا ایک عام سی روزمرہ کی بات ہوتی بلکہ جن گھرانوں کے لڑکوں کو کیمرے کا شوق بھی تھا ان کو بھی تاکید کی جاتی تھی کہ وہ رشتے دار خواتین خاص طور پر لڑکیوں کے فوٹو نہ اتاریں۔ یوں کبھی منیر کو حمیرا کی کوئی تصویر بھی دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اگر یہ موقع ملا ہوتا تو ممکن تھا کہ بعد میں پیش آنے والے حالات کی نوعیت دوسری ہوتی۔ کیونکہ حمیرا حسن صورت وسیرت میں اگر ہزاروں میں نہیں تو سیکڑوں میں ضرور ممتاز تھی کم سے کم اس کے اپنے خاندان میں اس جیسی کوئی دوسری لڑکی نہیں تھی۔ خود اس کی دو بہنیں بھی خوبصورت ہونے کے باوجود اس کے مقابلے میں کم تر معلوم ہوتی تھیں۔

دوسری جانب دفتر میں منیر اور سائرہ گزرتے دنوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ قریب آرہے تھے۔ ابتدا رسمی تعارف سے ہوئی تھی اور کئی ماہ تک صرف سلام ودعا کا سلسلہ ہی چلتا رہا۔ پھر کمپنی میں ایک پارٹی کے موقع پر دونوں کی ذرا کچھ زیادہ بے تکلفانہ ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد سلام کے ساتھ کلام بھی شروع ہوگیا۔ یہ دور بھی آہستہ خرامی مگر ابط میں روز افزوں گہرائی کے ساتھ کئی ماہ چلتا رہا۔

پھر ایک دن ایسا اتفاق پیش آیا کہ شہر میں ٹرانسپورٹ کی ہڑتال ہوگئی۔ منیر اپنی موٹر سائیکل پر دفتر آتا جاتا تھا۔ اس نے چھٹی کے بعد سائرہ کو مین روڈ پر کسی سواری کی تلاش میں پریشان دیکھا تو لفٹ کی پیشکش کردی جو کسی قدر ہچکچاہٹ کے بعد سائرہ نے مان لی۔ یوں ان کے تعلقات تیسرے مرحلے میں داخل ہوئے۔ جس کے بعد وہ گاہے گاہے دفتر کے ٹائم کے بعد یا چھٹیوں کے دنوں میں ایک دوسرے سے ملنے لگے۔ فطری طور پر ایک دوسرے کے لیے پسندیدگی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ روز وشب بھی آئے جب الفاظ میں اپنے جذبات کا اظہار کیے بغیر دونوں ایک دوسرے کو اپنی زندگی کے ہمسفر کی حیثیت سے دیکھنے اور سوچنے لگے۔

یہ وہ وقت تھا جب دونوں گھروں میں منیر اور حمیرا کی شادی کا مسئلہ پوری سنجیدگی سے کوئی تاریخ طے کرنے کے خیال سے اٹھایا گیا۔ تب تک منیر حمیرا سے کسی نفرت کی وجہ سے نہیں بلکہ سائرہ سے اپنی وابستگی کے باعث اس شادی کے خلاف ہوچکا تھا۔ اس نے اپنی ماں سے بات کی کہ شادی زندگی کا اہم ترین فیصلہ ہے جس میں والدین کو اپنے بچوں کی پسند اور ناپسند کا خیال بھی رکھنا چاہیے۔ اسے یہ رشتہ پسند نہیں ہے۔ بلکہ ابھی وہ شادی کرنا ہی نہیں چاہتا۔ اس لیے منگنی ختم کردی جائے تاکہ دونوں گھر کسی دوسرے رشتے کو قبول یا مسترد کرنے کے لیے آزاد ہوجائیں۔ پھر جب وہ شادی کرنا چاہے گا اپنے والدین کو بتادے گا۔ تب تک حمیرا کی شادی نہ ہو تو بیشک فریقین دوبارہ اس معاملے پر غور کرلیں اور جہاں اپنے بچوں کی رضامندی پائیں ان کی شادی کردیں۔

اس انکار نے دونوں گھروں میں ایک ہلچل پیدا کردی۔ خاص طور سے ظہیر احمد بہت ہی برافروختہ ہوئے۔ انہوں نے اپنا فیصلہ سنادیا کہ وہ برسوں پہلے اپنے دوست کو زبان دے چکے ہیں کہ حمیرا ان کے گھر میں بہو بن کر آئے گی۔ اس لیے اب وہ منیر کی ناتجربہ کار سوچ اور خام خیالی پر اس فیصلے کو تبدیل کرکے اپنے دوست کے سامنے شرمندہ ہونا نہیں چاہتے۔ منیر کو حمیرا سے ہی شادی کرنا پڑے گی اور آخر اسے اعتراض بھی ہے تو کیا ہے۔ خاندانی شرافت، شکل وصورت، اخلاق وسیرت اور سلیقہ شعاری میں حمیرا اپنی مثال آپ ہے۔ منیر کے لیے اس سے بہتر لڑکی نہیں مل سکتی۔

برکت اللہ..... لڑکی کے باپ تھے اور شاید ظہیر احمد سے زیادہ معاملہ فہم بھی کہ انہوں نے دل میں کوئی رنجش یا کدورت لائے بغیر ٹھنڈے دل ودماغ سے منیر کا انکار سنا اور اس ضمن میں اپنی تحقیر اور حمیرا کی آئندہ زندگی اثر پذیر ہونے کے اندیشے کے باوجود اپنے دوست کو سمجھانے کی کوشش کی کہ منیر کی خواہش کے خلاف کوئی فیصلہ کرنا سودمند نہ ہوگا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ بات ختم کردی جائے۔ انہوں نے یہ بھی اطمینان دلایا کہ وہ اس سلسلے میں اپنے دوست کو قصوروار نہیں سمجھتے اس لیے ان کے باہمی تعلقات حسب سابق ہی رہیں گے۔ مگر ظہیر احمد نے ان کے خیالات سے اتفاق نہیں کیا۔ ”نہیں بھائی منیر کی شادی ہوگی تو حمیرا سے ہی ہوگی۔“ انہوں نے پُرزور لہجے میں کہا۔ ”وہ ابھی ناتجربہ کار ہے اور اس حقیقت سے بالکل انجان ہے کہ ہم نے اس کے حق میں بہترین فیصلہ کیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اسے حمیرا جیسی لڑکی کبھی اور کہیں نہیں مل سکتی۔ والدین اپنی اولاد کے لیے جو بھی فیصلہ کرتے ہیں... بہت سوچ سمجھ کر کرتے ہیں۔ ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد کرتے ہیں۔ جبکہ نوجوان ذہن نہ اتنا پختہ ہوتا ہے اور نہ دور رس کہ تمام باتوں کا جائزہ لے سکے۔“

”لیکن جب وہ شادی سے انکار کررہا ہے تب آپ کیا کرسکتے ہیں۔“

”اول تو میں اسے انکار ہی نہیں سمجھتا۔ اس نے محض اپنے خیال کا اظہار کیا ہے۔“ ظہیر احمد نے کہا۔ ”وہ یہ حوصلہ نہیں کرسکتا کہ میرے کیے ہوئے فیصلے کو قبول کرنے سے انکار کردے۔“

”منیر تمہارے فیصلے سے بغاوت کی ہمت نہ بھی کرسکے تب بھی ایک طرح سے یہ شادی زبردستی کی شادی ہی ہوگی۔ کیا ایسی صورت میں شادی کے بعد وہ دونوں خوشگوار ازدواجی زندگی گزار سکیں گے۔“

”کیوں نہیں۔“

”مجھے اس میں شک ہے۔“

”جبکہ مجھے پورا یقین ہے۔ آخر منیر حمیرا کے بارے میں کیا جانتا ہے۔“ ظہیر احمد نے جواب دیا۔ ”اس نے تو شاید آج تک حمیرا کو دیکھا بھی نہیں ہوگا۔ جبکہ ہم دونوں کو بچپن سے دیکھتے چلے آرہے ہیں۔ یقین کرو منیر کا احتراز محض اس لیے ہے کہ وہ حمیرا کی خوبیوں سے بالکل انجان ہے۔ شادی کے بعد جب دونوں کو ایک ساتھ رہنے کا موقع ملے گا تب اسے اندازہ ہوگا کہ ہمارا یہ فیصلہ اس کے حق میں کتنا بہترین اور مفید ثابت ہورہا ہے۔“

”کیا حمیرا تمہاری بیٹی ہوتی اور منیر میرا بیٹا ہوتا تب بھی تمہارے خیالات یہی ہوتے۔“

”یقیناً۔ میں اب بھی حمیرا کو اپنی بیٹی سے کم عزیز نہیں رکھتا برکت اللہ۔“ ظہیر احمد نے بڑے وثوق سے کہا۔ ”اگر مجھے ذرا بھی شبہ ہوتا کہ شادی کے بعد منیر حمیرا کی خوبیوں سے متاثر ہوکر اسے دل وجان سے قبول نہیں کرے گا تو میں ہرگز اتنا زور نہیں دیتا۔ ساری بات تو یہی ہے کہ منیر کو معلوم ہی نہیں کہ وہ کس بیش بہا نعمت سے منہ موڑ رہا ہے۔“

”تمہارا اندازہ غلط بھی تو ہوسکتا ہے۔“

”دیکھو بھائی۔“ دفعتاً ظہیر احمد سنجیدگی سے بولے۔ ”اگر منیر کے ناعاقبت اندیشانہ اظہار خیال سے حمیرا کا ردِعمل کچھ اور ہو تب تو میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔ مگر تم اس کی رائے بھی معلوم کرنے کی کوشش کرو۔ اگر اسے کوئی اعتراض نہ ہو تو میں یہی کہوں گا کہ تم بھی دل میں کوئی خدشہ مت لاؤ۔ مجھے یقین ہے کہ خدا نے چاہا تو یہ تعلق بہت مبارک ثابت ہوگا۔“

حمیرا کے کانوں تک بھی منیر کے خیالات پہنچ چکے تھے۔ قدرتی طور پر اسے دکھ ہوا تھا۔ لیکن وہ اس سے اپنی تصوراتی اور جذباتی وابستگی میں اس حد تک آگے جاچکی تھی جہاں سے واپسی ناممکن محسوس ہوتی تھی۔ پھر ظہیر احمد صاحب کی طرح اسے بھی خود پر اتنا اعتماد تھا کہ وہ پورے یقین سے سمجھتی تھی کہ اپنی محبت اور خدمت سے وہ اپنے خوابوں کے روٹھے ہوئے شہزادے کو منالے گی۔ بات جب اس کے خیالات معلوم کرنے تک پہنچی تو اس نے اپنی قریبی سہیلیوں کو بتایا کہ وہ منیر سے الگ ہوکر اپنی آئندہ زندگی کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔ اگر تقدیر میں ان دونوں کا ساتھ نہیں لکھا ہے تو وہ قسمت کا مقابلہ تو نہیں کرسکتی مگر منیر کے بعد کوئی اور اس کی زندگی کا شریک نہیں بن سکے گا۔ وہ ساری عمر شادی نہیں کرے گی۔ والدین نے زبردستی کی تو ممکن ہے وہ اسے کسی اور کے ساتھ ڈولی میں بٹھا کر رخصت کردیں۔ لیکن ڈولی میں وہ نہیں اس کی زندہ لاش اس گھر سے نکلے گی۔

سہیلیوں نے یہ بات برکت اللہ صاحب اور ان کی بیگم تک پہنچائی تب پہلی مرتبہ انہیں اس غلطی کا احساس

ہوا کہ بچوں کی نسبت بچپن میں ہی طے کر دینا اچھا نہیں ہوتا۔ اسی طرح طویل مدت تک رہنے والی منگنی کے بھی دور رس نتائج نکل سکتے ہیں۔ خود انہوں نے ہی حمیرا کے ذہن کی سادہ سلیٹ پر منیر کا نام لکھنے میں اس کی مدد کی اب اگر یہ نام اس کے دل و دماغ میں نقش ہو چکا ہے تو اسے کھرچنا اور مٹانا اتنا آسان نہیں جتنا وہ خیال کر رہے تھے۔ برکت اللہ صاحب ایک بار پھر اپنے دوست سے ملے۔ وہ صاف صاف تو اپنی بیٹی کے خیالات کا اظہار نہیں کر سکے مگر یہ کہے بغیر چارہ بھی نہ تھا کہ اگر کسی طرح بھی منیر سے شادی ہو جاتی ہے تو حمیرا کو اب بھی یہ رشتہ منظور ہے۔

''لیکن ایک باپ کی حیثیت سے میں اپنی بیٹی کے مستقبل کے تحفظ کی ضمانت چاہتا ہوں۔'' انہوں نے آخر میں کہا۔ ''خدا کرے کہ تمہاری توقعات پوری ہوں اور شادی کے بعد منیر حمیرا کو پسند کرنے لگے لیکن بالفرض ایسا نہ ہو سکا تب کیا ہوگا۔''

''میں یہ گارنٹی اور ضمانت دینے کے لیے تیار ہوں۔'' ظہیر احمد نے جواب دیا۔ ''جتنا چاہو مہر مقرر کرو کوئی مکان یا ماہانہ جیب خرچ حمیرا کے نام لکھوانا چاہو تو میں اس کے لیے بھی آمادہ ہوں۔''

مقررہ تاریخ اور وقت پر منیر اور حمیرا کی شادی بخیر و خوبی انجام پائی۔ حمیرا اپنے ماں باپ کے گھر سے رخصت ہو کر سسرال آ گئی جہاں تمام مروجہ رسومات کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا گیا۔ بیگم ظہیر بھی اس شادی سے بیحد خوش تھیں۔ جب سے بزرگوں کے درمیان سے نسبت طے ہوئی تھی تب ہی سے وہ حمیرا سے اپنی بیٹی کی طرح محبت کرنے لگی تھیں۔ پھر کچھ حمیرا کی اپنی ذاتی خوبیاں بھی ایسی تھیں کہ جو بھی ایک بار اس سے مل لیتا تھا اسے پسند کیے بغیر نہیں رہتا تھا۔ اس لیے بیگم ظہیر بھی اپنے شوہر کے اس یقین و اعتماد میں شریک تھیں کہ منیر نے چونکہ حمیرا کو نہیں دیکھا ہے اس لیے شادی پر آمادہ نہیں ہے۔ پھر جب دونوں کو ایک ساتھ زندگی گزارنے کا موقع ملے گا تو حمیرا کے حسن صورت و سیرت کا جادو خود منیر کو مسخر کر لے گا۔ انہیں وہم و گمان تک نہیں تھا کہ جب اپنے والد کے مجبور کرنے پر منیر نے شادی کی ہامی بھری تھی تب ہی اس نے دل ہی دل میں ایک ایسا فیصلہ کر لیا تھا جس میں ان دونوں کے درمیان کوئی رابطہ قائم ہونا انتہائی مشکل بلکہ ناممکن ہو جائے گا۔

شادی کی رات جب منیر اس کمرے میں داخل ہوا جسے حجلہ عروسی قرار دیا گیا تھا تو اس نے مسہری پر گھونگھٹ نکالے، سر جھکائے بیٹھی حمیرا کے قریب آ کر سپاٹ لہجے میں کہا۔

''آپ کو معلوم ہو یا نہ ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ شادی میرے والدین کے اصرار اور دباؤ سے ہوئی ہے۔ اس میں میری خواہش اور میری مرضی کا قطعاً کوئی دخل نہیں ہے۔ ذاتی طور پر مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں کیونکہ جس جبر کے سامنے میں سر جھکانے پر مجبور ہو گیا اس میں آپ سے بغاوت کی توقع کرنا بیکار تھا۔ میرے دل میں آپ کے لیے کوئی جذبہ نہیں ہے نہ نفرت نہ محبت اگر کچھ ہے بھی تو رحم اور ہمدردی کا ہے کہ والدین کی ضد نے آپ کو ایسی کڑی آزمائش میں ڈال دیا ہے جس میں کامیابی کی کوئی امید نہیں ہے میرے ماں باپ آپ کو بیاہ کر لائے ہیں۔ اس لیے میرا آپ سے کوئی تعلق نہ اب ہے نہ آئندہ ہوگا۔ اب اس گھر میں آپ کو آرام ملے یا کوئی تکلیف پہنچے تو آپ ان سے ہی رجوع کریں جو آپ کو یہاں لانے کے ذمہ دار ہیں۔ ممکن ہے میرا طرز عمل بھی آپ کے لیے رنج کا باعث بنے۔ لیکن اس میں میرا قصور نہیں ہوگا کیونکہ میں نے اس رشتے کو دل سے قبول ہی نہیں کیا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ میرا کوئی کام انجام دیں یا میرے سامنے آئیں۔ جس دن ایسا ہوا میں یہ گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ بس مجھے اتنا ہی کہنا تھا۔ میں دوسرے کمرے میں سونے جا رہا ہوں۔ یہ کمرا صرف آپ کا ہے اور آپ آزاد ہیں کہ یہاں جو چاہیں کریں۔''

ان الفاظ کے ساتھ ہی منیر حمیرا کے کسی جواب یا ردعمل کا انتظار کیے بغیر ملحقہ کمرے میں چلا گیا جو دراصل اسی کا کمرا تھا۔ مگر چونکہ نسبتاً چھوٹا تھا اور جہیز سے ملنے والا سامان مثلاً پلنگ الماری سنگھار میز وغیرہ آسانی اور گنجائش کے ساتھ اس کمرے میں نہیں آ سکتا تھا اس لیے منیر کی والدہ نے شادی کے بعد اس کے برابر والے کمرے کو دولہا دلہن کا مشترکہ کمرا بنا دیا تھا۔ تب انہیں کیا معلوم تھا کہ ان کے کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ وہ کمرا منیر اور حمیرا کا نہیں بلکہ صرف حمیرا کا کمرا بن کر رہ جائے گا۔

☆☆☆

شب عروسی کس طرح گزری اس کا اندازہ گھر والوں کو دوسری صبح ہی ہو گیا تھا۔ جس پر فطری بات تھی کہ منیر کی والدہ اور ظہیر احمد صاحب کو بیحد تکلیف پہنچی۔ منیر کی والدہ نے اس کے کمرے میں جا کر اسے سمجھانا بھی چاہا لیکن منیر



نے انہیں زیادہ بولنے کا موقع نہیں دیا۔

''یہ شادی میری نہیں آپ کی مرضی سے ہوئی ہے۔'' وہ بولا۔ ''آپ لوگوں نے اپنی ضد پوری کر لی اور میں آپ کے حکم کی آخری حد تھی۔ میں نے جس رشتے کو دل سے قبول ہی نہیں کیا اس سے کوئی تعلق رکھوں نہ رکھوں یہ میری مرضی ہے اور میرا فیصلہ یہ ہے کہ حمیرا آپ کی بہو تو ہو سکتی ہے میری بیوی نہیں ہو سکتی۔ وہ اس گھر میں رہے مجھے کوئی اعتراض نہیں کیونکہ یہ گھر آپ کا ہے لیکن اگر اس نے از خود یا آپ کے اشارے پر میرے معمولات میں دخل دینے یا میرے سامنے آنے یا مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی تو میں گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ یہ میرا فیصلہ ہے جس پر عمل کرنے کا میں تہیہ کر چکا ہوں۔''

منیر کی والدہ جواب میں کیا کہتیں۔ خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئیں اور جا کر ظہیر احمد صاحب کو بتایا کہ آپ کا بیٹا حمیرا سے کوئی تعلق رکھنا تو درکنار ہے اس سے بات کرنے یا اس کی صورت دیکھنے کا بھی روادار نہیں ہے۔ اس نئی صورت حال سے گھر کے سب ہی افراد کو افسوس ہونا لازمی تھا۔ مگر وہ ہستی جس سے اس معاملے کا براہ راست تعلق تھا، گزشتہ شب کچھ دیر آنسو بہانے کے بعد یہ سوچ کر اپنی تقدیر پر شاکر ہو چکی تھی کہ اگر اپنے شوہر کے لیے اس کے دل میں سچی محبت و عقیدت موجود ہے تو ایک نہ ایک دن وہ ضرور اس کے دل میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہو جائے گی۔ اس لیے جب منیر کی والدہ نے بیٹے کے رویے پر معذرت چاہتے ہوئے اسے سمجھانے کی کوشش کی تو اس نے فوراً جواب دیا۔

''امی جان آپ میری جانب سے بالکل پریشان نہ ہوں۔ مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ وہ مجھے چاہے کچھ سمجھیں یا نہ سمجھیں مگر اب میرا مستقبل ان ہی سے وابستہ ہے۔ میں کوشش کروں گی کہ مجھ سے ان کی مرضی کے خلاف کوئی بات سرزد نہ ہو۔ باقی رہا باہمی تعلق تو سب کچھ قسمت سے ملتا ہے۔ اگر میرے نصیب میں شوہر کا پیار ہوگا تو ایک نہ ایک دن ضرور مل کر رہے گا۔ آپ ان سے میرے سلسلے میں کوئی بات نہ کریں۔ وہ جو چاہیں انہیں کرنے دیں۔ میں انتظار کر لوں گی۔ مجھے انتظار کرنے کی عادت ہے۔''

منیر کی والدہ اور حمیرا کی اس گفتگو سے جہاں کچھ تسلی ہوئی وہیں اس پر بے اختیار پیار بھی آیا اور انہوں نے دل کی گہرائیوں سے دعا کی کہ پروردگار اس معصوم اور محبت کرنے والی لڑکی کو کسی کڑی آزمائش میں نہ ڈالنا۔ وہ دعائیں دیتے ہوئے چلی گئیں۔ یہ بھی طے ہوا کہ یہ بات گھر ہی تک رہے تو زیادہ بہتر ہے۔ چنانچہ دس گیارہ بجے کے قریب حمیرا کا بھائی اور بہن اسے لینے کے لیے آئے تو حسب دستور اسے بھیج دیا گیا۔ رات کو ولیمہ کی تقریب ہوئی جس کے بعد حمیرا پھر سسرال آ گئی۔ غنیمت تھا کہ منیر نے دعوت میں اپنے سسرالی

## برجستگی

تیمور لنگ نے سمرقند فتح کیا تو مال غنیمت میں کچھ خواتین بھی ہاتھ آئیں۔ ان میں ایک اندھی عورت بھی تھی۔ جب اسے تیمور کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے پوچھا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

''دولت'' عورت نے جواب دیا۔

تیمور ہنس کر بولا۔ ''دولت اندھی بھی ہوتی ہے کیا؟''

عورت نے برجستہ جواب دیا۔ ''اگر دولت اندھی نہ ہوتی تو لنگڑے کے گھر کیوں آتی؟''

## خودکش

☆خودکش حملہ آور کو اس کے کمانڈر نے بم باندھ کر خودکش حملے کے لیے روانہ کیا۔ نوجوان نے جانے سے پہلے پوچھا۔

''سر یہ خودکش حملہ کیا ہوتا ہے؟''

''اس حملے میں خود کو ہلاک کرنا پڑتا ہے۔'' کمانڈر بولا۔

نوجوان روانہ ہوا۔ دو گھنٹے بعد اس نے کمانڈر کو فون کیا۔

''سر میں اس جگہ موجود ہوں جہاں دس آدمی ہیں۔''

کمانڈر نے کہا۔ ''نہیں...... اس سے زیادہ رش والی جگہ پر جاؤ۔''

آدھے گھنٹے بعد نوجوان نے فون کیا۔ ''یہاں پچاس آدمی ہیں۔''

کمانڈر نے کہا۔ ''ٹھیک ہے حملہ کر دو۔''

یہ سنتے ہی نوجوان نے نعرہ بلند کیا اور چاقو اپنے پیٹ میں گھونپ لیا۔

رضا علی، ملتان

عزیزوں اور دوسروں کے ساتھ مناسب رویہ رکھا۔ اور وہ لوگ کچھ بھی اندازہ نہیں کر سکے کہ حمیرا پر اس کی سسرال میں کیا گزر رہی ہے۔

دوسری رات بھی پہلی سے کچھ مختلف نہ تھی۔ منیر اپنے کمرے میں جا کر سو گیا اور اگلی صبح ناشتا کیے بغیر دفتر چلا گیا۔ پھر رات کو گیارہ بجے کے بعد اس وقت واپس آیا جب اس کے اندازے کے مطابق گھر کے بیشتر افراد سو چکے تھے۔ دو تین دن یہی صورتِ حال رہی تو حمیرا کے کہنے پر منیر کی والدہ نے اس سے بات کی۔

"اگر تم یہ سب کچھ اس لیے کر رہے ہو کہ حمیرا پر تمہاری نگاہ نہ پڑ سکے تو اس کی ضرورت نہیں ہے۔" انہوں نے کہا۔ "تم اپنے معمول کے مطابق گھر میں رہو۔ ناشتا اور کھانا حسبِ معمول کھاؤ۔ میں حمیرا کی طرف سے وعدہ کرتی ہوں کہ وہ کبھی تمہارے سامنے آنے کی کوشش نہیں کرے گی۔"

"حمیرا کی طرف سے وعدہ...!" منیر نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں، تم سے یہ بات کہنے کے لیے خود اسی نے مجھے بھیجا ہے۔" منیر کی والدہ نے جواب دیا۔

اس کے بعد اگرچہ منیر کا طرزِ عمل کم و بیش حسبِ سابق ہو گیا مگر اس کی دانستہ کوشش یہی رہتی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ گھر سے باہر رہے تاکہ کبھی سوئے اتفاق سے بھی حمیرا اس کے سامنے نہ پڑ سکے۔ یوں عملاً ظہیر احمد اور بیگم ظہیر کی وہ توقع خواب و خیال ہی بن کر رہ گئی کہ اگر منیر نے حمیرا کو دیکھ لیا اور ان دونوں کو ساتھ رہنے کا موقع ملا تو وہ از خود حمیرا کو پسند کرنے لگے گا۔ کئی ہفتے...... اسی طرح گزر گئے تو ایک رات منیر کی والدہ نے اپنے شوہر سے کہا۔

"مجھے بے چاری حمیرا پر بے حد ترس اور رحم آتا ہے۔ شاید ہم نے اس کی زندگی برباد کر دی ہے۔"

"میں اب بھی یہ یقین رکھتا ہوں کہ اگر کسی وجہ سے منیر اور حمیرا کی ملاقات ہو جائے، وہ حمیرا کو دیکھ لے، اس سے بات کر لے تو اسے ضرور پسند کرنے لگے گا۔" ظہیر صاحب جواب دیا۔

"مگر ایسا کیسے ہو گا وہ تو حمیرا کی آواز تک سننے کا روادار نہیں ہے۔"

"میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"ہم یہ کہہ کر حمیرا کو اس کے میکے بھیج دیں کہ جب عملاً یہاں اس کے رہنے کا کوئی فائدہ ہی نہیں ہے بلکہ ایک طرح اس کی نقل و حرکت پر پابندی عائد ہے کہ وہ منیر کے سامنے نہ آئے تو اس کا اپنے والدین کے گھر چلے جانا ہی مناسب ہے۔ پھر دو چار دن یا ہفتہ بھر کے بعد تم اسے اپنی کسی سہیلی کی بیٹی کہہ کر واپس بلا لینا۔ تب تو منیر اس کے سامنے آنے سے نہیں کترائے گا۔"

"مگر اس کے یہاں رہنے کا بہانہ کیا ہو گا۔"

"کوئی بھی بات بنائی جا سکتی ہے۔" ظہیر صاحب نے جواب دیا۔ "مثلاً یہ کہ تمہاری سہیلی کا انتقال ہو گیا ہے اور چونکہ ماں کے انتقال کے بعد لڑکی بے سہارا رہ گئی تھی اس لیے تم نے اسے اپنی سرپرستی میں لے لیا ہے۔"

"جی نہیں، میں جیتے جی اس کی ماں کو نہیں مار سکتی۔"

"تب پھر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے ماں باپ حج کرنے گئے ہیں اور گھر یا خاندان میں کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہیں تھا اس لیے وہ حمیرا کو تمہارے سپرد کر گئے ہیں۔"

"مگر ایسی کوئی بات برکت اللہ بھائی کو اعتماد میں لیے بغیر کیسے ہو سکتی ہے۔"

"برکت کو میں سمجھا دوں گا۔" ظہیر صاحب نے کہا۔ "ویسے بھی ان لوگوں سے یہ بات کب تک چھپائی جا سکتی ہے۔ اب بھی وہ منیر کے طرزِ عمل سے کچھ نہ کچھ مشکوک ضرور ہو گئے ہوں گے۔ منیر ایک مرتبہ بھی اپنی سسرال نہیں گیا ہے۔ ہم مکمل رازداری کے لیے حمیرا کا نام بھی تبدیل کر کے نجمہ رکھ دیں گے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ حمیرا کو اس طرح چند روز بھی منیر کے سامنے آنے کا موقع مل جائے، وہ اسے اچھی طرح دیکھ لے، گھر میں اس کے طرزِ عمل کو جان لے تو پھر اسے بتایا جا سکتا ہے کہ یہی اس کی بیوی حمیرا ہے جس سے وہ بغیر کسی معقول وجہ کے کنارہ کش ہوتا رہا ہے۔"

☆☆☆

ظہیر صاحب کا اندازہ کم سے کم اس حد تک تو سو فیصد درست ثابت ہوا کہ منیر نے نجمہ کو بے حد پسند کیا۔ جب اسے معلوم ہو گیا کہ حمیرا کو اس کے والدین کے گھر بھیج دیا گیا ہے۔ تو وہ رفتہ رفتہ گھر آنے جانے اور رہنے میں اپنے معمول پر آ گیا۔ پھر ایک دن بیگم ظہیر نے یونہی تذکرتاً کہا کہ ان کی ایک عزیز سہیلی اپنے شوہر کے ساتھ مقاماتِ مقدسہ کی زیارت اور پھر وہاں سے فارغ ہو کر حج کرنے جا رہی ہیں۔ ان کی ایک ہی بیٹی ہے نجمہ۔ خرچ کی کمی اور کچھ دوسری وجوہات سے اسے ساتھ لے جانا ممکن نہیں ہے اس لیے وہ چند ماہ کے لیے نجمہ کو ہمارے گھر چھوڑنا چاہتی ہیں تو ظہیر صاحب نے فوراً آمادگی کا اظہار کر دیا... اور یوں حمیرا کے میکے جانے کے تقریباً دو ہفتے بعد نجمہ گھر میں آ گئی۔

گھر میں قدم رکھتے ہی نجمہ نے رفتہ رفتہ غیر محسوس طور پر انتظامی امور میں اس طرح مداخلت شروع کی کہ دو تین ہفتے کے بعد تقریباً تمام گھریلو معاملات اس کے ہاتھ میں آ گئے اور اس نے ہر کام میں ایسی بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا کہ منیر سمیت سب گھر والے اس کو پسند ہی نہیں بلکہ اس سے محبت کرنے لگے۔ منیر نے ایک طرح سے ماں باپ سمیت پورے گھر کو اپنے خلاف محاذ آرا خیال کر لیا تھا کیونکہ شادی کے مسئلے پر باری باری سب ہی نے اس سے بحث و تکرار کی تھی۔ اب نجمہ گھر میں آئی اور منیر نے ایک دو موضوعات پر اس سے بات کی تو اسے مزاجی طور پر بڑی ہم آہنگی کا احساس ہوا۔ کوئی بھی بات ہوتی تو نجمہ منیر کی رائے اور اس کے خیال کی تائید کرتی تھی۔ اس طرح منیر پورے گھر میں صرف اسی کو اپنا دوست اور ہمنوا خیال کرنے لگا۔

ادھر آفس میں منیر اور سائرہ کے باہمی تعلقات اس موڑ پر آ گئے تھے کہ پہلے اشاروں کنایوں اور پھر واضح الفاظ میں مستقل رفاقت کے موضوع پر گفتگو ہونے لگی۔ سائرہ نے منیر کو بتایا کہ وہ اپنے والد کے ساتھ تنہا رہتی ہے۔ ماں کا انتقال اس کے بچپن میں ہی ہو گیا تھا اور اس کے والد نے صرف اس کی محبت کی خاطر دوسری شادی نہیں کی، خاندان میں کچھ دور کے عزیز بیشک ہیں مگر ان سے یونہی رسمی نوعیت کے تعلقات ہیں اس لیے شادی کے سلسلے میں صرف اس کے والد کو ہی رضامند کرنا ہو گا۔ اور چونکہ وہ سائرہ سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ اب تک کبھی اس کی کسی خواہش اور کسی پسند کی مخالفت نہیں کی ہے۔ اس لیے ان کی طرف سے کسی مخالفت کا اندیشہ نہیں ہے۔ منیر کا ان سے صرف ایک بار ملنا ہی کافی ہو گا۔ دوسری جانب منیر کو اندازہ تھا کہ اگر اس نے اپنے گھر میں سائرہ سے دوسری شادی کرنے کا عندیہ بھی ظاہر کیا تو کسی بھی جانب سے اس کی حمایت نہیں کی جائے گی۔ اس لیے پیش بندی کے طور پر اس نے سائرہ کو یہی بتایا تھا کہ اس کے والدین چونکہ کسی دوسری جگہ اس کی شادی کرنا چاہتے ہیں اس لیے اس معاملے میں کوئی اس کی تائید نہیں کرے گا۔ مگر اسے اپنے گھر والوں کی مخالفت کی پروا نہیں ہے۔ وہ سائرہ کو اپنانے کے لیے ان سب کو چھوڑ سکتا ہے۔ البتہ اسے پوری امید ہے کہ ایک بار ان کی شادی

## راشد منہاس شہید

(1971-1951) نشانِ حیدر حاصل کرنے والے پائلٹ آفیسر۔ کراچی میں پیدا ہوئے۔ منہاس (رجپوت گوت) گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ 1968 میں سینٹ پیٹرک اسکول کراچی سے سینئر کیمبرج کیا۔ خاندان کے متعدد افراد پاکستان کی بری، بحری اور فضائی افواج میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ انہوں نے بھی اپنا آئیڈل فوجی زندگی ہی کو بنایا اور اپنے ماموں ونگ کمانڈر سعید سے جذباتی وابستگی کی بنا پر فضائیہ کا انتخاب کیا۔ تربیت کے لیے پہلے کوہاٹ اور پھر پاکستان ائر فورس اکیڈمی رسالپور بھیجے گئے۔ فروری 1971ء میں پشاور یونیورسٹی سے انگریزی، ائر فورس لا، ملٹری ہسٹری، الیکٹرونکس، موسمیات، جہاز رانی، ہوائی حرکیات وغیرہ میں بی ایس۔سی کیا۔ بعدازں مزید تربیت کے لیے کراچی بھیجے گئے اور اگست 1971ء میں پائلٹ آفیسر بن گئے۔

20 اگست 1971ء کو راشد کی دوسری تنہا پرواز تھی۔ وہ ٹرینر جیٹ طیارے میں سوار ہوئے ہی تھے کہ ان کا انسٹرکٹر سیفٹی فلائٹ آفیسر غدار مطیع الرحمن خطرے کا سگنل دے کر کاک پٹ میں داخل ہو گیا اور طیارے کا رخ بھارت کی سرحد کی طرف موڑ دیا۔ راشد نے ماری پور کنٹرول ٹاور سے رابطہ قائم کیا تو انہیں ہدایات دی گئی کہ طیارے کو ہر قیمت پر اغوا ہونے سے بچایا جائے۔ اگلے پانچ چھ منٹ راشد اور انسٹرکٹر کے درمیان کشمکش میں گزرے اور اسی کشمکش کے دوران طیارہ زمین پر گر کر تباہ ہو گیا۔ راشد نے شہادت کا درجہ پایا اور انہیں اس عظیم کارنامے کے صلے میں سب سے بڑا فوجی اعزاز نشانِ حیدر دیا گیا۔ مدفن کراچی میں ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی کے قبرستان میں ہے۔

مرسلہ: زاہد فاروق، کراچی

ہوجائے تو پھر کچھ ہی مدت میں اس کے ناراض والدین اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوجائیں گے اور یوں عارضی طور پر تعلقات ٹوٹے بھی تو ایک نہ ایک دن ضرور بحال ہوجائیں گے اور سائرہ کو خاندان کے فرد کی حیثیت سے قبول کرلیا جائے گا۔ اس لیے سائرہ اپنے والد کو صرف شادی کی اجازت دینے پر ہی آمادہ نہ کرے بلکہ اس صورتِ حال کو قبول کرنے کے لیے بھی آمادہ کرے کہ اگر شادی میں منیر کے والدین یا خاندان کا کوئی فرد شامل نہ ہو تو انہیں اس کا ملال نہیں ہوگا۔

بظاہر سائرہ کے لیے اس صورتِ حال سے نمٹنا خاصا مشکل معلوم ہوتا تھا۔ مگر پھر ایک دن اس نے منیر کو بتایا کہ وہ اس کے بارے میں اپنے والد سے پہلے ہی بات کرچکی تھی اور اب منیر کا... خاندانی پس منظر بتاتے ہوئے انہیں اس بات پر بھی آمادہ کرلیا ہے کہ وہ منیر کے عزیز و اقارب کی شرکت پر اصرار نہیں کریں گے مگر یہ کہ کوئی آخری فیصلہ کرنے سے قبل وہ منیر سے مل کر تفصیلی گفتگو کرنا ضروری خیال کرتے ہیں۔

اس مرحلے پر منیر کے ذہن میں پہلی مرتبہ یہ خیال پیدا ہوا کہ اس نے بیشک سائرہ کو اپنی پہلی شادی کے بارے میں لاعلم رکھا ہے۔ لیکن وہ ایک بیوی کی موجودگی میں اس سے شادی کرکے مزید بے وفائی اور فریب سے کام نہیں لے گا اور سائرہ سے شادی کرنے سے قبل حمیرا کو طلاق دے دے گا۔ اس نے یہ بھی ضروری سمجھا کہ سائرہ کے والد کے ملاقات کرنے سے قبل ہی اس معاملے میں یکسو ہوجائے تو بہتر ہے۔ اسے معلوم تھا کہ اعلانیہ طلاق ابھی سے پورے خاندان میں ایک ہنگامہ کھڑا کردے گی۔ اس لیے اس نے اپنے طور پر حمیرا کو طلاق دینے کا فیصلہ کرلیا۔ خواہ طلاق کا اعلان... بعد میں کیوں نہ ہو۔ اس طرح وہ کم سے کم اپنی حد تک تو مطمئن ہوگا کہ سائرہ سے شادی کرتے وقت وہ کسی دوسری لڑکی سے ایسے تعلق سے تو آزاد ہوگا۔ لیکن یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جس پر اسے کسی اچھے وکیل کے قانونی مشورے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

اب یہ حسنِ اتفاق ہی تھا کہ اس نے اس مسئلے پر جس وکیل سے مشورہ کرنے کا فیصلہ کیا ان کا نام غلام دستگیر تھا اور وہ سائرہ کے والد تھے۔ سائرہ ابھی تک کبھی منیر کو اپنے گھر لے کر نہیں گئی تھی نہ ہی اپنے والد کے نام یا پیشے کے بارے میں کچھ بتایا تھا اس لیے منیر کے پاس یہ جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ اپنے طور پر وہ جس کام کو پوشیدہ طور سے، اپنے والدین اور خود سائرہ سے بھی چھپا کر انجام دینا چاہتا ہے۔ غلام دستگیر صاحب سے مشورہ کرکے وہ کم سے کم سائرہ تک تو بات پہنچانے کا ذریعہ بن گیا۔

پہلی ملاقات میں غلام دستگیر صاحب کو بھی اندازہ نہیں ہوسکا کہ ان کا یہ نیا موکل جس طلاق کی بات کررہا ہے اس سے ان کا بھی کوئی بالواسطہ تعلق ہوسکتا ہے۔ تمام حالات سننے کے بعد انہوں نے جواب دیا کہ جب تک وہ شادی کے موقع پر دستخط کیے جانے والے کاغذات اور نکاح نامہ کا جائزہ نہیں لے لیتے کوئی مشورہ نہیں دے سکتے اس لیے منیر کے لیے ضروری ہے کہ اگلی ملاقات میں نکاح نامہ اور اگر کچھ دوسرے کاغذات ہوں تو وہ ساتھ لے کر آئے۔ شادی کے بعد ظہیر صاحب نے نکاح نامہ کی ایک نقل کے ساتھ ہی دوسرے ہونے والے معاہدے کی کاپی بھی منیر کے سپرد کردی تھی۔ نہ صرف اس خیال سے کہ کاغذات اسی کے پاس رہنا چاہئیں بلکہ اس خیال سے بھی کہ اگر کبھی منیر کوئی غلط قدم اٹھانے لگے تو اسے معلوم رہے کہ وہ محض اپنی مرضی سے اس تعلق کو ختم نہیں کرسکتا۔ منیر نے وہ کاغذات بیزاری کے ساتھ وصول کرکے اپنی الماری میں رکھ دیے تھے۔

اب غلام دستگیر صاحب نے انہیں دیکھنے کا مطالبہ کیا تو اس نے اسی سرسری انداز میں کاغذات الماری سے نکالے اور بغیر انہیں ایک نظر دیکھے دوسرے دن دستگیر صاحب کے سامنے پیش کردیے۔

غلام دستگیر صاحب نے تمام کاغذات بغور پڑھے۔

"معلوم ہوتا ہے کہ شادی سے قبل لڑکی والوں کو تمہاری جانب سے کسی ایسے ہی اقدام کا خطرہ تھا۔" وہ سنجیدگی سے بولے۔ "کہ انہوں نے نکاح سے قبل ہی اس کی پیش بندی کرلی۔"

"کیا مطلب۔" منیر چونکا۔

"اس معاہدے کی رو سے۔" دستگیر صاحب نے دستاویز دکھاتے ہوئے کہا۔ "تم نے اپنے طلاق کے حق کو اپنی بیوی کی رضامندی کے ساتھ مشروط کردیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں تم اسے تین بار نہیں تین ہزار بار بھی طلاق دو لیکن تمہاری بیوی اس سے متفق نہ ہو تو طلاق موثر نہیں ہوگی۔"

منیر سکتے میں رہ گیا۔ اس معاہدے پر اس کے والد نے اس سے دستخط کرائے تھے اور اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ اسے اس حد تک بے بس کرنے میں فریق بن سکتے ہیں۔



لیکن ظاہر ہوا کہ انہیں دوست کی بیٹی کا مفاد اپنے بیٹے کی خوشی سے زیادہ عزیز تھا۔

"پھر کیا اس معاہدے کا کوئی توڑ نہیں ہوسکتا۔" منیر نے بے بسی سے پوچھا۔

"نہیں۔"

"گویا میں اپنی بیوی سے کسی صورت میں نجات حاصل نہیں کرسکتا۔"

"کرسکتے ہو اگر اسے بھی قائل کرلو کہ ایک ایسے بے فائدہ رشتے میں بندھے رہنے سے خود اس کا مستقبل بھی تباہ ہوجائے گا۔" دستگیر صاحب نے جواب دیا۔ "میرا مشورہ ہے کہ تم طلاق نامہ کے ساتھ ہی اسے ایک خط بھی لکھو جس میں اسے سمجھاؤ کہ طلاق نامہ پر اپنی منظوری کے دستخط کرنے میں ہی اس کا فائدہ ہے۔ کیونکہ تم تو اس کی مرضی کے بغیر بھی دوسری شادی کرسکتے ہو مگر وہ تم سے آزاد ہوئے بغیر اپنی زندگی کا کوئی دوسرا راستہ منتخب نہیں کرسکتی۔ اگر وہ مان جائے تو بہتر ہے ورنہ ظاہر ہے کہ تم شوق سے دوسری شادی کرو وہ یا کوئی بھی قانون تمہیں اس اقدام سے نہیں روک سکتا۔ البتہ تمہیں خواہ اپنی مرضی سے یا مقدمہ بازی کے بعد اس کا نان و نفقہ لازماً ادا کرنا ہوگا۔"

☆☆☆

سائرہ نے غلام دستگیر صاحب کو منیر کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا۔ اس میں اس کے نام کے علاوہ اس کے والد کا نام اور ان کی معاشرتی پوزیشن کا ذکر بھی شامل تھا۔ کاغذات میں تمام تفصیل دیکھتے ہی غلام دستگیر صاحب کو کوئی شک نہ رہا کہ ان کی بیٹی نے جس منیر کا ذکر کیا تھا وہ یہ ہی منیر احمد ولد ظہیر احمد تھا۔ یہ ایسی بات نہیں تھی جسے وہ اپنی بیٹی سے چھپا سکتے۔ چنانچہ اسی شام کو انہوں نے سائرہ سے پوچھ لیا کہ آیا منیر نے اسے یہ بھی بتایا ہے یا نہیں کہ وہ پہلے سے شادی شدہ ہے۔ فطری طور پر سائرہ کو اس انکشاف سے رنج ہی نہیں ہوا بلکہ غصہ بھی آیا۔ منیر نے اپنی پہلی شادی کے بارے میں حقیقت چھپا کر اسے دھوکا دینے کی کوشش کی اور اس سے شادی کرنے کی خواہش کرکے وہ دہری ناانصافی کا مرتکب ہونے کی تیاری کررہا ہے۔ ایسی صورت میں سائرہ کا اس سے شادی کرنا اس کی پہلی بیوی سے ظلم کے مترادف ہوگا۔ اور وہ اس ظلم میں ہرگز منیر کی فریق نہیں بنے گی۔

☆☆☆

غلام دستگیر صاحب کے مشورے نے منیر کو ذہنی طور پر بے حد پریشان کردیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنی پریشانی کس سے بانٹے۔ کس سے اپنے دل کی بات کرے کس سے پوچھے کہ ان حالات میں اسے کیا کرنا چاہیے۔ اس کی اس کیفیت کو گھر میں سب نے محسوس کیا۔ سب نے ہی معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن منیر نے سب کو کوئی خاص بات نہیں کہہ کر ٹال دیا۔ مگر جب نجمہ نے اس سے پریشانی کی وجہ پوچھی تو وہ خاموش نہ رہ سکا۔

اس نے بتایا کہ والدین نے اس کی شادی زبردستی ایک لڑکی سے کردی جبکہ وہ کسی اور لڑکی کو پسند کرتا تھا۔ ماں باپ نے اس قدر دباؤ ڈالا کہ اسے مجبوراً جھکنا پڑا۔ پھر بھی اس نے انتقاماً اپنی بیوی سے کوئی تعلق نہیں رکھا۔ تب اسے یہ یقین نہیں تھا کہ جس لڑکی کو وہ پسند کرتا ہے آیا وہ بھی اسے چاہتی ہے یا نہیں مگر اب... دونوں ایک دوسرے کا ساتھی بننے کا وعدہ کرچکے ہیں۔ اس نے چاہا کہ دوسری شادی کرنے سے پہلے اپنی پہلی بیوی کو آزاد کردے تاکہ اس کی زندگی مزید برباد نہ ہو اور اگر وہ چاہے تو خود اپنے لیے بھی کوئی دوسرا ساتھی چن سکے مگر اب اسے معلوم ہوا کہ شادی سے قبل اس سے ایک ایسے معاہدے پر دستخط کرالیے گئے ہیں کہ جب تک اس کی بیوی آمادہ نہ ہو وہ اسے طلاق بھی نہیں دے سکتا۔ اور اب وہ حیران ہے کہ اس الجھن کو کس طرح سلجھائے۔ کیا اس کی بیوی حمیرا اس کے کہنے پر طلاق لینے پر آمادہ ہوجائے گی۔ اور بالفرض وہ آمادہ نہ ہوئی تب وہ اس دوسری لڑکی سائرہ کو کیا جواب دے گا جسے اس نے ابھی تک یہ بھی نہیں بتایا ہے کہ اس کی ایک شادی ہوچکی ہے کیا وہ سائرہ کو یہ حالات بتائے بغیر اس سے شادی کرلے۔

یہ کوئی بتانے والی بات نہیں کہ منیر کی زبان سے یہ ساری باتیں سن کر نجمہ (دوسرے الفاظ میں حمیرا) کو کس قدر صدمہ ہوا ہوگا۔ مگر اس باحوصلہ لڑکی نے اپنے کسی تاثر سے دلی جذبات کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ کہا تو یہ کہا کہ اگر منیر کسی دوسری لڑکی کو پسند کرتا ہے اور وہ لڑکی بھی اسے چاہتی ہے تو اسے پورا حق ہے کہ وہ اسی کو اپنی زندگی کا شریک بنائے۔ اتنا ہی نہیں اس نے یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ یہ تمام حالات اپنی پہلی بیوی کو بتادے۔ اسے خط لکھ کر سمجھائے کہ اس بے نام تعلق کو برقرار رکھنے سے نہ اسے کوئی فائدہ ہوگا اور نہ ہی اس کی بیوی کو کچھ حاصل ہوگا۔ اس لیے بہتر ہے کہ وہ طلاق پر اپنی رضامندی کا اظہار کردے۔ اس طرح بات بلاشبہ کھل جائے گی۔ خاندان میں منیر کو برا بھلا بھی کہا جائے گا۔

لیکن اس کے جذبات مخلص اور سچے ہیں تو اسے ان حالات کا سامنا کرنے سے گھبرانا نہیں چاہیے ساتھ ہی یہ امید بھی ظاہر کی کہ اگر اس کی بیوی حمیرا اتنی ہی سمجھدار اور حقیقت پسند ہے جتنا اس کے بارے میں کہا جاتا ہے تو وہ ضرور اس کے اور سائرہ کے راستے سے ہٹ جائے گی اور طلاق لینا منظور کرلے گی۔

منیر نجمہ سے حوصلہ افزائی پاکر اتنا جوش میں آیا کہ اسی رات ایک تفصیلی خط حمیرا کے نام لکھا ساتھ ہی طلاق نامہ بھی لکھ دیا اور دوسرے دن یہ دونوں تحریریں بذریعہ رجسٹری حمیرا کے گھر کے پتے پر اسی کے نام سے رجسٹری کردیں۔

☆☆☆

لیکن منیر کو معلوم نہیں تھا کہ سائرہ تمام حالات سے واقف ہوچکی ہے۔ اس نے دفتر میں کئی دن تک سائرہ کا اکھڑا اکھڑا طرزِ عمل اور سرد رویہ دیکھ کر موقع نکال کر آخر اس سے پوچھ ہی لیا کہ وہ اس سے گریزاں کیوں نظر آرہی ہے جواب میں سائرہ جو اَب تک بہ مشکل اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کررہی تھی پھٹ پڑی۔

''آپ کو شرم آنا چاہیے منیر صاحب کہ آپ نے اپنے شادی شدہ ہونے کی بات مجھ سے چھپائی اس طرح نہ صرف مجھے دھوکا دیا بلکہ اپنی ذات سے میرا اعتماد بھی ختم کردیا۔ اب میں ایک دوسری لڑکی کی حق تلفی کرکے ... ہرگز آپ سے شادی نہیں کرسکتی۔''

''میں نے تم سے یہ بات چھپائی ضرور تھی۔'' منیر نے جواب دیا۔ ''لیکن میرا کوئی ارادہ تمہیں دھوکا دینے کا نہیں تھا۔ اس لیے میں تم سے شادی کرنے سے پہلے اپنی پہلی بیوی کو طلاق دینا چاہتا ہوں۔''

''بحث کرنے سے کوئی فائدہ نہیں، مجھے سب کچھ معلوم ہوچکا ہے۔'' سائرہ نے کہا۔ ''میں نے آپ کو یہ نہیں بتایا تھا کہ میرے والد وکیل ہیں اور ان کا نام غلام دستگیر ہے۔ قدرت کی ستم ظریفی کہ آپ کی بے وفائی کا راز فاش کرنا تھا کہ آپ طلاق دینے کے سلسلے میں میرے والد... کے پاس پہنچے اور ان کے ذریعے مجھے تمام حالات کا علم ہوگیا۔ اس کے بعد میرا آپ سے شادی کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ براہِ کرم آئندہ مجھ سے بات کرنے کی کوشش بھی نہ کیجئے گا۔''

اس شام منیر گھر پہنچا تو وہ پہلے سے کہیں زیادہ مضطرب اور پریشان تھا۔ اس نے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے یہ بات بھی نجمہ کو بتادی۔ تب تک منیر کی بھیجی ہوئی رجسٹری حمیرا کے گھر موصول ہوچکی تھی اور اس کے والد نے رجسٹری کا لفافہ بغیر کھولے حمیرا کو اس کی سسرال میں بھجوادیا تھا۔ اگرچہ انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ اس رجسٹری میں کیا ہوگا۔ مگر انہوں نے مناسب سمجھا کہ صرف حمیرا ہی اس کے مضمون سے واقف ہو اور پھر خود ہی سوچ سمجھ کر جو قدم مناسب سمجھے وہ اٹھائے۔

حمیرا نے منیر کے دل کی یہ بھڑاس بھی بڑے صبر و تحمل سے سنی۔

''میرا خیال ہے۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ''کہ سائرہ ان حالات سے واقف نہیں جن میں آپ کی پہلی شادی ہوئی تھی۔''

''میں تو اسے بتانا چاہتا تھا مگر اس نے مجھے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔''

''کوئی بات نہیں۔'' حمیرا نے جواب دیا۔ ''آپ مجھے سائرہ بہن کے گھر لے... چلیں، میں انہیں یہ سمجھانے کی پوری کوشش کروں گی کہ جو کچھ ہوا اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں تھا۔ پھر مجھے امید ہے کہ اصل واقعات کو جان کر سائرہ بہن ضرور اپنی رائے تبدیل کرلیں گی۔ پھر اسی طرح میں کسی دن آپ کی بیوی سے ملنے بھی ان کے گھر جاؤں گی اور انہیں بھی سمجھاؤں گی کہ وہ ایک ایسے تعلق کو قائم رکھنے پر اصرار نہ کریں جو کسی کے حق میں بھی مفید ثابت نہیں ہورہا ہے۔''

''اگر تم ایسا کرسکو تو میں ساری زندگی تمہارا احسان مند رہوں گا۔'' منیر نے بڑے جوش کے ساتھ کہا۔

☆☆☆

جب سے منیر اپنا کیس لے کر غلام دستگیر صاحب کے پاس آیا تھا۔ وہ مسلسل اس بات کی کوشش کررہے تھے کہ منیر کو سمجھا بجھا کر اسے اپنی پہلی بیوی کو قبول کرنے اور اسی تعلق کو برقرار رکھنے پر آمادہ کرلیا جائے کیونکہ انہیں اندازہ تھا کہ سائرہ بلاشبہ منیر کو بہت چاہتی ہے اور اگرچہ ابھی وہ جذباتی ردِعمل کے طور پر منیر سے ناراض ہے۔ مگر یہ عین ممکن ہے کہ منیر اس محبت کے سہارے جو سائرہ کے دل میں اس کے لیے موجود ہے کسی کمزور اور نازک لمحہ میں سائرہ کو دوبارہ منائے اور سائرہ اس کے ساتھ شادی پر آمادہ ہوجائے۔ جبکہ ان کے خیال میں اس شادی کے بعد بھی سائرہ اور منیر کے تعلق میں وہ پختگی نہیں آسکتی تھی جو ان حالات کی عدم موجودگی میں متوقع تھی۔ اس مقصد کے لیے وہ حمیرا کے والد سے ملنے گئے مگر اتفاق سے برکت اللہ صاحب گھر پر موجود نہیں تھے۔ پھر وہ ظہیر احمد صاحب سے بات کرنے ان کے گھر پہنچے اور ان کی دستک کے جواب میں جو ہستی دروازے پر آئی وہ خود حمیرا تھی۔ اسے دیکھتے ہی جیسے کسی غیبی اشارے سے دستگیر صاحب کو یقین ہوگیا کہ یہ ہی حمیرا ہے۔

''مجھے ظہیر صاحب سے ملنا ہے۔'' غلام دستگیر صاحب نے کہا۔ حمیرا پل بھر کے آمنا سامنا ہونے کے بعد کواڑ کی آڑ میں ہوگئی تھی۔

''ابو تو سرکاری کام کے سلسلے میں شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''تم ان کی بیٹی ہو؟''

''بیٹی ہی سمجھیے۔'' حمیرا اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتی تھی۔ غلام دستگیر صاحب کو اپنے اندازے کی صحت کا اور یقین ہوگیا۔

''ظہیر صاحب کب تک واپس آئیں گے؟''

''شاید پرسوں تک آجائیں۔'' حمیرا نے کہا۔ ''آپ اپنا نام اور کام بتادیں۔ میں ان کی واپسی پر ان سے کہہ دوں گی۔''

''اس کی ضرورت نہیں، میں دو تین دن کے بعد پھر حاضر ہوجاؤں گا۔'' دستگیر صاحب نے جواب دیا۔

☆☆☆

ایک شام منیر حمیرا کو سائرہ کے گھر لے گیا اور اسے دروازے پر چھوڑ کر خود چلا گیا۔ طے یہ ہوا تھا کہ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد وہ اسے لینے واپس آئے گا تب تک حمیرا سائرہ سے گفتگو کرلے گی۔ اگر دیر لگی تو منیر گلی کے موڑ پر اس کا انتظار کرلے گا اور بات پہلے ختم ہوجائے تو حمیرا اس کا انتظار کرلے۔

سائرہ ایک خوبصورت جوان لڑکی کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر جلدی سے آگے بڑھی۔

''آپ سائرہ ہیں۔'' حمیرا اس کے کچھ پوچھنے سے پہلے بول دی۔

''جی ہاں، مگر آپ مجھے کیسے جانتی ہیں؟''

''میرا نام نجمہ ہے اور میں آپ ہی سے ملنے آئی ہوں۔'' حمیرا نے جواب دیا۔ جہاں تک جاننے کا سوال ہے تو اتنا ہی کہہ سکتی ہوں کہ شاید میں منیر صاحب کی واحد رازدار ہوں جس سے وہ بے دھڑک اپنے دل کی بات کہہ لیتے ہیں۔ مجھے ان سے ہی آپ کے بارے میں معلوم ہوا ہے۔''

''بہت خوب! مگر آپ میرے پاس کیوں آئی ہیں؟''

''آپ کی یہ غلط فہمی دور کرنے کے لیے کہ منیر صاحب نے آپ کو دھوکا دیا یا آپ سے بے وفائی کے مرتکب ہوئے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے اور آپ مجھے چند منٹ بولنے کا موقع دیں تو میں اپنی بات ثابت بھی کردوں گی۔''

پھر اس نے بڑی تفصیل سے سائرہ کو حمیرا اور منیر کی نسبت طے ہونے بعد میں منگنی ہونے سے لے کر شادی ہونے تک کے تمام حالات کہہ سنائے۔

''آپ خود اندازہ لگا سکتی ہیں کہ ان تمام حالات میں منیر صاحب کا کوئی قصور نہیں تھا۔'' اس نے آخر میں کہا۔ ''وہ شادی کے وقت بھی آپ کو چاہتے تھے مگر افسوس کہ تب تک یہ پسندیدگی اس اعتبار سے یک طرفہ تھی کہ انہیں آپ کے خیالات کا علم نہیں تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تب آپ نے اپنے جذبات کا اظہار کردیا ہوتا تو وہ ... ہرگز شادی نہ کرتے خواہ اس کے لیے انہیں اپنا گھر ہی کیوں نا چھوڑنا پڑتا۔ اور اب بھی یہ ان کا خلوص ہی تھا جس نے یہ پسند نہ کیا کہ وہ ایک بیوی کی موجودگی میں آپ سے شادی کرلیں حالانکہ اگر وہ ایسا کرتے تو پورا امکان تھا کہ ان کا راز فاش نہ ہوتا آپ سے ضرور ان کی شادی ہوجاتی پھر اس کے بعد بات کھل بھی جاتی تب آپ کچھ نہ کرسکتی تھیں۔ اب بھی وہ یہی چاہتے ہیں کہ اگر ان کی بیوی سے خوش اسلوبی سے علیحدگی ہوجائے تب آپ سے شادی کریں۔ مجھے امید ہے کہ اس وضاحت کے بعد آپ کی غلط فہمی دور ہوچکی ہوگی اور آپ ان سے مل کر انہیں پھر سے زندگی کا پیغام سنا سکیں گی۔ یہ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ پہلی بیوی سے علیحدگی میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئے گی کیونکہ میں اس بارے میں حمیرا سے بھی بات کرچکی ہوں۔''

☆☆☆

سائرہ نے حمیرا کے جانے کے بعد بڑی سنجیدگی سے اس کی باتوں پر غور کیا اور اسی نتیجہ پر پہنچی کہ پہلی شادی کرنے میں منیر کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اس نے یہ بات سائرہ سے چھپا کر غلطی ضرور کی تھی لیکن یہ غلطی اتنی بڑی نہیں کہ اسے مسترد کرنے کا فیصلہ کرلیا جائے۔ خاص طور سے اس صورت میں کہ وہ اس سے شادی سے قبل پہلی بیوی کو طلاق دینا ضروری خیال کرتا ہے۔

اس نتیجہ پر پہنچتے ہی سائرہ اس قدر جوش میں آئی کہ اسی وقت منیر کے گھر فون کیا۔ ریسیور اتفاق سے منیر نے ہی اٹھایا سائرہ نے اس کی آواز پہچان لی۔ اس نے کہا کہ وہ منیر کے ساتھ اپنے طرزِ عمل پر شرمندہ ہے۔ اب جبکہ اسے صحیح حالات کا علم ہو چکا ہے وہ منیر کی بے وفائی خیال نہیں کرتی۔ کل آفس ٹائم کے بعد وہ حسبِ معمول اسی ریسٹورنٹ میں ملیں گے جہاں اب تک ملتے رہے ہیں اور باقی باتیں اسی وقت ہوں گی۔ مگر یہ کہ اگر منیر اپنی پہلی بیوی سے علیحدگی حاصل کر لے تو امید ہے کہ سائرہ کے والد بھی ان دونوں کی شادی پر معترض نہیں ہوں گے۔

دوسری طرف غلام دستگیر صاحب ڈرائنگ روم میں کسی مقدمے کے سلسلے میں چند افراد سے مصروفِ گفتگو تھے۔ انہوں نے حمیرا کو گھر میں آتے دیکھا اور اسے فوراً پہچان لیا۔ انہیں حیرت تھی کہ وہ ان کے گھر کیا کرنے آئی ہے۔ یہ تو واضح تھا کہ وہ سائرہ سے ملنے آئی ہوگی۔ مگر کیوں، کیا اس لیے کہ سائرہ سے کہے کہ وہ اس کے اور منیر کے راستے سے ہٹ جائے۔ مگر چونکہ اس وقت وکیل صاحب ایک دوسرے ہی کیس کی تفصیلات میں الجھے ہوئے تھے اس لیے حمیرا کی آمد کے بارے میں زیادہ نہ سوچ سکے۔ ان کی گفتگو بھی کافی دیر تک چلتی رہی۔ جس کے دوران انہوں نے حمیرا کو واپس جاتے ہوئے بھی دیکھا۔ بالآخر تقریباً چار گھنٹے کی طویل نشست کے بعد جب ان کے ملاقاتی چلے گئے تب وہ سائرہ کے پاس پہنچے۔

سائرہ اس وقت منیر سے فون پر بات کرنے کے بعد ریسیور کریڈل پر رکھ رہی تھی۔

''یہ حمیرا تمہارے پاس کیوں آئی تھی؟'' دستگیر صاحب نے پوچھا۔

''حمیرا!'' سائرہ چونکی۔ ''وہ تو اپنا نام نجمہ بتا رہی تھیں۔'' سائرہ نے حیرت سے کہا۔

''وہ یہاں آئی کیوں تھی؟''

''مجھے یہ بتانے کہ پہلی شادی میں منیر کا کوئی قصور نہیں تھا۔'' سائرہ نے کسی گہرے خیال میں ڈوبے ہوئے کہا۔ ''اور یہ کہ مجھے ان کی محبت کو ٹھکرانا نہیں چاہیے۔ وہ یہ بھی کہہ رہی تھیں کہ انہوں نے منیر کی پہلی بیوی کو آمادہ کر لیا ہے اور اب ان دونوں کی علیحدگی میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔''

''او میرے خدا اتنا بڑا ظرف، اتنا بڑا ایثار۔'' بے اختیار دستگیر صاحب کی زبان سے نکلا۔ ''جانتی ہو وہ کون تھی۔''

''ہاں۔'' سائرہ نے اسی کیفیت میں جواب دیا۔ ''منیر کی رفیقۂ حیات جو اپنے شوہر سے اتنی پُرخلوص اور بے لوث محبت رکھتی ہیں کہ منیر کی خوشی کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے تیار ہیں۔''

''کیا تم ایسا کر سکتی تھیں۔''

''شاید نہیں۔'' سائرہ نے جواب دیا۔ ''حمیرا نے ثابت کر دیا ہے کہ ان کی چاہت مجھ سے زیادہ بڑی اور عظیم ہے۔''

☆☆☆

سائرہ سے فون پر بات کرنے کے بعد منیر اپنے جوشِ مسرت کو دبا نہیں سکا۔ اسے یہ توقع نہیں تھی کہ نجمہ سائرہ پر کوئی ایسا جادو کر آئے گی کہ وہ اس سے ملنے کے ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد ہی اپنی رائے اپنے خیالات تبدیل کرلے نہ صرف اسے معاف کر دے گی بلکہ ٹوٹا ہوا رشتہ پھر سے استوار ہونے کی امید بھی دلائے گی۔ وہ نجمہ کو یہ خوش خبری سنانے کے لیے بیتاب ہو گیا۔ وہ اس کا شکریہ بھی ادا کرنا چاہتا تھا کہ اس کی کوشش سے بگڑی بات پھر سے بنتی نظر آ رہی تھی۔

وہ نجمہ کے کمرے میں پہنچا۔ نجمہ کمرے میں نہیں تھی۔ منیر واپس لوٹنے لگا تھا کہ اس کی نظر میز پر رکھے ہوئے کچھ کاغذات پر پڑی۔ مانوسیت کا احساس ہوا تو وہ پلٹا۔ بلاشبہ یہ اسی کے ہاتھ کا لکھا ہوا لفافہ تھا اور دوسرے کاغذات بھی وہی تھے جو اس نے حمیرا کو ارسال کیے تھے۔ مگر سوال یہ تھا کہ یہ تمام کاغذات نجمہ کے پاس کیسے آئے۔

منیر کاغذات واپس میز پر رکھ کر عجیب سوچوں میں ڈوبا ہوا کمرے سے باہر نکلا۔ چند قدم کے فاصلے پر اس کی والدہ کا کمرا تھا جہاں سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ منیر نے کھڑکی کی آڑ سے جھانک کر دیکھا۔ کمرے میں اس کے والد اور والدہ کے علاوہ نجمہ بھی موجود تھی۔ اور وہ ظہیر صاحب اور ان کی بیگم کو اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس تمام الجھن کا یہی حل مناسب ہے کہ وہ منیر سے علیحدگی اختیار کر لے اور منیر کی شادی سائرہ کے ساتھ ہو جائے۔ دو تین فقروں کے تبادلے کے بعد ہی منیر کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ کمرے میں کاغذات دیکھ کر جو شک اس کے ذہن میں پیدا ہوا ہے وہ سچ ہے۔ نجمہ ہی اصل میں حمیرا ہے۔ اور کتنی عجیب لڑکی ہے یہ حمیرا کہ جب وہ اپنے شوہر کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے نجمہ بن کر گھر میں آئی تو اس کو اپنے شوہر کی زبان سے یہ سننا پڑا کہ وہ کسی دوسری لڑکی سے محبت کرتا ہے۔ اور اس پاگل لڑکی نے اپنے مشن کو فراموش کر کے منیر اور سائرہ کو دوبارہ ملانے کی جدوجہد شروع کر دی۔ کیا وہ اندر سے بالکل بے حس اور پتھر ہے۔ نہیں کوئی انسان محسوسات سے اتنا عاری نہیں ہو سکتا اور خاص طور پر وہ بیوی جسے شادی کے روزِ اول اور سہاگ رات سے ہی اپنے شوہر کی ناقدری کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ یقیناً حمیرا کا دل بھی زخمی ہوا ہوگا لیکن اسی کی طرح عجیب تھی منیر سے اس کی محبت کہ اس نے اپنی چاہت قربان کر کے بھی منیر اور سائرہ کی محبت کو کامیاب بنانے کی کوشش کی۔ کاش اس نے حمیرا کو پہلے دیکھ لیا ہوتا۔ کم سے کم شادی کی رات کو ہی جبکہ ابھی سائرہ کی جانب سے اس کی چاہت کی پذیرائی کا اظہار نہیں ہوا تھا تو عین ممکن تھا کہ آج حالات مختلف ہوتے۔ منیر واپس لوٹا۔ دوبارہ نجمہ کے کمرے میں داخل ہوا اور میز پر سے لفافہ اور تمام کاغذات اٹھا کر اپنی جیب میں رکھتے ہوئے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

سائرہ ایک ہفتہ تک دفتر سے غائب رہی۔ معلوم ہوا کہ اس نے چھٹی لے رکھی ہے۔ پھر جب چھٹی ختم ہونے والی تھی تو اس کا استعفا موصول ہو گیا۔ جس کے منظور ہونے کے بعد وہ ایک دن اپنے واجبات وصول کرنے دفتر آئی۔ منیر سے بھی سلام و دعا ہوئی مگر عجیب بات تھی کہ نہ سائرہ نے اس سے معذرت چاہی کہ فون پر ملنے کا وعدہ کرنے کے باوجود وہ ملنے نہ آ سکی اور نہ منیر نے ہی اس گفتگو کے حوالے سے کوئی بات کی۔ البتہ جب سائرہ واجبات وصول کر کے واپس جا رہی تھی تو اس نے منیر کو اپنے ساتھ چائے پینے کی دعوت دی۔ وہ اسی ریسٹورنٹ میں گئے جہاں اس سے قبل اکثر و بیشتر ملتے رہے تھے۔

''آپ مجھ سے اس اچانک استعفے کی وجہ نہیں پوچھیں گے۔'' سائرہ نے ہلکی مسکراہٹ سے کہا۔

''جاننا تو چاہتا ہوں مگر ظاہر ہے کہ مجبور نہیں کر سکتا۔'' منیر نے جواب دیا۔

''آپ سے فون پر گفتگو کرنے کے بعد میں نے اپنے ڈیڈی سے تفصیلی بات کی۔'' سائرہ نے بتایا ''اور اس گفتگو کے نتیجہ میں اس فیصلے پر پہنچی کہ میں ایک ورکنگ



## معرکۂ کارگل

کشمیر میں مجاہدینِ آزادی کی عسکری کارروائی۔ اس کے پس منظر میں مجاہدینِ آزادی کی وہ مسلح جدوجہد ہے، جو انہوں نے شروع کر رکھی ہے۔ ان کو اس امر کا بخوبی علم ہے کہ کشمیر کو صرف مسلح جدوجہد سے ہی آزاد کرایا جا سکتا ہے۔ 1999ء کا دن مقبوضہ کشمیر کی جدوجہد آزادی کے لیے ایک نیا موڑ ثابت ہوا اسی روز انہوں نے کشمیر میں کارگل سیکٹر میں کنٹرول لائن کی شمالی جانب دفاعی نوعیت کی پہاڑی چوٹیوں پر قبضہ کر لیا۔ بھارتی حکومت نے الزام عائد کیا کہ مجاہدینِ آزادی پاکستانی فوج کی مدد سے ایسا کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ حکومتِ پاکستان نے بھارت کے اس الزام کی تردید کی لیکن حسبِ معمول بھارتی فوج نے پاکستانی کشمیر کے علاقے میں نہتے شہریوں کو اپنے ظلم و بربریت کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ نیز کنٹرول لائن کے ساتھ شیوک سیکٹر میں پاکستان کی ایک چوکی پر قبضہ کرنے کی ناکام کوشش کی گئی۔ پاک فوج نے اس حملے کو پسپا کر دیا، ازاں بعد بھارت نے کارگل کے علاقے میں اپنی دو ڈویژن فوج سے بھرپور حملہ کیا۔ حملے میں ہیلی کاپٹر گن شپس بھی استعمال کیے گئے۔ پاکستان نے بھارت کو متنبہ کیا کہ مجاہدین کے خلاف اس کی جنگی کارروئیاں لائن آف کنٹرول کے بالکل قریب ہو رہی ہیں اور پاکستان کو یہ حق پہنچتا ہے کہ کسی بھی متوقع حملے پر لائن آف کنٹرول کی پاکستانی جانب سے جوابی کارروائی کرے، نیز پاکستان جنگ میں الجھنا نہیں چاہتا لیکن اس کے باوجود 1999ء میں دو بھارتی طیارے پاکستانی فضائی حدود کے 15 کلومیٹر اندر گھس آئے۔

پاک فوج نے مقبوضہ کشمیر میں فوجی ٹھکانوں کو تباہ کرنے اور بھارتی فوج کی جانب سے اس کی فضائی حدود کی خلاف ورزی کی سزا دینے کے لیے پیش قدمی شروع کر دی، جس کے نتیجے میں پاک فوج نے مقبوضہ کشمیر میں داخل ہو کر دفاعی اہمیت کی شاہراہ سری نگر دراس پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح سیاچن جانے والے بھارتی فوجیوں کو خوراک اور اسلحہ کی بہم رسانی ناممکن ہو گئی۔ اب بھارتی فوج کے لیے دو ہی راستے تھے یا وہ سری نگر دراس شاہراہ پر دوبارہ قبضہ کر لے یا پھر وہاں قائم اپنی فوجی چوکیاں خالی کر دے۔ اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل نے دونوں ملکوں کے مابین مصالحت کی پیش کش کی لیکن بھارت نے انکار کر دیا اور پاکستان نے اس کا مثبت جواب دیا۔ پاکستان نے بھارتی حکومت سے بات چیت کرنے کے لیے اپنا وزیر خارجہ بھارت بھیجنے کی پیش کش کی۔ لامحالا بھارت کو مذاکرات کی پیش کش کو تسلیم کرنا پڑا، کیوں کہ علاقے میں موجود 80 ہزار فوجیوں میں سے 17 ہزار فوجی سیاچن گلیشیر پر پھنسے ہوئے تھے۔ نیز بھارت جارحانہ کارروائی کے باوجود اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا، تاہم 4 جولائی 1999ء کو امریکا کے صدر بل کلنٹن اور پاکستان کے وزیر اعظم نواز شریف نے اعلانِ واشنگٹن پر دستخط کر دیے، جس کے تحت مجاہدین کو مقبوضہ کشمیر سے واپس آنا پڑا۔

مرسلہ: ارباز خان، کوئٹہ

وومن ہوں۔ فکر و عمل کی آزادی میرے مزاج کا حصہ بن چکی ہے۔ ایسی صورت میں میرے لیے ایک خاتونِ خانہ کی گھریلو ذمہ داریاں نبھانا انتہائی مشکل ہوگا۔ جبکہ جہاں تک میں نے آپ کے خیالات و جذبات کو سمجھا ہے آپ ایک گھریلو مزاج و طبیعت رکھنے والی لڑکی ہی کو پسند کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں کیا ہمارا کسی مستقل تعلق میں بندھ جانا مناسب ہوگا۔ میں شادی کے بعد بھی ملازمت نہیں چھوڑ سکتی اور یہ بات نہ آپ کو پسند ہوگی نہ آپ کے گھر والوں کو۔ میں یہ سب کچھ سوچ ہی رہی تھی کہ محض اتفاق سے مجھے ایک کمپنی کی ایسی سروس کی آفر ملی جس میں وہ مجھے اپنا نمائندہ بنا کر انگلینڈ بھیجنا چاہتے ہیں۔ اس کی شرائط بے حد پُرکشش تھیں۔ میں نے ڈیڈی سے ذکر کیا وہ خود بھی مختلف وجوہات سے انگلینڈ جانا چاہتے تھے۔ انہوں نے مجھے فوراً اس پیشکش کو قبول کرنے کا مشورہ دیا اور پھر میرے ساتھ خود بھی جانے کی تیاریاں مکمل کرلیں۔ اب ہم لوگ اگلے ہفتے لندن جا رہے ہیں۔ اس لیے مجھے بے حد افسوس ہے کہ وہ جو بھی ہمارے درمیان کوئی ربط تھا وہ کسی مستقل تعلق کی صورت اختیار نہیں کرسکتا۔"

"جب تم نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" منیر نے جواب دیا۔

حالانکہ سائرہ کی زبان سے یہ سب کچھ سن کر اسے ایک طرح کا اطمینان ہی محسوس ہوا تھا۔ پچھلا ہفتہ اس نے بھی مسلسل غور و فکر میں گزارا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے ایک طرف سائرہ کی آمادگی اور اس سے اپنا قلبی تعلق پیشِ نظر تھا تو دوسری جانب حمیرا نے صرف اس کی خوشی کے لیے جس ایثار و قربانی کا مظاہرہ کیا تھا وہ بھی کسی عام لڑکی کے بس کی بات نہیں تھی اور نہ ہی وہ اتنا سنگ دل تھا کہ حمیرا کے ایثار کا اعتراف نہ کرے اور اعتراف کرنے کا لازمی تقاضا یہ تھا کہ حمیرا کو وہ تمام حقوق دے جن سے اب تک اسے محروم رکھا ہے۔ سائرہ کے اس فیصلے نے اس کی الجھن ختم کردی تھی۔

"ممکن ہے اب زندگی میں ہم کبھی دوبارہ نہ مل سکیں۔" سائرہ نے چلتے ہوئے کہا۔ "مگر ہم دوستوں کی طرح جدا ہو رہے ہیں اور میری خواہش ہے کہ آپ حمیرا کو اس طرح اپنالیں جس طرح اپنانے کا حق ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی رفاقت میں آپ کو کبھی کسی کمی کا احساس نہیں ہوگا۔"

اور اس کے بعد سائرہ عملاً منیر کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئی۔ یہ دوسری بات ہے کہ ملازمت ملنے کا اس نے محض بہانہ کیا تھا۔ لندن پہنچنے کے بعد بلکہ اس سے پہلے ہی وہ کبھی شادی نہ کرنے کا عہد کرچکی تھی۔ اس نے لندن میں نرسنگ کی ٹریننگ لی اور کورس پاس کیا اور پھر پوری زندگی اپنا غم بھول کر دوسروں کے دکھ درد کو دور کرنے کی کامیاب کوشش کرتی رہی۔ دوسری طرف منیر نے کھلے دل سے حمیرا کو اپنالیا اور ان کی آیندہ خوشگوار ازدواجی زندگی نے ثابت کردیا کہ یہ فیصلہ کسی اعتبار سے بھی غلط نہیں تھا۔

☆☆☆

سائرہ آنٹی نے مجھے اپنی داستان جس طرح اور کرداروں کے جن ناموں کے ساتھ سنائی تھی وہ میں نے سرگزشت قارئین کے سامنے پیش کردی۔ مجھے نہیں معلوم کہ سب کچھ سچ بیان کرنے کے باوجود آنٹی سائرہ نے کرداروں کے حقیقی نام چھپانے اور ان کی جگہ فرضی نام بیان کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے ان کی کہانی کے بارے میں تب یہ گمان بھی نہ ہوسکا کہ اس کا کوئی تعلق مجھ سے ہوسکتا ہے۔

لیکن جیسا کہ میں نے آغاز میں بیان کیا۔ کئی برس بعد جب میرے ابو کا انتقال ہوا اور مجھے ان کے ذاتی کاغذات کی الماری میں ایک خاص ڈائری ملی اور میں نے اسے کھول کر دیکھا تو اس میں آنٹی سائرہ کی ایک تصویر دیکھ کر شدید حیرت ہوئی۔ پھر جب میں نے اس ڈائری کے مندرجات پڑھے تو یہ انکشاف ہوا کہ آنٹی نے جو کہانی سنائی تھی وہ نہ صرف یہ کہ بالکل سچ تھی بلکہ اس کے دوسرے مرکزی کردار میرے ابو اور امی ہی تھے۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ آنٹی کے لیے میرے دل میں عقیدت و احترام اور ان کے دل میں میرے لیے اتنی اپنائیت اور چاہت کہ زندگی میں پہلی مرتبہ کسی کو اپنا رازدار بنا لینے بلاوجہ اور بغیر کسی تعلق کے نہیں تھے۔ انہوں نے مجھے اپنی بیٹی کہا تھا اور میں اس اعتبار سے واقعی ان کی بیٹی تھی کہ میں اس شخص کی اولاد تھی جس کی خاطر آنٹی نے اپنی ساری زندگی کی خوشیاں تج دی تھیں۔

میں آج تک یہ فیصلہ نہیں کرسکی...... اور غالباً کبھی کر بھی نہیں سکوں گی کہ اپنی اپنی محبت کی خاطر کس نے زیادہ بڑی قربانی دی تھی...... میری امی نے یا آنٹی سائرہ نے لیکن اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ ان دونوں نے محبت و خلوص، ایثار اور قربانی کا حق ادا کردیا تھا۔

# مانگے کا چراغ

جناب مدیر اعلیٰ

سلام مسنون!

اس دنیا میں کیا کچھ نہیں ہوتا۔ کیسے کیسے عجیب لوگ یہاں بستے ہیں۔ وہ بھی تو عجیب فطرت کا تھا جسے لوگ میرا باس کہتے تھے۔ اس وقت وہ میری جان لینا چاہتا ہے اسی لیے میں روپوشی کی زندگی جی رہا ہوں ورنہ وہ مجھے قتل کرادے گا۔ وہ میرا جانی دشمن کیوں بنا یہی دنیا کو میں بتانا چاہتا ہوں۔

شہباز شیخ

(لاہور)

اُس نے مجھے مارنے میں کوئی کسر نہیں رکھی تھی۔

لیکن یا تو میری زندگی تھی یا پھر خدا نے میرا ساتھ دیا کہ اس کی چلائی ہوئی گولی میرے قریب سے ہو کر نکل گئی تھی اور میں نے اپنی جان بچانے کے لیے ایک طرف دوڑ لگادی تھی۔

جس آدمی نے مجھے مارنے کی کوشش کی تھی اس سے میری کوئی دشمنی نہیں تھی اور جس نے اسے اس کام پر لگایا تھا اس سے بھی کوئی دشمنی نہیں تھی۔

اس کے باوجود دونوں مجھے مارنا چاہتے تھے۔ ہے نا عجیب بات۔

اس کہانی کی ابتدا اس دن ہوئی جب میرے باس اظہر علی نے مجھے اپنے کمرے میں طلب کیا۔ اظہر درشت چہرے اور کرخت لہجے والا ایک ایسا آدمی ہے جس کے ماتھے پر ہمیشہ بل پڑے رہتے ہیں۔

وہ ایک بہت بڑی فرم کا مالک تھا۔ ایکسپورٹ امپورٹ کے وسیع کاروبار کے علاوہ اس کے اور بھی کئی کام تھے۔

ہم سب اس کے مزاج سے خائف رہا کرتے۔ اس لیے میں بہت ڈرتے ہوئے اس کے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ لیکن شاید پہلی بار اس نے بہت نرم لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔ ''تمہارا نام شہباز ہے نا؟'' اس نے پوچھا۔

''یس سر!'' میں نے مودب ہو کر جواب دیا۔

''بیٹھ جاؤ۔'' اس نے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

میں اس کے سامنے خوفزدہ سا بیٹھ گیا۔ وہ گہری نگاہوں سے میرا جائزہ لیتا رہا۔ پھر اس نے ایک طویل ہنکار لی۔ ''بیک گراؤنڈ کیا ہے تمہارا؟'' اس نے پوچھا۔

''جی...'' میں نے نہ سمجھنے والے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''میرا مطلب ہے تم کہاں رہتے ہو اور کون کون ہے تمہارے ساتھ۔''

''کوئی نہیں ہے جناب۔'' میں نے بتایا۔ ''میں ایک اکیلا انسان ہوں۔''

''شادی ہوئی ہے۔''

''نہیں جناب۔'' میں نے جواب دیا۔ مجھے اس کی باتوں پر حیرت ہونے لگی تھی۔ وہ آخر یہ سب کیوں پوچھ رہا تھا۔ ''حالات نے اس طرف دھیان دینے کا موقع ہی نہیں دیا۔''

''ہوں۔'' وہ پھر سوچنے لگا تھا۔ ''دیکھو مسٹر شہباز... میں تمہاری کارکردگی سے بہت خوش ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''تمہاری رپورٹ میرے پاس موجود ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تمہیں کچھ اور ذمے داریاں بھی دے دوں۔''

''آپ کی بڑی مہربانی ہوگی جناب۔''

''تم ایسا کرو، شام کو میرے گھر آجاؤ۔'' اس نے کہا۔ ''اور ابھی کسی سے تذکرہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

میں بہت حیران اور پریشان ہو کر اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ جو کچھ بھی تھا وہ مجھے حیران کر دینے والا تھا۔ شاید ہی اس نے دفتر میں کسی سے اس انداز میں بات کی ہو جس انداز سے مجھ سے بات کی تھی۔

ویسے میرے لیے یہ بہت اچھی خبر تھی کہ وہ مجھے اضافی ذمے داریاں دینے والا تھا۔ ظاہر ہے اس سے میری تنخواہ میں بھی اضافہ ہو جاتا اور میری بہت سی پریشانیاں ختم ہو جاتیں۔

میں اس کے گھر پہنچ گیا۔

وہ ایک شاندار گھر تھا۔ جہاں وہ سب کچھ تھا جس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔

کئی عدد گاڑیاں، شاندار ڈرائنگ روم وغیرہ۔ ان کے ملازم نے مجھے بہت احترام کے ساتھ ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھا دیا تھا۔

شاید اسے میرے بارے میں ہدایت دے دی گئی تھی۔

میں اپنی اس عزت و توقیر پر حیران ہونے لگا تھا۔ آخر کیوں، اظہر علی جیسا تنک چڑھا انسان مجھ پر اتنا مہربان کیوں ہو رہا تھا؟

میں شاندار ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر وہاں کے ساز و سامان کا جائزہ ہی لے رہا تھا کہ اظہر علی کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ایک دبلی پتلی، اسمارٹ اور بہت خوبصورت سی عورت بھی تھی۔

میں ان دونوں کو دیکھ کر احتراماً کھڑا ہو گیا تھا۔ ''بیٹھ جاؤ۔'' اظہر علی نے کہا۔ پھر اس عورت کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ میری مسز ہیں نازنین۔''

میں نے نازنین کو بھی ادب سے سلام کیا۔ وہ دونوں میرے سامنے ہی بیٹھ گئے تھے۔ میری الجھن بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ کیا چاہتا تھا اظہر علی؟

اظہر علی نے دفتر کے حوالے سے باتیں شروع کر دیں۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ میں دفتر کی کچھ اور ذمے داریاں بھی سنبھال لوں۔ لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جس کے لیے اتنی رازداری سے کام لیا جاتا۔ وہ یہ باتیں دفتر میں بھی کہہ سکتا تھا۔ خاص طور پر گھر بلانے کی کیا ضرورت تھی؟

اس دوران موبائل پر اس کا فون آگیا۔ وہ باتیں کرتے ہوئے کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی اس کی بیوی اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے پاس آگئی۔



میری سانسیں تیز ہونے لگی تھیں۔ کیونکہ وہ اتنی ہی خوبصورت تھی۔ اس نے کوئی مہنگا پرفیوم بھی لگا رکھا تھا جس کی خوشبو نے مجھے بے خود سا کر دیا تھا۔

''مسٹر شہباز۔'' نازنین نے مجھ سے کہا۔ ''آپ کے کیا مشاغل ہیں۔'' اس نے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے جم خانہ وغیرہ تو جاتے ہوں گے۔''

''نہیں میڈم۔'' میں جلدی سے بولا۔ ''میں ایک غریب سا انسان ہوں، اتنی مہنگی تفریح افورڈ نہیں کر سکتا۔''

''لیکن شاید اب تم غریب نہیں رہو گے۔'' اس نے عجیب سے انداز سے کہا۔

میں اس کی بے تکلفی پر حیران رہ گیا تھا۔ اول تو اس کا یہ کہنا ہی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ میں اب غریب نہیں رہوں گا۔ پھر اس نے آپ کی بجائے تم کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

''میں نہیں سمجھا میڈم؟''

''سامنے کی بات ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اظہر تم پر مہربان ہو گئے ہیں۔ تمہاری تعریف کرتے ہوئے بتا رہے تھے کہ بہت کام کا اور محنتی انسان ہے۔ اس لیے ان کا ارادہ تمہیں اپنی فرم کا جنرل منیجر بنانے کا ہے۔''

میں سکتے میں رہ گیا تھا۔

فرم کا منیجر ہونا بہت بڑی بات تھی۔

بھاری سیلری، فرم کی جانب سے گاڑی، اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ، لیکن سوال پھر وہی تھا کہ آخر کیوں؟ باس کو مجھ میں ایسی کون سی خوبی نظر آگئی کہ وہ مجھ پر اچانک اتنا مہربان ہو گیا تھا۔

''مسٹر شہباز۔'' نازنین نے مجھے مخاطب کیا۔ ''کیا آپ کو معلوم ہے کہ اظہر کی فرم اپنے جنرل منیجر کو جم خانہ کا اعزازی ممبر بھی بنوا دیتی ہے۔''

''نہیں میڈم، یہ مجھے نہیں معلوم تھا۔'' میں نے کہا۔

''اس لیے میں نے جم خانہ کی بات کی تھی۔'' اس نے بتایا۔ ''ممبر شپ اس لیے ہوتی ہے کہ فرم کے منیجر کا اٹھنا بیٹھنا اس معیار کے لوگوں کے درمیان ہو، یہ ایک پروفیشن کی بات ہے۔''

''سمجھ گیا میڈم۔ لیکن کیا ضروری ہے کہ جو کچھ آپ سوچ رہی ہوں اظہر صاحب بھی ایسا سوچ رہے ہوں۔''

''مسٹر شہباز، وہ یہ سوچ چکے ہیں۔'' نازنین نے بتایا۔ ''اس کے علاوہ خود میں بھی یہی چاہوں گی۔''

ایک اور حیرت، آخر کیوں۔ نازنین ایسا کیوں سوچنے لگی۔ میرا اس سے تعلق ہی کیا تھا۔ اس سے میری ملاقات تو آج ہی کچھ ہی دیر پہلے ہوئی تھی۔

اس دوران اظہر علی بھی واپس آگیا۔ میں اسے دیکھ کر جلدی سے کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی قیمتی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''شہباز، اس وقت مجھے ایک میٹنگ اٹینڈ کرنی ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ نازنین نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہوگا۔''

''جی سر، انہوں نے بتا دیا ہے۔ لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے۔''

''کیوں، اس میں نہ سمجھنے والی کون سی بات ہے۔'' اس نے کہا۔ ''تم کل دفتر میں مجھ سے مل لینا۔ تمہارا لیٹر تمہیں مل جائے گا۔ میں جا رہا ہوں۔''

وہ اپنی بیوی کو بائے کہہ کر چلا گیا۔ میں اپنی جگہ کھڑا ہی رہ گیا تھا۔ یہ سب کچھ مجھے ایک خواب کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ ایسا خواب جس کا دورانیہ طویل ہوتا چلا جا رہا ہو۔

''کیوں، اب تو بات سمجھ میں آگئی نا۔'' نازنین نے کہا۔

''یس میڈم۔'' میں جلدی سے بولا۔ ''لیکن میں تو ابھی تک خواب جیسی کیفیت میں ہوں۔''

''تمہارے خواب حقیقت بننے والے ہیں۔'' وہ مسکرا کر بولی۔ ''اب تم جا سکتے ہو۔ اور سنو، اظہر جو کہیں اس پر عمل کرتے رہنا۔ یہ ان کا مزاج ہے۔ جو اُن کی باتوں پر چلتا رہے اس کے لیے وہ بہت کچھ کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں اور جو خلاف ورزی کرے اس کے دشمن ہو جاتے ہیں۔''

''آپ بے فکر رہیں میڈم! ایسے مہربان باس کو کون ناراض کرنا چاہے گا۔''

میں نشے کی سی کیفیت میں اپنے فلیٹ پر واپس آگیا۔ دو کمروں کا ایک چھوٹا سا فلیٹ، جس کا کچن بس اتنا ہی بڑا تھا کہ صرف ایک آدمی کھڑا ہو پاتا۔

اس کی دیواروں کا... پلاستر جگہ جگہ سے گرنے لگا تھا۔ اس فلیٹ میں بہت معمولی انداز کا فرنیچر تھا۔ ظاہر ہے کہ میں اسی قسم کے فرنیچرز افورڈ کر سکتا تھا۔

لیکن اب کچھ دنوں کی بات تھی۔

سب کچھ بدلنے والا تھا۔ حالات تبدیل ہونے جا رہے تھے۔

مجھے ایک بہت بڑی فرم کا جنرل منیجر بنایا جا رہا تھا۔ خدا مجھ پر مہربان ہو گیا تھا۔ خدا نے باس کو مہربان کیا

تھا۔ اس کی بیوی مہربان ہوگئی تھی۔ پورا ماحول مہربان تھا۔ اب میں اپنے لیے دوسرے فلیٹ میں اپنی پسند کے فرنیچرز لاسکتا تھا۔

دوسری صبح میں دفتر میں اپنی سیٹ پر بیٹھا ہی تھا کہ باس کی طرف سے بلاوا آگیا۔ میں بہت دھڑکتے ہوئے دل اور کانپتے ہوئے قدموں کے ساتھ اس کے کمرے میں پہنچا تھا۔

مجھے دیکھ کر باس کے ہونٹوں پر ایک مہربان سی مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ ''بیٹھ جاؤ۔'' اس نے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

میں شکریہ ادا کرتے ہوئے بیٹھ گیا۔

''تمہارا لیٹر تیار ہورہا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''موجودہ منیجر کا ٹرانسفر لاہور ہوگیا ہے۔ دو دنوں تک وہ تمہارے ساتھ رہیں گے۔ اور تمہیں ان کے ساتھ بیٹھ کر پورا کام سمجھ لینا ہے۔ تمہاری کیا کیا ذمّے داریاں ہوں گی، وہ بھی محمود صاحب بتادیں گے۔''

''یس سر۔'' میں نے سعادت مندی سے اپنی گردن ہلادی۔

''اگر تم میرے کہنے پر چلتے رہے تو تمہارے لیے بہت آسانیاں ہوجائیں گی۔'' اس نے کہا۔ ''ہم اپنا ایک آفس انگلینڈ میں قائم کررہے ہیں۔ تمہاری کارکردگی کو دیکھتے ہوئے ہوسکتا ہے کہ وہاں کی ذمّے داریاں تمہارے حوالے کردی جائیں۔''

میرا دل چاہا کہ میں اسی وقت اٹھ کر اس کمرے میں رقص کرنا شروع کردوں۔ کس کس انداز سے میرے خوابوں کی تعبیر میرے سامنے آتی جارہی تھی۔

دفتر والوں کے لیے یہ ایک حیرت انگیز خبر تھی کہ مجھے اس فرم کا جنرل منیجر بنادیا گیا تھا۔ سب کے سب مجھے مبارکبادیں دینے لگے تھے۔ بہت ممکن ہے کہ ان میں سے کچھ میرے حاسد بھی ہوں۔ لیکن اس وقت سب نے گرم جوشی کا مظاہرہ کیا تھا۔

دفتر میں جنرل منیجر کا کمرا بہت شاندار تھا۔ میں جب کبھی اس کمرے میں آتا تو بہت حسرت سے ہر طرف دیکھا کرتا۔ آج میں اس کمرے میں بیٹھنے جارہا تھا۔

کتنی بڑی تبدیلی تھی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ایسے باس کا شکریہ کس طرح ادا کیا جائے۔ سب کے لیے حیرانی کی بات تھی کہ ایسا سخت مزاج باس مجھ پر اتنا مہربان کیوں ہوگیا ہے۔

دفتر کے بوڑھے اکاؤنٹنٹ نے میرے کمرے میں آنے کے بعد مجھ سے کہا۔ ''شہباز صاحب، آپ اس فرم کے جنرل منیجر ہوگئے ہیں۔ آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔ لیکن یاد رکھیں کہ اب آپ دودھاری تلوار پر چل رہے ہیں۔ عہدہ جتنا بڑا ہوتا ہے ذمّے داریاں اتنی ہی بڑھ جاتی ہیں۔''

''جی جناب، مجھے اس کا اندازہ ہے۔''

دفتر کے ذمّے داروں نے مجھے کام سمجھانا شروع کردیا۔ بہت بڑی فرم تھی۔ اس لیے اس کے مسائل بھی زیادہ تھے۔ بہت کچھ تو میں پہلے سے جانتا تھا۔ بہت کچھ اب معلوم ہوتا جارہا تھا۔

تین چار دنوں کے بعد باس اظہر علی نے مجھے بلا کر کہا۔ ''شہباز کام سمجھ میں آرہا ہے نا۔''

''یس سر، آپ کی مہربانی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''سب ہی مجھ سے تعاون کررہے ہیں۔''

''ہوں۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ کچھ دیر تک میری طرف دیکھتا رہا، پھر دھیرے سے بولا۔ ''آج شام کو میرے گھر چلے جانا۔ نازنین تمہیں اپنے ساتھ کلب لے جاکر اس کا ممبر بنوادے گی۔''

''یس سر۔'' میں نے سعادت مندی سے اپنی گردن ہلادی۔

قسمت شاید کچھ زیادہ ہی مہربان ہوتی چلی جارہی تھی۔ میرے لیے راستے کھلنے لگے تھے۔ میں باس کے کہنے کے مطابق شام کو اس کے گھر پہنچ گیا۔

باس کی بیوی نازنین جیسے میرے ہی انتظار میں بیٹھی تھی۔ میں جب اس کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو اس نے بہت بے تکلفی کے ساتھ مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھادیا۔ میں نے جھجکتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ وہ چند لمحوں تک اپنا گداز ہاتھ میرے ہاتھ میں دیے رہی تھی۔ اس وقت اس کے ہونٹوں پر ایک نقلی سی مسکراہٹ بھی تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ ایک خوبصورت عورت تھی، زندگی اور حرارت سے بھرپور، میں اس کا لمس محسوس کرکے پگھلنے لگا تھا۔ پھر میں نے آہستگی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

''مسٹر شہباز۔'' اس نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ ''آپ مجھے پانچ منٹ دیں۔ میں تیار ہوکر آتی ہوں۔''

اس کے جانے کے بعد میں ایک طرف بیٹھ کر اس کے ڈرائنگ روم کا جائزہ لینے لگا۔ کیا نہیں تھا وہاں۔ میرا خیال ہے کہ لاکھوں کا ڈرائنگ روم ہوگا۔

اس کی واپسی میں دس کی بجائے بیس پچیس منٹ لگ گئے تھے۔ لیکن جب وہ آئی تو میں اس کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔

اس نے بننے سنور نے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ اس نے ڈریسنگ ہی ایسی کررکھی تھی کہ اس کا حسن دوآتشہ ہوگیا، پاس آکر اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''ٹھیک ہے۔ کیسی لگ رہی ہوں میں؟''

میں اسے کیا جواب دیتا۔ سر جھکا کر رہ گیا۔

وہ ہنس پڑی۔ ''مسٹر شہباز، اب تمہیں کسی اور سوسائٹی میں موو کرنا ہے۔ وہاں اس قسم کی باتیں عام ہیں۔ اس لیے تم کو بھی اپنا انداز بدلنا ہوگا۔''

''جی بہت بہتر۔''

''چلو، اب چلتے ہیں۔'' اس نے کہا۔

اپنی شاندار گاڑی وہ خود ہی ڈرائیو کررہی تھی۔ اس لیے مجھے اپنے ساتھ ہی بٹھایا تھا۔ سارے راستے میں اس کے بدن سے اٹھنے والی قیمتی پرفیوم کی خوشبو سے مہکتا ہوا گیا تھا۔

کلب میں گاڑی سے اترتے ہی اس نے مجھ سے کہا۔ ''مسٹر شہباز، تم پورے اعتماد کے ساتھ میرے ساتھ ساتھ چلوگے۔ کیونکہ اب تم ایک بہت بڑی فرم کے جنرل منیجر ہو۔''

''جی میڈم!''

''یہ کیا میڈم میڈیم لگا رکھا ہے۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''میرا نام نازنین ہے۔ تم مجھے نازنین کہا کرو۔''

''جی اچھا۔''

کلب میں بہت لوگ اسے جانتے تھے۔ اس نے سب سے میرا تعارف کرایا۔ وہ سب اسی کے طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے۔ خوش حال، دولت مند، بڑے بڑے کاروباری... اور بڑے بڑے سرکاری عہدیدار۔ کیا زندگی تھی؟ لوگوں سے ملنے کے بعد ہم کلب کے دفتر میں آگئے۔ یہاں بھی اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا۔ اس نے میری طرف سے ممبر شپ کا فارم بھر دیا۔

آدھے گھنٹے کے اندر میں اس کلب کا ممبر بن چکا تھا۔ یہ وہ کلب تھا جس کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں یہ سوچا کرتا تھا کہ نہ جانے اس چہار دیواری کے اندر کی دنیا کیسی ہوگی۔ اور آج خود میں اس دنیا کا ایک حصہ بن چکا تھا۔ اور وہ سب مہربان باس کی مہربانی سے ہوا تھا۔

ہم پھر ایک طرف آکر بیٹھ گئے۔ نازنین نے کھانے پینے کی بہت سی چیزوں کے آرڈر دے دیے تھے۔ وہ اس دوران مجھ سے باتیں بھی کرتی رہی تھی۔

اس نے میرے بارے میں درجنوں سوالات کیے۔ اپنے بارے میں بہت کچھ بتایا۔ وہ ایک شگفتہ مزاج کی عورت تھی۔ وہ خوبصورت باتیں کرنا جانتی تھی۔ اس لیے اس سے باتیں کرکے مزہ آنے لگا تھا۔

کھانے سے فارغ ہوکر ہم بہت دیر تک جوگنگ ایریا میں واک کرتے رہے تھے۔ اس وقت شاید میں زمین پر نہیں بلکہ بادلوں پر چل رہا تھا۔

دنیا کے سارے رنگ جیسے اچانک ہی میرے لیے اتر آئے تھے۔ پھر اس نے ایک بات کی۔ ''شہباز، اب یہاں سے تم کہاں جاؤگے۔''

''ظاہر ہے نازنین، میں اپنے فلیٹ میں جاؤں گا۔'' میں نے بتایا۔

''نہیں، تم میرے ساتھ میرے گھر چلوگے۔ تم یہ بتاؤ گھر پر تو تمہارا انتظار نہیں ہورہا ہے۔''

''نہیں میڈم، میرے گھر پر میرا انتظار کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ میں اکیلا ہی رہتا ہوں۔''

''تو پھر کوئی بات نہیں۔ تم میرے ساتھ چلوگے۔'' اس نے مجھے حکم سنادیا تھا۔

ہم کلب میں بہت دیر تک رہے۔ پھر گیارہ بجے واپس آگئے۔ دل کی عجیب کیفیت ہورہی تھی۔ گھر آکر پتا چلا کہ باس آج رات واپس نہیں آنے والا تھا۔ وہ کسی کام سے نائٹ کوچ سے اسلام آباد روانہ ہوگیا ہے۔

''نازنین، میرا خیال ہے کہ مجھے چلنا چاہیے۔'' میں نے کہا۔ ''آپ کہیں تو میں صبح آجاؤں گا۔''

''نہیں، اتنی رات گئے تم کہیں نہیں جاؤگے۔'' اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''تم میرے ساتھ آؤ۔''

وہ مجھے پکڑ کر اپنے بیڈروم لے آئی تھی۔

اس وقت میں ایک ایسی کشمکش میں تھا جس کا تجربہ مجھے پہلی بار ہورہا تھا۔ ایک ایسے خواب کی سی کیفیت ہورہی تھی جیسا خواب آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔

اتنا خوبصورت فرنیچر، اتنا خنک ماحول، نیلی روشنی اور ایک خوبصورت عورت، جس کے اشاروں کو سمجھنے کے لیے کسی خاص عقل کی ضرورت نہیں تھی۔

وہ سراپا نیاز بنی ہوئی تھی... اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ

مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اپنے آپ کو اس سیلاب میں بہہ جانے دوں یا اپنے باس کی عزت کا خیال کرتے ہوئے یہاں سے بھاگ نکلوں۔ جھڑک دوں اس عورت کو۔ اس کو احساس دلا دوں کے یہ بہت غلط کر رہی ہے۔

اور جب اس نے مزید پیش قدمی کی تو میں نے سختی کے ساتھ کہا۔ "میڈم! آپ کو یہ سب نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے جانے دیں۔ جس شخص نے میرے ساتھ اتنی ہمدردی کی ہے مجھے زمین سے اٹھا کر آسمان تک لے آیا ہے۔ میں اس کے ساتھ خیانت نہیں کر سکتا۔"

"بے وقوف ہو تم۔" وہ غصے سے بولی۔ "تمہارا کیا خیال ہے کہ یہ سب اظہر کے علم میں نہیں ہے۔"

"کیا؟" اس کی بات نے مجھے چونکا دیا تھا۔ "باس کے علم میں ہے؟"

"ہاں، تم ایسا کرو، اب تم جاؤ۔" اس نے کہا۔ "اور صبح اظہر سے مل کر میری شکایت کر دینا۔ پھر دیکھو وہ کیا کہتا ہے۔"

"میں ضرور جاؤں گا۔" میں واقعی غصے میں تھا۔ "کیونکہ یہ سب کچھ میرے اصولوں کے خلاف ہے۔"

میں اتنی رات گئے اس گھر سے باہر نکل آیا۔ نازنین نے گاڑی کی پیشکش کی تھی لیکن میں نے انکار کر دیا تھا۔ اس عورت پر واقعی مجھے غصہ آ رہا تھا۔ جو اپنے شوہر کی عزت کو پامال کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

ساری رات میں اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ کیسی بے باک اور بے دھڑک عورت تھی۔ بظاہر کتنی مہذب، لیکن اندر سے کتنی گناؤنی۔ لعنت ہو ایسی عورتوں پر۔

دوسری صبح میں غصے اور ہیجان کے جذبات میں بھرا ہوا اپنے باس کے کمرے میں پہنچ گیا۔ اظہر نے مسکرا کر میری طرف دیکھا تھا، "مبارک ہو مسٹر شہباز، تم کلب کے ممبر بن گئے ہو۔"

"یس سر، لیکن آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں ہاں بتاؤ۔"

"سر، کل رات کو میڈم مجھے اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئی تھیں۔" میں نے بتایا۔

"ہاں، معلوم ہے مجھے۔ اس نے یہ بتا دیا تھا۔"

"سر، کل انہوں نے کچھ ایسی باتیں کیں جو شاید انہیں نہیں کرنی چاہیے تھیں۔" میں نے کہا۔ "مجھے تو بتاتے ہوئے بھی شرم آ رہی ہے سر۔"

"میں سمجھ گیا۔" وہ مسکرا دیا۔ "بیٹھ جاؤ۔ مجھے بھی تم سے ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

"یس سر۔"

"تم کیا سمجھتے ہو کہ اس نے جو کچھ بھی کیا وہ میری مرضی کے بغیر کیا ہوگا۔"

"کیا؟" میں اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

"ہاں شہباز، یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "اور تمہیں اس لیے بتایا جا رہا ہے کہ تم اس بات کا چرچا نہیں کرو گے۔ کسی کو بھی معلوم نہ ہو پائے کہ معاملات کیا ہیں۔"

"آپ بے فکر رہیں سر۔" میں نے یقین دلایا۔ "آپ کھل کر پورے یقین کے ساتھ بات کریں۔"

"المیہ یہ ہے کہ میرا خاندان بہت بڑا ہے۔" اس نے کہا۔ "اور پورے خاندان کی نگاہیں ہماری طرف لگی ہوئی ہیں کہ ہم ابھی تک بے اولاد کیوں ہیں۔ اور کسی کو بھی بتایا نہیں جا سکتا کہ اولاد نہ ہونا میری مجبوری ہے۔ میں اس قابل ہی نہیں ہوں۔"

اس نے اچانک ہی ایک اتنی بڑی بات کہہ دی تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے پورا کمرا گردش کرنے لگا ہو۔ باس اس وقت انتہائی مظلوم اور بے بس دکھائی دینے لگا تھا۔

باس نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر رکھا تھا۔ اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ انسان بھی کتنا بے بس اور کمزور ہوا کرتا ہے۔ اس کی سخت گیری اس وقت نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔

"تم میری بات سمجھ رہے ہو نا۔" باس نے میری طرف دیکھا۔ "ہمیں ایک بچے کی ضرورت ہے۔ وہ بچہ جو نازنین کی کوکھ سے پیدا ہو۔ ہمیں کسی کو اڈاپٹ نہیں کرنا ہے۔"

"سر، دوسری شادی تو ہو سکتی ہے نا۔" میں نے کہا۔

"بے وقوفی کی بات مت کرو۔ اصل کمزوری تو مجھ میں ہے۔ دوسری یا تیسری شادی سے کیا ہونے والا ہے۔"

"یہ بات تو ہے سر۔"

"اب تم نے سمجھ لیا ہوگا کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔" اس نے بات آگے بڑھائی۔ "میں نے مہینوں تمہارے بارے میں سوچا ہے۔ نازنین سے گفتگو کی ہے اور پھر یہ فیصلہ ہوا ہے کہ وہ اولاد تمہاری وجہ سے وجود میں آئے گی۔"

"کیا؟" مجھے ایک زوردار جھٹکا سا لگا تھا۔

"ہاں۔" اس نے اپنی گردن ہلائی۔ "اس بچے کے باپ تم ہو گے۔ لیکن یہ راز صرف ہم تینوں کے درمیان رہے گا۔ کسی کو بھی نہیں معلوم ہونا چاہیے۔ اور بچے کی پیدائش کے بعد تمہارا اس سے کوئی تعلق نہیں رہے گا۔"

"سر، کم از کم پہلے مجھ سے تو پوچھ لیں کہ میں اس قسم کے سودے کے لیے تیار ہوں یا نہیں۔" میں نے کہا۔

"اگر تم عقل مند ہوئے تو کبھی انکار نہیں کرو گے۔ اور اس میں تمہارا نقصان ہی کیا ہے۔ سب کچھ تو مل رہا ہے تمہیں۔ تمہارا عہدہ بڑھ گیا ہے۔ تمہاری سیلری تین گنا ہو گئی ہے۔ تمہارے پاس گاڑی آنے والی ہے۔ اور...... اور ایک خوبصورت عورت کی قربت حاصل کرنے والے ہو۔" اس کی زبان لڑکھڑانے لگی تھی۔

"سر، مجھے افسوس ہے میں یہ سب نہیں کر سکوں گا۔" میں نے کہا۔

"پلیز۔ میری بات مان لو۔" وہ جلدی سے بولا۔ "خود سوچو۔ اس میں ہم سب کی بھلائی ہے۔ اگر تم نے انکار کر دیا تو میں کس کو پکڑنے جاؤں گا۔ تم پر میں بھروسا کر رہا ہوں۔ اس لیے میں نے اتنی بڑی بات تمہیں کہہ دی ہے۔ تم چاہو تو میرے گھر اور میرے خاندان کو برباد ہونے سے بچا سکتے ہو۔"

اب مجھے واقعی اس پر رحم آنے لگا تھا۔ واقعی ایسی صورت تھی کہ کوئی بھی شوہر اس قسم کی بات برداشت نہیں کرتا۔ لیکن وہ اتنا بے بس ہو چکا تھا کہ اس نے میرے سامنے یہ تجویز رکھ دی تھی۔

"سر، اب ایک کام ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں کہو۔" اس نے بے تابی سے پوچھا۔

"آپ میڈم کو طلاق دے دیں۔" میں نے کہا۔

"کیسی بات کر رہے ہو۔ اس سے کیا فائدہ ہوگا؟"

"آپ سن تو لیں سر! یہ طلاق بہت خاموشی سے دی جائے گی۔ کسی کو پتا نہیں چلے گا۔ میڈم آپ ہی کے گھر میں آپ کے پاس رہیں گی۔ وہ عدت کے دن گزاریں گی۔ اس کے بعد میں ان سے نکاح کر لوں گا۔"

"اوہ۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "ہاں، یہ [illegible] بھی ہے۔"

"یہ ایک شرعی اور اخلاقی طریقہ ہوگا سر، ویسے تو اس [illegible] پر شادی کرنا ہی غلط ہے کہ حلالہ کرنے والا طلاق [illegible] دے گا۔ لیکن آپ کے کیس میں شاید اس کی گنجائش نکل [illegible] آئے۔ کم از کم مجھے اطمینان رہے گا کہ میں نے کوئی غلط راہ تیار نہیں کی اور آپ کی بات بھی رہ جائے گی۔"

"لیکن یہ سب کیسے ہو سکتا ہے؟"

"بہت خاموشی سے ہو جاتا ہے سر۔" میں نے کہا۔ "کسی کو کانوں کان خبر ہی نہیں ہوگی۔"

☆☆☆

میری سہاگ رات تھی۔

کچھ عجیب شادی تھی۔ پتا نہیں، سہاگ رات اسے کہنا مناسب بھی تھا یا نہیں لیکن جو کچھ بھی تھا وہ یہی تھا کہ باس نے خاموشی سے نازنین کو طلاق دے دی تھی۔

طلاق کے بعد نازنین اس گھر میں رہی تھی۔ کسی کو خبر بھی نہیں ہو سکی تھی۔ اس نے عدت کے دن گزار لیے تھے۔ اور میں نے اس سے نکاح کر لیا تھا۔

نازنین کے لیے تو یہ رات پہلے بھی آ چکی تھی۔ لیکن میری پہلی شادی تھی۔ پہلا موقع تھا۔

نازنین کو دلہن کیا بننا تھا۔ وہ اپنے عام سے لباس میں مسہری پر بیٹھی تھی۔ میں اس وقت بدقسمت باس کے لیے سوچ رہا تھا۔ کیا نہیں تھا اس آدمی کے پاس۔ پھر بھی کچھ نہیں تھا۔ اس کے دل پر اس وقت کیا گزر رہی ہوگی۔ اس وقت اس کی جو کیفیت ہوگی اس کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔

"شہباز!" نازنین نے مجھے مخاطب کیا۔ "تم نے اچھا کیا جو یہ راستہ نکال لیا۔ ورنہ میں واقعی بہت آگے نکل چکی تھی۔"

"میڈم! میں تو اپنے بارے میں سوچ رہا ہوں کہ کیسی شادی ہے۔" میں نے کہا۔ "ایک معاہدے کے تحت ہماری شادی ہوئی ہے۔ چند گھنٹوں یا چند دنوں کے لیے۔ اس کے بعد سب کچھ ختم ہو جائے گا۔"

"کوئی ضروری نہیں ہے۔" وہ ایک معنی خیز انداز سے بولی۔

"کیا مطلب؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"مطلب یہ کہ تم پر کوئی جبر نہیں ہے۔" اس نے کہا۔ "تم چاہو تو مجھے طلاق دینے سے انکار بھی کر سکتے ہو۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" میں بوکھلا گیا تھا۔

"سب کچھ ہو سکتا ہے۔" اس نے کہا۔ "دیکھو شہباز، عورت کو صرف دولت ہی تو نہیں چاہیے نا۔ اسے ایک بھرپور مرد کی بھرپور قربت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ جو بدقسمتی سے اظہر کے پاس نہیں ہے۔ دولت تو میرے پاس بھی ہے۔ اگر زندگی گزارنا چاہوں تو آرام سے گزار

سکتی ہوں۔"
"میڈم یہ ایک ہنگامے والی بات ہو جائے گی۔ اظہر کبھی برداشت نہیں کریں گے۔"
"میں جانتی ہوں کہ وہ برداشت نہیں کرے گا۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "کیونکہ بدقسمتی سے وہ بے چارہ مجھ سے بہت محبت بھی کرتا ہے۔ لیکن کیا فائدہ ایسی محبت کا۔ یہ تو صرف اپنے آپ کو سلگائے رکھنے کا عمل ہے۔ بس ٹھنڈے بستر پر کروٹیں لیتے رہو۔ اب تم میری زندگی میں شامل ہو گئے ہو۔ اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ اور جہاں تک تمہارے مستقبل کا سوال ہے تو اس کی فکر مت کرو۔ میرے پاس خود اتنے پیسے ہیں کہ میں تمہیں کاروبار کروا سکتی ہوں۔"
"تم نے تو مجھے مشکل میں ڈال دیا ہے۔" میں نے کہا۔
"کوئی مشکل نہیں۔ ہمت کرلو تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ابھی نہیں، مقصد حل ہو جائے تو کچھ دنوں کے بعد اظہر سے کہہ دینا کہ تم مجھے طلاق نہیں دے رہے۔ بس، وہ کیا کر سکتا ہے۔ کیونکہ میں قانونی اور شرعی طور پر تمہاری بیوی بن چکی ہوں۔"
"یہ تو بہت بڑا دھوکا ہوگا نازنین۔"
"دھوکا!" وہ تلخ ہو گئی تھی۔ "کس دھوکے کی بات کر رہے ہو۔ کیا اس آدمی نے مجھ سے شادی کر کے مجھے دھوکا نہیں دیا ہے۔ کیا اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ اندر سے کمزور ہے۔ پھر اس نے اپنی ناک اونچی رکھنے کے لیے مجھ سے شادی کیوں کی! کیا اس نے مجھے دھوکا نہیں دیا۔"
"یہ بات تو ہے۔" میں نے اعتراف کیا۔
"تو بس بھول جاؤ اس کو۔" اس نے کہا۔ "اس نے جو کیا ہے اس کی سزا تو برداشت کرنا ہوگی۔ اگر اس کا خاندان اسے بچے کا باپ دیکھنا چاہتا ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ کیا میں اس کے خاندان کی خوشی کے لیے زندگی بھر سولی پر لٹکتی رہوں۔ بتاؤ، جو کچھ ہو رہا ہے کیا اس میں میرا کوئی قصور ہے؟ کیا عورت کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ کیا وہ اس لیے ہوتی ہے کہ جب چاہا اس سے شادی کرلی، جب چاہا اسے کسی اور کے حوالے کر دیا۔ اور جب چاہا کسی اور سے طلاق دلا کر خود شادی کرلی۔ یہ کیا تماشا ہے۔ یہ کیسا کھیل ہے۔"
نازنین کی باتوں نے مجھے ڈگمگا دیا تھا۔ وہ بھی اپنی جگہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ وہ عورت تھی، انسان تھی۔ اس کے بھی جذبات تھے۔ اس کی بھی خواہشات تھیں۔ وہ جوان اور خوبصورت تھی۔ اس کے لیے بہک جانے کے بے شمار امکانات تھے۔
"چلو اپنے ذہن پر ابھی زور مت دو۔" نازنین نے کہا۔ "ہم اس موضوع پر بعد میں بات کریں گے۔"
دوسری صبح میں معمول کے مطابق دفتر آ گیا تھا۔ کچھ دیر بعد اظہر نے مجھے اپنے کمرے میں بلا لیا۔ وہ بہت پُرامید نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ "ہاں بھائی، اب طلاق کے کاغذات پر سائن کر دو، جو بعد میں کام آئیں گے، تاریخ میں خود ڈال لوں گا۔"
اس نے کچھ کاغذات میری طرف بڑھا دیے۔ اس وقت میرا ذہن کام کرنے لگا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "سر، اتنی جلدی نہ کریں۔ کچھ دن ٹھہر جائیں۔ جس مقصد کے لیے ہم نے یہ سب کیا ہے، پہلے اسے کنفرم تو ہو جانے دیں۔"
"ہوں۔" اس نے ایک طویل سانس لی۔ "یہ بھی ٹھیک کہتے ہو۔"
اس نے کاغذات میز کی دراز میں رکھ لیے۔
"سر، میں نے یہ بات آپ ہی کی بھلائی کے لیے کہی ہے۔"
"ہاں بھئی، تمہاری بات میری سمجھ میں آ گئی ہے۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "اب جاؤ، اپنی سیٹ سنبھالو۔"
میں نے کام شروع کر دیا۔
اس کے بعد یہ ہوتا رہا کہ میں دن بھر دفتر میں رہتا۔ شام کو اپنے فلیٹ چلا جاتا۔ وہاں کچھ وقت گزار کر رات کو اظہر کے گھر آ جاتا جہاں نازنین میرے انتظار میں ہوتی۔ اس کے ارادے ابھی تک مستحکم تھے۔ وہ اظہر کو چھوڑ ہی دینا چاہتی تھی۔ لیکن ابھی تک کوئی پیش رفت نہیں ہو سکی تھی۔
وہ کس طرح بتاتی، یا میں کس طرح اعلان کرتا۔ بہت الجھی ہوئی صورتِ حال تھی۔
نازنین اکساتی رہتی تھی کہ میں بات کر کے اظہر سے یہ کہہ دوں۔ لیکن میں نے اس سے بھی یہی کہا کہ میں کنفرم ہونے کے بعد کوئی فیصلہ کروں گا۔
اور ایک رات جب میں اپنے فلیٹ میں تھا تو میں نے ایک فیصلہ کرلیا اور وہ فیصلہ یہ تھا کہ میں نازنین کو



چھوڑ دوں گا۔ اظہر نے مجھ پر اتنا بھروسا کیا تھا۔ اس نے اپنی سب سے قیمتی چیز میرے حوالے کر دی تھی۔ اس نے میرا عہدہ بڑھایا تھا۔ مجھے اپنی فرم کا جنرل منیجر بنایا تھا۔ اس نے میرے لیے ایک خوش گوار زندگی کے راستے کھول دیے تھے۔ میں کس طرح ان سب باتوں کو نظر انداز کر سکتا تھا۔ میں نے ابھی تک زندگی سے حاصل ہی کیا کیا تھا۔ یہ سب کچھ اسی کی وجہ سے اس کی مہربانیوں سے ہو رہا تھا۔ اس لیے میں اس کو دھوکا نہیں دے سکتا تھا۔ ایک صبح نازنین کو طلاق دے کر یہ کہانی ختم کر دینی تھی۔
دو مہینوں تک اس طرح چلتا رہا۔
دو مہینے کم نہیں ہوتے۔ ایک ایک لمحہ قیامت کا تھا۔ میں ہونے اور نہ ہونے کے درمیان لٹک رہا تھا۔ ایک طرف نازنین کی ضد اور خواہش تھی اور دوسری طرف اپنا وعدہ تھا، اظہر کی مہربانیاں تھیں۔
اور ہوا یہ کہ جب میں نے نازنین کو طلاق دینے کا ارادہ کیا تو اسی وقت نازنین نے ایک ایسی بات بتائی کہ میں لڑکھڑا کر رہ گیا۔ اس نے کہا تھا۔ "مبارک ہو شہباز، تم باپ بننے والے ہو۔"
"کیا؟" میں حیران ہو کر رہ گیا تھا۔ "یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔"
"وہی جو تم نے سنا ہے۔" اس نے کہا۔ "اب ہمارے درمیان اولاد کا مضبوط ترین رشتہ بھی آ گیا ہے۔ تم باپ بننے والے ہو اور میں ماں بننے والی ہوں۔ ہمارے درمیان اب دنیا کا مقدس ترین بندھن ہو چکا ہے۔"
"نازنین اس خبر کا تو اظہر کو بھی انتظار تھا۔" میں نے بتایا۔
"تم اس کی بات مت کرو۔ اپنے آپ کو دیکھو۔" نازنین نے کہا۔ "تم اعلان کر دو کہ تم اب مجھے نہیں چھوڑ رہے ہو۔ یہ تمہارا قانونی اور شرعی حق ہے۔ آنے والا کسی گناہ کا پھل نہیں ہے بلکہ جائز اولاد ہے۔"
"کیسی قسمت ہے۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔ "یہ جائز اولاد بھی کس انداز سے ہماری زندگی میں شامل ہونے آ رہی ہے۔" دوسری صبح جب اظہر نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ اس وقت وہ بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔ نازنین نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔
میں اس کی خوشی کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ اس کے پاس ادھار کی خوشیاں تھیں۔ مانگے کی خوشی۔

جسٹس ناظم حسین صدیقی
عدالت عظمیٰ کے چیف جسٹس۔ ان کا تقرر آئین میں سترھویں ترمیم کی منظوری کے نتیجے میں 31 دسمبر 2003ء کو کیا گیا۔ وہ صوبہ سندھ سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے حیدرآباد یونیورسٹی سے بی اے، ایل ایل بی اور ایل ایل ایم کے امتحانات پاس کیے۔ قانونی تعلیم کی تکمیل کے بعد 1961ء سے 1967ء تک حیدرآباد میں کامیاب وکیل کی حیثیت سے پریکٹس کرتے رہے، بعد ازاں انہوں نے سول جج ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج اور سیشن جج کی حیثیت سے سکھر اور دادو میں خدمات انجام دیں۔ انہیں دو مرتبہ سندھ ہائی کورٹ کے رجسٹرار رہنے کا موقع ملا۔ پھر بطور اسپیشل جج بینکنگ کورٹ، چیئرمین کمرشل کورٹ چیئرمین انسٹیٹیوٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن کراچی اور رکن بورڈ آف گورنرز انڈس ویلی اسکول کراچی میں کام کیا۔ سپریم کورٹ کا چیف جسٹس بننے سے پہلے وہ مرکزی زکوٰۃ کونسل پاکستان کے چیئرمین تھے۔
مرسلہ: زاہد حمیدی صدیقی، حیدرآباد

"مسٹر شہباز، تم نے اپنا فرض پورا کر دیا ہے۔" اظہر نے کہا۔ "اب تم نازنین کو طلاق دے کر ان دونوں سے بالکل الگ ہو جاؤ۔"
اور اس وقت اچانک نہ جانے کس طرح میرے دل میں ایک جذبہ جاگ اٹھا۔ یہ جذبہ میں نے پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ یہ ایک باپ ہونے کا جذبہ تھا۔ اولاد کی محبت کا جذبہ تھا۔
حالانکہ وہ ابھی دنیا میں آیا بھی نہیں تھا۔ اس کے باوجود نہ جانے کتنے خواب میری آنکھوں میں آ گئے تھے۔ میں محسوس کرنے لگا تھا کہ اولاد کی محبت کیا ہوتی ہے اور میں نے اظہر سے صاف صاف کہہ دیا۔ "سوری سر، میں نازنین کو طلاق نہیں دے سکوں گا۔"
"کیا!" حیرت، غصے اور صدمے سے اظہر کے ہونٹ کھلے رہ گئے تھے۔ "کیا بکواس کر رہے ہو تم۔"
"یس سر، اگر نازنین ماں بننے والی نہیں ہوتی تو میرے لیے یہ قدم اٹھانا مشکل نہیں ہوتا۔ لیکن اب وہ ماں بننے والی ہے۔ اور میں باپ بننے والا ہوں۔ اس لیے پلیز

ہمارے حال پر رحم کریں...اور نازنین کو میرے پاس ہی رہنے دیں۔"

"بے وقوف آدمی...!"وہ غصے سے بل کھانے لگا تھا۔"تو نازنین جیسی عورت کو دے ہی کیا سکتا ہے؟ نازنین نے صرف اس مجبوری سے تجھ سے شادی کی تھی۔ ورنہ وہ تو تیری طرف دیکھنا بھی پسند نہ کرے۔"

"نہیں سر، ایسی بات نہیں ہے۔"میں نے کہا۔"یہ تو خود نازنین کی خواہش ہے۔ وہ دوبارہ آپ کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔ کیونکہ عورت کو آپ صرف دولت سے مطمئن نہیں کر سکتے۔"

"بکواس بند کر۔" اظہر غصے سے بل کھانے لگا تھا۔"نازنین نے کبھی ایسا نہیں کہا ہوگا۔"

"آپ فون کر کے معلوم کرلیں۔" میں نے کہا۔"لیکن وعدہ کریں، اس کے بعد آپ ہمیں اپنی مرضی کی زندگی گزارنے دیں گے۔"

"ابھی پتا چل جائے گا۔" اظہر نے فون پر نمبر ملانا شروع کر دیا۔"ہیلو نازنین۔"اس نے نازنین سے بات کی۔"یہ شہباز کیا بکواس کر رہا ہے؟ کیا کہا ہے تم نے؟ کیا تم اس کے ساتھ رہنے کے لیے تیار ہو۔ اچھا، ٹھیک ہے۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔"میں اسے تمہارے پاس بھیج رہا ہوں۔ تم ہی اس کا دماغ درست کردو۔"

ریسیور رکھ کر اس نے میری طرف دیکھا۔"جا جاکر نازنین سے معلوم کرلے۔"اس نے کہا۔"تجھے خود ہی پتا چل جائے گا۔"

"سر، ایک بات تو یہ ہے کہ آپ مسلسل تو تکار سے باتیں کرتے ہوئے میری توہین کیے چلے جا رہے ہیں۔" میں نے کہا۔"جبکہ میں نے ابھی تک ایسی کوئی بات نہیں کی ہے جو آپ کی شان کے خلاف ہو۔"

"اوہو۔" وہ طنزیہ انداز سے مسکرا دیا۔"جناب والا! واقعی مجھ سے غلطی ہوئی ہے جو میں آپ کی شان کے خلاف باتیں کر رہا ہوں۔ لیکن پلیز آپ جائیں بلکہ میرے ساتھ چلیں۔ آپ کو خود اپنی حیثیت کا اندازہ ہو جائے گا۔"

☆☆☆

میری توقع کے بالکل برعکس نازنین نے میرے ساتھ رہنے سے انکار کر دیا تھا۔

اس وقت میرا یہ حال تھا کہ میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی ہو۔"نازنین ہمارے درمیان جو باتیں ہوئی تھیں، وہ کیا تھیں۔"

"بھول جاؤ ان باتوں کو۔"اس نے کہا۔"وہ میری حماقت کی باتیں تھیں۔ جذبات میں آکر ایسی باتیں کہہ رہی تھی۔ پھر میں نے بعد میں بہت سوچا تو اس نتیجے پر پہنچی کہ میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکوں گی۔ آنے والے کو ایک شاندار مستقبل کی ضرورت ہے جو ظاہر ہے تم نہیں دے سکو گے۔ ہماری اولاد کی خواہش پوری ہو چکی ہے تو اب مجھے طلاق دے کر ہماری زندگی سے نکل جاؤ۔"

"نازنین یہ تو سوچو کے اظہر تمہیں وہ خوشیاں نہیں دے سکے گا جو بھرپور محبت کی خوشیاں ہوتی ہیں۔"

"وہ خوشیاں وقتی ہوتی ہیں مسٹر شہباز۔"اس کا لہجہ بہت سرد ہو گیا تھا۔"ان کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ اگر دولت ہو تو عورت دس شہباز خرید سکتی ہے۔"

"ٹھیک کہتی ہو تم۔" میرا لہجہ بہت تلخ ہو گیا تھا۔"مجھ جیسے دس انسان تو خرید لوگی۔ لیکن بچے کا باپ نہیں خرید سکوگی۔ وہ محبت نہیں خرید سکوگی جو ایک حقیقی باپ کے سینے میں ہوتی ہے۔"

ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں کچھ سائے سے آکر گزر گئے۔ پھر اس نے اپنے آپ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔"یہ بھی جذباتی بات ہے۔ اس دور میں سب کچھ ہو جاتا ہے۔ اب تم بھول جاؤ اس تمام کہانی کو۔ مجھے طلاق دے کر یہ سمجھ لو کہ تم ہماری زندگی میں شامل ہی نہیں ہوئے تھے۔"

"لیکن میں نہیں بھولوں گا۔" میں غصے سے بولا۔"یہ کوئی مذاق نہیں ہے۔ تم قانونی اور شرعی طور پر میری بیوی ہو۔ تم پر میرا پورا حق ہے۔ اور اس اولاد پر حق ہے جو اس دنیا میں آنے والی ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھے اس حق سے محروم نہیں کر سکتی۔"

"تم معاہدے کے خلاف جا رہے ہو شہباز۔" اس نے کہا۔

"ایسے معاملات میں اس قسم کے معاہدے نہیں ہوتے۔" میں غصے سے بولا۔"کیونکہ یہ جسم اور روح کا معاملہ ہے۔ میں تمہیں شاید چھوڑ بھی دوں۔ لیکن اپنی اولاد کو نہیں چھوڑ سکتا۔"

"تم شاید پاگل ہو گئے ہو، اس اولاد کے لیے تو یہ سب کیا گیا ہے۔"

"کچھ بھی ہو، میں نے اپنا فیصلہ سنا دیا ہے۔"

میں یہ سب بول کر تو چلا آیا تھا لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میرا دوسرا قدم کیا ہونا چاہیے۔ میں کس طرح نازنین کو اس گھر سے نکالوں۔ کس طرح اپنا حق جتاؤں۔

اب تو یہ سوال ہی نہیں تھا کہ میں اظہر کی فرم میں کام کر سکوں گا۔ یہ دروازہ ہی بند ہو چکا تھا۔ اب تو صرف ایک جنگ لڑنی تھی۔ اپنی بیوی کے لیے اور اپنی اولاد کے لیے۔

میری کہانی بھی کچھ عجیب ہی ہوتی جا رہی تھی۔ سب کچھ ملنے کے باوجود میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ بیوی تھی، لیکن وہ میری نہیں بن رہی تھی۔ اولاد آنے والی تھی۔ لیکن میں اسے اپنا نہیں کہہ سکتا تھا۔ ایک بڑی فرم کا جنرل منیجر تھا لیکن نہیں تھا۔

بہت پیچیدہ صورتِ حال تھی۔ مجھے فیصلہ کرنا تھا۔ اگر میں نازنین اور اظہر کے حق میں فیصلہ کر لیتا تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ پھر سب کچھ ٹھیک تھا۔ میری جاب چلتی رہتی، میرا گھر بحال رہتا۔

لیکن یہ فیصلہ ہی تو نہیں ہو پا رہا تھا۔ میرے اندر کا انسان، مرد اور ایک باپ جاگ اٹھا تھا۔ اگر آنے والا ناجائز طور پر آ رہا ہوتا تو شاید مجھے اس کی زیادہ پروا نہیں ہوتی۔ لیکن وہ میری جائز اولاد تھی۔ اس پر میرا قانونی اور شرعی حق تھا۔ وہ خون تھا میرا۔

اب یہی ہو سکتا تھا کہ میں کسی وکیل سے رجوع کروں۔ میرے پاؤں مضبوط تھے۔ میرا کیس جینئن تھا۔ میں حق پر تھا۔ اس لیے ممکن تھا کہ مقدمے کا فیصلہ میرے ہی حق میں ہوتا۔

ویسے بھی کسی وکیل کے لیے یہ کیس بہت دلچسپ ہوتا۔ اس کیس میں اظہر کی حیثیت بہت کمزور تھی۔ اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔

نکاح کے کاغذات تو میرے پاس تھے۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اگر اولاد ہو جاتی...اور یہ کیس عدالت ہی میں ہوتا تو ڈی این اے ٹیسٹ کے ذریعے یہ ثابت ہو جاتا کہ وہ اولاد میری ہے اور میں اس کا باپ ہوں۔

آج کے دور میں ایسی باتیں میڈیکلی رپورٹ کے ذریعے سامنے آجاتی ہیں۔ ان کو چھپایا نہیں جا سکتا۔ اس لیے آپ نے دیکھا ہوگا کہ فلموں اور ڈراموں سے یہ موضوع ہی ختم ہو گیا ہے۔

اب کوئی کسی پر الزام نہیں لگا سکتا کہ یہ اولاد اس کی نہیں ہے۔ یا اس کی ہے۔ اس لیے میری پوزیشن بالکل ٹھیک تھی۔

دوسری صبح میں دفتر جانے کی بجائے کورٹ کی طرف چل پڑا۔ دفتر تو اب جا ہی نہیں سکتا تھا۔ ابھی میں رکشے کے انتظار میں تھا کہ اچانک دو آدمی میرے دائیں اور بائیں آکر کھڑے ہو گئے۔

"مسٹر......" ان میں سے ایک نے سرد لہجے میں مخاطب کیا۔"وہ سامنے جو گاڑی کھڑی ہے، بس میں جا کر بیٹھ جاؤ۔"

"لیکن کیوں؟"میں نے احتجاج کرنا چاہا۔

"سوال کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ورنہ ہم تمہیں مار کر ڈال دیں گے۔"اس نے کہا۔"بس تم سے دو چار باتیں کرنی ہیں اس کے بعد تمہیں چھوڑ دیا جائے گا۔"

☆☆☆

میں سمجھ گیا تھا کہ یہ کہانی کیا ہے۔

یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں۔ یہ اظہر کے بھیجے ہوئے لوگ ہو سکتے تھے۔ وہ ایک دولت مند آدمی تھا۔ اور اس معاشرے میں ساری طاقت دولت مندوں کے پاس ہوتی ہے۔

غریب بے چارہ تو بس بے چارہ ہی رہتا ہے۔ وہ سوائے صبر کرنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا۔ اور اگر وہ اپنی آواز بلند کرنے کی حماقت کرتا ہے۔ تو اسے مار دیا جاتا ہے۔

جس طرح یہ لوگ مجھے مارنے کے لیے کہیں لے جا رہے تھے۔ کیونکہ یہ اجرتی لوگ تھے۔ انہیں مجھ سے یا اظہر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ انہیں صرف پیسوں سے دلچسپی تھی جو ظاہر ہے کہ میں نہیں دے سکتا تھا۔

میں نے راستے میں ان سے بات کرنا چاہا لیکن وہ اب گونگے بہرے ہو چکے تھے۔ میری کسی بات کا جواب نہیں دے رہے تھے۔

وہ گاڑی بہت تیز رفتاری سے فاصلہ طے کر رہی تھی۔

نہ جانے کیوں میں اس وقت زیادہ خوفزدہ نہیں تھا۔ میں ایک بے حسی کی کیفیت میں تھا۔ کسی بھی قسم کے احساس سے عاری۔ جیسے کوئی پتھر ہو۔

بالآخر ایک ویران مقام پر آکر گاڑی روک دی گئی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ وہی جگہ ہے جہاں مجھے مارا جائے گا۔ اس کے باوجود ذہن کی وہی کیفیت تھی۔

انہوں نے مجھے گاڑی سے اترنے کے لیے کہا۔ وہ تین آدمی تھے۔ ایک گاڑی چلا رہا تھا۔ دو اور تھے۔ اور ان دونوں کے پاس اسلحہ تھا۔"چلو اترو۔" اس نے کہا۔ جس

نے پہلے بات کی تھی۔

میں گاڑی سے اتر آیا اور اس وقت میرے احساسات جیسے اچانک بے دار ہو گئے ہوں۔ بے بسی کی دھند چھٹ گئی تھی۔ میں خوفزدہ تھا۔ بہت بری طرح خوفزدہ۔

انسانی جبلّت پوری طرح بے دار ہو چکی تھی۔

اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ سکتے۔ میں نے اپنے قریب والے کو ایک زور دار دھکا دیا اور بے تحاشا ایک طرف دوڑ لگا دی۔

"رکو۔ رکو۔" اس آدمی نے آواز لگا دی۔

لیکن میں لہراتا ہوا دوڑ رہا تھا۔ کبھی اِدھر کبھی اُدھر۔ نہ جانے اس وقت میرے ذہن میں یہ طریقہ کہاں سے آ گیا تھا۔ ایک ہی دھن سوار تھی جان بچانی ہے تو بس پاگلوں کی طرح دوڑتے چلے جاؤ۔ اور میں لہراتا ہوا دوڑتا چلا گیا۔

ایک گولی چلی، میری زندگی تھی کہ وہ گولی میرے برابر سے گزر گئی۔ شاید خدا کو میری زندگی بچانی تھی۔ اس لیے میں اس گولی سے بچ گیا تھا۔

پھر اچانک ہی ایک معجزہ سا ہوا۔

اس ویران راستے پر نہ جانے کہاں سے ایک گاڑی آ نکلی۔ وہ گاڑی پولیس کی تھی۔ اس کو دیکھ کر مجھ کو یہاں تک لانے والے اپنی گاڑی میں فرار ہو چکے تھے۔ جبکہ میں نڈھال ہو کر نیم بے ہوش سا ایک طرف گر پڑا تھا۔

پولیس کی گاڑی میرے پاس آ کر رک گئی۔

ان میں سے دو پولیس والے اتر آئے۔ انہوں نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا تھا۔ اس وقت میری دونوں ٹانگیں ایسی بری طرح کانپ رہی تھیں کہ مجھ سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔

وہ دونوں مہربان قسم کے تھے۔ مجھے سہارا دے کر وین میں لے جا کر بٹھا دیا۔ ایک نے ایک گلاس پانی دیا۔

پانی پی کر میرے اوسان کچھ قابو میں آئے تھے۔

"ہاں، اب بتاؤ کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ۔"

"جناب، میں دفتر جا رہا تھا کہ اچانک ایک گاڑی میرے پاس آ کر رکی اور مجھے زبردستی اٹھا کر یہاں لے آئے۔ مجھے مارنا چاہتے تھے، لیکن میں ان کو دھوکا دے کر بھاگ نکلا۔ آپ کی گاڑی کو دیکھ کر وہ بھی بھاگ گئے۔"

"ہاں، ایک گاڑی تیزی سے نکلی تو تھی لیکن ہمارا دھیان تم پر تھا۔ کون تھے وہ لوگ؟"

"میں نہیں جانتا۔" میں نے بتایا۔ "بس اٹھا کر لے آئے تھے۔"

"بغیر کسی دشمنی کے؟"

میرا دل چاہا کہ ان پولیس والوں کو ساری کہانی سنا کر اظہر کے بارے میں بتا دوں۔ لیکن یہ سوچ کر رہ گیا کہ... اظہر کے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا میرے پاس۔

"کیا تم کوئی بڑی اسامی ہو؟" ایک نے پوچھا۔

"نہیں بھائی، میں تو ملازمت پیشہ ہوں۔ شہر کی ایک فرم میں کام کرتا ہوں۔"

"پھر کیوں اٹھا لائے؟"

"چھوڑیں سر جی۔" ایک پولیس والے نے کہا۔ "آج کل اسی طرح کی کتنی کہانیاں ہونے لگی ہیں۔ کسی نہ کسی کو زبان و بل وغیرہ کی بنیاد پر اٹھا کر لے آتے ہیں۔ پھر دوسرے دن بے چارے کی لاش ملتی ہے۔ یہ تو روز کا چکر ہو گیا ہے۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔" اس نے کہا۔ "کیا تم کسی کے خلاف پرچہ کٹوانا چاہتے ہو؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"کس کے خلاف جناب، جبکہ میں کسی کو جانتا بھی نہیں ہوں۔"

"چلو، تمہیں دفتر پہنچا دیتے ہیں۔"

میں شاید پھر اپنی موت کی طرف جا رہا تھا۔ اس حملے کی ناکامی نے اظہر کو جھلا دیا ہوگا۔ وہ دوسرا قدم بھی اٹھا سکتا تھا۔ وہ پیسے والا تھا۔ اس کے وسیع تعلقات تھے۔ کہ میری کوئی حیثیت نہیں تھی۔

لیکن میں اپنے بچاؤ کے لیے زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا تھا کہ اپنا فلیٹ خالی کر دوں۔ کہیں روپوش ہو جاؤں۔ کم از کم اظہر کی نگاہوں سے غائب ہو جاؤں۔

میں نے یہی کیا ہے۔ میں ایک بزدل اور کمزور انسان ہوں۔ اس لیے میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کر پایا۔

اس کے بعد اظہر کی طرف سے بھی خاموشی ہو گئی۔ نہ کسی نے مجھ سے ملنے کی کوشش کی۔ نہ کسی کا فون وغیرہ آیا۔ جیسے ان کے لیے میں گم ہو گیا تھا۔ اور میرے لیے وہ۔

اب برسوں گزر گئے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ اظہر اور نازنین کا کیا حال ہے۔ لیکن پچھلے دنوں اتنا ضرور معلوم ہوا ہے کہ اظہر کی فرم کا چارج اس کے بیٹے نے سنبھال لیا ہے۔

اور وہ بیٹا کون ہو سکتا ہے؟



# راجا اندر

محترم مدیر اعلیٰ

سلامِ تہنیت!

یہ زندگی کیسے کیسے لوگوں سے آشنا کراتی ہے۔ میں ایسے ہی لوگوں کی تلاش میں رہتا ہوں اور ہر بار ایک نہ ایک ایسا ہی کردار مجھے نظر آجاتا ہے۔ اس بار بھی ایک منفرد کردار کے حامل کی سرگزشت لے کر آیا ہوں۔ امید ہے قارئین کو بھی پسند آئے گی۔


منظر امام
(کراچی)


وہ بہت عجیب آدمی تھا۔

کرداروں کی تلاش میں رہتے رہتے ایسے لوگ ملتے رہتے ہیں جن کی نفسیاتی گرہیں بے مثال ہوا کرتیں۔

مجھے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ میں نے کئی کرداروں کی کہانیاں لکھی ہیں۔ یہ دلچسپ کردار ہمارے اپنے معاشرے کے ہوتے ہیں بس ان پر نظر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

فیاض بھی ایک ایسا ہی کردار تھا۔ اس سے میری ملاقات ایک پارک میں ہوئی تھی۔ میں یوں ہی ٹہلنے کے لیے اس پارک میں چلا گیا تھا۔ وہاں میں نے فیاض کو پہلی بار دیکھا۔

ایک تیس بتیس کی عمر کا انسان۔ سنولایا ہوا رنگ۔ بدن دبلا پتلا۔ اس حلیے کے لوگ تو ہر جگہ پھیلے ہوتے ہیں یعنی اس کی شخصیت میں ایسی کوئی بات نہیں تھی کہ دوسری بار دیکھنے کی خواہش ہو۔

میں اس کے برابر والی بینچ پر جا کر بیٹھ گیا تھا۔ دراصل اس کی بڑبڑاہٹ نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ وہ غصے کے عالم میں بولے جا رہا تھا۔ "کم بخت، یہ لڑکیاں اپنے آپ کو نہ جانے کیا سمجھتی ہیں۔ ایک گھنٹے سے انتظار کر رہا ہوں نہ جانے کہاں جا کر مر گئی۔"

بولتے بولتے اس کی نگاہ مجھ پر پڑی اور اس نے جھینپ کر دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ میں نے اس کی بڑبڑاہٹ سن لی ہے۔

کچھ دیر بعد اس کی ناراضی کا سبب سامنے آ گیا۔ وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی جس نے سن گلاسز لگا رکھے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ اسی کی طرف آ رہی تھی۔ وہ شخص اسے دیکھتے ہی

برس پڑا۔ ”شرم نہیں آتی ایک گھنٹے سے انتظار کرا رہی ہو۔“
اس لڑکی نے جواب میں جو کچھ کہا وہ میں نہیں سن پایا تھا بہرحال وہ دونوں وہاں سے کچھ دور ایک اور بینچ پر جا کر بیٹھ گئے۔
میں اس آدمی کی قسمت پر رشک کر رہا تھا۔ کم بخت میں ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی اور اس نے ایک خوبصورت لڑکی کو اپنے قابو میں کر رکھا تھا۔
دونوں اب ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھ کر چلے گئے۔
میری فیاض سے دوسری ملاقات ایک ہوٹل میں ہوئی تھی۔ یہ اتفاق تھا کہ فیاض وہاں پہلے سے موجود تھا اور اس بار بھی ایک لڑکی اس کے ساتھ تھی۔
میں اس لڑکی کو مکمل طور پر تو نہیں دیکھ سکا تھا کیونکہ وہ برقع میں تھی اور صرف اس کی خوبصورت آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔
دونوں ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ ان کی وہی باتیں تھیں جو ایسے جوڑوں کی ہوا کرتی ہیں۔ شکوے، شکایات، شوخ گفتگو وغیرہ۔
اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ آخر ہے کون جس نے بہ یک وقت دو لڑکیوں سے ایسی دوستی کر رکھی ہے۔
پھر ایک دن فیاض سے میری باقاعدہ ملاقات ہو ہی گئی۔
یہ ملاقات محلے ہی میں ہوئی تھی۔ میرے محلے میں ایک ٹی ہاؤس ٹائپ کی چیز تھی جہاں ڈھنگ کی چائے ملا کرتی۔ ہم سارے دوست اسی میں بیٹھا کرتے تھے۔
ہم میں سے اکثر کو لکھنے لکھانے اور شاعری وغیرہ کا شوق تھا۔ اسی لیے ہم محلے کے دانش ور خیال کیے جاتے تھے۔ اس شام ہماری گفتگو کا موضوع ادب نہیں بلکہ ایک ایسا شخص تھا جو پچھلے ہفتے اس محلے میں آ کر آباد ہوا تھا۔
”یار، وہ تو کمال کا آدمی ہے۔“ میرے دوست انور مانی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
”کیوں، کیا خاص بات ہے اس میں؟“ میں نے پوچھا۔
”خاص بات یہ ہے کہ ہم نے لڑکیوں پر شاعری کی ہے اور اس نے لڑکیوں سے دوستی کی ہے۔“ انور نے بتایا۔ ”پتا نہیں اس کے پاس کیا جادو ہے۔ ایسے ایسے قصے سناتا ہے کہ بس کچھ نہ پوچھو۔“
”اور تم بھی اس کی باتوں میں آ گئے۔“ میں ہنس پڑا۔
”ارے بھائی بہت سے لوگ اپنے احساسِ کمتری کو چھپانے کے لیے اسی قسم کی باتیں کرتے ہیں۔“
”وہ دیکھو وہ آ رہا ہے۔“ ایک اور دوست نے آواز لگائی۔
اس دوران وہ آنے والا ہوٹل میں داخل ہو چکا تھا اور وہ وہی تھا جسے میں دو لڑکیوں کے ساتھ دیکھ چکا تھا۔ ہمارا تعارف کروایا گیا اس نے اپنا نام فیاض بتایا تھا۔
مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر شناسائی کی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ ظاہر ہے وہ دو بار مجھے قریب سے دیکھ چکا تھا۔
پھر اِدھر اُدھر کی باتیں شروع ہو گئیں۔ باتوں کے درمیان پتا چلا کہ وہ شادی شدہ ہے اور کسی سرکاری محکمے میں کام کرتا ہے۔
وہ ادب سے بھی دلچسپی رکھتا تھا۔ کچھ دیر کی باتوں کے بعد اندازہ ہو گیا کہ وہ باتیں کرنے کا ہنر جانتا ہے اور اس کا مطالعہ بھی زبردست تھا۔
اس کے جانے کے بعد میں نے انور مانی کی تصدیق کر دی۔ ”یار، تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں خود اسے دو بار دو مختلف لڑکیوں کے ساتھ دیکھ چکا ہوں۔“
”لیکن کیوں۔“ بہزاد میز پر گھونسا مار کر بولا۔ ”لڑکیاں ہمارے ساتھ کیوں نہیں ہوتیں۔ اس میں کون سی خاص بات ہے۔“
”ہاں یار، پرسنالٹی بھی بے کار سی ہے۔ جاب بھی بس یونہی ہے۔ دولت بھی نہیں ہے اس کے پاس پھر لڑکیاں کیوں اس کے چکر میں آ جاتی ہیں۔“
”ایسا تو نہیں کہ سالا کالا جادو جانتا ہو۔“
”ہو سکتا ہے۔“ کسی نے کہا۔
بہرحال یہ تھا فیاض اور اس کے حالات۔
وہ اب تقریباً روزانہ ہی ہم لوگوں کے ساتھ بیٹھا کرتا تھا۔ چونکہ اس کی باتیں بھی ادبی اور خوبصورت ہوا کرتیں اسی لیے ہم اسے برداشت کر لیتے۔ دوسری طرف اس کی ملاقاتوں کی داستانیں چلتی رہتیں۔
خود اس کا یہ کہنا تھا کہ وہ دو ہفتے میں ایک نئی لڑکی سے دوستی کیا کرتا ہے اور جس لڑکی سے ایک بار ملاقات ہو جائے وہ بس اسی کی ہو کر رہ جاتی ہے، وہ اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔
”لیکن کیوں؟“ میں نے ایک دن اس سے پوچھا۔
”لڑکیوں کو تم میں کیا دکھائی دیتا ہے۔“



”یہ تو کسی لڑکی سے پوچھو۔“ وہ مسکرا کر بولا۔ ”کوئی نہ کوئی خوبی تو ہو گی نا۔“
”فیاض بھائی، وہی تو پوچھ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”کون سا جادو ہے تمہارے پاس۔“
”ہر انسان کے پاس کوئی نہ کوئی صلاحیت ہوتی ہے۔ اتفاق سے میرے پاس یہی صلاحیت ہے۔“
”یہ تو بہت رنگین قسم کی صلاحیت ہے۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔
وہ ہنس پڑا۔
وہ اکثر ہم لوگوں کو اپنی داستانیں سنایا کرتا۔ مجبوری یہ تھی کہ ہم اس کی داستانوں پر یقین کرنے کے لیے مجبور تھے کیونکہ ہم میں سے اکثر اس کی رنگین داستانوں کے دلچسپ کرداروں کو دیکھ چکے تھے۔
ایک دن میں نے اس سے دریافت کیا۔ ”یار فیاض ایک بات بتاؤ کیا بھابی کو تمہاری ان حرکتوں پر اعتراض نہیں ہوتا۔“
”اول تو پتا ہی نہیں چلنے دیتا۔“ اس نے کہا۔ ”ویسے میں اس سے کہہ چکا ہوں کہ میں ہر حال میں اسی کا ہوں۔ چاہے جہاں بھی جاؤں لیکن میری واپسی اسی کے پاس ہو گی۔“
اس معاملے میں بھی خوش قسمت ہو تم۔“
وہ مسکرا کر رہ گیا۔
ایک دن میں نے اسے ایک شاپنگ سینٹر سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا۔ اس بار اس کے ساتھ کوئی اور لڑکی تھی۔ اس نے بھی گرچہ برقعہ پہن رکھا تھا اور نقاب کے پیچھے سے صرف آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں لیکن وہ کوئی اور لڑکی تھی کہ اس کی چال میں ہلکی سی لنگڑاہٹ تھی۔
نہ جانے یہ شخص لڑکیوں کو کس طرح بہکا کر لاتا ہو گا اور حیرت کی یہ بات تھی کہ باپردہ قسم کی لڑکیاں ہی اس کے جال میں پھنستی تھیں۔
اس وقت مجھے اس پر غصہ آ رہا تھا۔
یہ سوچ کر بھی غصہ آیا تھا کہ خود اس کے گھر کی حالت خستہ تھی اور وہ لڑکیوں اور عورتوں کو شاپنگ کراتا پھر رہا تھا۔
میں نے سوچا اس لڑکی کا تعاقب کر کے کم از کم اس کے گھر والوں کو ضرور بتا دوں گا۔ کم از کم ایک تو اس کے شر سے بچ جائے۔
وہ دونوں ایک طرف چل پڑے۔
میں کچھ فاصلے سے ان کا تعاقب کر رہا تھا لیکن یہ میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ فیاض اچانک ٹیکسی روک کر اس

## دیگر راہ نصیحت

اللہ ربُ العزت نے مجھے تین جڑواں بیٹوں سے نوازا۔ اس پر کراچی سے ایم این اے مولانا شاہ تراب الحق نے قومی اسمبلی میں نقطۂ اعتراض پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ محکمہ خاندانی منصوبہ بندی کو بند کر دینا چاہیے کیونکہ وزرا خود اس پر عمل نہیں کر رہے اور ان کے یہاں بہ یک وقت تین تین بچوں کی پیدائش ہو رہی ہے۔ اس بات پر پورا ایوان کشتِ زعفراں بن گیا۔ ایوان میں موجود اس وقت کے وزیراعظم محمد خان جونیجو نے مجھے بلا کر تصدیق چاہی کہ کیا شاہ صاحب کی بات درست ہے۔ میرے ہاں کہنے پر بھی وہ خوب ہنسے۔
چاہ یوسف سے صدا/از یوسف رضا گیلانی
انتخاب: اقتدار احمد خان، خان پور کٹورہ

میں بیٹھ جائے گا اور میں اس کو دیکھتا رہ جاؤں گا۔
بہرحال یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا۔ فیاض کے عشق کی داستانیں سن سن کر ہمارا خون کھولتا رہا لیکن ہم سوائے اپنی بدنصیبی پر افسوس کرنے کے اور کیا کر سکتے تھے۔
ان ہی دنوں اس کی شخصیت میں ایک بہت بڑی تبدیلی آ گئی۔ کچھ دنوں سے فیاض نے اپنی داستانیں سنانی ختم کر دی تھیں اور وہ کسی نئی لڑکی کے ساتھ بھی دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ ہم نے ایک بات محسوس کی کہ اس کے مزاج میں چڑچڑا پن بھی شامل ہو گیا تھا۔
اس کے لطیفے کہیں کھو گئے تھے اور اس کی باتوں میں وہ پہلے جیسی چاشنی نہیں رہی تھی۔ خدا جانے کیا بات تھی جس نے فیاض کو بدل کر رکھ دیا تھا۔
ایسا لگتا تھا جیسے وہ راتوں کو جاگتا بھی رہتا ہے۔ اس کی آنکھوں کے گرد حلقے یہ ظاہر کرتے رہتے تھے۔ اوروں نے شاید یہ بات محسوس نہ کی ہو لیکن میں نے محسوس کر لی تھی۔
پھر وہ اچانک غائب ہو گیا۔ غائب سے مراد یہ ہے کہ اس نے ٹی ہاؤس کی طرف آنا ترک کر دیا تھا جہاں ہم ایک ساتھ بیٹھا کرتے تھے۔
ایک دو دنوں تک سرسری انداز میں اس کا ذکر ہوتا رہا پھر یاروں نے نئے موضوعات تلاش کر لیے اور بھی غم تھے

زمانے میں اس شخص کے سوا۔
میں ذاتی طور پر اس کی طرف سے پریشان تھا۔ اس لیے صورتِ حال معلوم کرنے کے لیے اس کے گھر پہنچ گیا۔ پہلا موقع تھا کہ میں اس کے گھر آیا تھا۔
دستک کے جواب میں ایک لڑکی نے دروازہ کھولا۔ پہلی نظر میں وہ لڑکی ہی معلوم ہوئی تھی۔ خوبصورت اور دبلی پتلی سی۔ میں نے اسے اپنا نام بتاتے ہوئے پوچھا۔ ”فیاض کئی دنوں سے دکھائی نہیں دیے۔ اسی لیے میں ان کی خیریت معلوم کرنے آیا ہوں۔“
”وہ بیمار ہیں۔“ اس نے بتایا۔
”اوہ ! مجھے اندازہ تھا کہاں ہیں اس وقت۔“
”گھر میں ہیں لیکن خواب آور دوا دی گئی ہے ان کو۔“
”میری طرف سے پوچھ لیجیے گا ان کو۔“
”آپ آئیں۔ اندر آجائیں۔“ اس نے کہا۔ ”فیاض اکثر آپ کا ذکر کرتے ہیں۔“
”آپ فیاض کی۔“
”جی۔۔جی میں ان کی مسز ہوں۔“ اس نے بتایا۔
میں نے ایک گہری سانس لی۔ کم بخت بیوی کے معاملے میں بھی خوش نصیب ثابت ہوا تھا چونکہ وہ سویا ہوا تھا اسی لیے میں نے اس کے گھر میں داخل ہونا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ ”میں پھر کبھی آجاؤں گا۔“ میں نے کہا۔
”نہیں آپ آئیں، میں آپ کو ان کی بیماری کے بارے میں بتانا چاہتی ہوں۔“
اس کے بے حد اصرار پر میں اس کے چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گیا۔ وہ میرے سامنے بیٹھی تھی۔ اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ”آپ کو معلوم ہے کہ فیاض کی کیا بیماری ہے؟“
”نہیں یہ میں نہیں جانتا۔“
”وہ انتہائی ڈپریشن کا شکار ہیں۔“ اس نے بتایا۔
”خیریت۔ کیوں ہوا ایسا۔“
”اس کی وجہ شاید خود میں ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”میں نے ان کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اسی لیے وہ بیمار ہو گئے۔ خدا کے لیے آپ ہی انہیں سمجھائیں ورنہ وہ پاگل ہو جائیں گے۔“
”کیا انکار کیا تھا آپ نے؟“
”ان کے پاگل پن میں ان کا ساتھ دینے سے۔“ اس نے بتایا۔ ”کیونکہ اب انتہا ہو گئی تھی۔ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ جینز اور شرٹ پہن کر میرے ساتھ چلو۔“
”معاف کیجیے گا۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی وہ ایسا کیوں کہہ رہے تھے۔“
”شوق ہے ان کو۔ پاگل پن ہے ان کا۔“ اس نے بتایا۔ ”وہ ہر ہفتے مجھے مختلف ڈریس پہنا کر مختلف جگہوں پر ملتے ہیں ..... اب کیا بتاؤں شرم آتی ہے بس یہ سمجھ لیں کہ محبوب اور محبوبہ کی طرح پھر ہم ہوٹلز جاتے ہیں، پارک جاتے ہیں، شاپنگ کرتے ہیں پھر چپکے سے گھر واپس آجاتے ہیں۔“
”کیا۔“ اس انکشاف نے میرے ہوش اڑا دیے تھے۔ ”کیا ہر بار آپ ہی ان کے ساتھ ہوتی تھیں۔“
”جی ہاں۔ کبھی برقع پہنا کر، کبھی چشمہ لگا کر۔ ایک بار تو انہوں نے میری چال تک بدلوا دی تھی۔ کہنے لگے، تھوڑا تھوڑا لنگڑا کر چلنا ہے۔ میں اسی طرح چلتی رہی لیکن اب معاملہ میری برداشت سے باہر ہو گیا ہے۔ میں نے جب صاف انکار کر دیا تو بیمار پڑ گئے۔“
”اوہ خدا !“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ اب میں فیاض کی پرابلم سمجھ گیا تھا۔ ”وہ نفسیاتی مریض ہیں اور میں آپ کو یہ مشورہ دیتا ہوں کہ اگر آپ ان کو خوش رکھنا چاہتی ہیں تو وہی کریں جو وہ کہتے ہیں ورنہ وہ ڈپریشن کا شکار رہیں گے۔“
”لیکن یہ تو عجیب پاگل پن ہے۔“
”چلنے دیں اسی طرح اس میں آپ کا کیا جا رہا ہے۔ آپ کے لیے تو اطمینان کی بات یہ ہونی چاہیے کہ آپ کا شوہر کسی غیر لڑکی کے ساتھ فلرٹ کرنے کی بجائے آپ ہی کے ساتھ گھومتا پھرتا ہے۔ آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔“
اور شاید میری بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ ”ٹھیک ہے بھائی صاحب، میں ویسا ہی کروں گی جیسا آپ نے کہا ہے۔“
اور تیسرے ہی دن فیاض پھر ٹی ہاؤس میں ہمارے درمیان آکر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے وہی لطیفے تھے۔ ویسی ہی چاشنی بھری گفتگو تھی اور ویسی ہی داستانیں تھیں۔
لیکن صرف مجھے معلوم تھا کہ ان داستانوں کی حقیقت کیا ہے۔ اس کی بیوی نے مجھ سے قسم لی تھی کہ میں کبھی فیاض پر یہ راز ظاہر نہیں کروں گا کہ میں سب جانتا ہوں۔
اتنے دنوں کے بعد مجھے وہ کردار یاد آگیا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے، کس حال میں ہے، کیا اس کی حرکتیں جاری ہیں یا اس نے اپنے احساسِ کمتری کو بہلانے کا کوئی اور راستہ نکال لیا ہے۔



# مصلحتِ محبت

محترم ایڈیٹر سرگزشت
سلام تہنیت!
میری ایک جاننے والی جو پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہیں اور میری طرح سرگزشت کی دیوانی ہیں۔ انہوں نے کل ایک سچ بیانی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ کہانی کا ایسا انجام نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس پر میں نے جواب دیا کہ سرگزشت کی یہی خوبی ہے کہ وہ منفرد آپ بیتیوں کو پیش کرتا ہے۔ کئی مشہور آپ بیتیاں جو سرگزشت کی زینت ہیں ان کے متعلق بتایا تو وہ قائل ہوئیں اور تب میں نے سوچا کہ میں اپنی سرگزشت بھی لکھ بھیجوں۔ اگر میری سرگزشت پسند آجائے تو پلیز میرا اصل نام شائع نہ کریں۔
روبینہ ناز
(لاہور)

میرا شوہر شراب پیتا ہے۔ یہ کوئی ایسی اطلاع نہیں تھی کہ میں اپنا گھر خراب کر لیتی۔ سمجھا سکتی تھی جھگڑ سکتی تھی۔ یہ سب میں نے کر کے دیکھ لیا۔ وہ توبہ کر لیتے تھے مگر توبہ ایک یا دو دن کی۔ پھر میں نے یہ سوچ کر صبر کر لیا کہ وہ محض شرابی نہیں، سول انجینئر بھی تو ہے۔ مجھے اچھی زندگی دے رہا ہے۔ میرے بچوں کا تن پیٹ کاٹ کر تو شراب نہیں پیتا۔ اوپر تلے چار بچے ہو گئے تو یہ خیال ہی دل سے نکل گیا کہ میں اسے چھوڑ سکتی ہوں۔ یہ خیال تو اس وقت دل میں آیا جب

مجھے یہ معلوم ہوا کہ میرا شوہر صرف شرابی نہیں قاتل بھی ہے۔ اور قاتل بھی کس کا؟ میرے سابق شوہر کا۔ یہ خبر کوئی دوسرا پہنچاتا تو شاید مجھے یقین بھی نہ آتا۔ یہ دعویٰ تو خود میرے شوہر نے کیا تھا اور وہ بھی نشے کی حالت میں جس میں کہتے ہیں انسان سچ بولتا ہے۔ مصلحت تو عقل سکھاتی ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ کون سی بات چھپانی ہے کون سی بتانی ہے۔ نشے میں عقل ماری جاتی ہے۔ انسان سوچے سمجھے بغیر وہ سب کہہ جاتا ہے جو اسے معلوم ہوتا ہے۔ یہ نہیں سوچتا کہ اس کے ثمرات کیا ہوں گے۔

میری بڑی بیٹی انیس سال کی ہوگئی تھی۔ کچھ لوگ اس کے رشتے کے لیے آنے والے تھے۔ کتنی عجیب بات تھی کہ اس کا باپ اس رات بھی نشے کی حالت میں گھر پہنچا تھا بلکہ اس رات کچھ زیادہ ہی پی لی تھی۔ ڈرائیور انہیں سہارا دے کر کمرے تک لایا تھا۔ وہ جب اس حالت میں آتے تھے تو میں ناگواری کے باوجود ان کی خدمت میں لگ جاتی تھی۔ ان کے جوتے اتارتی تھی۔ ان کے سر کے نیچے تکیہ رکھتی تھی۔ کچھ کھانے کو کہتے تھے تو اسی وقت حاضر کرتی تھی لیکن اس وقت میں سخت غصے میں تھی۔ میں نے آنکھ اٹھا کر بھی ان کی طرف نہیں دیکھا۔ بس یہی غضب ہوگیا۔ انہوں نے اپنے پاؤں سے جوتا نکالا اور میری طرف اچھال دیا۔

”کتیا! تیرا شوہر گھر آیا ہے۔ اتار میرے جوتے اور میرے لیے کھانا گرم کر۔“

”اب اپنے کام خود کیا کرو۔ بہت کرلی میں نے خدمت۔ جوانی سے بڑھاپا آگیا۔ ایک لمحہ جو سکون کا ملا ہو۔“

”کیا کہا۔“ وہ زور سے دہاڑا۔”میں نے تجھے ایک لمحہ بھی سکون کا نہیں دیا؟“

”آہستہ بولو۔ بچے بڑے ہوگئے ہیں۔ کم از کم ان پر تو تمہارے کرتوت ظاہر نہ ہوں۔“

”کیا ہیں میرے کرتوت؟“ وہ اٹھا اور میرے بال پکڑ کر جھول گیا۔”تجھ سے محبت کی۔ تجھے اپنے گھر لے کر آیا۔ یہ ہیں میرے کرتوت۔ یہی تھی میری غلطی۔“

غلطی مجھ سے بھی ہوئی۔ میں یہ بھول گئی کہ جب آدمی نشے میں ہو تو اس سے بحث نہیں کرنی چاہیے۔ میں اس سے بحث کرنے لگی۔

”تم نے محبت نہیں کی تھی اپنی غرض پوری کی تھی۔ مجھے اپنی آوارگی کی بھینٹ چڑھایا تھا۔ محبت کرتے تو محبت کا ثبوت بھی دیتے۔ یوں میری زندگی برباد نہ کرتے۔ بچے جوان ہوگئے اور تم سے شراب نہیں چھوٹتی۔ واہ بھئی واہ! خوب محبت ہے۔“

میں نے اسے جھوٹا قرار دے دیا تھا۔ اس کی محبت کا دعویٰ ٹھکرا دیا تھا۔ اس کے تو جیسے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

”ذلیل عورت! میری محبت پہ شک کرتی ہے۔ میں نے تجھے حاصل کرنے کے لیے قتل تک کیا اور تو مجھ پر شک کرتی ہے۔“

یہ عجیب انکشاف تھا۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”شراب پی کر بیوی پر ہاتھ اٹھانا ہی جانتے ہو۔ قتل کرنے کے لیے مردانگی کی ضرورت ہوتی ہے۔ کس کا قتل کردیا میری خاطر۔“

”اس کا جس کے پاس تو مجھ سے بے وفائی کرکے گئی تھی۔ جس نے تجھے مجھ سے چھینا تھا۔ میں یہ برداشت نہیں کرسکتا تھا کہ تو کسی اور کی ہوکر رہے۔ اور تو کہتی ہے مجھے تجھ سے محبت نہیں۔ بڑے جتن کرکے تجھے اپنایا ہے۔ اب تو مجھے بھی برداشت کرے گی اور میری شراب کو بھی۔“

وہ اتنی سرشاری میں تھا کہ تفصیلات بھی خود ہی بتانے لگا۔

”میں نے تیری خاطر دشمن سے دوستی کی۔ اسے شراب کا عادی بنایا تاکہ تم دونوں میں جھگڑا ہو۔ تم ایسی وفادار ثابت ہورہی تھیں کہ اس کے بعد بھی جھگڑا نہیں ہوا۔ پھر میں نے تمہارے دل میں شک کا بیج بویا۔ تمہیں بتایا کہ ارسلان کسی لڑکی کے چکر میں پڑگیا ہے اور عنقریب شادی کرنے والا ہے۔ میں کئی دن انتظار کرتا رہا۔ تمہاری غلطی کہ تم نے کوئی ہنگامہ کھڑا نہیں کیا۔ میں چاہتا تو یہی تھا کہ تم ارسلان سے طلاق لے کر الگ ہوجاؤ اور میں تم سے شادی کرلوں لیکن تم نے میری ایک نہ چلنے دی۔ اب میرے پاس ایک ہی راستہ رہ گیا تھا۔ میں نے ارسلان کی شراب میں تھوڑا سا زہر ملا دیا۔ کسی کو پتا بھی نہیں چلا اور تم میرے پاس آنے کے لیے آزاد ہوگئیں، اس سے زیادہ میں اور کیا کرتا۔ پھر بھی تم کہتی ہو میں نے تم سے محبت نہیں کی۔ اور کسے کہتے ہیں محبت۔ اب بھی نہیں مانو تو جاؤ بھاڑ میں۔“

میرے کان بہت کچھ سن چکے تھے۔ اس نے اور کیا کہا میں نے کچھ نہیں سنا۔ کچھ دیر بعد حقارت سے اس کی طرف دیکھا تو وہ سو چکا تھا۔ اس کے بھیانک خراٹے مجھے خوفزدہ کررہے تھے۔ میں کمرے سے باہر نکل آئی۔ گھر میں سناٹا تھا۔ بچیاں اپنے کمرے میں تھیں۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا مجھ پر کیا گزر گئی۔ میں آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آئی اور صوفے پر ڈھیر ہوگئی۔ اُف میرے خدا! میں ایک قاتل کے ساتھ رہتی رہی ہوں اور وہ بھی میرے شوہر کا قاتل۔ میری آنکھوں سے آنسو باہر آگئے۔ شاید ارسلان کے نام کے۔

آخری دنوں میں ارسلان میرے دل سے اتر گیا تھا۔ ہمارے جھگڑے رہنے لگے تھے۔ اس کی شراب نوشی اور پھر کسی لڑکی سے اس کے تعلق کی خبر نے مجھے اس سے لاتعلق کردیا تھا۔ میں نے اسے بہت دکھ دیے تھے۔ اب وہ بے قصور نظر آرہا تھا۔ اس کے خلاف سازش کی گئی تھی جس کا شکار میں بھی ہوئی تھی۔ پچھتاوے کی آندھی چل رہی تھی اور وہ بھی بیس سال بعد۔

میرے شوہر کا قاتل میرے سامنے تھا۔ میری ایک گواہی اسے پھانسی کے پھندے تک پہنچا سکتی تھی لیکن میرے بچوں کا مستقبل! میں نے گھبرا کر آنکھیں بند کرلیں۔ سونے کے لیے نہیں سوچنے کے لیے۔

ہاکس بے کا ساحل آنکھوں کے سامنے تھا۔ لہریں شور مچا رہی تھیں۔ لڑکیاں تتلیوں کی طرح اِدھر اُدھر بھاگتی پھر رہی تھی۔ کچھ پانی میں کچھ گیلی ریت پر۔

ہمارا کالج پکنک منانے ہاکس بے آیا ہوا تھا۔ ٹیچرز ساتھ تھیں۔ مرد اسٹاف کو بھی نگرانی کے لیے ساتھ لے لیا تھا۔ یہ حضرات کچھ زیادہ ہی سرگرم تھے۔ کوئی لڑکی جیسے ہی پانی میں پاؤں ڈالتی، وہ چیخ پڑتے کہ آگے مت جانا۔ پیچھے ہٹو۔ پانی بہت چڑھا ہوا ہے وغیرہ وغیرہ۔

مجھے بہت غصہ آرہا تھا کہ بھئی جب یہی سب کچھ کرنا تھا تو سمندر پر آئے ہی کیوں ہو۔ کہیں اور جاکر پکنک منا لیتے۔ سمندر پر آؤ اور گیلے ہوئے بغیر چلے جاؤ یہ کہاں کی پکنک ہوئی۔ میں نے اپنی جیسی کچھ شرارتی لڑکیوں کو اپنے ساتھ ملایا اور ان ”نگرانوں“ کی نظروں سے بچنے کے لیے آہستہ آہستہ ایک طرف کو چل دیے۔ ظاہر یہی ہوتا تھا کہ ہم گیلی ریت پر چہل قدمی کررہے ہیں۔ ہم کل آٹھ لڑکیاں تھیں۔ ایک جگہ عورتوں اور بچوں کا خوب ہجوم تھا۔ ہم ان میں شامل ہوگئے۔ دل ہی دل میں خوش ہورہے تھے کہ ہم نے اپنے نگرانوں کو جھانسا دے دیا ہے۔ پکنک کا مزہ تو اب آئے گا۔ ہم شوخ لہروں سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگے۔

کبھی بہت آگے چلے جاتے کبھی واپس لوٹ آتے۔ ہم آٹھ میں سے بھی کچھ بزدل لڑکیاں تھیں کچھ میری طرح نڈر۔ ہم ذرا آگے جاتے تو محتاط لڑکیاں چیخنے لگتیں۔ بس ایک لڑکی تھی کنول جو مجھ سے بھی زیادہ بے خوف تھی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور یوں آگے کی طرف بڑھی جیسے سمندر پار کرجائے گی۔ کوئی بڑی لہر آتی تو ہم لہر کے ساتھ واپس آجاتے۔ حلیہ درست کرتے اور پھر آگے چل دیتے۔ یہ آنکھ مچولی بڑی دیر سے چل رہی تھی کہ ایک بہت بڑی لہر آئی۔ کنول کا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ پھر مجھے یوں لگا جیسے میں پلٹ گئی ہوں۔ میرا سر نیچے ہے اور ٹانگیں اوپر ہیں۔ دل میں سوچ رہی تھی کہ یہ لہر مجھے ساحل تک لے جائے گی لیکن غالباً وہ لہر ساحل تک آنے سے پیشتر ہی دائرہ سا بنا کر گھوم گئی تھی۔ اس لیے کہ میں پھر سیدھی ہوگئی تھی لیکن سمندر کی طرف جارہی تھی۔ ساحل پر کھڑے لوگ دھندلے دھندلے نظر آرہے تھے۔ پھر میں نے دیکھا کہ کوئی اور بھی ہے جو میرے ساتھ ڈوب رہا ہے۔ یہ کوئی لڑکا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی تھی۔ ایک اور لہر آئی تھی اور مجھے اس سے دور لے گئی تھی۔ اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہیں رہا تھا۔

میری آنکھ تو اس وقت کھلی جب میں ساحل کی ریت پر لیٹی ہوئی تھی اور لڑکیاں مجھ پر جھکی ہوئی تھیں۔ میں نے کئی مرتبہ آنکھیں کھولیں اور بند کیں۔ تب ہی کسی لڑکی کی آواز میرے کانوں میں آئی ”میڈم! روبینہ کو ہوش آگیا۔“

کالج کی پرنسپل مسز ارشد تھیں۔ انہوں نے میرے گال تھپ تھپائے۔ پھر انہوں نے آوازیں دیں۔ روبینہ! تم ٹھیک ہو نا۔ آنکھیں کھولو۔ چلو شاباش اٹھو۔ تمہیں کچھ نہیں ہوا۔ اور بھی بہت سی آوازیں میرے کانوں میں آرہی تھیں۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ پھر اٹھنے کی کوشش کی۔ کسی نے مجھے سہارا دیا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس اطمینان کے بعد کہ میں بچ گئی ہوں۔ ایک پھیکی سی مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر آگئی۔

”میڈم، آپ کا شکریہ کہ آپ نے مجھے بچالیا۔“

”شکریہ میرا نہیں اس لڑکے کا ادا کرو جو فرشتہ بن کر آگیا اور تمہیں بچالیا۔ ہم کیا بچاتے ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ جو لڑکی ڈوب رہی ہے وہ ہمارے کالج کی ہے۔“

میں نے اس لڑکے کی طرف دیکھا اور اس کا شکریہ ادا کیا حالانکہ اس نے جو بڑا کام کیا تھا اس کے لیے شکریہ کا لفظ بہت چھوٹا تھا۔

اس لڑکے نے میڈم سے اجازت طلب کی۔ ”میڈم، میرے خیال میں اب یہ بالکل ٹھیک ہیں۔ مجھے اجازت دیجئے۔ کوئی اور خدمت ہو تو بتایئے۔“

”بیٹا میں ایک مرتبہ پھر تمہارا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ تم نے ہمیں ایک بڑی مصیبت سے بچالیا۔ ہم اس لڑکی کے گھر والوں کو کیا جواب دیتے۔ خدا تمہیں اس کا اجر دے گا۔“

وہ لڑکا چلا گیا اور میں اس طرح اٹھ کر کھڑی ہوگئی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

میری جان بچ گئی تھی لیکن ہر لڑکی سہم گئی تھی۔ ہر طرف یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ اگر میں ڈوب گئی ہوتی تو کیا ہوتا۔ اب کسی لڑکی میں ہمت تھی کہ پانی میں اترتی لہٰذا یہی طے ہوا کہ جو کھانا ساتھ لایا گیا ہے وہ جلدی جلدی کھایا جائے اور واپس چلا جائے۔ میری وجہ سے سب کی پکنک خراب ہوگئی تھی۔

جب ہم واپسی کے لیے بسوں میں بیٹھنے لگے تو میڈم نے مجھ سے خاص طور پر کہا کہ میں گھر جا کر اس حادثے کا کسی سے ذکر نہ کروں۔

میں کیوں ذکر کرتی۔ حادثہ تو ٹل گیا تھا۔ امی خوامخواہ پریشان ہو جاتیں بلکہ آئندہ کسی پکنک پر بھیجتیں بھی نہیں۔ بہر حال میڈم کی ہدایت کے بعد میں نے بالکل ہی ارادہ کرلیا کہ کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔

بس میں بیٹھنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ حادثہ کیسا سنگین تھا یا ہو سکتا تھا۔ ہر لڑکی کی زبان پر تالا لگا ہوا تھا یا اگر کوئی بولتی بھی تھی تو اس حادثے کے سوا کوئی بات زبان پر نہیں آتی تھی۔ دو ایک لڑکیاں ایسی بھی تھیں جو دبے لفظوں میں مجھے برا بھلا کہہ رہی تھیں کہ میں نے ان کی پکنک خراب کردی۔ میں ان کی باتیں سنی ان سنی کرتی رہی۔

میرا گھر نزدیک آرہا تھا۔ میں نے ایک جگہ بس رکوالی۔ سڑک پار کرنے کے بعد کچھ دور پیدل چلنا پڑتا تھا اور پھر ایک گلی میں میرا گھر تھا۔ بس رکی اور میں نیچے اتری۔ کوئی اور لڑکی وہاں نہیں اتری تھی۔ ابھی میں سڑک پار کرنے کے لیے قدم بڑھانے ہی والی تھی کہ وہ لڑکا اچانک میرے سامنے آگیا جس نے میری جان بچائی تھی۔ وہ بائیک پر تھا اور اس نے اپنی بائیک بالکل میرے قریب لا کر روک دی تھی۔

”آپ! میرا مطلب ہے آپ وہی ہیں نا......“

”جی ہاں، میں وہی ہوں۔ میرا نام شکیل ہے۔“

”مجھے معلوم ہوگیا، اب میں جا سکتی ہوں؟“

”میں آپ کو کیسے روک سکتا ہوں لیکن اتنا تو کرسکتا ہوں کہ جب سمندر سے بچایا ہے تو بہ حفاظت گھر تک بھی چھوڑ آؤں۔“

”مسٹر میں آپ کی احسان مند ضرور ہوں لیکن احسان جتانے والے مجھے سخت ناپسند ہیں اور اس وقت آپ یہی کر رہے ہیں۔ اگر آپ معاوضے کے طلب گار ہیں تو میرے ساتھ گھر تک چلیے۔ کچھ پیسے اپنی امی سے آپ کو دلوا دوں گی۔“

”یہی تو میں چاہتا ہوں۔ آیئے بیٹھیے۔“ اس نے بائیک کی کک پر پاؤں رکھتے ہوئے کہا۔

”میں آپ کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتی۔ آپ کو پیدل چلنا ہوگا۔ بس سڑک کے اس طرف میرا گھر ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ تھوڑی سی مشقت کے بعد کچھ رقم مل جاتی ہے تو کیا برائی ہے۔“

میں اس کے ساتھ سڑک پار کرتے ہوئے اس کی گھٹیا ذہنیت پر افسوس کر رہی تھی۔ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو چند ٹکوں کی خاطر اپنی نیکیاں برباد کر دیتے ہیں۔

سڑک پار کرنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ اگر یہ لڑکا میرے ساتھ گھر چلا گیا تو سارا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ میڈم نے کہا تھا گھر جا کر کچھ نہ بتاؤں۔ جو میں نہیں بتانا چاہتی وہ یہ بتا دے گا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر اس سے جان چھڑانی چاہی۔

”دیکھیے مسٹر شکیل، میں آپ کو کس چیز کا واسطہ دوں کہ آپ میرا پیچھا چھوڑ دیں۔“

”چند کرارے نوٹوں کا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”عجیب لالچی آدمی ہیں آپ۔ ایک نیکی سرزد ہوہی گئی ہے تو اسے کیوں ضائع کرتے ہیں۔“

”روبینہ ایک بات سنیں۔“ وہ چلتے چلتے رک گیا اور نہایت گستاخی سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”میں لالچی نہیں ہوں۔ میں آپ کے ساتھ چل کر یہاں تک صرف اس لیے آیا ہوں کہ آپ سے اظہارِ محبت کرسکوں۔“

”ہاتھ چھوڑیے میرا۔“ میں نے ہاتھ چھڑا لیا اور چلنے لگی۔

”جس وقت آپ کے کالج کی بسیں ساحل پر پہنچی تھیں اور آپ بس سے اتری تھیں اسی وقت مجھے آپ پسند آگئی تھیں۔ میری آنکھیں برابر آپ کی نگرانی کر رہی تھیں۔ سارے وقت میں آپ کے ساتھ ساتھ رہا تھا۔ پھر میں نے دیکھا سمندر کی لہریں آپ کو بہا کر لے جا رہی ہیں۔ میں آپ کو بچانے کے لیے آگے بڑھا۔ خوش قسمتی سے میں بہت اچھا تیراک ہوں، میں نے آپ کو بچالیا۔ آپ کو بچاتے ہوئے میری جان بھی جا سکتی تھی۔ میری محبت ہی کا تقاضا تھا کہ میں نے اپنی جان کی پروا نہیں کی۔“

وہ باتیں کرتا ہوا میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ وہ گلی آگئی تھی جس میں میرا گھر تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر وہ نہیں رکا تو گھر تک میرے ساتھ جائے گا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ میرا گھر دیکھے۔

”مسٹر میرا گھر قریب آگیا۔ میں نہیں چاہتی کہ کوئی آپ کو دیکھے۔ اب آپ چلے جائیں۔ آپ نے جو احسان مجھ پر کیا ہے اسے میں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔“

”مگر میں کچھ اور بھی چاہتا ہوں۔“

”کیا چاہتے ہیں آپ!“

”میں چاہتا ہوں آپ مجھ سے ملا کریں۔ میری محبت کا جواب محبت سے دیا کریں۔ اگر آپ چاہیں گی تو میں آپ کو اپنا بھی لوں گا۔“

”میں ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔ میں آپ سے نہیں مل سکتی۔“

”ٹھیک ہے، تو پھر میں آپ کے گھر چلتا ہوں۔ ملاقات نہیں تو معاوضہ ہی لے لوں۔“

میں سمجھ گئی تھی کہ اسے معاوضہ نہیں چاہیے۔ وہ گھر دیکھ لینے کی دھمکی دے رہا ہے۔ اس نے اگر گھر دیکھ لیا تو بار بار تنگ کرے گا۔ اگر اس سے کہیں ملنے کا وعدہ کرلوں تو یہ اس وقت چلا جائے گا۔ بعد میں مجھے کہاں ڈھونڈتا پھرے گا۔ جان چھوٹ جائے گی۔ میں پھر رک گئی۔

”آپ کہاں ملنا چاہتے ہیں۔“

”یہ ہوئی نا بات۔“

اس نے ایک ہوٹل کا پتا بتایا جو میرے کالج کے قریب ہی تھا۔ یہ بھی بتا دیا کہ کل مجھے کس وقت وہاں پہنچنا ہے۔ میں نے وعدہ کیا اور گھر جانے کے لیے گلی میں مڑ گئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کسی غیر لڑکے سے میں نے اتنی دیر باتیں کی تھیں۔ میرے ہاتھ پاؤں قابو میں نہیں تھے۔ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی گھر کی طرف چلی جا رہی تھی۔ گھر کے دروازے پر پہنچ کر میں نے غیر ارادی طور پر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ گلی کے کونے پر کھڑا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس نے میرا گھر دیکھ لیا۔ اب اگر میں اس سے ملنے نہیں گئی تو وہ گھر آسکتا ہے، میں نے سوچا۔ ایک مرتبہ اس سے ضرور مل لوں گی اور ایسی دل شکنی کروں گی کہ دوبارہ ملنے کی ہمت نہیں کرے گا۔

میری حالت ہی ایسی ہو رہی تھی کہ امی مجھے دیکھتے ہی پریشان ہوگئیں۔

”روبینہ اپنی حالت تو دیکھ کیا ہو رہی ہے۔“

”امی، آپ کو تو معلوم ہے سمندر کی پکنک پر آدمی کی کیا حالت ہوتی ہے۔“

”منہ دیکھو تانبے کا بنا ہوا ہو رہا ہے۔ اب کئی دن تک یہی چہرہ لے کر گھومو گی۔“

”وہ تو ہے امی لیکن پکنک تو پکنک ہوتی ہے۔“

”سمندر کی پکنک سے چڑ ہے مجھے۔ آئے دن ڈوبنے کے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ چل تو خیریت سے آگئی اللہ کا شکر ہے۔“

میرے دل میں چور تھا۔ ایسا لگا جیسے امی کو سب کچھ معلوم ہوگیا ہے۔ اسی لیے لوگوں کے ڈوبنے کا ذکر کر رہی ہیں۔ یہ خیال آتے ہی کہ میں بھی ڈوبتے ڈوبتے بچی ہوں میرا دل بھر آیا۔ قریب تھا کہ آنسو نکل آتے، میں بھاگ کر غسل خانے میں چلی گئی۔

نہا کر نکلی تو چائے تیار تھی۔ چائے پینے بیٹھ گئی۔ ذرا بدن پر پانی پڑا، چائے پیٹ میں اتری تو تھکن کا احساس ہوا۔ پورا بدن ایسے ٹوٹ رہا تھا جیسے کسی نے لاٹھیوں سے مارا ہے۔

”دن بھر پکنک منا کر آگئیں اب پڑ کر سو جاؤ گی۔“ امی کی آواز میرے کانوں میں آئی تو مجھے خیال آیا کہ اس وقت نیند ہی میری تھکن کا علاج ہے۔ میں واقعی سونے کے لیے بستر پر چلی گئی۔ بستر پر لیٹتے ہی بپھرا ہوا سمندر میرے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ میں موجوں سے لڑنے لگی۔ اپنے ڈوبنے کا منظر یاد آیا تو بدن پر کپکپی طاری ہوگئی۔ اگر وہ لڑکا مجھے نہ بچاتا تو اس وقت میں کمرے میں نہیں مٹی کے نیچے ہوتی۔ امی پر کیا گزر جاتی۔ یہ خیال آتے ہی ان باتوں کا خیال آگیا جو شکیل نے مجھ سے راستے میں کی تھیں۔ اس کا اتنا حق تو ہے کہ میں اس سے کم از کم ایک ملاقات کرلوں۔ میں اس سے کہہ سکتی ہوں کہ آئندہ مجھ سے نہ ملے۔ اگر میں اس سے ملنے نہیں گئی تو ہو سکتا ہے وہ گھر ہی چلا آئے۔ اگر وہ

گھر چلا آیا اور امی کو سمندر پر ہونے والے حادثے کے متعلق بتا دیا تو آیندہ کبھی پکنک نصیب نہیں ہوگی۔ میں نے طے کرلیا کہ کل جب کالج جاؤں گی تو واپسی میں اس سے ملاقات کرلوں گی۔ یہی وقت اس نے بھی دیا تھا۔

میں نے اس کی طرف سے بے فکر ہوکر آنکھیں بند کرلیں۔ اتنی تھکی ہوئی تھی کہ مجھے یاد ہے لیٹتے ہی نیند آگئی تھی لیکن یہ بھی یاد ہے کہ رات بھر سمندر سے لڑتی رہی تھی۔ صبح جب امی مجھے اٹھانے کے لیے آئیں تو میرے بدن کو ہاتھ لگا کر اچھل پڑیں۔

''روبینہ، تجھے تو بڑا تیز بخار ہے۔ منع کیا تھا کہ پکنک پر مت جاؤ مگر تم مانتی ہی نہیں ہو۔ اب پڑ گئیں کم از کم دو دن کے لیے۔ گھر کا سارا کام میرے سر آپڑے گا۔

ان کا کہنا ٹھیک ہی نکلا۔ پورے تین دن تک میں کالج جانے کے قابل نہ ہوسکی۔ دل میں دعائیں مانگ رہی تھی کہ کہیں شکیل گھر پر نہ آدھمکے۔

چوتھے دن جب میں کالج جانے لگی تو دل بڑا مطمئن تھا۔ میں اس سے ملنے نہیں گئی تھی اور وہ گھر بھی نہیں آیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ میری طرف سے مایوس ہوگیا ہے۔

میں کالج گئی تو سب نے میرا اس طرح استقبال کیا جیسے میں کوئی عجوبہ ہوں۔ سب سے پہلے میڈم نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔

''کیا بات ہے تم تین دن سے کالج کیوں نہیں آرہی تھیں۔ ہم تمہارے گھر فون کرتے یا کسی کو بھیجتے لیکن میں نے سوچا تمہارے گھر والوں پر کوئی راز کھل نہ گیا ہو۔ پھر ہم سے بھی پوچھ گچھ ہوگی۔''

''میڈم میں بیمار ہوگئی تھی۔ بخار تھا کہ اترنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔''

''مجھے یہی ڈر تھا کہ تم بیمار پڑ جاؤ گی۔ بھول جاؤ اس واقعے کو... اور ہاں کسی وقت بھی اپنی والدہ کو نہ بتانا ورنہ ہمیشہ کے لیے تم پر پکنک کے دروازے بند ہو جائیں گے۔ اب تم جاؤ۔''

یہی نصیحت مجھے ہر ٹیچر سے بھی سننے کو ملی۔

چھٹی ہونے میں کچھ ہی دیر باقی تھی کہ اچانک مجھے شکیل کا خیال آگیا۔ دل ہی دل میں مجھے ہنسی بھی آئی۔ وہ بے چارہ اس روز ہوٹل پر آیا ہوگا اور ناکام لوٹ گیا ہوگا۔ سوچ تو رہا ہوگا روبینہ نکلی چالاک۔

چھٹی ہوئی تو میں نے غیر ارادی طور پر نسبتاً مختصر راستہ چھوڑ کر وہ راستہ بس اسٹاپ تک جانے کے لیے منتخب کیا جو اس ہوٹل کے سامنے سے گزرتا تھا جہاں شکیل نے ملاقات کے لیے کہا تھا۔ یہ میں نہیں کہہ سکتی کہ یہ خیال کیوں دل میں آیا تھا جبکہ شکیل سے ملنے کا مجھے کوئی شوق نہیں تھا۔ ہوٹل کے سامنے پہنچتے ہی میرے قدم خود بخود رک گئے۔ حیرت نے میرے پیروں میں زنجیریں ڈال دی تھیں۔ شکیل اپنی موٹر سائیکل سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

''مجھے یقین تھا تم میری درخواست رد نہیں کروگی۔ ملنے ضرور آؤ گی۔''

''جی نہیں اس خیال میں مت رہنا۔ میں آپ سے ملنے نہیں آئی۔ یہ تو میرا راستہ ہے۔ میں ادھر سے روز گزرتی ہوں۔''

''چلیے آپ آ ہی گئی ہیں تو میں آپ کو ایک کپ چائے تو پلا دوں۔''

میرے منع کرنے کے باوجود اس نے اصرار کیا اور میں اس کے ساتھ ہوٹل میں چلی گئی۔ یہ ایک عام سا ہوٹل تھا لیکن فیملی... کیبن بنے ہوئے تھے۔ ہم ایک کیبن میں جا کر بیٹھ گئے۔ اس نے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ سول انجینئر ہے ابھی ایک ماہ پہلے اس کی ملازمت ہوئی ہے۔ اس نے بڑی بے تکلفی سے یہ بھی کہہ دیا کہ وہ چند ملاقاتوں کے بعد میرے بارے میں کچھ ضروری باتیں جاننے کے بعد مجھ سے شادی کرلے گا۔

میں اس کی صاف گوئی سے متاثر ہوئی۔ اس کی شرافت کی قائل بھی ہوئی کہ وہ محض وقت گزاری نہیں کر رہا ہے بلکہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ پڑھا لکھا ہے، خوبصورت ہے اچھی ملازمت ہے۔ اگر شادی ہو جائے تو کیا حرج ہے۔

اس پہلی ملاقات کے بعد جلد ہی دوسری ملاقات ہوگئی اور پھر یہ ملاقاتیں تسلسل سے ہونے لگیں۔ وہ سب باتیں ہوئیں جو ان ملاقاتوں میں ہوتی ہیں۔ جب بے تکلفی زیادہ بڑھی تو ہم اس ہوٹل تک محدود نہیں رہے بلکہ تفریح گاہیں اور بہت سی تھیں۔ یہاں تک کہ وقت کم پڑنے لگا۔ میں نے ایک فرضی ٹیوشن پکڑ لی۔ ٹیوشن کے بہانے گھر سے نکل جاتی۔ شکیل پہلے سے طے شدہ مقام پر میرا انتظار کر رہا ہوتا۔

جب وہ مجھے اچھی طرح سمجھ چکا اور اس نے یہ بھی دیکھ لیا کہ میرے دل میں بھی اس کے لیے جگہ ہو چکی ہے تو



وہ اپنے دل کی بات زبان پر لے آیا۔

''تم کہو تو میں اپنی والدہ کو تمہارے گھر بھیجوں۔''

''میں خود آپ سے اس بارے میں بات کرنے والی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے آپ کو آج تک یہ نہیں بتایا کہ میرے ابو سعودی عرب میں ہیں۔ ان کا خط آیا تھا۔ وہ اگلے مہینے آنے والے ہیں۔ وہ آجائیں تو پھر یہ قدم اٹھائیے گا۔ اگر ابھی آپ نے بات چھیڑی تو امی وہی کہیں گی جو میں کہہ رہی ہوں اور ابو کے آنے تک آپ سے ملنے پر پابندی بھی عائد کردیں گی۔''

''چلو، ایک مہینے اور صبر کیے لیتا ہوں۔''

میں بے چینی سے ابو کا انتظار کر رہی تھی اور پھر ایک دن ان کا خط آگیا۔ وہ آرہے تھے۔ یہ خبر میں نے شکیل کو بھی پہنچا دی تھی۔ وہ بھی خوش ہوگیا۔

''میری والدہ خان پور میں ہیں۔ تم جیسے ہی اپنے والد کے آنے کی خوش خبری دوگی میں انہیں لینے چلا جاؤں گا۔''

ابو آئے تو ان کے ساتھ میرا پھوپی زاد بھائی ارسلان بھی تھا۔ میری پھوپی سعودی عرب میں رہتی تھیں۔ ابو ان ہی کے پاس جا کر ٹھہرے تھے۔ ان کا بیٹا ارسلان تھا جس نے مکینکل انجینئرنگ میں ڈگری لی تھی۔ اب پھوپی جان پاکستان شفٹ ہونا چاہتی تھیں کیونکہ پھوپا کا انتقال ہوگیا تھا۔ انہوں نے ارسلان کو ابو کے ساتھ بھیج دیا تھا تاکہ وہ یہاں پہنچ کر نوکری کا بندوبست کرلے پھر وہ بھی آجائیں گی۔

ابو کے آنے کے بعد میں دو دن تک گھر سے نہیں نکل سکی۔ تیسرے دن میں ٹیوشن کے بہانے گھر سے نکلی (کالج کی چھٹیاں تھیں) باہر نکل کر میں نے ایک جنرل اسٹور سے شکیل کے آفس فون کیا۔ وہ اسی وقت مجھ سے ملنے کو تیار ہوگیا۔ میں اس کے بتائے ہوئے مقام پر پہنچ گئی۔ ابو کے آنے کی اطلاع میں فون پر بھی دے سکتی تھی لیکن اس سے ملے ہوئے دو دن ہوگئے تھے۔ دو دن میرے لیے بہت [illegible] تے تھے۔

ملاقات ہوئی تو میں نے اسے ابو کے آنے کی خوش خبری سنائی۔ مجھے یاد ہے وہ بہت خوش ہوا تھا۔ اس نے کہا تھا وہ رات ہی کو کسی وقت روانہ ہو جائے گا۔ مجھے بھی جلدی تھی وہ بھی جلدی اٹھ گیا تھا۔ اسے خانپور جانے کے لیے تیاری کرنی تھی۔

شکیل سے ملاقات کے بعد گھر پہنچی تو سب گھر والے جمع تھے۔ کچھ رشتے دار بھی آئے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان بیٹھا ارسلان باتوں کے چٹکلے چھوڑ رہا تھا۔ وہ بڑا خوش گفتار لڑکا تھا۔ جس دن سے آیا تھا اس کی زبان رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ میں اس سے کھنچی کھنچی رہتی تھی لیکن پھر بھی اس کی باتوں کے سحر میں آ ہی جاتی تھی۔ اس وقت بھی مجھے بیٹھنا پڑا۔ شکیل کا چہرہ ابھی تک آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا لیکن ارسلان کی باتوں کے آگے سب کچھ بھول گئی۔

ارسلان ملازمت تلاش کررہا تھا۔ صبح نکل جاتا تھا اور دوپہر تک کہیں واپسی ہوتی تھی۔ وہ آتے ہی میرے کمرے میں چلا آتا تھا اور اِدھر اُدھر کی باتیں چھیڑ دیتا تھا۔ مجھے زبردستی اس کا ساتھ دینا پڑتا تھا۔ دل ہی دل میں اس پر ہنستی بھی تھی کہ ارسلان صاحب بس کچھ دنوں کی بات ہے۔ ایک لڑکا آئے گا اور مجھے لے کر چلا جائے گا، پھر ہاتھ ملتے رہ جائے گا۔

ایک ہفتہ گزر گیا تھا۔ شکیل کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ ارسلان کی ملازمت ہوگئی تھی۔ ایک گھر میں رہتے ہوئے میں اس سے کنارہ کشی اختیار نہیں کرسکتی تھی۔ شام کو اکثر مجھے اس کے ساتھ کہیں نہ کہیں جانا پڑتا تھا۔ امی بھی اس کی حوصلہ افزائی کررہی تھیں اس لیے کوئی بہانہ کارگر نہیں ہوسکتا تھا۔ مجھے شکیل پر غصہ آتا رہتا تھا کہ وہ اپنی ماں کو لے کر اب تک کیوں نہیں آیا۔ خانپور کیا لندن میں ہے جو اسے اتنی دیر لگ گئی۔ میں نے ایک دن پھر اسے اس کے دفتر فون کیا۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ وہ چھٹی پر ہے۔ اس کے علاوہ مجھے کسی نے کچھ نہیں بتایا۔ اتنا اطمینان ہوگیا کہ وہ ابھی تک آیا ہی نہیں ہے۔ یہ وہم البتہ سر اٹھا رہا تھا کہ وہ اب تک آیا کیوں نہیں۔ کہیں اس کی والدہ نے اس رشتے کی مخالفت تو نہیں کردی۔ کہیں انہوں نے آنے سے انکار تو نہیں کردیا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ شکیل نے مجھے دھوکا دیا ہو۔ وہ انہیں ملانا ہی نہ چاہتا ہو۔ شاید وہ اب کبھی مجھ سے نہ ملے۔

کالج کھل گئے تھے۔ میں آتے جاتے اس ہوٹل کے سامنے سے گزرتی تھی جہاں ہم پہلی بار ملے تھے شاید کسی دن وہ وہاں مل جائے۔

ایک مہینا گزر گیا۔ اب گھر میں یہ خبریں گردش کررہی تھیں کہ پھوپی جان آنے والی ہیں۔ ارسلان کو آفس کی طرف سے مکان مل گیا تھا۔ پھوپی جان کو کچھ دنوں ہمارے گھر ٹھہرنا تھا پھر اپنے بیٹے کے ساتھ الگ مکان میں چلے جانا تھا۔

میں روز ہوٹل کے سامنے سے گزرتی تھی۔ شکیل نظر نہیں آیا۔ اس کے آفس سے بھی یہی معلوم ہوا کہ وہ ابھی تک چھٹی پر ہے۔

پھوپی جان آئیں تو نیا ہی گُل کِھل گیا۔ انہوں نے آتے ہی ارسلان کے لیے مجھے پسند کرلیا۔ امی کے اور ان کے درمیان کیا بات ہوئی مجھے نہیں معلوم۔ مجھے تو ہوش اس وقت آیا جب امی نے مجھ سے پھوپی جان کے خیال کا ذکر کیا۔ میں سوچ میں پڑ گئی کہ انکار کروں یا اقرار۔ شکیل کے بارے میں کچھ بتاؤں یا چپ رہوں۔ شکیل کا کہیں پتا نہیں تھا کس توقع پر امی کو کچھ بتاتی۔ ارسلان میں کوئی ایسی برائی یا کمی بھی نہیں تھی کہ انکار کردیتی۔ میں خاموش ہوگئی اور امی نے اسے میری رضامندی سمجھ لیا۔ گھر کی بات تھی دوسرے ہی دن مجھے انگوٹھی پہنا دی گئی اور شادی کی تاریخ بھی طے ہوگئی۔

میں نے غور کیا تو ارسلان، شکیل سے بہتر ہی نظر آیا خصوصاً ایسی حالت میں کہ شکیل مجھے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ بس خوف تھا تو یہ کہ اگر شادی کے بعد شکیل کہیں سے نمودار ہوگیا تو کیا ہوگا۔ وہ اگر اب بھی مل جائے تو میں اسے شادی کے بارے میں بتادوں۔ میرے پاس بہانہ موجود ہے۔ میں کہہ سکتی ہوں اس نے مجھ سے رابطہ نہیں کیا اور شادی طے ہوگئی۔

اسی خوف کے عالم میں ایک روز میں کالج جاتے ہوئے ہوٹل کے سامنے سے گزر رہی تھی کہ وہ مجھے نظر آگیا۔ جب مل کر بیٹھے تو اصل حقیقت ظاہر ہوئی کہ وہ کیوں غائب ہوگیا تھا۔ اس کی والدہ کا انتقال ہوگیا تھا۔

"میں جب خانپور پہنچا تو وہ سخت بیمار تھیں۔ کچھ دن ان کے علاج معالجے میں گزر گئے پھر ان کا انتقال ہوگیا۔ میں ان کے انتقال کے بعد چلا آتا لیکن زمینوں کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے چچاؤں نے اماں کی بیماری کا فائدہ اٹھا کر کاغذات اپنے قبضے میں کرلیے تھے۔ اس پر جھگڑا ہوا اور مجھے پندرہ دن جیل میں رہنا پڑا۔ اس عرصے میں نہ تم سے رابطہ کرسکا نہ دفتر والوں سے۔ واپس آیا تو میری نوکری بھی چھوٹ چکی تھی۔ شکر ہے تم سے ملاقات ہوگئی۔ نوکری کا کیا ہے کہیں اور مل جائے گی۔ بس نوکری مل جائے پھر تمہارے گھر اکیلے ہی آنا پڑے گا۔ میں اپنے وعدے پر اب بھی قائم ہوں۔"

میں اسے کیا بتاتی کہ اس نے دیر کردی۔ میری شادی ہونے والی ہے۔ اس سے نہیں کسی اور سے۔ اپنی بے بسی پر میری آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔ وہ بے چارہ یہی سمجھا کہ اس کی بپتا سن کر میری آنکھیں بھیگ گئی ہیں۔ وہ مجھے تسلیاں دینے لگے۔

ہماری ملاقاتیں پھر شروع ہوگئی تھیں۔ اب ان ملاقاتوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی بلکہ یہ احساس ہوتا تھا کہ میں ارسلان کو دھوکا دے رہی ہوں۔ میں صرف اس لیے ملاقاتیں کررہی تھی کہ شکیل کو جب تک میں بتا نہ دوں کہ میری شادی ہونے والی ہے اسے ہنگامہ کرنے کا کوئی موقع نہ مل سکے۔ یہ الگ بات کہ مجھے کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ کس طرح اسے بتاؤں۔

شادی کے دن جوں جوں قریب آتے جارہے تھے میری حالت غیر ہوتی جارہی تھی۔ میں مائیوں بیٹھنے والی تھی اس کے بعد مجھ پر پابندی لگ جاتی۔ میں آخری مرتبہ شکیل سے ملی۔

"میں ایک مہینے کے لیے اپنے گھر والوں کے ساتھ لاہور جارہی ہوں۔ اس کے بعد ہی ملاقات ہوسکے گی۔"

اس اطلاع نے اسے حواس باختہ کردیا۔ "ہم ایک مہینے تک ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکیں گے؟"

"کیا کروں مجبوری ہے۔ اچھا ہے اس عرصے میں تم آرام سے نوکری ڈھونڈ لینا۔"

"اس کے بعد میں تمہارا ہاتھ مانگنے ضرور آؤں گا۔"

وہ اس بہانے کو سچ سمجھ کر مطمئن ہوگیا تھا۔ یہ تو میں سمجھ رہی تھی کہ اب اسے کبھی نہ دیکھ سکوں گی۔

میں اس سے مل کر واپس آگئی اور ارسلان سے میری شادی ہوگئی۔

ایک مہینے تک تو میں مطمئن رہی کہ شکیل مجھے تلاش نہیں کرے گا لیکن اس کے بعد میں خوفزدہ رہنے لگی۔ ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا کہ شکیل مجھے ڈھونڈتا ہوا آجائے گا۔ امی کے گھر جاتی تو وہاں بھی کھوئی کھوئی سی رہتی۔ امی سے کرید کرید کر پوچھتی کہ کوئی آیا تو نہیں تھا۔ ایک دن میں امی کے گھر گئی تو انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ "تمہاری کوئی سہیلی ہے شائستہ۔"

"مجھے تو یاد نہیں آرہی کوئی ایسی سہیلی۔"

"کمال ہے وہ یہی نام بتا رہا تھا۔"

"کون بتا رہا تھا۔"

"کوئی شکیل نام کا لڑکا آیا تھا۔ کہہ رہا تھا وہ شائستہ کا بھائی ہے۔ شائستہ کا کوئی پیغام لے کر آیا ہے۔ تمہارا پوچھ رہا تھا۔"

"آپ نے کیا کہا۔"

"کیا کہتی۔ میں نے یہی کہا کہ تمہاری شادی ہوگئی ہے۔ کوئی بات ہو تو بتادو میں اس تک پہنچادوں گی۔ اس نے بتانا مناسب نہ سمجھا اور چلا گیا۔"

"پتا نہیں کون تھا۔ نہ تو میں کسی شکیل کو جانتی ہوں نہ شائستہ سے واقف ہوں۔ ہوسکتا ہے غلط پتے پر آگیا ہو۔"

"تمہارا نام لے رہا تھا۔"

"پھر ہوسکتا ہے کوئی شائستہ ہو میرے کالج کی لڑکی۔"

بات آئی گئی ہوگئی لیکن میرے خوف میں اضافہ ہوگیا۔ اب میں ارسلان کے ساتھ بھی باہر نکلتی تو میری آنکھیں اِدھر اُدھر گھومتی رہتیں کہ کہیں شکیل میرے تعاقب میں نہ ہو۔ دروازے پر کوئی آتا تو میں چونک پڑتی کہ شکیل نہ ہو۔

آہستہ آہستہ خوف کم ہونے لگا۔ کئی مہینے گزر گئے اور کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ میں مطمئن ہوگئی کہ میری شادی کی خبر سن کر وہ مایوس ہوگیا ہوگا اور اس نے اپنا راستہ بدل لیا ہوگا۔

آیندہ کچھ ایسے واقعات سامنے آئے کہ شکیل کا خیال بالکل ہی دل سے نکل گیا۔ پھوپی جان ایسی بیمار پڑیں کہ ان کی تیمارداری کے سوا کوئی ہوش ہی مجھے نہیں رہا۔ پھر ان کا انتقال ہوگیا۔ زندگی بالکل ہی بدل گئی۔ قدرت کو رحم آگیا اور گھر کی تنہائی دور کرنے کے لیے ایک بچی مجھے دے دی۔ ہم دونوں نے اس کا نام پھوپی جان کے نام پر فاخرہ رکھا۔ فاخرہ کے آنے کے بعد میں اسی میں گم ہوکر رہ گئی تھی۔

ایک دن ارسلان آئے تو ان کے ساتھ ان کا کوئی دوست بھی تھا جسے انہوں نے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا اور میرے پاس آئے۔

"میرا ایک دوست آیا ہے۔ تم ذرا چائے بنادو۔"

"کون ہے؟"

"ہے ایک دوست۔"

"آپ کے دو چار ہی تو دوست ہیں۔ ان کو تو میں جانتی ہوں۔ یہ کون سا دوست ہے؟"

"یہ پرانے دوستوں میں سے نہیں ہے۔ تم چائے لے کر آؤ گی تو خود ہی دیکھ لینا۔"

"میں بھی آؤں۔"

"اس میں حرج ہی کیا ہے۔ اب تو اس کا آنا جانا لگا

ہی رہے گا۔ بڑا دلچسپ آدمی ہے۔ تم اس سے ملوگی تو دیکھوگی۔''

میں نے چائے بنائی اور ڈرائنگ روم میں پہنچ گئی۔ آج تک سوچتی ہوں ٹرے میرے ہاتھ سے گر کیوں نہیں گئی تھی۔ ان کا جو دوست میرے سامنے تھا وہ کوئی اور نہیں شکیل تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے ٹرے ٹیبل پر رکھی اور واپسی کے لیے مڑ گئی لیکن ارسلان نے مجھے آواز دے ڈالی۔ میں بھی یہ سوچ کر پلٹ آئی کہ میں بیٹھی رہی تو اچھا ہے میری غیر موجودگی میں وہ کوئی ایسی ویسی بات نہ کہہ دے۔

''یار ارسلان تم ہو خوش قسمت۔ تمہیں بیوی خوبصورت ملی ہے۔''

''میں کہتا ہوں تم بھی شادی کرلو۔ کیا خبر تمہیں اس سے زیادہ خوبصورت بیوی ملے۔''

''اب کہاں۔ وہ تو ایک ہی بنی تھی۔ وہ کسی اور کی ہوگئی۔'' شکیل نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ارسلان نے مجھے اطلاع دی ''شکیل صاحب کسی لڑکی سے محبت کرتے تھے۔ اس نے انہیں دھوکا دیا اور کہیں اور شادی کرلی۔ یہ انہی محترمہ کا ذکر فرما رہے ہیں۔''

''ہوسکتا ہے اس لڑکی کی کوئی مجبوری ہو۔ اس نے دھوکا نہ دیا ہو مجبور ہوگئی ہو۔'' میں نے کہا۔

''وہ اگر کہیں ملی تو یہی کہے گی جو آپ کہہ رہی ہیں۔ لڑکیوں کا یہ پرانا حربہ ہے۔''

''ارے تم کن باتوں میں پڑ گئے۔ چائے ٹھنڈی ہورہی ہے۔''

شکیل نے چائے کا کپ ہاتھ میں لے لیا ''یار ارسلان، آج بھابی کو پہلی مرتبہ دیکھا ہے تو سوچ رہا ہوں آج تم لوگ ڈنر میرے ساتھ کرو۔''

''ابے گھر ور تمہارا ہے نہیں ڈنر کہاں دوگے۔''

''ہوٹل زندہ باد۔''

''کون سے ہوٹل میں بلا رہے ہو۔''

شکیل نے اس ہوٹل کا نام لیا جہاں ہماری ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔ اس ہوٹل کا نام سن کر ارسلان نے برا سا منہ بنایا۔ ''ابے وہ کوئی ہوٹل ہے۔''

''یار اس دعوت کو ٹھکرانا مت۔ میں اس لڑکی سے اسی ہوٹل میں ملا کرتا تھا۔ اب وہ تو ہے نہیں بھابی سہی، سوچتا ہوں یادیں تازہ کرلوں۔''

''تمہیں بھائی نہیں، ہم نہیں ٹھکرا رہے تمہاری دعوت۔ پہنچ جائیں گے اس ہوٹل۔''

اس کے چلے جانے کے بعد میں نے اس کے بارے میں ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ ارسلان پر واضح کردیا تھا کہ اس کا یہ دوست مجھے قطعی پسند نہیں آیا ہے۔ اس کی آنکھوں میں دھوکا ہے۔ یہ کسی وقت بھی تمہیں دھوکا دے جائے گا۔''

ارسلان نے میری بات قہقہے میں اڑا دی تھی۔

''تم ابھی اسے سمجھی نہیں ہو۔ بہت صاف دل کا آدمی ہے۔ اور پھر وہ کون سا میرا بزنس پارٹنر ہے جو مجھے دھوکا دے جائے گا۔''

میں نے بھی زیادہ بحث مناسب نہیں سمجھی تھی کہ زیادہ مخالفت کی تو کہیں ارسلان کو شک ہی نہ ہوجائے۔

ارسلان کے مجبور کرنے پر میں اس ہوٹل میں ڈنر پر چلی گئی جہاں شادی سے پہلے شکیل سے ملا کرتی تھی۔ ایک ایک یاد تازہ ہوگئی۔ شکیل کے ذو معنی فقرے مجھے اذیت پہنچا رہے تھے لیکن نہ تو اسے روک سکتی تھی نہ اٹھ کر جا سکتی تھی۔ وہ ارسلان کو بتا رہا تھا کہ کس طرح وہ لڑکی یہاں آتی تھی اور کس طرح آمنے سامنے بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے۔ مجھے معلوم تھا وہ یہ سب باتیں مجھے سنانے کے لیے کررہا ہے۔

میں نے اس کی بات کاٹی ''شکیل بھائی، اب ان باتوں کا کیا فائدہ۔ اسے اپنے گھر میں خوش رہنے دیں آپ اپنی دنیا میں خوش رہیں۔ بھلا دیں اسے۔''

''مجھے نہیں معلوم کہ آپ نے کسی سے محبت کی ہے یا نہیں۔ جس سے محبت کی جاتی ہے اسے بھلایا نہیں جاتا۔ اور یہ باتیں تو میں آپ کے سامنے کررہا ہوں اور اس پردے کے ساتھ کہ اس لڑکی کا نام بھی ابھی تک نہیں لیا۔ ہر ایک کے سامنے تھوڑی کرتا ہوں۔ بس اسے بھلانے کے لیے تھوڑی سی شراب پی لیتا ہوں۔ وہ بھی اس لیے کہ نیند نہیں آتی۔''

''اگر وہ لڑکی آپ کو کہیں مل جائے تو آپ کا ردِعمل کیا ہوگا۔'' میں نے پوچھا تھا۔

''یہی جواب ہو رہا ہے۔''

میں یہ سن کر گڑبڑا گئی ''میرا مطلب ہے آپ اس سے کیا کہیں گے۔''

''اس سے درخواست کروں گا کہ میری دوستی قبول کرلے۔''

''اگر اس نے انکار کردیا۔''

''میں اس سے کہوں گا میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تمہیں حاصل کرلوں گا۔''



''یہ تو خودغرضی ہوگی۔''

''یہی تو محبت ہے۔''

''آپ اسے نقصان پہنچائیں گے۔''

''نہیں، میں اس کے گھر سے اپنے گھر تک کانٹے اور پھول بچھا دوں گا اور اس سے کہوں گا، کانٹے ہٹا کر پھولوں پر چلتی ہوئی میرے پاس آجائے۔''

میں دیکھ رہی تھی کہ ارسلان ان باتوں سے اکتانے لگے ہیں۔ ڈنر ان باتوں کی نذر ہوچکا تھا۔ میں ذاخرہ کو امی کے پاس چھوڑ کر آئی تھی اور اب بہت دیر ہوگئی تھی۔ ہمیں اٹھنا پڑا۔

گھر واپس آکے تو ارسلان کی زبان پر شکیل کے قصیدے تھے جبکہ میں اسے شکیل کا ساتھ چھوڑنے پر آمادہ کررہی تھی۔ اس کی شراب نوشی کے طعنے دے رہی تھی۔

''آپ نے نہیں سنا؟ وہ خود کہہ رہا تھا کہ وہ شراب پیتا ہے۔''

''اسی سے اندازہ کرلو کہ وہ کتنا سچا آدمی ہے۔''

''میں تو اس وقت سے ڈر رہی ہوں جب اس کی صحبت میں آپ بھی شراب پینے لگیں گے۔''

''کیسی باتیں کرتی ہو۔ اس کا فعل اس کے ساتھ۔''

''میں آپ کو تو نہیں روک سکتی لیکن آپ اسے یہاں لے کر نہ آیا کریں۔ شرابیوں کا کیا ہے۔ کسی دن شراب پی کر یہاں بھی آجائے گا۔''

ارسلان یہ سن کر چپ ہوگئے تھے۔ غالباً انہوں نے میری بات مان لی تھی کیونکہ اس دن کے بعد سے شکیل میرے گھر نہیں آیا تھا۔

شکیل نے آنا چھوڑ دیا تھا لیکن ارسلان اب گھر سے باہر رہنے لگے تھے۔ میرا دھیان پھر شکیل کی طرف گیا تھا اور میں نے ارسلان سے لڑنا شروع کردیا تھا۔ وہ یہ ماننے کو تیار نہ تھے کہ وہ شکیل سے ملتے ہیں لیکن اپنی آوارگی کا ذمے دار شکیل کو نہیں سمجھتے تھے۔

ایک دن وہ گھر لوٹے تو پانی سر سے اونچا ہوچکا تھا۔ وہ نشے میں تھے۔ کہیں سے شراب پی کر آئے تھے۔ شاید پہلے بھی اس حالت میں آتے رہے ہوں لیکن اس رات کچھ زیادہ پی لی تھی اور راز مجھ پر کھل گیا۔ میں نے نشے کی حالت میں ان سے لڑنا مناسب نہ سمجھا لیکن صبح جب وہ سو کر اٹھے تو میں نے قیامت کھڑی کردی۔ وہ یہ تو نہیں جھٹلا سکتے تھے کہ شراب نہیں پی لیکن یہ ماننے کو تیار نہیں تھے کہ شکیل نے انہیں اس راہ پر لگایا ہے۔

اس دن کے بعد سے ارسلان زیادہ سے زیادہ گھر سے باہر رہنے لگے تھے۔ ان کی آوارگی بڑھتی جارہی تھی۔ گھر کے خرچ میں بھی کنجوسی دکھانے لگے تھے۔ جھگڑے بھی تقریباً روز ہی ہورہے تھے۔ میرا دل ان کی طرف سے برا ہوتا جارہا تھا۔ میں اس سب کا ذمہ دار شکیل کو ٹھہرا رہی تھی۔

میں اپنے میکے آئی ہوئی تھی کہ ارسلان کے دوست کی حیثیت سے شکیل میرے میکے آیا۔ امی نے مجھے بتایا کہ ارسلان کا کوئی دوست شکیل آیا ہے۔ کہتا ہے روبینہ سے ملنا ہے۔ شکیل ایک مرتبہ پہلے بھی آچکا تھا لیکن شکر ہے امی کو اس کی شکل یا نام یاد نہیں رہا تھا۔ میں حیران تھی کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے۔ پہلے تو میں نے سوچا اسے واپس کردوں لیکن یہ سوچ کر بلا لیا کہ شاید وہ کوئی اہم بات کرنے آیا ہو۔

میں ڈرائنگ روم میں پہنچی تو وہ بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے جاتے ہی اس کے آنے کا سبب پوچھا۔ اس نے بھی کوئی تمہید باندھے بغیر اپنا مطلب بیان کردیا۔

''روبینہ، میں جانتا ہوں تم مجھے اچھا نہیں سمجھتیں لیکن میں تم سے محبت کرتا ہوں۔''

''اب آپ کو اس جذبے کے اظہار کا کوئی حق نہیں۔''

''یہ حق تو ہے کہ اپنی صفائی پیش کرسکوں۔ تم سمجھتی ہو تمہارے شوہر کو شراب کی عادت میں نے ڈالی ہے۔ میں اپنی صفائی پیش کرنے آیا ہوں۔ وہ مجھ سے تو ملتا ہی کم ہے۔ ایک اطلاع آپ کو دے دوں۔ وہ کسی عورت سے ملنے لگا ہے۔ شراب کی عادت بھی اسے وہیں سے پڑی ہے۔ میں نے اسے بہت سمجھا کر دیکھ لیا۔ اب تم اسے روک سکتی ہو تو روک لو ورنہ وہ عورت اسے برباد کردے گی۔''

''کون ہے وہ عورت؟''

''یہ تو مجھے نہیں معلوم لیکن اس نے مجھے خود بتایا تھا۔ یہ میں اس سے کوشش کے باوجود نہیں اگلوا سکا کہ وہ عورت کون ہے اور کہاں رہتی ہے۔''

''کیا آپ اس کے سامنے یہ بات کرسکتے ہیں۔''

''تم مجھے اس امتحان میں مت ڈالو۔ ہماری دوستی ہے۔ وہ کہے گا میں نے اس کا راز تمہیں بتا دیا۔ تم مجھے اپنا دوست مت سمجھو لیکن میں تمہیں اپنا دوست سمجھتا ہوں۔ اس لیے میں نے تمہیں باخبر کردیا۔ اب اسے راہِ راست پر لانا تمہارا کام ہے۔''

وہ یہ پیغام دے کر چلا گیا۔ میں نے دل ہی دل میں

اس کا شکریہ ادا کیا اور توبہ کی کہ میں اسے اپنا دشمن سمجھ رہی تھی وہ تو میرا ہمدرد ہے۔

شکیل میرے دل میں شک کا بیج بو کر چلا گیا تھا۔ میں اسی وقت گھر چلی گئی۔ اب مجھے ارسلان پر نظر رکھنی تھی۔ دل میں شک تھا اس لیے اس کی ہر حرکت مجھے مشکوک کر رہی تھی۔ وہ اگر کسی کو فون کرتا تو میں چھپ چھپ کر سنتی۔ وہ کہیں جانے کے لیے تیار ہوتا تو میں ہر ممکن کوشش کرتی کہ وہ نہ جائے۔ اس بات پر جھگڑا بھی ہوتا۔

کوشش کے باوجود میں اسے رنگے ہاتھوں نہ پکڑ سکی۔ پھر ایک دن میں نے اس عورت کا ذکر چھیڑ ہی دیا۔ وہ پاگلوں کی طرح میری شکل دیکھ رہا تھا کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔ اس نے میری بات کو سختی سے جھٹلا دیا تھا۔ مجھے اس کی بات کا اس وقت بھی یقین نہیں آیا۔ اتنی آسانی سے کون اپنا جرم قبول کرتا ہے جبکہ میرے پاس کوئی ثبوت بھی نہیں تھا۔ میں اس سے صرف لڑ سکتی تھی اور لڑ رہی تھی۔ شک کی چنگاری نے میری زندگی جہنم بنا کر رکھ دی تھی۔ میرے اس رویے نے اسے مجھ سے دور کر دیا۔ اس کا زیادہ تر وقت اب باہر ہی گزرتا تھا۔ میں یہ سوچ سوچ کر جلتی رہتی تھی کہ وہ میرے پاس نہیں ہے تو یقیناً اس عورت کے پاس ہوگا۔ وہ جتنی اپنی صفائی پیش کرتا تھا اتنا ہی میرا شک قوی ہوتا تھا۔

اس کی شراب نوشی میں اضافہ ہو گیا تھا البتہ میرے خوف سے اس نے یہ پردہ ضرور رکھا تھا کہ وہ یہ شغل گھر میں نہیں کرتا تھا۔ رات گئے آتا تھا۔ کبھی نشے میں کبھی نشے کے بغیر۔ ایک روز آیا تو اس کی حالت کچھ زیادہ ہی دگرگوں تھی خلافِ معمول میرے قریب آ کر بیٹھ گیا اور آہستہ آہستہ مجھے آوازیں دینے لگا۔ میں جاگ گئی تھی لیکن بول نہیں رہی تھی۔ پھر مجھے محسوس ہوا اس نے قے کی ہے۔ شرابی قے کرتے ہی ہیں۔ وہ میرا شوہر تھا۔ مجھ سے رہا نہ گیا اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ مسلسل الٹیاں کر رہا تھا۔ میں نے اٹھ کر روشنی کر دی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ پکڑے ہوئے تھا اور خون کی الٹیاں کر رہا تھا۔ میں بھاگتی ہوئی گئی اور شکیل کو فون کر دیا۔ واپس آئی تو ارسلان فرش پر بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر میں شکیل آ گیا۔ میں نے اس کی مدد سے ارسلان کو بستر پر لٹایا۔

"تم اپنے امی ابو کو بلا لو۔ ارسلان کی نبض رک گئی ہے۔"

"ڈاکٹر کو کیوں نہیں بلاتے۔"

"ایسی غلطی بھی مت کرنا۔ ارسلان کو زہر دیا گیا ہے۔ خوامخواہ پولیس کیس بن جائے گا۔ تم بھی پھنسو گی۔ یہ مر چکا ہے۔ صبح خاموشی سے دفنا دینا۔"

"امی کے گھر تو فون نہیں ہے۔"

"میں جاتا ہوں۔"

وہ جا کر امی ابو کو بلا لایا۔ ساری سچویشن انہیں بھی سمجھا دی گئی۔ وہ کوئی غیر تو تھا نہیں میری پھوپی کا بیٹا تھا۔ جو رشتے دار اس کے تھے ہمارے بھی تھے۔ پھر بھی ہم نے احتیاط کی اور بہت کم رشتے داروں کو خبر کی۔ ارسلان کو خاموشی سے دفنا دیا گیا۔

جس مکان میں ہم رہ رہے تھے وہ آفس کی طرف سے ملا ہوا تھا۔ کبھی نہ کبھی اسے چھوڑنا تھا۔ ابو مجھے اپنے گھر لے آئے۔ یہیں مجھے عدت گزارنی تھی۔

شکیل نے یہاں آنا شروع کر دیا اور ایسی ہمدردی کا مظاہرہ کیا کہ امی ابو کے دل میں جگہ پیدا کر لی۔ میں تو عدت میں تھی لیکن سنتی ضرور تھی کہ شکیل آیا تھا۔ میری بیٹی فاخرہ کا بھی وہ بہت خیال رکھ رہا تھا۔ میرا دل بھی اس کی طرف سے صاف ہو چکا تھا بلکہ ایک طرح سے اس کی شکر گزار تھی۔

میری عدت ختم ہوئی تو اس نے شادی کا پیغام دے دیا۔ امی نے بھی مجھے سمجھایا کہ آج کل کنواریوں کے رشتے نہیں آ رہے ہیں تم تو خیر سے ایک بیٹی کی ماں ہو اچھا رشتہ ہے قبول کر لو۔

شکیل بالآخر مجھے جیتنے میں کامیاب ہو گیا۔

مجھے معلوم تھا وہ شراب پیتا ہے۔ میں نے اسے برداشت کیا۔ اس سے میری تین لڑکیاں اور ہوئیں اور اب پورے بیس سال بعد یہ انکشاف ہوا کہ وہ صرف شرابی نہیں میرے شوہر کا قاتل بھی ہے۔ اس نے اپنی کامیابی کے لیے ارسلان کو راستے سے ہٹا دیا۔

میں ڈرائنگ روم میں لیٹی یہ سب کچھ سوچ رہی تھی کہ صبح ہو گئی اور میری بڑی بیٹی ڈرائنگ روم میں آ گئی۔

"امی آپ یہاں سو رہی ہیں؟ کیا پاپا سے لڑائی ہوئی ہے۔"

"ارے نہیں وہ تو بہت اچھے ہیں۔ وہ آئے نہیں تھے میں یہاں لیٹ گئی اور آنکھ لگ گئی۔"

میں اب بھی اسی قاتل کے ساتھ رہ رہی ہوں۔ یہ فیصلہ آپ کو کرنا ہے کہ یہ میری مصلحت ہے یا محبت؟



# شکستہ آئینہ

محترمی!

سلامِ تہنیت!

سرگزشت کا مطالعہ برابر کرتا ہوں لیکن کبھی کوئی تحریر بھیجی نہیں۔ پہلی بار اپنی ہی زندگی کے واقعات کو یکجا کرکے آپ کی خدمت میں پیش کررہا ہوں۔ اگر اسے شائع کردیا تو مزید واقعات ارسال کروں گا۔

وقار احمد وکی
(سکھر)

لوگ کہتے ہیں کہ میں خطرناک آدمی ہوں۔ لوگوں کو ضرر پہنچا کر خوش ہوتا ہوں۔ اس لیے مجھے اس کال کوٹھڑی میں قید کر دیا گیا ہے۔ یہاں بھی میرا دو قیدیوں سے بہت زبردست جھگڑا ہو چکا ہے۔ ان میں سے ایک قیدی اکبر تو جاں بہ لب ہے۔ پولیس والے نے مجھ سے کہا تھا۔ "دعا کر اوئے، اکبر کی جان بچ جائے ورنہ دوسری دفعات کے ساتھ ساتھ تجھ پہ دفعہ تین سو دو بھی لگ جائے گی۔"

"اس سے کیا ہوگا؟" میں نے طنزیہ لہجے میں

کہا۔ ”تم لوگ زیادہ سے زیادہ مجھے پھانسی پر لٹکا دو گے۔ میں تو خود اس زندگی سے عاجز آچکا ہوں۔“

”اوئے بس اوئے۔“ پولیس والے نے کہا۔ ”موت کی کال کوٹھڑی میں بڑے بڑے طرم خان کی ہوا نکل جاتی ہے۔“

”تو اگر مزید بکواس کرتا رہا تو اکبر تو شاید بچ جائے لیکن تو نہیں بچے گا۔“ میں نے پولیس والے کو کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

وہ سلاخوں کے باہر تھا اس کے باوجود خوف زدہ ہو کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ میں اس کی حالت پر بے اختیار ہنسنے لگا۔

☆☆☆

میں نے جلدی جلدی ہوم ورک نمٹایا اور اپنی سائیکل لے کر باہر نکل ہی رہا تھا کہ مما نے مجھ سے کہا۔ ”وکی، آج ذرا جلدی گھر آجانا، کل کی طرح سورج غروب ہونے کے بعد گھر میں مت گھسنا، تمہارے ڈیڈی بہت ناراض ہو رہے تھے۔“

میں نے ان کی بات سنی اور کوئی جواب دیے بغیر گھر سے نکل گیا۔ مجھے اس شخص سے شدید نفرت تھی جو میرا ڈیڈی کہلاتا تھا۔ وہ میرا سگا باپ نہیں تھا۔ ابو کے انتقال کے بعد مما نے اس شخص سے شادی کی تھی۔ یوں وہ میرا باپ اور صوبیہ میری بہن بن بیٹھی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ شخص بھی مجھ سے اتنی ہی نفرت کرتا ہے، جتنی نفرت میں اس سے کرتا ہوں۔ صوبیہ کا رویہ البتہ بہت اچھا تھا۔ وہ مجھ سے بات بھی کرتی تھی اور میرے چھوٹے موٹے کام بھی کر دیتی تھی۔ وہ عمر میں مجھ سے دو تین سال چھوٹی تھی اور واقعی مجھے سگے بھائیوں کی طرح چاہتی تھی لیکن میں اسے وہ محبت نہ دے سکا کہ وہ آفتاب کی بیٹی تھی۔

میرے سوتیلے باپ کا نام آفتاب تھا لیکن وہ میری زندگی میں رات کی سیاہی بن کر داخل ہوا تھا۔ اس کا خیال آیا تو میں زور زور سے پیڈل مارنے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں سائیکل چلانے کی بجائے اس شخص کے وجود کو روند رہا ہوں۔ میرا رخ اس وقت حسبِ معمول اس محلے کی طرف تھا جہاں میرا بچپن گزرا تھا۔

وہ مکان اب بھی موجود تھا جس میں میں نے زندگی کے ماہ و سال گزارے تھے۔ وہ مکان مما نے کرائے پر دے دیا تھا۔

اسی محلے میں شائستہ رہتی تھی۔ وہ انکل سلمان کی بیٹی تھی۔ اس سے چھوٹا ایک بھائی بھی تھا جو مجھ سے چار پانچ سال چھوٹا ہوگا۔ شائستہ مجھے بچپن ہی سے اچھی لگتی تھی۔ وہ ان دنوں نویں میں تھی اور میں میٹرک کا امتحان دے رہا تھا۔

ہمارا بچپن ساتھ کھیلتے گزرا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مجھے احساس ہوا کہ میں شائستہ سے محبت کرنے لگا ہوں۔ وہ عمر بھی بہت ہنگامہ خیز ہوتی ہے۔ شائستہ کو بھی شاید میرے جذبات کا علم تھا۔ لڑکیاں تو لڑکوں کی نسبت اس معاملے میں زیادہ حساس ہوتی ہیں۔ میں اسکول سے آکر اپنا ہوم ورک نمٹاتا پھر سائیکل لے کر نکل کھڑا ہوتا۔

ہمارا پرانا گھر نارتھ ناظم آباد میں تھا۔ اب میں سوسائٹی میں رہ رہا تھا۔ اچھا خاصا فاصلہ تھا لیکن میں روزانہ وہ فاصلہ سائیکل پر طے کرتا تھا۔

مجھے دیکھ کر شائستہ کھل اٹھی۔ اس کا بھائی بابر دوڑتا ہوا آیا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ ”وکی بھائی، میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔“ اس نے ہنس کر کہا۔

”خیریت تو ہے بھئی؟“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”یہ انتظار کرنے کا کام تم نے کب سے سنبھال لیا؟“

”آج ہی سے۔“ بابر نے ہنس کر کہا۔ ”یہ بھی کوئی کام ہے وکی بھائی؟“

”ارے یہی تو ایک کام ہے۔ تم اپنی باجی سے پوچھ لو۔“ میں نے شائستہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”وکی“ شائستہ نے ہنس کر کہا۔ ”یہاں کوئی تمہارا انتظار نہیں کرتا۔“

”ٹھیک ہے، پھر میرا یہاں آنا ہی فضول ہے۔“ میں نے مصنوعی ناراضی سے کہا اور اپنی سائیکل کی طرف بڑھا۔

”ارے ارے وکی بھائی، آپ لوگوں کے جھگڑے میں میرا نقصان ہو جائے گا۔“ اس نے میری سائیکل کا ہینڈل پکڑ لیا۔

اسی وقت آنٹی آگئیں۔ وہ مسکرا کر بولیں۔ ”ارے بھئی وکی، یہ بابر کافی دیر سے تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ آج اسے اپنی کچھ شاپنگ کرنا ہے۔ شائستہ نے کہا بھی کہ میرے ساتھ چلو لیکن اس کی تو ایک ہی رٹ تھی کہ وکی بھائی کے ساتھ جاؤں گا۔ ان کی پسند بہت اچھی ہے۔“

”پسند تو واقعی اچھی ہے۔“ میں نے شائستہ کو پُرشوق نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”چلو یار، تمہیں شاپنگ کرا دیں۔“

میں بابر کو سائیکل پر بٹھا کر حیدری لے گیا اور اسے شاپنگ کرا دی۔ میں نے شائستہ کے لیے بھی چوڑیاں خرید لیں۔ ہری ہری چوڑیاں شائستہ کی گوری کلائیوں میں بہت اچھی لگتیں۔

واپس پہنچ کر بابر، آنٹی کو اپنی لائی ہوئی چیزیں دکھانے لگا، شائستہ اس وقت ٹی وی لاؤنج میں تھی۔ چوڑیاں لے کر میں بھی وہیں پہنچ گیا اور شائستہ سے بولا۔ ”ذرا اپنا ہاتھ دکھاؤ۔“

”تمہیں ہاتھ دیکھنے کا بہت شوق ہے؟“ شائستہ ہنس کر بولی۔ ”میں نے ہاتھ دکھا دیے تو چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔“

”ارے وہ تو پہلے ہی سے روشن ہیں۔“ میں نے ہنس کر کہا اور چوڑیاں اس کے سامنے کر دیں۔

”یہ...... تم لائے ہو...... میرے لیے؟“

”ہاں بھئی، اب میں آنٹی کے لیے تو لانے سے رہا۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

شائستہ نے خوشی خوشی وہ چوڑیاں پہن لیں۔ وہ چوڑیاں اس کی خوب صورت کلائیوں میں واقعی بہت اچھی لگ رہی تھیں۔

”اب تم ایک کپ چائے کے تو حق دار ہو ہی چکے ہو۔“ شائستہ نے ایک ادا سے کہا اور لہراتی ہوئی کچن کی طرف بڑھ گئی۔

اس دن میں کافی دیر تک وہاں رہا۔ اس وقت تک انکل سلطان بھی آچکے تھے۔ وہ بھی میرے ساتھ بہت محبت سے پیش آتے تھے۔ میں ان کے گھر کے ایک فرد ہی کی طرح تھا۔

میں آنے لگا تو انکل نے کہا۔ ”وکی بیٹا، کھانا کھا کر جانا۔“

”کھانا پھر کبھی کھا لوں گا انکل!“ میں نے کہا۔ ”مما کھانے پر میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔“ یہ کہہ کر میں باہر نکل کر ان کے مختصر سے لان میں آگیا۔

میں سائیکل نکال رہا تھا کہ شائستہ میرے پیچھے آگئی اور بولی۔ ”وکی! کل آؤ گے؟“

”نہیں بھئی۔“ میں نے منہ بنا کر کہا۔ ”جب یہاں کوئی میرا انتظار ہی نہیں کرتا تو آنے کا فائدہ؟“

”ارے بابا، وہ تو میں نے تمہیں چڑانے کو کہا تھا۔ میں کرتی ہوں نا تمہارا انتظار!“

”میں نے بھی تمہیں چڑانے ہی کو انکار کیا تھا ورنہ میں تمہیں دیکھے بغیر رہ سکتا ہوں؟“

اسی وقت بابر باہر نکلا تو شائستہ کچھ جواب دیتے دیتے رک گئی۔

میں گھر پہنچا تو مما شدید غصے میں تھیں۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بولیں۔ ”وکی، میں نے تم سے جلدی آنے کو کہا تھا؟“

”لیکن مما! میں جلدی آکر کیا کرتا؟“ میں نے جھلا کر کہا۔

”تم بہت گستاخ ہو گئے ہو۔“ مما نے تلخ لہجے میں کہا۔

”مما، چھوڑیں نا!“ صوبیہ درمیان میں آگئی۔ ”بھیا تھکے ہوئے آئے ہیں۔ انہیں کھانا تو کھانے دیں۔“

”مجھے نہیں کھانا ہے کھانا۔“ میں نے کہا اور پیر پٹختا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

مما میرے پیچھے پیچھے کمرے میں آگئیں اور بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔ ”وکی، تم کیوں مجھے اتنا پریشان کرتے ہو؟“

”مما! میں آپ کو کب پریشان کرتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے آج تک آپ کی کوئی بات ٹالی ہے۔ ہاں، میں کسی دوسرے کی کوئی بات نہیں مانوں گا۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

گزشتہ پانچ سال سے یہی ہو رہا تھا۔ میں اپنے نام نہاد باپ کی کوئی بات نہیں مانتا تھا۔ وہ جھنجلا کر میری پٹائی کر دیتا تھا۔ روز روز کی مار سے میرا جسم مضبوط ہو گیا تھا اور اب تو مار بھی مجھ پر کوئی اثر نہیں کرتی تھی۔ میرے نام نہاد باپ نے کچھ دنوں سے مجھے مارنا پیٹنا چھوڑ دیا تھا۔

مجھے حیرت تھی کہ اس کی فطرت میں یہ انقلاب کیسے آگیا لیکن صوبیہ نے مجھے بتایا کہ مما نے ڈیڈی سے کہا ہے کہ وکی اب بڑا ہو گیا ہے۔ میں اسے خود سمجھا لوں گی۔

”اگر تو اپنے باپ کی بات نہیں مانے گا تو میں تجھ سے بات نہیں کروں گی۔“ مما نے روتے ہوئے کہا۔

”وہ میرا باپ نہیں ہے۔“ میں نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

”رہنے دو ساجدہ!“ اچانک آفتاب کمرے میں آگیا۔ ”یہ لاتوں کا بھوت ہے، باتوں سے نہیں مانے گا۔“ یہ کہہ کر وہ مجھے مارنے کو آگے بڑھا تو مما بیچ میں آگئیں۔

اس نے مما کو بھی ایک طرف دھکیل دیا۔ وہ بیچاری کمزور سی عورت تھیں۔ اس کے دھکے سے وہ کمرے میں رکھی الماری سے ٹکرائیں اور فرش پر گر گئیں۔

مما کو اس حال میں دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ آفتاب نے مجھے تھپڑ مارنا چاہا لیکن میں نے مضبوطی

سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔ ''بہت ہوگیا آفتاب صاحب! اب آپ نے مجھے یا میری مما کو ہاتھ بھی لگایا تو میں آپ کے ہاتھ توڑ دوں گا۔ آپ میری ہی آنکھوں کے سامنے میری ماں کو مار رہے ہیں۔'' میں پھر کر بولا۔

آفتاب نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑایا اور اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ میں جانتا تھا کہ اب وہ بید لے کر آئے گا اور مجھے روئی کی طرح دُھن کے رکھ دے گا۔ میں بھی آج اس کی مار کھانے کے موڈ میں نہیں تھا۔

میری توقع کے عین مطابق آفتاب بید لے کر کمرے سے باہر نکلا۔ میں اس دوران میں مما کو اٹھا کر بیڈ پر بٹھا چکا تھا۔ آفتاب مجھ پر وحشیانہ انداز میں بید برسانے لگا۔ وہ چار چھ بید مارنے میں تو کامیاب ہوگیا لیکن میں نے اسے مزید موقع نہ دیا اور بید پکڑ کر جھٹکے سے کھینچ لیا۔ دوسرے ہی لمحے بید میرے ہاتھ میں تھا۔ پھر مجھ پر گویا جنون سوار ہوگیا۔ میں وہی بید دیوانہ وار آفتاب کے جسم پر برسانے لگا۔ میں نے لمحوں میں اس کا حلیہ بگاڑ دیا۔ میرا بید اس کے بازوؤں، سر اور چہرے پر برس رہا تھا۔

میں اتنی قوت سے اس پہ بید برسا رہا تھا کہ وہ فرش پر گر پڑا۔ میں آج اپنی ہر چوٹ، ہر تکلیف کا حساب بے باق کر دینا چاہتا تھا۔

''ساجدہ!'' آفتاب حلق پھاڑ کے چیخا۔ ''اسے روکو ورنہ میں اسے جان سے مار دوں گا۔''

''مجھے جان سے مار دے گا۔'' میں نے اس کے چہرے پر پے در پے دو تین بھرپور ضربیں لگا کر کہا۔ ''میں تجھے اس قابل رہنے دوں گا تو کچھ کرے گا نا؟'' میں نے اس کے پیٹ میں بھرپور لات رسید کرتے ہوئے کہا۔

''وکی!'' مما چیخ کر بولیں۔ ''کمینے اپنے باپ پر ہاتھ اٹھاتا ہے۔''

''یہ میرا باپ نہیں ہے۔'' میں نے اس کی کلائی پر بید کی زوردار ضرب لگاتے ہوئے کہا۔ ''یہ میرے سامنے میری ماں پر ہاتھ اٹھائے گا۔ میں اس کے ہاتھ ہی توڑ دوں گا۔''

میں نے بید کی دو تین بھرپور ضربیں اس کی کلائی پر ماریں تو وہ ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح چیخنے لگا۔ پھر چیخ کر بولا۔

''نمک حرام، کتے، کمینے، ذلیل! نکل جا میرے گھر سے۔ آج سے میرا اور تیرا کوئی رشتہ نہیں ہے۔''

''رشتہ!'' میں نے اس کے پیٹ میں ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔ ''کون سے رشتے کی بات کر رہا ہے تو؟ میں اس گھر سے ضرور جاؤں گا لیکن تجھے اپاہج کرنے کے بعد!'' یہ کہہ کر میں پھر اس پر پل پڑا اور لاتوں، گھونسوں اور بید سے مار مار کر اسے بے دم کر دیا۔

مما گرتی پڑتی اچانک میرے سامنے آگئیں۔ وہ تو شاید بہت پہلے مجھے روک دیتیں لیکن ان کے سر میں شدید چوٹ لگی تھی۔ ان سے کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا تھا۔ انہوں نے میرے منہ پر تھپڑ مارنے کی کوشش کی، پھر لڑکھڑا کر گرنے لگیں۔

میں نے بید پھینک کر انہیں ہاتھوں میں سنبھال لیا اور بیڈ پر لٹا دیا۔ مما گہرے گہرے سانس لے رہی تھیں اور مجھے برا بھلا کہہ رہی تھیں۔ اس وقت ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

موقع کا فائدہ اٹھا کر آفتاب وہاں سے بھاگ گیا تھا۔

مما نے ناگواری سے کہا۔ ''وکی! تو نے اچھا نہیں کیا۔''

''اور اس نے میرا ساتھ بہت اچھا کیا ہے نا!'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

اچانک صوبیہ بھاگتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور مجھ سے بولی۔ ''بھیا، آپ یہاں سے بھاگ جائیں۔ ڈیڈی پولیس کو فون کر رہے ہیں۔''

''آنے دو پولیس کو۔'' میں نے چیخ کر کہا۔

''صوبیہ ٹھیک کہہ رہی ہے وکی!'' مما نے کہا۔ ''تُو یہاں سے بھاگ جا۔''

''مما! میں آپ کو اس حال میں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''پولیس کے آنے سے پہلے میں اپنے اس نام نہاد باپ کو چلنے پھرنے کے قابل نہیں چھوڑوں گا۔'' یہ کہہ کر میں کمرے سے باہر نکلا۔

آفتاب بنیادی طور پر ایک بزدل آدمی تھا۔ حالانکہ وہ جسمانی طاقت میں مجھ سے کہیں زیادہ تھا۔ میں کمرے سے باہر نکلا تو آفتاب نے جھپٹ کر اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ وہ اگر تھوڑی سی بھی ہمت کرتا تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔ اس کے بزدلانہ رویّے کی وجہ سے میں مزید شیر ہوگیا تھا۔

میں نے اس کے کمرے کا دروازہ پیٹ ڈالا۔ ''آفتاب! باہر نکل بزدل! آج تک تو مجھے مارتا پیٹتا آیا ہے۔ آج میں تجھ سے ایک ایک تھپڑ، ایک ایک بید کا حساب لوں گا۔''

''تو اگر بہت بہادر ہے تو یہاں سے ہلنا مت۔ ابھی تیری ساری غنڈا گردی ناک کے راستے بہہ جائے گی۔''



آفتاب اندر سے چیخ کر بولا۔

''بھیا!'' صوبیہ چیخ کر بولی۔ ''کیا کر رہے ہیں آپ؟ آپ کو شرم نہیں آتی۔ وہ آپ کے باپ نہ سہی، باپ کی عمر کے تو ہیں۔ آپ کی مما کے شوہر ہیں اور آپ......''

''تم اپنی بکواس بند رکھو تو بہتر ہے۔'' میں نے صوبیہ کو بری طرح جھڑک دیا۔

''میں نہیں چپ رہوں گی۔'' صوبیہ بھی بپھر کر بولی۔ ''کیا کریں گے آپ، مجھے بھی ماریں گے؟'' پھر وہ بولی۔ ''بھیا پلیز آپ یہاں سے چلے جائیں۔ وہ پولیس......''

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی تھی۔ پھر بھاری بوٹوں کی دھمک سے برآمدہ گونج اٹھا۔

دوسرے ہی لمحے پولیس کا ایک سب انسپکٹر اور دو پولیس والے اندر داخل ہوئے۔ دونوں پولیس والوں نے اپنی بندوقیں شانے سے اتار کر ہاتھ میں پکڑ رکھی تھیں۔

''وقار عرف وکی کون ہے؟'' انسپکٹر نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

''میرا نام ہے وکی!'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

اسی وقت آفتاب کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ میں نے غصے میں اس وقت تو اس کی حالت پر غور نہیں کیا تھا۔ اس کا پورا چہرہ خون میں تر تھا۔ چہرے، جسم اور ہاتھوں پر بہت سے زخم تھے۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔

''انسپکٹر صاحب! یہی ہے وہ بدمعاش جس نے میری یہ حالت کی ہے۔'' آفتاب نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو اس کے منہ سے بھی خون کے بلبلے سے نکلے، شاید اس مار پیٹ میں اس کے ایک دو دانت بھی ٹوٹ گئے تھے۔

انسپکٹر کے ساتھ آئے ہوئے سپاہیوں نے مجھ پہ بندوقیں تان لیں۔

''اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش مت کرنا۔'' انسپکٹر نے اپنی بیلٹ سے ہتھکڑی نکالتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں گرفتار کر رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے ہتھکڑی میرے ہاتھ میں ڈال دی۔ پھر وہ آفتاب سے مخاطب ہوا۔ ''سر، آپ کو بھی پولیس اسٹیشن تک چلنا ہوگا۔ وہاں چل کر آپ رپورٹ درج کرائیں، پھر میں آپ کو طبی معائنے کے لیے بھیجوں گا۔ ڈاکٹر کی رپورٹ کے بعد ہی اس پر فردِ جرم عائد ہوگی۔''

اچانک مما کمرے سے نکل آئیں اور روتے ہوئے بولیں۔ ''انسپکٹر صاحب! وکی ابھی بچہ ہے۔ اس سے غلطی ہوگئی ہے۔ اسے معاف کر دیں۔ میں خود اسے سزا دوں گی۔''

''یہ بچہ ہے؟'' سب انسپکٹر نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔ ''اس بچے کا کارنامہ تو دیکھیے۔ میں اسے معاف نہیں کر سکتا۔''

''ساجدہ!'' آفتاب نے سخت لہجے میں کہا۔ ''تم اندر جاؤ۔''

''انسپکٹر صاحب، پلیز! میرے بھیا کو چھوڑ دیں۔'' صوبیہ نے روتے ہوئے کہا۔

''صوبی!'' آفتاب چیخا۔ ''تم بھی اندر جاؤ۔'' پھر وہ سب انسپکٹر سے مخاطب ہوا۔ ''انسپکٹر صاحب، آپ اسے لے جایئے۔''

سب انسپکٹر نے میری گردن پر زوردار ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''چل، گاڑی میں بیٹھ۔''

ہتھکڑی کی زنجیر ایک سپاہی نے تھام لی اور وہ مجھے کھینچتا ہوا گاڑی کی طرف لے چلا۔

تھانے پہنچ کر پولیس والوں نے مجھے لاتیں مار کے حوالات میں دھکیل دیا۔

وہاں تین ملزمان پہلے سے موجود تھے۔ تینوں ہی چہروں سے بدمعاش نظر آرہے تھے۔

ایک بدمعاش میری طرف کھسک کر بولا۔ ''تو نے کیا کیا ہے؟ کسی کی جیب کاٹی ہے یا کسی عورت کا پرس چھین کر بھاگا ہے؟''

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

''ابے گھور کیا رہا ہے؟'' وہی ملزم طنزیہ انداز میں بولا۔ ''کسی دکان سے کوئی چیز لے کر بھاگا تھا؟''

''مجھے تو لگتا ہے کسی لونڈیا کا چکر ہے۔'' کونے میں بیٹھا ہوا مکروہ صورت ملزم بولا۔

اس کی بات پر تینوں ہنسنے لگے۔

میں بھنا کر بولا۔ ''بکواس بند کرو۔ یہ گھٹیا کام تم ہی جیسے گھٹیا لوگ کرتے ہیں۔''

''واہ میرے شہزادے!'' مکروہ صورت ملزم بولا۔ ''تو تو نے کون سا بڑھیا کام کیا ہے؟''

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

اسی وقت پولیس کا ایک سپاہی حوالات کی طرف آیا اور بولا۔ ''وقار عرف وکی! چلو تمہیں صاحب نے بلایا ہے۔''

اس نے حوالات کا دروازہ کھول کر میرے ہاتھ میں ہتھکڑی ڈالی اور مجھے لے کر ایس ایچ او کے کمرے میں پہنچ گیا۔

ایس ایچ او بڑی بڑی گھنی مونچھوں والا بارعب شخص

تھا۔ اس کے سامنے انکل سلطان بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ کالے کوٹ اور ٹائی میں ملبوس باوقار سا ایک شخص بیٹھا تھا۔

باوقار شخص نے اپنے بریف کیس سے ایک فارم نکالا اور انتہائی شستہ لہجے میں بولا۔ ''مسٹر وقار! میں بیرسٹر احسان ہوں، اس وکالت نامے پر سائن کر دیں۔''

میں نے اس کی بتائی ہوئی جگہ پر دستخط کر دیے۔ میری تسلی کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ انکل سلطان وہاں موجود تھے۔

''ہاں تو انسپکٹر!'' بیرسٹر صاحب نے ایس ایچ او کو مخاطب کیا۔ ''کیا آپ بتانا پسند کریں گے کہ آپ نے وقار کو کس الزام میں گرفتار کیا ہے؟''

''اس کے خلاف مار پیٹ اور غنڈا گردی کی رپورٹ درج کرائی گئی ہے بیرسٹر صاحب!''

''کس نے رپورٹ درج کرائی اور آپ نے محض رپورٹ پر اسے گرفتار کر لیا۔ میں ابھی کسی کے خلاف رپورٹ درج کراؤں تو کیا آپ اسے بھی گرفتار کر لیں گے؟''

''بالکل کر لیں گے جناب!'' ایس ایچ او نے جبراً مسکراتے ہوئے کہا۔

''بغیر کسی گواہ اور ثبوت کے؟'' بیرسٹر صاحب نے سنجیدگی سے پوچھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے انسپکٹر کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔

''ثبوت اور گواہوں کی ضرورت تو بعد میں پڑتی ہے جناب! سب انسپکٹر لطیف نے اس ملزم کو موقعِ واردات سے گرفتار کیا ہے۔''

''آپ ذرا انسپکٹر لطیف کو بلانے کی زحمت کریں گے۔''

''میں حاضر ہوں جناب!'' دروازے کے پاس سے سب انسپکٹر لطیف کی آواز سنائی دی۔ میں ہی سب انسپکٹر لطیف ہوں۔ حکم کریں جناب!''

بیرسٹر صاحب نے سب انسپکٹر کا بھرپور انداز میں جائزہ لیا، پھر بولے۔ ''ایس آئی صاحب! آپ نے وقار کو موقعِ واردات سے گرفتار کیا ہے؟''

''جی ہاں، جناب! اس نے مار مار کے ایک شریف آدمی کو ادھ موا کر دیا ہے۔ میں نے اسے وہیں سے گرفتار کیا ہے۔''

''یہ اُس شریف آدمی کو کس چیز سے مار رہا تھا۔ آپ کی زبان میں کہوں گا کہ یہ کس آلے سے ضرب لگا رہا تھا؟''

''اس کے ہاتھ میں اس وقت مضبوط سا ایک ڈنڈا تھا۔'' سب انسپکٹر نے اپنی دانست میں بہت سوچ سمجھ کر جواب دیا۔

''وہ ڈنڈا اب آپ کی تحویل میں ہوگا؟'' بیرسٹر صاحب نے اسے گہری نظر سے گھورتے ہوئے پوچھا۔ ''کیسا ڈنڈا تھا؟''

''وہ...... عام سا ڈنڈا تھا جناب...... جیسے...... عموماً ...... ڈنڈے ہوتے ہیں۔'' لطیف کچھ گھبرا گیا۔

''آپ نے موقعِ واردات کے ایک گواہ کو دیکھ لیا؟'' بیرسٹر صاحب، ایس ایچ او کی طرف مڑے۔ ''اس شریف آدمی نے اپنی رپورٹ میں کیا لکھا ہے؟'' بیرسٹر صاحب نے کہا۔ ''کیا اب بھی آپ یہی کہیں گے کہ سب انسپکٹر لطیف نے ملزم کو مار پیٹ کرتے دیکھا ہے؟''

''بیرسٹر صاحب! یہ سارے سوال جواب کل عدالت میں کیجیے گا۔'' انکل سلطان نے پہلی دفعہ زبان کھولی۔

''میں تو سب انسپکٹر صاحب کو صرف یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ کسی بھی معزز شہری کو بغیر کسی ثبوت اور گواہ کے گرفتار کرنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ میری بات ان لوگوں کی سمجھ میں بھی آ رہی ہوگی۔'' پھر وہ اچانک اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھ سے بولے ''مسٹر وقار! آپ ان کی مرضی کا بیان دے دیجیے گا۔ میں کل عدالت میں دیکھوں گا کہ ان میں سے کون کون معطل ہوتا ہے۔''

انکل سلطان بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھ سے بولے۔ ''وکی بیٹا! گھبرانا مت۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''

بیرسٹر صاحب انکل کے ساتھ باہر نکل گئے۔

ایس ایچ او مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ دانت پر دانت جما کر بولا۔ ''ابھی اسے لے جاؤ میں اس سے دو گھنٹے بعد تفصیلی ملاقات کروں گا۔''

پولیس کانسٹیبل مجھے کھینچتا ہوا حوالات کی طرف لے گیا۔

اس وقت تک حوالات میں چار نئے ملزمان کا اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ سب یوں اطمینان سے بیٹھے تھے جیسے حوالات میں نہ ہوں، اپنے گھر کے ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے ہوں۔ ان سب نے مجھے بہ غور دیکھا لیکن کوئی کچھ بولا نہیں۔ وہ لوگ پھر ایک دوسرے سے بات چیت میں مصروف ہو گئے۔ نئے آنے والے چاروں ملزمان نوجوان تھے اور اپنے لباس سے اچھے گھرانوں کے لگ رہے تھے۔

پھر سلاخوں کے پاس ایک سنتری کا چہرہ دکھائی دیا۔ اس نے ایک نظر تمام قیدیوں پر ڈالی اور مکروہ صورت کو خفیف سا اشارہ کیا۔ پھر وہ کچھ دیر وہاں رک کر ہٹ گیا۔

اس کے جانے کے بعد مکروہ صورت والا مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''ہاں شہزادے! صاحب نے تجھے کیوں بلایا تھا، کیا چوری کا مال برآمد ہو گیا؟ ارے چوری کرنے کے لیے بھی جگرا چاہیے۔ تُو تو شکل سے مجھے اٹھائی گیرا لگ رہا ہے۔''

ان لڑکوں میں سے ایک میرے بالکل نزدیک آ گیا اور آہستہ سے بولا۔ ''تم ان کی کسی بھی بات کا جواب مت دینا۔ وہ پولیس والا ابھی اس بدمعاش کو کوئی اشارہ کر کے گیا ہے۔ یہ لوگ جان بوجھ کر تمہیں مشتعل کرنا چاہتے ہیں۔''

''ابے کیا صاحب نے ......'' اس نے نہایت غلیظ بات کا حوالہ دیا۔ ''جو تجھے چپ لگ گئی ہے۔''

''ہاں یار۔'' دوسرا بدمعاش بولا۔ ''لیکن یہ شکل سے تو ایسا نہیں لگتا۔''

میں خاموشی سے ان کی باتیں سنتا رہا۔

''او بھائی، کیا...... کے ساتھ ساتھ تیری بولتی بھی بند ہو گئی؟'' مکروہ صورت نے پھر غلیظ زبان کا سہارا لیا۔

اب میری بھی سمجھ میں آ رہا تھا کہ وہ لوگ جان بوجھ کر مجھے اشتعال دلانا چاہتے ہیں تاکہ میں انہیں جواب دوں تو وہ میرے ساتھ مار پیٹ کریں اور میرے خلاف ایک اور مقدمہ بن جائے۔

میں نے اپنا دھیان ہٹانے کو اسی لڑکے کو مخاطب کیا جس نے مجھے پُرسکون رہنے کی تلقین کی تھی۔ ''مسٹر...... کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟'' میں نے انگریزی میں کہا۔

''ہاں ہاں، کیوں نہیں۔'' اس لڑکے نے بھی انگریزی میں ہی جواب دیا۔ ''مجھے جواد کہتے ہیں۔ پولیس نے مجھے ایک سیاسی جماعت کے احتجاجی جلوس سے گرفتار کیا ہے۔'' جواد اب بھی انگریزی ہی بول رہا تھا۔ ''اور تمہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''میں نے ایک شخص کو بہت بری طرح مارا ہے۔'' میں نے بھی انگریزی ہی میں جواب دیا۔ ''میرا نام وقار ہے۔ میرے دوست مجھے وکی کہتے ہیں۔''

''وہ شخص کون تھا اور تم نے اسے کیوں مارا؟ ویسے تم چہرے سے ایسے لگتے تو نہیں ہو۔''

''میں ایسا ہوں بھی نہیں۔ میں برسوں سے اس شخص کے ظلم کا نشانہ بن رہا تھا لیکن برداشت کر رہا تھا۔ آج جب اُس نے میری ماں پر ہاتھ اٹھایا تو مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ وہ شخص میرا سوتیلا باپ ہے۔''

''او، آئی سی!'' جواد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا، پھر

بولا۔ ”وکی، ابھی ہماری پارٹی کے ایک مرکزی رہنما یہاں آئیں گے۔ وہ بہت بارسوخ آدمی ہیں۔ آج کل بھی وہ قومی اسمبلی کے رکن ہیں، کئی دفعہ وہ وزارت میں بھی رہ چکے ہیں۔ لیکن اس وقت ہماری پارٹی اقتدار میں نہیں ہے۔ میں اپنی پارٹی کی طلبا تنظیم کا جوائنٹ سیکریٹری ہوں۔ تم فکر مت کرو۔ صمدانی صاحب آئیں گے تو میں ان سے بات کروں گا۔“

صمدانی صاحب کا نام سن کران کا چہرہ میرے ذہن میں آگیا۔ انہیں میں نے اکثر ٹیلی وژن کے پروگراموں میں دیکھا تھا۔ اخبارات میں ان کی تصویریں بھی چھپتی رہتی تھیں۔

”ابے، یہ تم لوگ کیا آپس میں گٹ پٹ کررہے ہو۔“ مکروہ صورت نے عامیانہ لہجے میں کہا۔

”بکواس بند کرو۔“ جواد بپھر کر کھڑا ہوگیا۔ ”تُو بہت دیر سے بھونک رہا ہے۔ اب تُو نے ایک لفظ بھی کہا تو تیری زبان کھینچ لوں گا۔“

مکروہ صورت حیرت سے جواد کو دیکھنے لگا۔

اچانک باہر ہلچل سی محسوس ہوئی۔ سنتریوں کی چیخ پکار، بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں۔ پھر تھانے کی راہداری میں بھاری بوٹوں کی آہٹ گونجی۔

مجھے پولیس کا ایک اعلیٰ افسر دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ صمدانی صاحب بھی تھے۔ ان دونوں کے پیچھے دو اعلیٰ افسران کے ساتھ ایس ایچ او بھی تھا۔

وہ سب حوالات کے سامنے آکر رک گئے۔ جواد اور دوسرے لڑکے جلدی سے کھڑے ہوگئے۔ جواد نے مجھے بھی اٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں بھی ان کے ساتھ کھڑا ہوگیا۔

جواد نے صمدانی صاحب کو سلام کیا۔

انہوں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے حیرت سے کہا۔ ”ارے جواد! تم بھی یہاں ہو؟“

”سر کیا کروں؟“ جواد نے کہا۔ ”قانون ان کا ہے، پولیس ان کی ہیں۔ یہ صاحبِ اختیار ہیں سر، کچھ بھی کرسکتے ہیں۔“ اس نے صمدانی صاحب کے ساتھ کھڑے ہوئے پولیس کے افسران کی طرف اشارہ کرتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔

اس افسر نے ایس ایچ او کو اشارہ کیا۔ ایس ایچ او نے آگے بڑھ کر جلدی سے حوالات کا دروازہ کھول دیا۔ پھر ایس ایچ او نے جواد اور دوسرے لڑکوں سے باہر آنے کو کہا۔

جواد نے مجھ سے کہا۔ ”گھبرانا مت وکی، میں تمہارے لیے بھی کچھ کرتا ہوں۔“ وہ لوگ باہر نکل گئے۔

جواد، صمدانی صاحب سے بغل گیر ہوگیا۔

ایس ایچ او نے سلاخوں کے پاس آکر بلند آواز میں کہا۔ ”اس جلوس میں اور تو کوئی شامل نہیں تھا؟“

وہ چند لمحے انتظار کرتا رہا، پھر مڑ کر اپنے افسرِ اعلیٰ سے کچھ کہنے لگا۔

افسرِ اعلیٰ نے صمدانی صاحب سے کچھ کہا۔ جواب میں وہ مسکرائے اور جواد کے ساتھ چلے گئے۔ ان کے پیچھے بقیہ تینوں لڑکے بھی تھے۔

میرا خیال تھا کہ جواد نے میرا دل رکھنے کے لیے مجھے تسلی دی تھی۔ وہ بیچارہ کیا کرسکتا تھا۔

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک سنتری تیزی سے حوالات کے نزدیک آیا اور بولا۔ ”وکی کون ہے؟ چلو تمہیں بڑے صاحب نے بلایا ہے۔“

حیرت کی بات یہ تھی کہ اس نے میرے ہاتھ میں ہتھکڑی نہیں ڈالی تھی۔

وہ سب ابھی تھانے کے احاطے میں ہی کھڑے تھے۔ وہیں مجھے معلوم ہوا کہ پولیس کا وہ اعلیٰ افسر ڈی آئی جی ہے۔ وہ صمدانی صاحب کے آگے گویا بچھا جارہا تھا۔

ڈی آئی جی نے غور سے میرا جائزہ لیا اور بولا۔ ”وقار عرف وکی تم ہی ہو؟“

”جی سر!“ میں نے جواب دیا۔

”یہ مار پیٹ کرکے تمہیں کیا ملتا ہے بچے؟“ ڈی آئی جی صاحب نے کہا۔ ”جاؤ آئندہ تمہاری کوئی شکایت نہ آئے۔“ پھر وہ ایس ایچ او سے سرگوشی میں کچھ بولا۔ ایس ایچ او نے جلدی جلدی اثبات میں سر ہلایا۔

”بھئی وکی صاحب!“ صمدانی صاحب نے اپنے مخصوص لہجے میں مخاطب کیا تو مجھے خوش گوار حیرت ہوئی۔ اتنا بڑا آدمی مجھ سے مخاطب تھا۔ ”یہ میرا وزیٹنگ کارڈ رکھ لیجیے۔“ انہوں نے کہا۔ ”کل شام کو پانچ بجے آپ میرے غریب خانے پر آجائیں۔ آپ تو بھئی بہت کام کے آدمی ہیں۔ اپنی توانائی مار پیٹ میں ضائع کرنے کی بجائے کوئی مثبت کام کریں۔ اس سے آپ کا بھی بھلا ہوگا اور ملک و قوم کا بھی۔“ صمدانی صاحب مسکرائے۔

تھانے کے احاطے میں صمدانی صاحب کی سیاہ مرسڈیز موجود تھی۔ گاڑی کے بونٹ پر پاکستان کا جھنڈا تھا اور نمبر پلیٹ پر نمایاں حروف میں انگریزی میں ”ایم این اے“ لکھا ہوا تھا۔ انہوں نے ڈی آئی جی صاحب سے



ہاتھ ملایا، پھر جواد کی پیٹھ پر ہلکا سا ہاتھ مارا اور مسکراتے ہوئے گاڑی میں سوار ہوگئے۔

اُن کے جانے کے بعد جواد نے مجھ سے کہا۔ ”آؤ وکی، اب چلیں۔“

میں جواد کے ساتھ باہر نکل آیا۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ میں پولیس کی قید سے آزاد ہوچکا ہوں۔

”تم کہاں جاؤ گے وکی؟“ جواد نے پوچھا۔

”جہاں بھی تقدیر لے جائے....“ میں تلخی سے مسکرایا۔ ”ظاہر ہے اب میں اپنے گھر تو جانے سے رہا۔“

”تو پھر تم میرے ساتھ چلو۔“ جواد نے کہا۔

اس وقت رات کے دس بجے تھے۔ مجھے امید تھی کہ سلطان انکل ابھی تک جاگ رہے ہوں گے۔ میں نے جواد سے کہا۔ ”تم مجھے اپنا ایڈریس دے دو۔ میں ایک دو ضروری کام نمٹا کر آتا ہوں۔“

”او بھائی!“ جواد ہنس کر بولا۔ ”کہیں پھر کسی کے ساتھ مار پیٹ مت کرنا۔“

”نہیں یار!“ میں نے کہا۔ ”بار بار ایسا نہیں ہوگا۔“

اس نے مجھے اپنا تعارفی کارڈ بھی دیا اور پتا بھی اچھی طرح سمجھا دیا۔ وہ ڈیفنس میں رہتا تھا۔

اس سے پتا لے کر میں .... بس اسٹاپ کی طرف روانہ ہوگیا۔

میں انکل سلطان کے گھر پہنچا تو ساڑھے دس بج چکے تھے۔ میں نے اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔

تھوڑی دیر بعد اندر سے بابر کی .... آواز آئی۔ ”کون ہے؟“

”میں ہوں بابر...... میں وکی...... دروازہ کھولو۔“

بابر نے جلدی سے دروازہ کھول دیا اور بولا۔ ”ارے وکی بھائی آپ...... آپ تو......“

”ہاں، پولیس نے ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے چھوڑ دیا ہے۔“ پھر میں نے کچھ توقف کے بعد پوچھا۔ ”انکل ابھی سوئے تو نہیں ہیں؟“

”نہیں۔“ بابر نے کہا اور ہم دونوں مختصر سالان عبور کرکے برآمدے میں آئے، پھر اندر داخل ہوگئے۔

انکل سلطان مجھے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ ”وکی بیٹا...... تم...... تم تو......“

”جی انکل!“ میں نے کہا اور مختصراً انہیں سب کچھ بتا دیا۔

میری بات سننے کے بعد انکل سلطان بولے۔ ”چلو، یہ بھی اچھا ہوا۔ میں ابھی بیرسٹر صاحب کو ٹیلی فون کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ اپنے بیڈروم میں چلے گئے۔

میں نے شائستہ کی تلاش میں نظریں دوڑائیں لیکن وہ مجھے نظر نہ آئی۔

آنٹی کچن سے نکلیں تو مجھے دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ ”وکی بیٹا! تم تو......“

”ہاں آنٹی، میں پولیس اسٹیشن کے لاک اپ میں تھا“ پھر میں نے انہیں بھی مختصراً بتایا کہ میں وہاں سے رہا کیسے ہوا۔ ”آنٹی، آپ میرے گھر ٹیلی فون کرکے مما کو بتا دیں۔ میں خود وہاں ٹیلی فون نہیں کرنا چاہتا۔“

شائستہ شاید اپنے بیڈروم میں تھی۔ میری آواز سن کر وہ بھی باہر نکل آئی۔ ”یہ تم ہو وکی!“ شائستہ نے کہا۔ ”پولیس والوں نے زیادہ مارا تو نہیں۔“

”نہیں۔“ میں نے مختصراً جواب دیا۔ ”انکل، بیرسٹر احسان صاحب کو اپنے ساتھ لے کر تھانے گئے تھے۔ بیرسٹر صاحب نے پولیس والوں سے ایسے سوالات کیے کہ وہ بھی سب چوکڑی بھول گئے۔“

اسی وقت انکل سلطان وہاں آگئے اور سرد لہجے میں بولے۔ ”وکی! ویسے تم نے انتہائی گھٹیا حرکت کی ہے۔ کچھ بھی ہو، آفتاب صاحب تم سے عمر میں بہت بڑے ہیں۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

”انکل! انہوں نے......“

”میں جانتا ہوں۔“ انکل سلطان نے مجھے بولنے سے روک دیا۔ ”ساجدہ بہن نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ ان ہی کے کہنے پر میں بیرسٹر صاحب کو لے کر پولیس اسٹیشن گیا تھا۔ پہلے تو مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ وکی بھی ایسی حرکت کرسکتا ہے۔ یہ بات مجھے ساجدہ بہن کی بجائے کوئی اور بتاتا تو مجھے کبھی یقین نہ آتا۔ اب تم میرے ساتھ گھر چلو اور آفتاب صاحب سے معافی مانگو۔ وہ تم سے بڑے ہیں اور تمہارے والد کے انتقال کے بعد انہوں نے تمہاری سرپرستی کی ہے۔ تم جو اس اعلیٰ اسکول میں پڑھ رہے ہو۔ کیا تم وہاں پڑھ سکتے تھے؟ میں مانتا ہوں کہ آفتاب صاحب کا سلوک تمہارے ساتھ اچھا نہیں ہے لیکن بیٹا، اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ تم ان پر ہاتھ اٹھاؤ، نہ صرف ہاتھ اٹھاؤ بلکہ انہیں مار مار کے ادھ موا کردو۔ میں نے تھانے میں آفتاب صاحب کو بھی دیکھا تھا۔ میرے ساتھ گھر چلو اور چل کر اُن

سے معافی مانگو۔"
"سوری انکل!" میں نے ان کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "میں ان سے معافی نہیں مانگوں گا۔"
انکل چند لمحے تک حیرت زدہ سے ہو کر مجھے گھورتے رہے، پھر سخت لہجے میں بولے۔ "تو پھر آج کے بعد یہاں بھی مت آنا۔ میں نہیں چاہتا کہ بابر بھی وہی کچھ سیکھے جو تم نے کیا ہے۔"
"ٹھیک ہے انکل!" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں یہاں نہ آؤں تو میں یہاں نہیں آؤں گا۔"
"یاد رکھو وکی! کل جب تمہیں اپنی زیادتی کا افسوس ہوگا تو تم بہت پچھتاؤ گے۔"
میں نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور انہیں سلام کر کے باہر نکل آیا۔
میں نے سوچا تھا کہ انکل سے کچھ پیسے لے لوں گا تاکہ میں ڈیفنس تک پہنچ سکوں۔ تھوڑی بہت ریزگاری جیب میں پڑی تھی جو یہاں تک آتے ہوئے بس کے ٹکٹ کی نذر ہو گئی تھی۔ میری جیب میں تین، چار سو روپے کی رقم موجود تھی لیکن پولیس والوں نے ریزگاری چھوڑ کر میری جیب سے سب کچھ نکال لیا تھا۔ انہوں نے میری گھڑی بھی لے لی تھی۔ مجھے تھانے میں اس کا خیال نہیں آیا ورنہ مجھے رقم بھی مل جاتی اور گھڑی بھی۔
میں نے سوچا کہ یہاں سے پیدل ہی ڈیفنس تک جانا پڑے گا۔ یہ سوچ کر میں تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔
حیدری مارکیٹ تک پہنچنے میں ساڑھے بارہ بج گئے۔ میں تیزی سے چلنے لگا۔
کوئی بائیک پر میرے برابر سے گزرا، پھر اس نے آگے جا کر بائیک روک دی اور اسے گھما کر میرے نزدیک آ گیا۔ اسٹریٹ لیمپ کی روشنی کافی تھی۔ مجھے اس لڑکے کا چہرہ کچھ جانا پہچانا سا محسوس ہوا۔
وہ میرے نزدیک آیا تو میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ وہ ان ہی تین لڑکوں میں سے ایک تھا جو جواد کے ساتھ حوالات میں تھے۔
وکی! تم اس وقت کہاں جا رہے ہو؟"
"میں جواد کے پاس جا رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔
"اچھا تم بھی جواد بھائی کے پاس جا رہے ہو۔ چلو پیچھے بیٹھ جاؤ۔ میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔"
میں جلدی سے بائیک پر بیٹھ گیا اور اس سے کہا۔ "معاف کرنا دوست، میں نے تو تمہارا نام بھی نہیں پوچھا۔"
"میرا نام ارشد ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "میں بھی اسی طلبا کی تنظیم کا رکن ہوں۔ کیا تم بھی ہماری طلبا تنظیم میں شامل ہو چکے ہو؟"
"ابھی تو نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "لیکن بہت جلد شامل ہو جاؤں گا۔"
پھر میں نے اس سے پوچھا۔ "پولیس نے تمہیں گرفتار کیوں کیا تھا؟"
"ہم نے مزار قائد سے ایک جلوس نکالا تھا۔ جلوس کی قیادت جواد بھائی کر رہے تھے۔ اللہ والی چورنگی کے پاس پولیس نے ہمارا راستہ روکا اور منتشر ہونے کے لیے کہا۔ جواد بھائی نے جلوس منتشر کرنے سے انکار کر دیا۔ وہاں شیلنگ اور پولیس کا لاٹھی چارج شروع ہو گیا۔ پھر پولیس نے ہمیں گرفتار کر لیا۔"
ہم ڈیفنس پہنچ چکے تھے۔ ارشد سیدھا ایک بہت وسیع و عریض کوٹھی کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ کوٹھی کے اندر بلند و بالا جام کے درخت کھڑے ہوئے تھے۔ اس کی چار دیواری بھی خاصی بلند تھی۔
ارشد نے اطلاعی گھنٹی بجائی تو فوراً ہی پھاٹک کی ذیلی کھڑکی کھول کر دربان نے باہر جھانکا پھر ارشد کو دیکھ کر اس نے پھرتی سے گیٹ کھول دیا۔
ارشد موٹر سائیکل اندر لے کر چلا گیا۔ اس کوٹھی کا کار پورچ اتنا بڑا تھا کہ اس میں بہ یک وقت چار پانچ بڑی گاڑیاں کھڑی ہو سکتی تھیں۔ ابھی وہاں صرف ایک ہنڈا سوک موجود تھی۔
ہم پورچ کی سیڑھیاں چڑھ کر برآمدے میں آئے، پھر ارشد بلا جھجک اندر داخل ہو گیا۔
جواد کوٹھی کے وسیع و عریض لاؤنج میں موجود تھا۔ اس کے ساتھ دو لڑکے اور بھی تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا اور بولا۔ "آؤ وکی۔" اس نے اٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔
اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے دونوں لڑکے بھی کھڑے ہو گئے۔ ان دونوں نے باری باری مجھ سے ہاتھ ملایا۔
جواد نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "یہ وقار احمد ہے۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "وقار، یہ ہمارے ساتھی اقبال اور مسعود ہیں۔" پھر وہ ارشد سے مخاطب ہوا۔ "ارشد، یہ تمہیں کہاں مل گئے؟"
"یہ [illegible] ناظم آباد سے اس طرف آ رہے تھے۔ میں انہیں ساتھ لے آیا۔"
اقبال اور مسعود تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے گئے۔
جواد نے مجھ سے کہا۔ "وکی! تم نے کھانا تو نہیں کھایا ہوگا؟" پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر کہنے لگا۔ "پہلے تم نہا دھو کر فریش ہو جاؤ۔ میں کھانا لگواتا ہوں۔"
میں نہا دھو کر فارغ ہوا تو مجھے تازگی کا احساس ہوا۔ ارشد اس وقت تک جا چکا تھا۔ جواد مجھے ڈائننگ روم میں لے گیا۔ کھانے کی میز پر اچھا خاصا اہتمام تھا لیکن کھانے والے صرف ہم دونوں تھے۔
میں نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا، پھر جواد مجھ سے بولا۔ "تم مجھے بہت تھکے تھکے لگ رہے ہو۔ باقی باتیں صبح ہوں گی۔"
میں خود بھی آرام کرنا چاہ رہا تھا۔ مجھے رات کو اتنی دیر تک جاگنے کی عادت نہیں تھی۔ ایک ملازم مجھے بیڈ روم تک چھوڑ گیا۔
وہ کمرا ہر طرح سے آراستہ تھا۔ وہاں آرام دہ ڈبل بیڈ تھا، ڈریسنگ ٹیبل تھی، ایک طرف ایک صوفہ بھی رکھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ملحقہ باتھ روم تھا۔
میں جوتے اتار کے بیڈ پر لیٹا اور لیٹتے ہی سو گیا۔
صبح میری آنکھ کھلی تو دیوار گیر گھڑی نو بجا رہی تھی۔ تھوڑی دیر تک تو مجھے یاد ہی نہیں آیا کہ میں کہاں ہوں۔ پھر میں جلدی سے اٹھ گیا۔
میں نہا دھو کر تازہ دم ہونے کے بعد کمرے سے باہر نکلنے ہی والا تھا کہ جواد کا ایک ملازم دستک دے کر اندر آ گیا اور بولا۔ "آپ ناشتا یہاں کریں گے یا ڈائننگ روم میں؟"
"بھئی میں جواد صاحب کے ساتھ ہی ناشتا کروں گا۔" میں نے جواب دیا۔
"صاحب تو صبح صبح کسی کام سے چلے گئے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ آپ اٹھیں تو میں آپ کو ناشتا کرا دوں۔ جواد صاحب دوپہر تک واپس آئیں گے۔"
"پھر تم ایسا کرو کہ میرا ناشتا یہیں لے آؤ۔" میں نے کہا۔
ملازم سر جھکا کر چلا گیا۔ میں نے اٹھ کر کھڑکیوں کے پردے ہٹائے تو سورج کی روشنی اندر آنے لگی۔ میں نے کھڑکی کھول کر دو تین گہرے گہرے سانس لیے۔ کمرے کی ایک کھڑکی لان میں کھلتی تھی۔ وہاں سے مجھے لان کا خوبصورت منظر دکھائی دے رہا تھا۔ رات تو میں غور نہیں کر سکا تھا۔ اس کوٹھی کا لان اتنا بڑا تھا کہ وہاں ٹینس کھیلا جا سکتا تھا۔
ملازم ناشتے کی ٹرالی لے آیا۔ ناشتے میں بھی خاصا اہتمام تھا۔ ٹرالی میں پراٹھے، مکھن، ابلے ہوئے انڈے، شہد اور پھل تھے۔
میں ناشتا کرتے ہوئے سوچتا رہا کہ یہ جواد آخر کون ہے؟ اس کوٹھی میں تنہا کیوں رہتا ہے۔ وہ آخر کرتا کیا ہے اور ایک سوال میرے ذہن میں سب سے زیادہ چبھ رہا تھا کہ وہ آخر مجھ سے کیا چاہتا ہے؟ میں سوچتا رہا اور ناشتا کرتا رہا۔
ملازم برتن لینے آیا تو میں نے اس سے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"
"میرا نام شریف ہے جی۔" اس نے جواب دیا۔
"یہاں تمہارے علاوہ کتنے ملازم ہیں؟"
"یہاں میرے علاوہ چار ملازم ہیں۔" پھر وہ جلدی سے بولا۔ "سر آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے آواز دے کر بلا لیجیے گا۔" اس نے برتن سمیٹے اور باہر نکل گیا۔
کمرے میں ٹیلی فون سیٹ بھی موجود تھا۔ میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا تو مجھے شریف کی آواز سنائی دی۔ "جی صاحب، انہوں نے ناشتا کر لیا ہے۔"
"اچھا تم ان کا خیال رکھنا میں آ رہا ہوں۔" دوسری طرف سے بولنے والا جواد تھا۔

## چابی

☆ دو دوست ایک بلڈنگ کی دسویں منزل پر رہتے تھے۔ ایک دن وہ گھر آئے تو معلوم ہوا بجلی گئی ہوئی ہے لہٰذا لفٹ بھی بند تھی۔ سیڑھیوں کے ذریعے دسویں منزل تک جانے کے خیال سے ہی دونوں پریشان ہو گئے مگر مرتے کیا نہ کرتے۔ دونوں نے فیصلہ کیا کہ سیڑھیوں کے ذریعے باتیں کرتے چلیں گے۔ ایک نے کہا کہ "میں تمہیں مزاحیہ قصہ سناتا ہوں تم مجھے کوئی افسوس ناک واقعہ سناؤ۔"
مزاحیہ قصہ سناتے ہوئے وہ آٹھویں منزل پر پہنچ گئے تو پہلا دوست بولا۔ "اب تمہاری باری ہے کوئی افسوس ناک واقعہ سناؤ۔"
دوسرا بولا۔ "اگر میں نے تمہیں افسوسناک واقعہ سنایا تو تم رونے لگو گے۔"
پہلے نے کہا۔ "نہیں، میں نہیں روؤں گا۔"
دوسرا بولا۔ "تو پھر سنو گھر کی چابی تو نیچے ہی رہ گئی ہے۔"
صائمہ عبداللہ، لاہور

''ٹھیک ہے صاحب!'' شریف نے کہا۔
میں نے آہستگی سے ریسیور رکھا اور ایک شیلف میں رکھی ہوئی ایک کتاب نکال لی۔ وہ فلسفے کی کتاب تھی۔ میرے کچھ پلے ہی نہیں پڑا۔ میں کتاب ایک طرف رکھ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔
کوٹھی میں عجیب قسم کا سکوت طاری تھا۔ میں کوریڈور سے نکل کر برآمدے میں چلا گیا، پھر میں ٹہلتا ہوا گیٹ تک پہنچ گیا۔
میں نے باہر نکلنے کے لیے پھاٹک کی ذیلی کھڑکی کھولی ہی تھی کہ چوکیدار جھپٹ کر وہاں آیا اور مجھ سے بولا۔ ''واپس جائیں سر!''
میں نے چونک کر اسے دیکھا، پھر ہنس کر بولا۔ ''ارے یار، تم تو یوں کہہ رہے ہو جیسے میں یہاں قیدی ہوں۔''
''نہیں سر، آپ تو ہمارے مہمان ہیں۔'' چوکیدار جلدی سے بولا۔ ''صاحب نے کہا تھا کہ......''
اس کا جملہ ادھورا رہ گیا کیونکہ باہر کسی گاڑی کا ہارن بجا تھا۔
''صاحب آگئے۔'' اس نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھا۔
اس نے گیٹ کھولا تو جواد کی گاڑی اندر داخل ہوئی۔ جواد گاڑی سے اتر کر اندر جانے کی بجائے میری طرف بڑھا۔ ''ہیلو وکی!'' اس نے کہا۔ ''کیا کہیں باہر جا رہے تھے؟''
''ہاں، بند کمرے میں ذرا دل گھبرا رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ باہر کا ایک چکر لگا لوں لیکن تمہارا یہ چوکیدار مجھے جانے ہی نہیں دے رہا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔
''ارے، یہ تو اس سے میں نے ہی کہا تھا۔'' جواد ہنس کر بولا۔ ''اصل میں باہر تمہارے لیے خطرہ ہے۔''
''خطرہ؟'' میں نے پوچھا۔
''ہاں۔'' جواد نے جواب دیا۔ ''تمہارے باپ کو..... میرا مطلب ہے سوتیلے باپ کو معلوم ہو گیا ہے کہ صمدانی صاحب کے کہنے پر تمہیں حوالات سے چھوڑ دیا گیا ہے۔ وہ پاگل کتے کی طرح تمہیں ڈھونڈ رہا ہے۔ اس نے کسی نہ کسی طرح پولیس پر بھی دباؤ ڈالا ہے۔''
''پولیس پر دباؤ ڈالا ہے؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔ مجھے یاد آ گیا کہ پولیس کے کچھ اعلیٰ افسروں سے آفتاب کے تعلقات تھے۔
''اس کی تو خیر کوئی پروا نہیں ہے۔'' جواد نے کہا۔ ''پولیس صمدانی صاحب کے خلاف تو کوئی ایکشن لینے سے رہی۔ ہاں، آفتاب نے تمہیں سزا دینے کے لیے کچھ غنڈوں کو بھی تمہارے پیچھے لگا دیا ہے۔''
میں حیران رہ گیا۔ آفتاب اس قسم کا آدمی نہیں تھا۔ وہ کاروباری آدمی تھا۔ گھر سے باہر تو وہ انتہائی شگفتہ مزاج اور خوش گفتار سمجھا جاتا ہے۔ اس کے دوستوں میں بھی معزز اور شریف لوگ تھے۔ پھر غنڈوں اور بدمعاشوں تک اس کی رسائی کیسے ہو گئی؟ میں الجھ کر رہ گیا۔
''کیا سوچ رہے ہو وکی؟'' جواد نے غور سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
''کچھ نہیں۔'' میں نے سر جھٹک کر کہا۔ ''بس ذرا موجودہ حالات پر غور کر رہا تھا۔''
''ارے تم پریشان مت ہو۔'' جواد نے کہا۔ ''دو چار دن میں صمدانی صاحب تمہیں لاہور یا اسلام آباد بھیج دیں گے۔ ممکن ہے، وہ تمہیں پاکستان ہی سے باہر بھجوا دیں۔ تم کھاؤ پیو، عیش کرو، کتابیں پڑھو، فلمیں دیکھو۔ اس گھر تک آنے کی کسی میں بھی جرات نہیں ہے۔''
میں الجھا الجھا سا واپس آ گیا۔
☆☆☆
مجھے وہاں رہتے ہوئے چار دن گزر چکے تھے۔ صمدانی صاحب اسلام آباد میں تھے۔ جواد نے کہا تھا کہ اسلام آباد سے واپس آتے ہی صمدانی صاحب تمہارے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے۔
اس دن بھی حسب معمول ناشتے کے بعد جواد کہیں چلا گیا تھا۔ اس دوران میں وہاں کچھ لوگ باہر سے آئے تھے۔ جواد کمرے میں بند ہو کر ان سے نہ جانے کیا باتیں کرتا تھا۔ مجھ سے اس نے یہی کہا تھا کہ یہ سب ہماری پارٹی کے ورکر ہیں۔
جواد کے جاتے ہی وہاں اقبال آ گیا۔ اس سے پہلے دن میری سرسری ملاقات ہوئی تھی۔
اس نے ملازم سے جواد کے بارے میں پوچھا، پھر وہ مجھ سے باتیں کرنے لگا۔
باتیں کرتے کرتے وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ''وکی، تم صمدانی صاحب کو کب سے جانتے ہو؟''
''میں نے انہیں پہلی دفعہ تھانے میں دیکھا تھا۔'' پھر میں نے مختصراً اسے بتایا کہ میں تھانے تک کیسے پہنچا تھا۔
اقبال کچھ دیر سوچتا رہا، پھر میری طرف جھک کر سرگوشی میں بولا۔ ''وکی، تم یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔ یہ

صمدانی بھی کوئی شریف آدمی نہیں ہے۔ تم ایک دفعہ اس کے چنگل میں پھنس گئے تو پھر نکلنا مشکل ہو جائے گا۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں وکی!" اقبال نے کہا۔ "میں خود تین سال سے اس آدمی کے چنگل میں پھنسا ہوا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہارے ساتھ بھی وہی کچھ ہو جو میرے ساتھ ہو چکا ہے۔"

"لیکن صمدانی صاحب تو ایک شریف اور ہمدرد انسان ہیں۔"

"میں بھی یہی سمجھ کر اُن کے جال میں پھنس گیا تھا۔ تم چاہو تو میری بات کا یقین کر لو ورنہ تم خود اپنی مرضی کے مالک ہو۔ ویسے تمہیں ایک بات بتاؤں۔ تمہیں شاید یہاں سے نکلنے بھی نہ دیا جائے۔"

"ہاں"، میں نے تشویش سے کہا۔ "یہ لوگ مجھے باہر نہیں جانے دیتے۔"

"اب تم خود ہی سوچو کہ یہ لوگ تمہیں باہر کیوں نہیں جانے دیتے۔"

اسی وقت گاڑی کا ہارن سنائی دیا تو اقبال چونک اٹھا۔ میں بھی اس ہارن کو پہچانتا تھا، جواد واپس آگیا تھا۔

"میری بات پہ غور ضرور کرنا۔" اقبال نے کہا اور مجھ سے کچھ فاصلے پر جا بیٹھا۔

جواد ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو اقبال کو دیکھ کر چونک اٹھا۔ "تم...... تم کب آئے؟" جواد نے اقبال سے پوچھا۔

"مجھے آئے ہوئے آدھا گھنٹا ہو چکا ہے۔" اقبال نے جواب دیا۔ "میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔"

"پارٹی کے پمفلٹ اور پوسٹرز چھپ گئے؟" جواد نے پوچھا۔

"ہاں، اسی سلسلے میں آپ سے بات کرنا ہے۔" اقبال نے کہا۔

"وکی، تم بیٹھو، میں ذرا اقبال کو فارغ کر کے آتا ہوں۔" وہ اقبال کو لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

وہ دونوں تقریباً بیس منٹ بعد کمرے سے باہر آئے۔ اقبال میری طرف دیکھے بغیر باہر نکل گیا۔

"یہ اقبال کیا کہہ رہا تھا؟" جواد نے پوچھا۔

"مجھے بور کر رہا تھا۔" میں نے منہ بنا کر کہا۔ "مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ کبھی تم نے محبت کی ہے، اگر نہیں کی تو اب کر کے دیکھو وغیرہ وغیرہ۔"

میری بات سن کر جواد بے اختیار مسکرانے لگا۔ "یار بات تو وہ ٹھیک ہی کر رہا تھا۔"

"کیا دنیا میں اس کے علاوہ کوئی کام ہی نہیں ہے؟" میں نے منہ بنا کر کہا۔

"میں سمجھ سکتا ہوں۔" جواد سنجیدہ ہو کر بولا "تم گھر میں پڑے پڑے بور ہو گئے ہو، پرسوں صمدانی صاحب کراچی پہنچ رہے ہیں۔ پھر تمہاری ساری بوریت دور ہو جائے گی۔"

میں کچھ دیر جواد کے ساتھ بیٹھا، پھر اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

صمدانی نے وہاں بہت اچھی کتابیں جمع کر رکھی تھیں۔ میں وہاں کتابیں ہی پڑھتا رہتا تھا۔

میں اس رات دو بجے تک جاگ کر ایک ناول پڑھتا رہا، پھر لائٹ آف کر کے سونے کے لیے لیٹ گیا۔

میں اس وقت نیم غنودگی کی حالت میں تھا جب میں نے کسی گاڑی کے انجن کی آواز سنی، میں چونک اٹھا۔ اتنی رات گئے کون آیا تھا؟ رات کے سناٹے میں گاڑی کے دروازے بند ہونے کی آواز بہت واضح تھی۔ پھر کئی افراد کے بولنے کی ملی جلی آوازیں سنائی دیں۔ ان آوازوں سے ایک نسوانی آواز سن کر مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے اب تک اس کوٹھی میں کسی لڑکی کو آتے نہیں دیکھا تھا۔ ممکن ہے یہ پارٹی کی کوئی ورکر ہو؟ میں نے سوچا، لیکن اتنی رات گئے یہ لوگ پارٹی کا کون سا کام کر رہے ہیں؟ ان دنوں تو الیکشن بھی نہیں ہو رہے تھے کہ سیاسی جماعتوں کے کارکن الیکشن میں بہت مصروف ہوتے ہیں۔

پھر نہ جانے میرے دل میں کیا آئی کہ میں اپنے کمرے سے دبے پاؤں باہر نکلا۔ کوریڈور کے ایک سرے پر انرجی سیور جل رہا تھا۔ میں پہلے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھا لیکن آوازیں جواد کے کمرے سے آرہی تھیں۔ کمرے کا دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا۔

مجھے جواد کی آواز سنائی دی۔ "اس دفعہ میں کسی قسم کا خطرہ مول نہیں لوں گا۔ مال لے کر ایک نیا آدمی باہر جائے گا۔"

"نیا آدمی؟" نسوانی آواز سنائی دی۔

"ہاں نیا آدمی۔" جواد شاید مسکرایا تھا۔ "خاصا باہمت اور پُرجوش لڑکا ہے۔ صمدانی صاحب نے اسے پولیس سے بچا کر اس پر احسان کیا ہے۔ اس سے یہی کہا جائے گا کہ اس کی حفاظت کے لیے صمدانی صاحب اسے ملک سے



باہر بھیج رہے ہیں۔"

"لیکن جواد صاحب!" لڑکی کی آواز سنائی دی۔ "کسی بالکل نئے آدمی کو بغیر کچھ بتائے کروڑوں کی ہیروئن دینے میں بھی تو رسک ہے۔"

"ہاں رسک تو ہے لیکن مجھے وکی پر اعتبار ہے، پھر تم بھی تو اس کے ساتھ ہو گی۔"

میرے ذہن میں دھماکے سے ہونے لگے۔ وہ لوگ مجھے کیریئر کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ اقبال جو کچھ کہہ رہا تھا، وہ صحیح تھا۔

اچانک میرے اندر نفرت کی ایک لہر سی اٹھی۔ غریبوں کے ہمدرد، وطن پرست اور معزز سیاست دان صمدانی کے چہرے سے نقاب اٹھ گیا تھا۔

"ہمیں جانا کب ہے؟" لڑکی نے پوچھا۔

"سولہ تاریخ کی رات کو تمہاری فلائٹ ہے۔" جواد نے کہا۔ "بس تم وکی پر نظر رکھنا۔"

میں دبے پاؤں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا، میں اب وہاں سے باہر نکلنے پر غور کر رہا تھا۔

میں نے سوچا کہ اگر یہاں سے نکلنا ہی ہے تو پھر کل کا انتظار کیوں کیا جائے؟

میں نے کپڑے بدلے اور جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ میں کوٹھی کے عقبی حصے میں پہنچا اور ایک درخت پر چڑھ کر بہت آسانی سے باؤنڈری وال پھلانگ لی۔ جواد یقیناً میری طرف سے مطمئن تھا ورنہ کوٹھی کے عقبی حصے میں بھی ایک چوکیدار ضرور ہوتا۔

میں بنگلے سے باہر آتو گیا لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب میں کہاں جاؤں؟ میری جیب بھی بالکل خالی تھی۔ میں نے فوری طور پر یہی سوچا کہ میں اس کوٹھی سے دور ہو جاؤں۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ایک طرف روانہ ہو گیا۔

اس وقت سڑکوں پر بالکل سناٹا تھا۔ کبھی کبھار کوئی اکّا دُکّا گاڑی گزرتی تھی تو سناٹا مجروح ہو جاتا تھا۔ ڈیفنس کا وہ علاقہ یوں بھی زیادہ آباد نہیں تھا، سڑک کی دونوں اطراف خودرو جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں، کہیں کہیں تو وہ جھاڑیاں اتنی گھنی تھیں کہ وہ علاقہ جنگل معلوم ہو رہا تھا۔ میں تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔

اچانک مجھے دور سے کسی گاڑی کے ہیڈ لیمپس دکھائی دیے۔ میں نے گھبرا کر پیچھے دیکھا۔ گاڑی بالکل میرے نزدیک ہی تھی۔ اچانک وہ گاڑی نہ جانے کہاں سے اور کیسے وہاں آگئی تھی۔ معاً مجھے خیال آیا کہ یہ کہیں پولیس کی گاڑی نہ ہو۔ رات کے اس پہر مجھے دیکھ کر وہ پوچھ گچھ ضرور کرتے۔

میں تیزی سے بائیں طرف کی جھاڑیوں کی طرف دوڑا اور وہاں چھپ کر بیٹھ گیا۔

فوراً ہی گاڑی کے بریک چرچرائے اور وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر رک گئی۔ یہ دیکھ کر مجھے کچھ اطمینان ہوا کہ وہ پولیس کی وین نہیں ہے۔

پھر گاڑی کا دروازہ کھلا اور اس میں دو آدمی باہر نکلے۔ اندھیرے میں ان کے چہرے نظر نہیں آرہے تھے، ان میں سے ایک شخص سگریٹ پی رہا تھا۔ سگریٹ پینے والا دوسرے شخص سے بولا۔ "میں نے ابھی کسی کو یہیں دیکھا تھا۔ ہماری گاڑی دیکھ کر وہ ان جھاڑیوں کی طرف بھاگا تھا۔"

"چھوڑ یار، ہو گا کوئی۔" دوسرا آدمی کسل مندی سے بولا۔ "آج تو بہت تھک گئے ہیں چل کر آرام کرتے ہیں۔"

ایک آدمی ہمارے ٹھکانے کے نزدیک یوں مشتبہ انداز میں گھوم رہا ہے اور تجھے آرام کی سوجھی ہے۔" پہلا آدمی سخت لہجے میں بولا۔ "چل گاڑی سے ٹارچ نکال کر لا۔"

میں سمجھ گیا کہ اب یہ ٹارچ کی روشنی میں مجھے تلاش کر لیں گے اس لیے چھپنا بے کار تھا۔

میں خود ہی جھاڑیوں سے نکل آیا اور بولا۔ "ٹارچ کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ شخص بری طرح چونکا ہو گا لیکن اندھیرے میں اس کے چہرے کے تاثرات نظر نہیں آرہے تھے۔

"کون ہے تو؟" وہ غرا کر بولا۔

"میں ایک مصیبت زدہ ہوں۔ پولیس سے چھپتا پھر رہا ہوں۔" میں نے کہا اور اسے مختصراً بتایا کہ پولیس کو میری تلاش کیوں ہے؟ میں نے اس کہانی میں اتنی ترمیم کر لی کہ اس میں سے صمدانی کا ذکر گول کر گیا۔ اسے صرف یہی بتایا کہ میں پولیس کی حراست سے فرار ہوا ہوں۔

"ابے تو کہیں جھوٹ تو نہیں بول رہا ہے؟" اس شخص نے بے یقینی سے کہا۔

"مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟" میں نے کہا۔ "تمہیں یقین نہ ہو تو اس علاقے کے تھانے سے معلوم کر لو۔"

"اب کہاں جائے گا؟"

"گھر تو میں جا نہیں سکتا۔ کوئی اور ٹھکانا بھی نہیں ہے۔ بس کسی پناہ کی تلاش میں ہوں۔"

"آجا، گاڑی میں بیٹھ جا۔" اس نے کہا۔
میں بلا سوچے سمجھے گاڑی میں بیٹھ گیا۔
ڈرائیونگ سیٹ پر وہ دوسرا آدمی تھا جو بہت تھک گیا تھا۔
"ارے استاد، اس مصیبت کو ساتھ کیوں لگالیا؟" اس نے اگنیشن میں چابی گھماتے ہوئے کہا۔
"حمیدے، تو خاموشی سے گاڑی چلا۔" استاد نے اسے جھڑک دیا۔
گاڑی کچھ آگے بڑھی تو کورنگی کا انڈسٹریل ایریا شروع ہوگیا۔ اس کا مطلب ہے کہ میں کئی میل تک پیدل چلتا رہا تھا۔
مشکل سے دومنٹ بعد گاڑی ایک بڑے سے احاطے کے سامنے رک گئی۔ حمیدے نے نیچے اتر کر اس احاطے کا بوسیدہ سا پھاٹک کھولا، پھر گاڑی کو اندر لے گیا۔
وہ کئی ہزار گز کا پلاٹ تھا۔ ایک کونے میں کچے پکے دو تین کمرے بنے ہوئے تھے۔ استاد مجھے لے کر ان کمروں کی طرف بڑھ گیا۔ حمیدا پھاٹک بند کرنے چلا گیا۔ رات بھر کی بھاگ دوڑ سے میرا جسم بری طرح ٹوٹ رہا تھا۔ افق پر صبح کے آثار نمودار ہو چکے تھے۔ استاد مجھے ایک کمرے میں لے آیا۔ اس کمرے میں پرانے سے دو بیڈ پڑے تھے۔ ایک طرف پانی کا مٹکا رکھا تھا۔
"ہم اچھے لوگ نہیں ہیں۔" استاد نے کہا۔
مجھے دل ہی دل میں ہنسی آئی کہ یہ بات بتانے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ یہ تو تمہاری شکلوں ہی سے ظاہر ہو رہا ہے کہ تم شریف نہیں ہو۔
"میرا نام غلام رسول ہے۔" استاد نے کہا۔ "یہ میرا شاگرد ہے حمید۔" اس نے دوسرے آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ "ہم دن بھر آرام کرتے ہیں اور رات کو چوریاں کرتے ہیں۔" استاد نے یوں بتایا جیسے وہ کوئی بہت قابلِ فخر کام کرتا ہو۔
پھر حمیدا گاڑی میں سے کھانے پینے کا سامان نکال لایا۔ میں نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا اور بیڈ پر لیٹ گیا، پھر نہ جانے کب مجھے نیند آگئی۔
میری آنکھ کھلی تو میرے کانوں میں حمیدے کی آواز آئی۔ "ارے استاد، ہم اسے پولیس کے حوالے کردیں گے تو ہمارا ہی فائدہ ہے۔"
"تیرا کیا فائدہ ہے؟" استاد نے پوچھا۔
"پولیس والے ہم سے خوش ہو جائیں گے۔" حمیدے نے کہا۔
"اور وہ تجھے اجازت دے دیں گے تو شہر میں چوریاں کرتا پھر۔" استاد نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
"استاد کہیں یہ اس مردود شہباز خان کی کوئی چال تو نہیں ہے؟" حمیدا اچانک بولا۔
استاد کوئی جواب دینے ہی والا تھا کہ باہر فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ پھر پولیس کے کئی سپاہی دندناتے ہوئے اندر آگئے۔ ان لوگوں نے ہمیں گرفتار کرلیا۔ استاد اور حمیدے پر چوری، ڈکیتی اور اقدامِ قتل کے الزامات تھے، میں بھی ان الزامات کی زد میں آگیا، پولیس نے مجھے بھی ان کا ساتھی سمجھ لیا۔ پھر مقدمہ چلا اور مجھے تین سال کی سزا ہوگئی۔
میں سزا کاٹ رہا تھا کہ ایک دن معلوم ہوا کہ ایک معروف سیاسی لیڈر جیل کے معائنے کے لیے آرہے ہیں۔
پھر صمدانی اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ جیل کے اعلیٰ افسران بھی تھے۔ اسے دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہی تو میری تباہی اور بربادی کا ذمے دار تھا۔
وہ میرے نزدیک پہنچا تو میں نے جھپٹ کر اس کا گلا دبوچ لیا اور لمحوں میں اسے زندگی کی قید سے آزاد کر دیا۔
اس دوران میں پولیس والے مجھ پر ڈنڈے برساتے رہے لیکن مجھے کسی بھی چوٹ کی کوئی پروا نہیں تھی۔
یوں میرے نامہ اعمال میں ایک... قتل کا اضافہ ہوگیا۔

☆☆☆

میں آج کل قیدِ تنہائی کاٹ رہا ہوں۔ کوئی بھی قیدی میرے ساتھ رہنے کو تیار نہیں ہے کیونکہ میں اپنے ساتھی قیدیوں میں سے دو کو بہت بری طرح زخمی کر چکا ہوں۔ مجھ پر مقدمہ چلا اور عدالت نے مجھے موت کی سزا سنا دی۔
میں موت کی کال کوٹھری میں اب اپنی پھانسی کا منتظر ہوں۔ میں اس قابل تو نہیں ہوں کہ میرے لیے کوئی دعا کرے لیکن میری کہانی پڑھنے کے بعد اگر آپ کو یہ محسوس ہو کہ مجھے جرم کی راہ پر ڈالنے والا یہ معاشرہ ہی ہے تو شاید آپ کو مجھ سے اتنی نفرت محسوس نہ ہو۔ میں ایسا شکستہ آئینہ ہوں جس میں ہر شخص کو اپنا چہرہ نظر آسکتا ہے۔ مجھے دعا کے قابل سمجھتے ہیں تو خدارا میرے حق میں دعا ضرور کیجیے گا کہ مجھے مرنے کے بعد سکون مل سکے۔



# فنکار

جناب ایڈیٹر سرگزشت کراچی
السلام علیکم!
میں عرصہ دراز سے سرگزشت پڑھ رہا ہوں۔ کئی بار خطوط بھی لکھے لیکن کبھی کوئی کہانی نہیں بھیجی۔ یہ پہلا موقع ہے جب میں نے ارادہ کیا ہے کہ کوئی کہانی بھیجوں۔ یہ میری اپنی سرگزشت ہے۔ میری زندگی کا واقعہ ہے، پسند آجائے تو شاملِ اشاعت کرلیں۔ مجھے کس طرح سے ایک لڑکی نے بے وقوف بنایا یہی سنانا چاہتا ہوں۔

نفیس احمد
(سیالکوٹ)

میرے پاس کوئی جادو تو نہیں تھا لیکن میں ادھار لینے کا فن جانتا تھا۔
چاہے پان سگریٹ والا ہو، بیکری والا ہو یا کوئی دوست اور رشتے دار۔ میں نے قرض لینے کے معاملے میں ہر ایک سے ایک جیسا سلوک کیا ہے۔
رشتے داروں نے اسی لیے مجھ سے ملنا چھوڑ دیا ہے۔
دوست دور سے دیکھ کر کترا کر گزرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن میں لپک کر ان کے پاس پہنچ جاتا ہوں۔ "ارے بھئی،

ایسی بھی کیا بے نیازی۔ مان لیا کہ ہم دوست ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم اپنے پیسے بھی واپس نہ لو۔ دوستی اپنی جگہ اور قرض اپنی جگہ۔“

”جانے بھی دو۔ وہ تو میں بھول گیا ہوں۔“

”کیوں بھول گئے ہو۔ تمہاری امانت تو گھر پر رکھی ہوئی ہے۔ یقین کرو کہ میں اس وقت بے انتہا پریشانی میں ہوں۔ اس کے باوجود ان پیسوں کو اس لیے ہاتھ نہیں لگاتا کہ وہ تمہاری امانت ہیں۔“

یہ سب سن کر دوست قربان ہو جانے والی نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگتا۔ میں اپنی بات آگے بڑھاتا۔ ”اب اسی وقت دیکھ لو۔ مجھے کسی کو پانچ سو روپے دینے ہیں۔ اگر چاہوں تو تمہارے دس ہزار میں سے اس کو دے سکتا ہوں لیکن نہیں، اگر میں نے ایک بار ہاتھ لگایا تو وہ کم ہوتے چلے جائیں گے۔“

”ارے بھئی، اب ایسا بھی کیا۔“ دوست جلدی سے کہتا۔ ”آخر ہم ایک دوسرے کے کام نہیں آئیں گے تو اور کون کام آئے گا۔ تم پانچ سو روپے مجھ سے لے لو۔“

”بہت بہت شکریہ۔“ میں اس سے پانچ سو لیتے ہوئے کہتا۔ ”اب تمہاری امانت پوری کی پوری تمہیں مل جائے گی۔“

دیکھ لیا آپ نے۔ یہ ہے قرض لینے کا آسان طریقہ۔

دکانداروں سے ادھار کا دوسرا طریقہ ہے جو بہت ٹیکنیکل قسم کا ہے۔ وہ کچھ یوں ہے۔ میں دکان جا کر کچھ خریدتا ہوں۔ فرض کریں تیس روپے کی چیز خریدی۔ اسے سو کا نوٹ دیا اور بقایا واپس لیے بغیر آگے بڑھ گیا پھر وہ آواز دیتا ہے۔ ”بھائی جان، بقایا تو لیتے جاؤ۔“

اس طرح میں دو چار بار کرتا ہوں اور وہ یہ جان لیتا ہے کہ میں روپے پیسے کی طرف سے کچھ بے نیاز قسم کا بندہ ہوں۔ اس کے بعد اگلے مرحلے کے طور پر میں اسے ہزار کا نوٹ دے کر سو ڈیڑھ سو کا سامان خرید کر اس سے کہتا ہوں۔ بھائی بقایا اپنے پاس رکھو۔ تم سے چیزیں لیتا رہوں گا۔ تم اس میں سے کم کرتے چلے جانا۔“

یعنی جناب، ساکھ بن گئی۔ اب آپ جی چاہے جتنا ادھار لیتے جائیں اور جب بہت زیادہ ہو جائیں تو وہ راستہ چھوڑ دیں اور جب بہت ہی زیادہ ہو جائے تو محلّہ چھوڑ دیں۔

خیر۔ تو میں یہ بتا رہا تھا کہ میں ادھار لینے کا فن جانتا ہوں۔

ایک بار میں اپنے خستہ حال فلیٹ میں بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہونے لگی۔ دستک سنتے ہی میرا دم نکل جاتا ہے کیونکہ سوائے تقاضا کرنے والوں کے میرے پاس کوئی نہیں آتا۔

اسی لیے میں نے اپنی سانسیں تک روک لیں لیکن جب دستک بڑھتی چلی گئی تو دروازہ کھولنا پڑا۔ دو اجنبی چہرے سامنے تھے۔ ان میں سے ایک ادھیڑ عمر مہذب اور باوقار سا آدمی تھا جبکہ دوسری ایک لڑکی تھی۔ بہت خوبصورت اور اسمارٹ قسم کی۔

”جی فرمائیں؟“ میں نے ان سے پوچھا۔

”کیا آپ شہزاد صاحب ہیں؟“ آدمی نے پوچھا۔

”نہیں، میرا نام نفیس ہے۔“ میں نے بتایا۔

”ابا۔“ اس لڑکی نے اس آدمی کو مخاطب کیا۔ ”خدا کے لیے اس بھاگ دوڑ کو ختم کریں۔ میں آپ کے ساتھ چلتے چلتے تھک چکی ہوں۔ لعنت بھیج دیں ان روپوں پر۔ پھینک دیں کہیں۔ آپ نے تو دماغ خراب کر کے رکھ دیا ہے۔“

”بکواس مت کرو۔“ اس آدمی نے اس لڑکی کو ڈانٹ دیا تھا۔ ”میں حقدار کو اس کا حق پہنچا کر رہوں گا۔“

پتا نہیں یہ کیا سلسلہ تھا۔

لیکن معاملہ چونکہ پیسوں کا معلوم ہو رہا تھا۔ اسی لیے میرے کان کھڑے ہو گئے تھے۔

”چلیں ابا۔“ اس لڑکی نے اپنے باپ کا ہاتھ تھام لیا۔

”ایک منٹ، آپ لوگ اندر آ جائیں۔“ میں جلدی سے بولا۔ ”شاید میں آپ لوگوں کے کسی کام آ سکوں۔ مجھے بتائیں کیا معاملہ ہے۔“

وہ دونوں ہچکچا رہے تھے۔ لیکن میرے پُر زور اصرار پر اندر آ ہی گئے۔ میں نے فٹافٹ ان کے لیے چائے تیار کر دی تھی۔ چائے پینے کے دوران جو کہانی سننے کو ملی وہ بہت دلچسپ تھی۔

ان صاحب کا نام مکرم تھا۔ مکرم صاحب کو ایک دن کہیں سے پانچ لاکھ روپے کے پرائز بانڈ مل گئے تھے۔ کوئی شخص اس پارک میں چھوڑ کر چلا گیا تھا جس پارک میں اتفاق سے مکرم صاحب بھی بیٹھے ہوئے تھے۔

”بس میاں کیا بتاؤں۔ صرف اس کا نام یاد رہ گیا ہے۔ شہزاد نام بتایا تھا اس نے۔ اس کا چہرہ دھیان میں نہیں ہے۔ اس سے بہت دیر تک سیاست وغیرہ پر باتیں ہوتی رہی تھیں۔ پھر وہ اٹھ کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد مجھے وہ تھیلا دکھائی



دے گیا جس میں پانچ لاکھ کے پرائز بانڈز تھے۔“

”بس وہ دن ہے اور آج کا دن۔ ابا نے اپنے ساتھ ساتھ میری زندگی بھی عذاب کر رکھی ہے۔ اس آدمی کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ اور وہ مل کر نہیں دے رہا۔“ لڑکی نے کہا۔

”آپ اخبار میں اشتہار کیوں نہیں دے دیتے۔“ میں نے پوچھا۔

”میں نے بھی یہی سوچا تھا۔“ مکرم صاحب نے کہا۔ ”لیکن ڈر ہے کہ نہ جانے کتنے امیدوار سامنے آ جائیں گے کیونکہ مجھے چہرہ تو یاد ہے نہیں۔“

”اگر وہ آپ کے سامنے آیا تو آپ اسے کیسے پہچانیں گے۔“

”ابا کی پلاننگ یہ ہے کہ وہ نام پوچھیں گے۔“ لڑکی نے بتایا۔ ”اگر اس کا نام شہزاد ہوا تو اس سے پارک کا ذکر کریں گے لیکن بتائیں گے کچھ بھی نہیں۔ پھر وہ خود ہی پارک کے ذکر پر کہہ دے گا کہ پارک میں اس کی کیا چیز گم ہوئی ہے۔ اول تو یہی ہو سکتا ہے کہ وہ ابا کو پہچان لے۔ پھر ابا کو اس کی صورت یاد آ جائے گی۔ ان کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔“

”آپ کے ابا کرتے کیا ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”کچھ نہیں کرتے۔“ وہ منہ بنا کر بولی۔ ”ریٹائر ہو چکے ہیں لیکن ایمانداری کو سینے سے لگائے گھوم رہے ہیں۔ ان سے پوچھیں اب تک کیا کیا ہے۔“

”بس۔ فالتو باتیں مت کرو۔“ بڑے میاں نے اپنی بیٹی کو ڈانٹ دیا۔ پھر میری طرف دیکھا۔ ”اچھا میاں، جب تم وہ نہیں ہو تو پھر تم سے کیا بات کروں۔ اب ہم چلتے ہیں۔“

وہ دونوں چلے گئے۔

اور میں سوچتا رہ گیا کہ اس دور میں بھی ایسے لوگ پائے جاتے ہیں۔ ویسے پانچ لاکھ کی رقم اچھی خاصی ہوتی ہے۔ اگر میرے پاس آ جائے تو میرے سارے دلدّر دور ہو جائیں۔ قرض کا پورا بوجھ اتر جائے۔

اس لڑکی کے انداز یہ بتا رہے تھے کہ وہ اپنے باپ کی ایسی ایمانداری سے عاجز آ چکی ہے اور چاہتی ہے کہ کسی طرح یہ بھاگ دوڑ ختم ہو۔“

اچانک دوسری شام کو وہ لڑکی اکیلی میرے پاس آ گئی۔ وہ ایک عجیب پلاننگ لے کر آئی تھی۔ ”سنیں، آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ مجھے اپنے ابو کی ایسی بے تکی ایمانداری بالکل پسند نہیں ہے۔ خود تو گھر میں فاقے ہو رہے ہیں اور ان کا یہ حال ہے کہ پانچ لاکھ کے بانڈز واپس کرنے کے چکر میں ہلکان ہوئے جا رہے ہیں۔“

”جی ہاں، میں نے اسی دن یہ اندازہ لگا لیا تھا۔“

”آپ اگر میرا ساتھ دیں تو یہ رقم ہمارے کام آ سکتی ہے۔“ لڑکی نے کہا۔

”وہ کس طرح؟“

”دیکھیں۔ ابو کو چہرہ تو یاد ہے نہیں۔ آپ کسی بندے کو set کر کے اسے ابو سے بھڑا دیں۔ وہ اپنا نام شہزاد بتائے اور پارک کی ساری کہانی سنا دے۔ ابو اسے چپ چاپ سارے پرائز بانڈز دے دیں گے۔“

”فرض کرو۔ اگر تمہارے ابو نے اس سے شناختی کارڈ طلب کر لیا تو پھر کیا ہوگا؟“

”ابو اتنے جھنجٹ میں نہیں پڑیں گے۔“ لڑکی نے کہا۔ ”ان کو اطمینان دلانے کے لیے پارک والی کہانی ہی بہت ہوگی۔“

”اب دوسرا سوال یہ ہے کہ وہ آدمی ایسا کیوں کرے گا؟“

”پیسوں کے لیے۔ ہم اسے پچاس ہزار دے دیں گے۔“ لڑکی نے مسکرا کر بتایا۔ ”باقی رہے ساڑھے چار لاکھ تو اس میں سے ڈیڑھ لاکھ آپ کے تین لاکھ میرے۔ سوچ لیں یہ ایک اچھی Deal ہے۔ آپ کا کچھ نہیں جا رہا۔ آپ صرف ایک بندے کو تیار کریں گے۔“

ڈیڑھ لاکھ اچھی رقم تھی۔ اس سے بہت کچھ ہو سکتا تھا۔ میرے قرضوں کا بوجھ اتر جاتا۔ زندگی میں کچھ آسانیاں آ جاتیں۔ پھر بھی دس بیس ہزار روپے بچ جاتے۔

لیکن سوال یہ تھا کہ ایسا بندہ کون ہو۔ بہر حال میں نے اس لڑکی کو اطمینان دلا کر واپس کر دیا۔

ایسا آدمی۔ کون ہو سکتا تھا۔ پھر وہ اعتماد کا بھی ہو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ سارے بانڈز ہی لے کر بھاگ جائے۔ پھر تو بہت پرابلم ہو جاتی۔

میں نے اپنے ایک دوست سے بات کی۔ میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ کچھ اس قسم کی صورتِ حال ہے۔ ایک دوسری کہانی سنا کر پچاس ہزار کا لالچ دیا تھا لیکن اس نے اپنے کان پکڑ لئے۔ ”نہیں بھائی، میں رزقِ حلال کا آدمی ہوں۔ اس قسم کی کوئی حرکت نہیں کر سکتا۔“

اس کے بعد ایک اور سے بات کی۔ اس کا بھی یہی جواب تھا۔ پھر کسی اور سے بات ہوئی۔ اس دوران اس لڑکی کا فون آتا رہا تھا۔ وہ بے چاری بار بار پوچھتی تھی کہ کیا ہوا؟

کچھ ہوا اور میں اسے اپنی ناکامی کی داستان سناتا رہا۔

بالآخر تنگ آ کر اس لڑکی نے فون پر بتایا کہ اس نے اب خود ایک لڑکے کا بندوبست کرلیا ہے۔ بہت سیدھا سادا نوجوان ہے اور اس کی خاص بات یہ ہے کہ اس کا... نام بھی شہزاد ہے۔ اگر ابو نے شناختی کارڈ کی بات کی تو وہ اپنا شناختی کارڈ بھی دکھا سکتا ہے۔

میں نے اس سے کہا کہ وہ اس لڑکے کو مجھ سے ملوا دے تاکہ میں اسے اپنے طور پر دیکھ سکوں۔

وہ دوسری شام اس لڑکے کو میرے پاس لے آئی تھی۔ وہ واقعی ایک سیدھا سادا نوجوان تھا۔ لیکن میرے پاس آ کر نہ جانے اس کی کوئی رگ کیوں ٹیڑھی ہوگئی تھی۔ ''ناجی... مجھے تو اب کسی پر بھروسا ہی نہیں رہا۔ سیدھی سی بات ہے، مجھے پچیس ہزار روپے پہلے چاہئیں۔''

''یہ کیا بات کر رہے ہو۔'' لڑکی بھڑک کر بولی۔ ''جب ہم کہہ رہے ہیں کہ کام ہوتے ہی تمہیں پچاس ہزار مل جائیں گے تو پھر کس بات کی جلدی ہے۔''

''میں نے کہا نا کہ میں پچیس ہزار پہلے لوں گا۔'' لڑکے نے کہا۔ ''اگر کام کروانا ہے تو بتا دیں... ورنہ جانے دیں۔''

ہم دونوں سر تھام کر بیٹھ گئے۔ اتنی مشکلوں سے تو ایک ملا تھا۔ اگر یہ بھی چلا جاتا تو پریشانی ہو جاتی۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ لڑکی اسے برا بھلا کہہ کر بھگا دیتی۔ میں نے اس سے کہا۔ ''ٹھیک ہے مسٹر شہزاد! کل تک تمہیں پچیس ہزار روپے مل جائیں گے۔''

''تو پھر آپ کا کام بھی ہو جائے گا۔''

لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم پیسے لے کر بھاگو گے نہیں۔'' میں نے پوچھا۔

''کیا بات کر رہے ہو۔ انہوں نے میرا گھر دیکھا ہوا ہے۔'' اس نے لڑکی کی طرف اشارہ کردیا۔

پھر وہ اجازت لے کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد لڑکی نے کہا۔ ''سوری! مجھ سے اندازے کی غلطی ہوگئی۔ میں نے یہ سمجھا تھا کہ یہ سیدھا سادا آدمی ہے۔ کچھ نہیں کہے گا لیکن اس نے تو اپنا ہنر دکھانا شروع کردیا۔''

''ارے بھئی اب پیسے تو دینے ہی ہیں نا۔ چاہے کام سے پہلے ہوں یا کام کے بعد۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن آپ کہاں سے لائیں گے پچیس ہزار۔''

''فکر مت کرو۔ کہیں نہ کہیں سے ہو ہی جائیں گے۔''

لڑکی پریشان سی ہو کر واپس چلی گئی۔ اب میرے لیے دشواری تھی کہ پچیس ہزار کہاں سے لائے جائیں۔ میرا تو گزارہ ہی ادھار پر تھا۔

اور ادھار بھی بہت قلیل انداز کا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی نے ساٹھ ستر ہزار روپے ہاتھ پر رکھ دیے کہ جاؤ عیش کرو۔ لوگ مجھ پر ہزار دو ہزار سے زیادہ کا تو بھروسا ہی نہیں کرتے تھے۔

لیکن پچیس ہزار کا بندوبست بہت ضروری ہوگیا تھا۔ میں نے اپنے ادھار لینے کے فن کو آزمانا شروع کردیا۔ کسی سے ہزار کسی سے دو ہزار کسی سے پانچ سو اور آخر میں اپنا موبائل سیٹ اور پرانا ریڈیو بھی فروخت کردیا۔

مجھے مل گئے تھے پچیس ہزار۔

دوسری شام کو وہ لڑکی تنہا میرے پاس آئی تھی۔ وہ مجھے منع کر رہی تھی۔ ''آپ یہ بے وقوفی نہ کریں۔ لعنت بھیجیں اس آدمی پر۔ آپ نے کتنی مشکلوں سے پچیس ہزار کیے ہوں گے۔''

''اب تو میں کر چکا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن کچھ ہی دیر کی بات ہے۔ تمہارے ابو سے پیسے ملتے ہی زندگی میں پہلی بار میں ٹھیک وقت پر اپنا قرض ادا کرسکوں گا۔''

''چلیں، آپ کی مرضی۔''

وہ لڑکا بھی اپنے وقت پر آ گیا تھا۔ وہ اپنا اوریجنل شناختی کارڈ ساتھ لایا تھا۔ اس لڑکی نے اسے بتایا کہ اس کے ابو روزانہ واک کرنے پارک کی طرف جایا کرتے ہیں۔ وہ پارک پہنچ جائے اور اس کے ابو سے جا کر کہے کہ جناب عالی۔ میں تو کب سے آپ کو تلاش کرتا پھر رہا ہوں پھر وہ بتائے کہ وہ پارک میں اپنے بانڈز بھول گیا تھا اور مزید ثبوت کے لیے وہ ابو کو اپنا شناختی کارڈ بھی دکھا دے بس اتنی سی بات ہے۔''

نوجوان کی سمجھ میں سب کچھ آ گیا پھر وہ اور لڑکی دونوں چلے گئے۔ میں نے پچیس ہزار روپے اس نوجوان کے حوالے کر دیے تھے۔

دوسری صبح دروازے پر ہونے والی دستک نے مجھے بیدار کردیا۔ شاید وہی لڑکی میرے حصے کی رقم لے کر آئی ہو گی۔ میں نے جلدی سے جا کر دروازہ کھولا تو ایک قرض خواہ موجود تھا جو بہت خونخوار نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے شام کے وعدے پر اسے ٹال دیا تھا۔

اس کے بعد شام ہوئی پھر رات ہوئی لیکن اس لڑکی کا کوئی پتا نہیں چلا۔ مصیبت یہ تھی کہ میں نے اس کا گھر بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ مجھے فون تو کیا کرتی تھی لیکن اس کی کال پی سی او



سے آیا کرتی تھی۔

اس کے بعد بھی وہ نہیں آئی اور میں مزید پچیس ہزار کے قرض میں مبتلا ہوگیا۔ قرض خواہوں نے میری زندگی الگ عذاب کر کے رکھ دی تھی۔

جب ان کے تقاضے حد سے زیادہ ہو گئے تو میں پریشان ہو کر کچھ دنوں کے لیے ایک دوست کے پاس آ گیا۔ میرا وہ دوست کچھ فاصلے پر رہا کرتا تھا اور سب سے اچھی بات یہ تھی کہ وہ اکیلا تھا۔ اس کی بیوی اور بچے کچھ دنوں کے لیے کہیں گئے ہوئے تھے۔ اسی لیے وقتی طور پر مجھے اس کے گھر میں پناہ مل گئی تھی۔

دوسری صبح اس کے دروازے کی گھنٹی بجی۔ وہ دیکھنے کے لیے چلا گیا جب کہ میں کمرے ہی میں رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے واپس آ کر بتایا۔ ''یار کمال کے لوگ ہیں۔ اس دور میں بھی ایسے لوگ ہوا کرتے ہیں۔''

''کیا ہوگیا بھائی۔

''دو باپ بیٹی تھے۔'' میرے دوست نے بتایا۔ ''باپ کو کسی پارک میں کسی شخص کے پانچ لاکھ کے پرائز بانڈز مل گئے ہیں اور وہ بے چارہ اسی مالک کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے۔''

''کیا...!'' میں بستر سے اچھل کر نیچے آ گیا۔ ''کہاں ہیں وہ دونوں؟''

''کیوں، خیریت! تمہیں کیا ہوا۔ تم کیوں اتنے پریشان ہوگئے ''

میں اس کا جواب دیے بغیر دروازے کی طرف دوڑ پڑا لیکن مجھے دیر ہو چکی تھی وہ دونوں جا چکے تھے اتنی دیر میں میرا دوست میرے پاس پہنچ گیا۔ ''ارے بھائی کیا ہوا بات تو بتاؤ؟''

میں نے ابھی تک اپنے دوست کو اپنے ساتھ ہونے والے فراڈ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ ورنہ وہ بری طرح میرا مذاق اڑاتا لیکن وہ پچویشن ایسی ہو گئی تھی کہ اسے بتانا ہی پڑا پھر میں نے اس سے کہا۔ ''اب وہ لڑکی تمہارے پاس اس طرح آئے گی جیسے وہ اپنے باپ کی ایمانداری سے بے زار ہو گئی ہو۔''

''آنے دو اس کو۔ ان دونوں کی تو ایسی تیسی کر کے رکھ دوں گا۔''

''نہیں تم کچھ مت کہنا۔ میں نقصان اٹھا چکا ہوں۔ اس لیے یہ کیس میرا ہے۔ تم ایسا کرنا اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر مجھے بلا لینا پھر دیکھو میں اس کا کیا حشر کرتا ہوں۔''

میرا اندازہ بالکل درست نکلا۔

وہ لڑکی دوسری صبح ہی میرے دوست کے پاس آ گئی۔

پلاننگ کے مطابق میرے دوست نے اسے جا کر ریسیو کیا اور اسے لاؤنج میں بٹھا کر میرے پاس آ گیا۔ ''وہ لاؤنج میں ہے۔''

''بس تم یہیں رہو۔'' میں نے اپنے دوست سے کہا۔ ''میں اس کے پاس جا رہا ہوں۔''

وہ لاؤنج میں تھی اپنے اسی مظلوم اور معصوم چہرے کے ساتھ۔ مجھے دیکھتے ہی وہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئی تھی۔ ''ارے، کہاں چلے گئے تھے آپ، میں تو آپ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئی۔''

''کیوں کیا اب کوئی نئی کہانی لے کر آئی ہو؟'' میں نے غصے سے پوچھا۔

''کیا آپ اسے کہانی سمجھ رہے ہیں۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''تو اور کیا سمجھوں۔'' میں نے غصے سے کہا۔

''میں بیٹھی ہوں۔ آپ پولیس کو فون کر دیں۔'' وہ اب باقاعدہ رونے لگی تھی۔ ''میں دھوکے باز ہوں، مجرم ہوں آپ کی اور صرف آپ کی نہیں بلکہ کئی لوگوں کی کیونکہ وہ سب میرے ہی کاندھے پر رکھ کر بندوق چلاتے ہیں۔ انہوں نے مجھے آگے کیا ہوا ہے۔''

''لعنت ہے تمہارے باپ پر۔''

''وہ میرا باپ نہیں ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ اس لڑکے کا باپ ہے جس کو میں اپنے ساتھ لے کر آئی تھی اور وہ میرا شوہر ہے۔''

پھر اس نے جو کہانی سنائی وہ بہت حیرت انگیز اور دردناک تھی۔

اس کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ یہ بوڑھا اس کے باپ کا دوست تھا۔ والدین کی موت کے بعد اس نے لڑکی کا اس طرح ساتھ دیا کہ وہ اس بوڑھے کو اپنا ہمدرد اور محسن سمجھنے لگی۔

اس بوڑھے نے پھر اپنے بیٹے سے اس کی شادی کرا دی اور شادی کے بعد ماہا کو پتا چلا کہ دونوں باپ بیٹے فراڈیے ہیں۔ دونوں مل کر اس قسم کی حرکتیں کرتے ہیں پھر انہوں نے ماہا کو بھی اپنے ساتھ شامل کرلیا تھا۔

ماہا نے اس پر بہت احتجاج کیا لیکن اس کی بات نہیں سنی گئی۔ طلاق کی دھمکی دی گئی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ماہا کا کوئی نہیں ہے مجبور ہو کر وہ ان کا ساتھ دینے لگی۔

"جناب میں اب اس زندگی سے تھک چکی ہوں۔" ماہا نے داستان سنانے کے بعد کہا۔ "اگر اجازت ہوتی تو میں خودکشی کر چکی ہوتی، یہ لوگ مجھ سے ہر طرح کے فراڈ کرواتے ہیں۔"

"تم ان سے الگ کیوں نہیں ہو جاتیں۔"

"کس بنیاد پر۔" وہ تلخ ہو کر بولی۔ "کون میرا ساتھ دے گا۔ وقتی طور پر مجھ سے محبت جتانے والے تو بہت مل جائیں گے لیکن ہمیشہ کے لیے کوئی ساتھ دینے کو تیار نہیں ہو گا۔ میری اسی کمزوری اور مجبوری کا تو فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔"

"اگر میں تمہارا ساتھ دوں تو۔" میں نہ جانے کس جذبے کے تحت بول پڑا۔

"آپ...!" اس نے یقین نہ کرنے والے انداز میں میری طرف دیکھا۔ "آپ کیوں میرا ساتھ دیں گے۔ میں تو آپ کی مجرم ہوں۔"

"اوہو، بھول جاؤ جرم اور مجرم کو۔" میں نے کہا۔ "میں تمہارا ساتھ دینے کو تیار ہوں۔"

"کس طرح ساتھ دیں گے آپ؟"

"تم چھوڑ دو ان کم بختوں کو۔"

"وہی تو پوچھ رہی ہوں کس طرح۔"

"خلع لے لو۔"

"جناب، یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ دونوں باپ بیٹے جو فراڈ کرتے ہیں اس میں سے کچھ مجھے ملتا ہوگا۔"

"میں تمہاری بات نہیں سمجھا۔ تم سے پیسوں کی بات کون کر رہا ہے۔"

"کہاں سے لاؤں گی وکیل اور عدالت کے اخراجات۔ کون دے گا مجھے۔"

"میں دوں گا۔"

"نہیں، میں آپ کو پہلے بھی نقصان پہنچا چکی ہوں۔ میری وجہ سے آپ کیوں خوار ہوں گے۔ رہنے دیں، میرے نصیب میں جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

"ماہا، میری بات سنو۔" میں نے اس کی طرف دیکھا۔ "تمہاری مدد کر کے مجھے خوشی ہوگی اور میرے لیے یہ بہت بڑی بات ہوگی کہ تم ان لوگوں کے چنگل سے نکل آئی ہو۔"

"لیکن کیوں، آپ میرا اتنا ساتھ کیوں دیں گے؟"

"اس لیے کہ تم مجھے اچھی لگی ہو۔" میں نے اظہار کر ہی دیا۔ "میں اسی دن سے تمہیں پسند کرنے لگا تھا جس دن تم پہلی بار میرے دروازے پر آئی تھیں۔"

"کیوں مذاق کرتے ہیں۔ ایک مجرم لڑکی کو کون پسند کرتا ہے۔"

"ارے بھئی تم مجرم نہیں مجبور ہو۔" میں نے کہا۔ "تم ذہنی طور پر ان لوگوں سے الگ ہونے کو تیار ہو جاؤ میں تمہارا ساتھ دوں گا اور تم آئندہ سے بلکہ اس وقت سے فراڈ کے کاموں میں ان کا ساتھ دینے سے انکار کر دو۔"

وہ کچھ سوچنے لگی تھی پھر اس نے گردن اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ "ٹھیک ہے حالانکہ مجھ پر سختی ہو گی لیکن ایک صاف ستھری اور پاکیزہ زندگی کی طرف میرا سفر شروع ہو جائے گا۔"

وہ ایک عزم کے ساتھ وہاں سے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میرا دوست لاؤنج میں داخل ہوا۔ "حد ہو گئی یار تم نے تو اس کو چپکا ہی لیا تھا اتنی دیر تک اس سے کیا باتیں ہوتی رہی تھیں۔"

میں نے اپنے دوست کو اس کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا وہ بھی سن کر افسوس کرنے لگا تھا۔ "یار کیا زندگی ہوتی ہے کیسے کیسے لوگ کیسی مجبوریوں کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔"

میں اس لڑکی کے دل میں جرم کے خلاف جنگ کرنے کی ہمت پیدا کر چکا تھا۔ میں نے کہا۔ "اور میں ہر حال میں اس کا ساتھ دوں گا۔"

اس لڑکی کا دو دنوں کے بعد فون آیا تھا وہ بتا رہی تھی کہ اس کے ساتھ وہی ہو رہا ہے جس کا اندیشہ تھا اس کے انکار کرنے پر ان لوگوں نے اس پر سختی شروع کر دی ہے اور وہ اب پوری طرح ان کم بختوں سے الگ ہونے کو تیار ہے۔

چار پانچ دنوں کے بعد اس نے پھر فون کیا۔ "میرا خیال ہے کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ میری قسمت میں جو کچھ ہے وہ ہو جانے دیں۔"

"آخر بات کیا ہوئی۔ تم کیوں بددل ہو گئیں؟"

"میں نے کسی طرح موقع نکال کر ایک وکیل سے بات کر لی تھی۔" اس نے بتایا۔ "کیس شروع کرنے کے تیس ہزار مانگ رہا ہے کہاں سے آئیں گے تیس ہزار۔"

"میں دوں گا چاہے اپنے آپ کو فروخت کرنا پڑے۔"

اور قارئین میں نے جس طرح سے تیس ہزار کر کے دیے وہ میرا دل جانتا ہے۔ اس کے بعد وہ دن ہے اور آج کا دن اس سے ملاقات نہیں ہوئی اور میں پچاس ساٹھ ہزار کا مقروض ہو گیا ہوں کیا آپ مجھ بے وقوف کی مدد کر سکتے ہیں۔"



# محبت کے پہلو

جناب ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم!
سرگزشت میرا پسندیدہ رسالہ ہے۔ اسے بڑے شوق سے پڑھتی ہوں۔ اس بار میں بلکہ پہلی بار میں ایک سچا واقعہ جو میرے ساتھ گزرا ہے اسے بھیج رہی ہوں۔ امید ہے پسند آئے گا۔

انیسہ
(کراچی)

میں اپنے شوہر کو دفتر کے لیے رخصت کر کے بستر پر لیٹی ہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

ایسا ہوتا نہیں ہے۔ میرے شوہر کی ڈیوٹی ایسی ہے کہ انہیں منہ اندھیرے دفتر جانا پڑتا ہے۔ اسی لیے ان کے ناشتے وغیرہ کے لیے مجھے بھی اٹھنا پڑتا ہے۔

حالانکہ وہ بے چارے مجھے منع بھی کرتے ہیں۔ "یار تم کیوں زحمت کرتی ہو۔ ناشتا ہی بنانا ہے نا۔ وہ تو خود میں بھی بنا سکتا ہوں۔"

میرے شوہر ایسے ہی ہیں۔ بے پناہ پیار کرنے والے۔ خیال رکھنے والے۔

بہرحال دروازے کی گھنٹی نے مجھے جھلا دیا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا تو ایک عورت کھڑی تھی۔ معمولی سے کپڑے لیکن جوان اور کسی حد تک قبول صورت بھی تھی۔

اس کا رنگ اگرچہ دبتا ہوا تھا لیکن بے پناہ کشش بھی تھی۔

''کہو کیا بات ہے۔'' میں نے تلخ ہوکر پوچھا۔

''بی بی جی مجھے کام چاہیے۔'' اس نے کہا۔ ''بہت ضرورت مند ہوں جی۔''

اس پر غصہ تو آیا تھا کہ یہ کام مانگنے کا کون سا طریقہ ہے اور کون سا وقت ہے لیکن اس کی صورت ایسی تھی کہ میں اس سے کچھ کہہ نہیں پائی۔ ویسے بھی ان دنوں مجھے کسی کام کرنے والی کی بھی ضرورت تھی۔ اس کے باوجود میں نے غصے سے کہا۔ ''یہ کام مانگنے کا کون سا طریقہ ہے۔ جاؤ کسی اور وقت آجانا۔''

''بی بی جی میں بہت ضرورت مند ہوں ورنہ کبھی تکلیف نہیں دیتی۔''

''اس کی اس بات پر میں کچھ پگھل سی گئی۔ شوہر صاحب دنیا بھر کی ہدایات دے کر دفتر جایا کرتے تھے۔ دیکھو کسی کے لیے بھی دروازہ کھولنے کی ضرورت نہیں ہے، کسی کو اندر نہیں بلانا۔ کسی پر بھروسا مت کرنا وغیرہ وغیرہ۔

لیکن میں نے اس پر بھروسا کرتے ہوئے اسے اندر بلالیا۔

اس نے اپنا نام شادا بتایا تھا۔ شادی شدہ تھی۔ دو بچے، شوہر مزدوری کیا کرتا تھا۔ ''دیکھو میں تمہیں رکھ تو لوں لیکن کیا کوئی تمہاری ضمانت دے گا۔''

''مجھ غریب کی ضمانت کون دے گا۔'' وہ مایوسی سے بولی۔ ''آپ کی مرضی پر ہے۔''

پھر میں نے اسے چھ سو روپے ماہوار پر رکھ لیا۔ دو کام کرنے تھے اس کو۔ برتن اور صفائی۔ شام کو جب میں نے شوہر کو اس کے بارے میں بتایا تو وہ بہت ناراض ہوئے۔ ''تم آخر سب پر بھروسا کیوں کرلیتی ہو۔ خدا جانے کیسی ہو۔ کیا ہو۔''

''میرا خیال ہے کہ وہ اچھی عورت ہے اور ضرورت مند بھی ہے۔''

''چلو تم نے رکھ ہی لیا ہے تو کیا کرسکتا ہوں لیکن میں اسے دیکھ کر فیصلہ سناؤں گا۔''

اور شوہر صاحب نے اسے دیکھ کر اس کے حق میں فیصلہ دے دیا تھا۔ ان کا بھی یہی خیال تھا کہ شادا ایک شریف .... اور مظلوم عورت ہے۔''

بہرحال شادا نے کام شروع کردیا۔

کچھ دنوں کے بعد اس نے میرے دل میں جگہ بنالی تھی۔ وہ میرا بہت ہاتھ بٹانے لگی تھی۔ حالانکہ میں نے اسے صرف دو کاموں کے لیے رکھا تھا لیکن وہ دوسرے کام بھی کرجایا کرتی۔

ایک دن میں نے اس سے کہا۔ ''شادا تمہارے جو کام ہیں تم وہ کرو باقی کام تو میں خود کرلیتی ہوں۔''

''بے فکر رہیں جی۔ میں ان کاموں کے آپ سے پیسے تو نہیں مانگ رہی ہوں نا۔''

ایک دن اس نے مجھ سے کہا۔ ''بی بی جی اگر آپ ناراض نہ ہوں تو میں آپ سے ایک بات کہوں۔''

''ضرور کہو۔''

''آپ اپنے پرانے کپڑے مجھے دے دیا کریں جی۔'' اس نے کہا۔

''کیا خود پہنو گی۔''

''نہیں جی اپنی بہن کو دوں گی۔ آپ کے کپڑے نئے ڈیزائن کے ہوتے ہیں نا اسی لیے کہہ رہی ہوں۔''

''اوہو تو کیا تمہاری بہن کو فیشن کا بھی شوق ہے۔''

''ہاں جی۔'' وہ مسکرا دی۔ ''وہ ہے بھی تو بہت اچھی۔ فیشن والے کپڑے اس پر بہت اچھے لگتے ہیں۔'' میں نے اپنے کچھ جوڑے نکال کر اس کو دے دیے۔ وہ بہت خوشی خوشی لے کر چلی گئی تھی۔

ایک دن میں نے اسے پریشان دیکھ کر پوچھا۔ ''کیا بات ہے شادا، کچھ پریشان سی ہو۔''

''ہاں جی میری بہن بیمار ہوگئی ہے۔ رات بھر اسے بخار رہا ہے۔ میں ساری رات اس کے ہاتھ پاؤں دباتی رہی ہوں۔''

''شادا کیا وہ تم سے چھوٹی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں جی لیکن وہ ویسی بہن نہیں ہے جیسی آپ نے سمجھا ہوگا۔'' اس نے کہا۔

''تو پھر؟''

''وہ میری سوکن ہے جی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ ''میرے میاں نے اس سے میرے بعد شادی کی تھی۔''

''شادا تم بھی کمال کی عورت ہو۔ اپنی سوکن سے اتنی محبت کرتی ہو؟''

''ہاں جی، اس بے چاری کا میرے اور میرے میاں کے علاوہ اور ہے کون۔''



''میں سمجھ گئی۔ تم سے بچے نہیں ہوئے ہوں گے اسی لیے تمہارے میاں نے کسی اور سے شادی کرلی۔''

''نہیں جی، اب ایسا بھی نہیں ہے۔ دونوں بچوں کو تو میں نے ہی جنم دیا ہے۔ اس کو تو اس معاملے سے الگ ہی رکھا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''بی بی جی' وہ بڑی نازک ہے جی۔ کہاں بچوں کا بوجھ برداشت کرسکے گی۔ اسی لیے میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ تو صرف آرام کر اور فیشن کر۔ تجھے بچے وغیرہ پالنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آخر میرے بچے بھی تو اس کے ہیں نا جی۔''

''تو کیا وہ کام نہیں کرتی ہے؟''

''نہیں جی' میں نے اسے کبھی کام کرنے ہی نہیں دیا۔'' اس نے کہا۔

''شادا تم بھی کمال کی عورت ہو۔ میں نے کسی عورت کو کسی سوکن کے لیے اتنا پیار کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔''

میں نے جب شوہر کو یہ کہانی سنائی تو وہ بھی حیران ہوئے تھے پھر ہنس کر بولے۔ ''کیا خیال ہے میں بھی کرلوں دوسری شادی۔ آنے والی تمہارا اسی طرح خیال رکھے گی۔''

''لیکن میں تو شادا نہیں ہوں نا۔'' میں نے کہا۔

شادا نے اب ہمارے گھر میں اپنی جگہ بنالی تھی۔

اس کی محنت دیکھ کر افسوس ہوا کرتا تھا۔ وہ دن بھر مختلف گھروں میں کام کیا کرتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اس نے اپنی ذات پر کچھ بھی خرچ نہیں کیا ہوگا جو کچھ کیا ہے وہ بانو کے لیے ہے۔ بانو اس کی سوکن کا نام تھا۔

وہ مختلف چیزیں لا لا کر مجھے دکھایا کرتی۔ ''یہ دیکھیں جی' یہ میں نے بانو کے لیے خریدی ہیں۔ یہ دیکھیں جی' یہ اس پر بہت اچھا لگے گا۔''

''بے وقوف عورت' کبھی اپنے لیے بھی تو کچھ لے لیا کر۔''

''نہیں جی۔ بانو خوش رہے میری اسی میں خوشی ہے۔''

ایک دن میں نے اس سے کہا۔ ''شادا' تو کسی دن بانو کو لے کر تو آ۔ میں بھی تو دیکھوں کہ وہ کیسی ہے جس پر تو قربان ہوئی جارہی ہے۔''

''کیوں نہیں جی۔ کل ہی لے کر آتی ہوں۔''

اور وعدے کے مطابق وہ دوسری صبح اپنی سوکن کو لے کر آگئی تھی۔ اس کو دیکھ کر میرا دل چاہا کہ یا تو اپنا ہی سر پیٹ لوں یا شادا کو مارنا شروع کردوں۔

بانو ایک موٹی بے ڈھنگی سی عورت تھی۔ جب کہ شادا اس کے مقابلے میں ہزار گنا زیادہ اچھی تھی۔ اس کے باوجود

## شوکت عزیز

ماہرِ اقتصادیات، وزیراعظم پاکستان۔ کراچی میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم سینٹ پیٹرک اسکول کراچی میں حاصل کی، پھر ایبٹ آباد پبلک اسکول میں داخلہ لیا۔ گارڈن کالج راولپنڈی سے گریجویشن کی۔ انسٹیٹیوٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن یونیورسٹی آف کراچی سے ایم بی اے کی ڈگری لی۔ 1969ء میں سٹی بینک کراچی سے انہوں نے ملازمت کا آغاز کیا۔ 1975ء میں بیرونِ ملک چلے گئے اور فلپائن، اردن، یونان، امریکا، برطانیہ، ملائیشیا، سنگاپور اور سعودی عرب میں ملازمت کی اور افریقن ریجن کے سربراہ بھی رہے۔ 1999ء میں جنرل پرویز مشرف نے انہیں وزارتِ خزانہ، اقتصادی امور پلاننگ و ڈویلپمنٹ اور ریونیو ڈویژن کا قلمدان سونپا۔ وہ کابینہ کمیٹی کے چیئرمین بھی رہے۔ چودھری شجاعت نے جون 2004ء میں وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ سنبھالا تو انہوں نے بھی انہیں اس عہدے پر برقرار رکھا۔ 1996ء میں ایشین پرسیج کونسل نیوجرسی (امریکا) نے انہیں پروفیشنل آف دی ائیر کا خطاب دیا۔ گلوبل نیویارک امریکا کی طرف سے آنر آف اچیومنٹ دیا گیا۔ یورومنی اور بینکرز میگزین نے انہیں سال 2001ء کا بہترین وزیرِ خزانہ کا ایوارڈ دیا۔ جون 2004ء کو وزیراعظم جمالی مستعفی ہوئے تو چودھری شجاعت نے انہیں وزیراعظم کے عہدے کے لیے نامزد کیا اور وہ اگست 2004ء میں پاکستان کے وزیراعظم بنے۔

مرسلہ: ناہید اختر لاہور

وہ بانو پر قربان ہوئی جارہی تھی۔

میں نے دوسرے دن شادا سے کہا۔ ”شادا کیا ہوگیا ہے تجھ کو۔ وہ تو تیرے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ اور تو اس کے لیے پاگل ہوئی جارہی ہے۔“

اپنی اپنی پسند کی بات ہے نا بی بی۔“ وہ مسکرا کر بولی۔ ”وہ مجھے اچھی لگتی ہے۔ اس کی ہر ادا اچھی لگتی ہے۔ اسی لیے میں اس کے اتنے نخرے برداشت کرتی ہوں۔“

”پھر تو تیرا خدا ہی حافظ ہے۔“

وہ مسکرا کر خاموش ہوگئی۔ ایک دن اس نے بتایا۔” بی بی ... کل میرے میاں سے میرا خوب جھگڑا ہوا تھا۔ میں نے اس کے پورے چہرے کو نوچ کر رکھ دیا ہے۔“

”وہ کیوں۔“

”ارے مردار نے ہاتھ اٹھایا تھا نا اس لیے۔“

”یہ تو ہونا ہی تھا شادا۔“

”نہیں جی آپ غلط سمجھیں۔ اس نے مجھ پر نہیں بانو پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ اس بات پر میں نے اس کو نوچ کھسوٹ کر رکھ دیا ہے۔“

”خدا تیرے حال پر رحم کرے۔ یاد رکھ شادا تیرا یہ پاگل پن تیرے کسی کام نہیں آئے گا۔ وہ کبھی تیرا ساتھ نہیں دے گی۔“

”مجھے اس کی آرزو بھی نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میں تو بس یہ چاہتی ہوں کہ وہ میری نگاہوں کے سامنے رہے۔“

میرے شوہر کا خیال تھا کہ شادا کسی نفسیاتی بیماری میں مبتلا ہے ورنہ ایسا پاگل پن تو بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ ایک ہفتہ اور اسی طرح گزر گیا۔

پھر شادا اچانک غائب ہوگئی۔

اس نے کام پر آنا چھوڑ دیا تھا۔ ایک دن، دو دن میں ہفتے بھر تک اس کا انتظار کرتی رہی۔ مجھے اس کی طرف سے پریشانی بھی ہوگئی تھی۔

میں نے اس کا گھر بھی نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی اس کے کسی جان پہچان والے کو جانتی تھی کہ اس کے بارے میں معلوم کرتی۔ ایک دن میں نے محلے کے ایک اور گھر میں کام کرنے والی ملازمہ کو پکڑ کر اس سے شادا کے بارے میں پوچھا۔

”کون شادا جی جو آپ کے یہاں کام کرتی تھی۔“

”ہاں۔ میں اسی کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔“

”وہ تو جی جیل میں ہے۔“ اس نے بتایا۔

”جیل میں۔“ میں پریشان ہوگئی تھی۔ ”کیوں جیل میں کیوں ہے کیا کیا تھا اس نے؟“

”یہ لیں جی۔ آپ کو تو معلوم ہی نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔ ”اس نے اپنی سوکن کا خون کردیا ہے نا اسی لیے۔“

”سوکن کا خون کردیا۔“ میں اچھل پڑی تھی۔ ”یہ کیا کہہ رہی ہو۔ سوکن کا خون کیوں کردیا؟“

”بی بی جی، بہت عجیب کہانی ہے جی۔“ اس نے بتایا۔ ”بانو نے اپنے میاں سے کہا تھا کہ وہ اسے چھوڑ دے۔“

”یہ کیا بات ہوئی۔ اس کو تو خوش ہونا چاہیے تھا کہ وہ اس کے شوہر کو چھوڑ کر جارہی ہے۔“

”یہی تو پاگل پن ہے اس کا۔“ اس نے بتایا۔ ”بات یہ ہوئی تھی جی کہ بانو نے کسی اور کو پسند کرلیا تھا اس لیے وہ اپنے میاں کو چھوڑ رہی تھی۔

”یعنی اپنے شوہر کی ہمدردی میں اس نے اپنی سوکن کا خون کردیا۔“

”نا جی نا۔ کہاں کی ہمدردی۔ شادا نے سوکن سے کہا تھا کہ وہ جس مرد سے شادی کرنا چاہتی ہے اس سے اس کی بھی شادی کروادے۔“

”یہ کیا پاگل پن ہے اس نے ایسا کیوں کہا تھا۔“

”اس لیے کہ وہ پاگل ہر حال میں بانو کو ساتھ رکھنا چاہتی تھی۔ بانو اگر میاں کو چھوڑ دیتی تو بانو اور شادا کے درمیان دوری ہوجاتی اور یہ دوری شادا کے لیے موت تھی جی۔ وہ تو صرف مرنے کے بعد ہی اس سے الگ ہونا چاہتی تھی لیکن جب بانو نے اسے دھتکار دیا تو اس نے بانو کو تو قبر میں پہنچادیا اور خود جیل چلی گئی۔“

”میرے خدا یہ کیسی کہانی ہے۔“

”اب کیا بتاؤں یہ شادا کے پاگل پن کی کہانی ہے۔“

مجھے اس انجام پر بہت افسوس ہوا تھا۔ میں نے محبت کی ہزاروں داستانیں پڑھی تھیں، میری نگاہوں کے سامنے بے شمار انسان گزرے تھے لیکن یہ اپنی نوعیت کی انوکھی مثال تھی۔

میں نے جب اپنے شوہر صاحب کو اس انجام کے بارے میں بتایا تو وہ گہری سانس لے کر رہ گئے۔ ”جانو یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ کیونکہ محبت کے ہزار پہلو ہوا کرتے ہیں اور یہ پہلو بھی ان ہی میں سے ایک ہے۔ اسے نفسیاتی گرہ کہہ سکتی ہو۔ اس بیماری میں مبتلا شخص جس شے کو پسند کرلے اس پر قربان ہوجاتا ہے۔ اسے شیزوفرینیا کے مرض کی ایک قسم کہہ سکتی ہو۔“



# بے وفا

محترم مدیر سرگزشت

السلام علیکم!

میں نے اپنی ہی کہانی کو الفاظ میں پرونے کی کوشش کی ہے۔ شاید میری یہ کوشش آپ کو بھی پسند آجائے۔ میرے ساتھ قسمت نے کیسا عجیب کھیل کھیلا ہے اسی کو میں نے کاغذ پر منتقل کردیا ہے۔ اگر یہ شائع ہوجائے گی تو بہتوں کو سبق حاصل ہوگا۔

مدیحہ انور
(راولپنڈی)

ہمارے ایک چچا تھے نہایت غریب اتنے غریب کہ صبح شام ان کے گھر میں فاقوں کی نوبت بجتی رہتی تھی۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ جب کھانے کو نہ ہو تو اسکول کیسا۔ دونوں بچے اسکول کی شکل نہ دیکھ سکے۔ چھوٹا تو خیر آوارہ نکل گیا لیکن بڑے نے پلمبر کا کام سیکھ لیا۔ ہاتھ میں ہنر ہو تو آدمی فاقے نہیں کرتا۔ اس کی کمائی گھر میں آنے لگی تو حالات کچھ سدھر گئے۔ وہ کمانے لگا تو ماں باپ کو اس کی شادی کی فکر ہوئی۔ نظرِ انتخاب مجھ پر پڑی، ہم بھی کوئی ایسے رئیس نہ

تھے۔ اور اب تو ابا بوڑھے ہو چلے تھے۔ کوئی بھائی نہیں تھا کہ سہارا بنتا۔ مشکل یہ تھی کہ میں نے اپنی محنت سے دسویں پاس کر لی تھی۔ جبکہ عبداللہ تعلیم کے معاملے میں کورا کاغذ تھا۔ کبھی اسکول گیا ہی نہیں تھا۔ میں نے اس رشتے کی مخالفت کردی۔ جواز یہی بنایا کہ میں پڑھی لکھی ہوں۔ عبداللہ میرے لائق نہیں۔ ایسی ہی بے جوڑ شادی ابا اور اماں کی تھی۔ اماں پرانے زمانے کی آٹھویں پاس تھیں اور ابا جاہل، مستری کا کام کرتے تھے۔ محنتی تھے اس لیے فاقوں کی نوبت نہ آنے دی۔ اچھی گزر گئی۔ ابا تعلیم کو اہمیت نہیں دیتے تھے اس لیے انہیں عبداللہ میں کوئی عیب نظر نہیں آیا۔ وہ یہی کہتے رہے کہ لڑکا خاندان کا ہے اور ہاتھ میں ہنر رکھتا ہے۔ اماں بھی ان ہی کا ساتھ دے رہی تھیں۔ میں نے بھی کوئی ایسی خاص ضد نہیں کی بلکہ یہ سوچ کر چپ ہوگئی کہ میں میٹرک ہوں، عبداللہ پر میرا رعب رہے گا۔ عبداللہ سے میری منگنی ہوگئی۔ ابا نے تیاری کے لیے ایک سال کا وقت مانگا تھا۔

ایک دن گھر میں بجلی کی کوئی ایسی خرابی ہوگئی کہ الیکٹریشن کو بلائے بغیر ٹھیک نہیں ہوسکتی تھی۔ اماں نے محلے کے ایک بچے سے کہا کہ وہ کسی الیکٹریشن کو بلا لائے۔ گلی سے نکلتے ہی الیکٹرک کی ایک دکان تھی۔ وہ بچہ گیا اور الیکٹریشن کو بلا کر لے آیا۔ وہ الیکٹریشن آیا تو اماں اس وقت باتھ روم میں تھیں۔ مجبوراً مجھے ہی دروازہ کھولنا پڑا اور اسے کام سمجھانا پڑا کہ کیا خرابی ہے۔

میں نے جب الیکٹریشن کو دروازے پر دیکھا تھا تو یہی سمجھا تھا کہ کوئی کاریگر موجود نہیں ہوگا تو دکان کا مالک خود آگیا ہے یا پھر مالک کا بیٹا ہے۔ وہ ایسا تھا جسے بے حد خوبصورت کہا جاسکتا تھا۔ سنہرے بال، بڑی بڑی آنکھیں، کھلتا ہوا رنگ، اونچا قد، کسی طرح بھی خوابوں کے شہزادے سے کم نہیں لگتا تھا۔ اندر آکر جب کام سمجھانے کے دوران باتیں ہوئیں تو اس کا لہجہ بھی نہایت شائستہ تھا۔ کچھ دیر بعد اماں باتھ روم سے آئیں تو وہ بھی اس کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں اور اس کے بارے میں جاننے کے لیے سوالات شروع کردیے۔

"بیٹا تمہارا نام کیا ہے۔"

"جی میرا نام عادل ہے۔"

"دکان پر کام کرتے ہو یا دکان اپنی ہے۔"

"اپنی دکان کہاں۔ دکان والے کی مہربانی سے اس کی دکان پر بیٹھ جاتا ہوں۔ جس کو کام کرانا ہوتا ہے مجھے لے جاتا ہے۔"

"تنخواہ پر ملازم ہو۔"

"جی نہیں، جو کماتا ہوں میرا اپنا ہوتا ہے۔"

"باتوں سے پڑھے لکھے لگتے ہو۔"

"میں میٹرک پاس ہوں۔ ڈپلوما بھی ہے میرے پاس۔"

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ خیر تم کام کرو جاتے وقت اپنا موبائل نمبر دیتے جانا وقت بے وقت ضرورت پڑ جاتی ہے۔ تمہیں بلا لیا کریں گے۔"

"جی کیوں نہیں۔ خوشی سے بلائیں۔"

وہ جب کام نمٹانے کے بعد جانے لگا تو میں نے اس کا سیل نمبر لے لیا اور یہ بھی پوچھ لیا کہ وہ رہتا کہاں ہے۔ اس نے بتایا کہ اس کے والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ اپنے ماموں کے ساتھ رہتا ہے۔ علاقے کا نام بھی بتایا۔

جب تک وہ کام کرتا رہا تھا، میرے دل میں اس کے لیے کوئی جذبہ پیدا نہیں ہوا تھا لیکن اس کے جاتے ہی اس کے لیے اپنے دل میں کشش محسوس کرنے لگی۔ ایسی کشش جس نے بعد میں محبت کا روپ دھار لیا۔ اس کی یاد تازہ کرنے کے لیے میں نے اماں سے اس کا ذکر چھیڑ دیا۔

"اماں آپ نے دیکھا شکل سے الیکٹریشن لگ ہی نہیں رہا تھا۔ سلیقے سے بال بنے ہوئے تھے۔ کپڑے بھی اچھے پہنے ہوئے تھے۔ میں سمجھی تھی دکان کا مالک ہے۔"

"ارے ہاں، کسی اچھے خاندان کا معلوم ہوتا ہے۔"

"بے چارے کے والدین مر چکے ہیں۔ ماموں کے ساتھ رہتا ہے۔"

"تجھے کیسے معلوم؟"

"میں نے یونہی پوچھ لیا تھا۔"

"بے چارہ۔" اماں نے کہا۔ "کبھی کوئی کام ہوا کرے تو اسی کو بلا لیا کرو۔"

میں جب رات کو سونے کے لیے لیٹی تو خود بخود اپنے منگیتر عبداللہ اور عادل کا موازنہ کرنے لگی۔ دونوں کا کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔ عادل میٹرک پاس اور ڈپلوما یافتہ تھا اور عبداللہ نے اسکول کی شکل تک نہیں دیکھی تھی۔ شکل وصورت بھی واجبی تھی جبکہ عادل کسی فلم کا ہیرو لگتا تھا۔ گفتگو بھی وہ جو پڑھے لکھے لوگ کرتے ہیں۔ میں کچھ دیر کے لیے عادل کے سحر میں کھو گئی۔ پھر خود پر ندامت ہونے لگی۔ میں کسی کی امانت بن چکی تھی اور اب کسی اور کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ میں نے گھبرا کر کروٹ بدل لی اور کوشش کرنے لگی کہ عادل کے خیال کو ذہن سے جھٹک دوں میں اس کوشش میں کتنی کامیاب رہی اس کا اندازہ اس وقت ہوا جب سوئے بغیر بستر سے اٹھی اور منہ دھو کر آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی۔ آنکھیں سرخ انگارا ہو رہی تھیں۔ میں رات بھر نہیں سوئی تھی۔

گھر کے کام کاج سے نمٹنے کے بعد ایک مرتبہ پھر عادل کا خیال آگیا۔ میں نے اماں سے ایک سہیلی کے گھر جانے کا بہانہ کیا اور گھر سے نکل آئی۔ کچھ دیر بعد میں اس کی دکان کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ مقصد یہی تھا کہ اس کو ایک نظر دیکھ لوں۔ وہ دکان پر نہیں تھا، یہی دکان ہے یا کوئی اور؟ میں دکان پر پہنچ گئی۔

"آپ کے یہاں کوئی الیکٹریشن عادل نام کا ہے؟"

"وہ تو اس وقت نہیں ہے۔ یہ بھی الیکٹریشن ہے، اسے بتا دیں کیا کام ہے۔" دکاندار نے ایک لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں۔ ہمیں اسی پر اعتبار ہے۔"

"تو پھر اپنا مکان نمبر لکھوا دیں۔ وہ آئے گا تو میں اسے بھیج دوں گا۔ اس وقت وہ کہیں کام کرنے گیا ہوا ہے۔"

"کوئی بات نہیں، میں پھر دیکھ لوں گی۔ قریب ہی تو رہتی ہوں۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔"

میں نے مکان نمبر نہیں لکھایا۔ کوئی کام ہی نہیں تھا نمبر کیا لکھواتی۔ مجھے تو بس اسے دیکھنا تھا۔ میں واپس آگئی۔ اماں سے کہہ دیا کہ میری سہیلی گھر پر نہیں تھی اس لیے فوراً چلی آئی۔ شام کو چلی جاؤں گی۔

مغرب سے پہلے ابا گھر آجاتے تھے اس لیے مغرب سے پہلے تیار ہوئی اور اس کی دکان کے سامنے سے گزری۔ وہ پھر نظر نہیں آیا۔ اس مرتبہ میری ہمت نہیں ہوئی کہ دکاندار سے کچھ پوچھتی۔ میں بوجھل قدموں سے گھر کی طرف لوٹ آئی۔ اماں سے پھر کہہ دیا کہ سہیلی نہیں ملی۔ واقعی نہیں ملی تھی۔

اب میرے شوق کی ناکامی میں شکست کا عنصر بھی شامل ہوگیا تھا۔ یہ میری شکست ہی تو تھی کہ میں اسے دیکھنے میں ناکام ہوگئی تھی۔ خیر کوئی بات نہیں کل دیکھا جائے گا۔ یہ رات بھی میں نے کروٹیں بدل بدل کر کاٹی۔ صبح ہوتے ہی ایک خیال نے میرے دل میں جگہ بنائی کہ اسے فون کیا جائے۔ مگر کیوں؟ اس کا جواب بھی فوراً مجھے سوجھ گیا۔ اماں کچن میں تھیں۔ میں اسٹول پر چڑھی اور چھت کے پنکھے کا ایک تار کھینچ کر توڑ دیا۔

"اماں، پنکھے کو نہ جانے کیا ہوگیا ہے۔ چل ہی نہیں رہا۔"

"ہوگیا ہوگا کچھ، مجھے کیا پتا۔"

"گرمی اتنی ہو رہی ہے اور پنکھا چل ہی نہیں رہا ہے۔ تم کہو تو اسی الیکٹریشن کو فون کردوں جو اس دن آیا تھا۔ اس کا نمبر ہے میرے پاس۔"

"کردو فون...... نہ جانے کتنے پیسے لے۔"

"کم ہی لے گا۔ اچھا آدمی ہے۔" میں نے کہا اور اس کا نمبر ملا لیا۔

"السلام علیکم!"

"عادل بول رہے ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"میں اسی مکان سے بول رہی ہوں جہاں آپ پرسوں آئے تھے اور سوئچ بدلا تھا۔ آج پنکھا نہیں چل رہا ہے۔ ذرا آکر دیکھ لیں۔"

"میں آتا ہوں۔"

تھوڑی دیر نہیں گزری تھی کہ وہ آگیا۔ میں بھاگتی ہوئی دروازے پر گئی کہ کہیں اماں مجھ سے پہلے نہ پہنچ جائیں۔ میں اسے جی بھر کے دیکھ رہی تھی اور وہ منتظر تھا کہ میں اسے اندر آنے کو کہوں۔

"کیا پنکھا یہاں لا کر دکھائیں گی۔"

"جی نہیں۔ وہ تو وہاں چھت پر لگا ہوا ہے۔ میرے کمرے کی چھت پر۔"

"تو پھر چھت اٹھا کر یہاں لے آئیں۔"

"کیوں مذاق کرتے ہیں۔ بھلا کوئی چھت بھی اٹھا کر لا سکتا ہے۔"

"تو پھر مجھے چھت کے پاس لے کر چلیں۔"

اسی وقت اماں نے مجھے آواز دی۔ وہ پوچھ رہی تھیں کہ دروازے پر کون ہے۔ میں نے گھبرا کر دروازہ چھوڑ دیا اور وہیں سے چیخ کر اماں کو اس کی آمد کی خبر سنائی۔ وہ اپنے سامان کا تھیلا اٹھا کر میرے ساتھ ساتھ میرے کمرے میں آگیا۔

"آپ دکان پر ہوتے کیوں نہیں ہیں؟"

"آپ گئی تھیں کیا۔"

"کل گئی تھی۔"

"یہ پنکھا کل سے خراب ہے؟"

"اور نہیں تو کیا؟"

"اوہ! آپ کو تو بڑی تکلیف اٹھانی پڑی ہوگی۔"

"ایسی ویسی، میں رات بھر سو نہ سکی۔"

"اب میں ایسا کیا کروں گا کہ روز آ کر پوچھ جایا کروں گا کہ کوئی کام تو نہیں ہے۔"

"جی نہیں، میں فون کرلیا کروں گی۔"

"زہے نصیب۔ یہ کہنے کے لیے بھی فون کرلیا کیجیے کہ آج کوئی کام نہیں ہے۔"

ابھی کچھ اور باتیں بھی ہوتیں لیکن اماں آ گئیں اور وہ اسٹول پر چڑھ گیا۔ کام تو کچھ تھا نہیں ایک تار نکلا ہوا تھا اس نے تار لگا دیا۔

"بیٹا، پیسے ذرا مناسب بتا دینا۔"

"میں پیسے آپ سے مانگ کب رہا ہوں۔"

"جب کام کیا ہے تو پیسے نہیں لو گے؟"

"کام ہی کیا تھا۔ ویسے بھی آپ لوگ مجھے اتنے اچھے لگے ہیں کہ پیسے لینے کو جی نہیں چاہتا۔ کبھی کوئی کام ہو مجھے بلالیں۔ اپنے گھر کے کام کے پیسے کیسے۔"

میں نے موقع غنیمت دیکھ کر اسے چائے کی پیش کش کردی۔

"اچھا پیسے نہ لو چائے تو پی لو۔"

"ہاں یہ ہوسکتا ہے۔ آنٹی کے ہاتھ کی گرم گرم چائے پینے کا مزہ آئے گا۔"

وہ بڑا ہوشیار تھا۔ اس نے اماں کے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے کی شرط رکھ دی تھی لہٰذا چائے بنانے کے لیے اماں کو اٹھنا پڑا۔

جتنی دیر میں اماں چائے لے کر آئیں ہم بہت سی باتیں کر چکے تھے۔

وہ چلا گیا لیکن میرے دل میں بہت سی تنہائیاں چھوڑ گیا۔ میں پہلی ہی ملاقات میں اس سے آئندہ ملنے کا نہیں کہہ سکتی تھی اور جی یہ چاہ رہا تھا کہ میں اس سے روز ملا کروں۔

دو دن گزر گئے تو اس سے ملنے کا اشتیاق بڑھنے لگا۔ اب اس کی دکان پر جاتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا، محلے کی بات تھی۔ اگر دکاندار کو شک ہوگیا تو بات پھیلتے دیر نہیں لگے گی۔ پھر وہی بہانہ سوجھا۔ گھر کی کوئی چیز خراب ہو جائے تو وہ آسکتا ہے۔

"اماں میرے کمرے کا بلب ہی نہیں جل رہا ہے۔ عادل الیکٹریشن کو بلالوں۔"

"بلالو بھئی۔"

وہ آ گیا۔ جان بوجھ کر کام میں دیر لگاتا رہا لیکن جانا تو تھا۔ وہ چلا گیا۔

اب ہر تیسرے چوتھے دن بجلی کا کوئی نہ کوئی کام نکل آتا تھا اور عادل کو بلانا پڑتا تھا۔ مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ اسے دیکھ لوں، اس سے کچھ باتیں کرلوں۔

جب یہ سلسلہ مستقل چلنے لگا تو اماں کو شک ہوا۔

"بیٹا، مجھے تو لگتا ہے یہ عادل جان بوجھ کر کام نکالتا ہے۔"

"وہ کیوں نکالے گا کام، پیسے تک تو لیتا نہیں ہے بے چارہ۔"

"پھر اسے کام نہیں آتا ہوگا۔ جس چیز کو سنبھال کر جاتا ہے دوسرے دن وہی پھر خراب ہو جاتی ہے۔ یہ کوئی بات ہے۔ میں تو کہتی ہوں اب کوئی چیز خراب ہو تو کوئی دوسرا الیکٹریشن بلاؤ۔"

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اماں کو اس کے کاریگر ہونے پر شک ہونے لگا تھا۔ اور بھی نہ جانے کیا کیا سوچ رہی ہوں گی۔ اب کوئی چیز خراب نہیں ہونی چاہیے۔ پھر ملاقات کیسے ہوگی؟ میں نے موبائل پر اس کا نمبر ملا دیا۔

"ہیلو، کیا پھر کوئی کام نکل آیا۔" عادل کی آواز آئی۔

"کیا کام کے بغیر بات کرنا منع ہے۔"

"بالکل نہیں بلکہ کام نہیں باتیں ہی اچھی لگتی ہیں۔"

"تو پھر کیجیے نا باتیں۔"

"کیا باتیں کروں۔"

"اماں کہہ رہی تھیں آپ کو کام نہیں آتا۔ اس لیے روزانہ کوئی نہ کوئی چیز خراب ہو جاتی ہے۔"

"ٹھیک تو کہہ رہی تھیں۔ آپ اتنی جلدی جلدی چیزیں خراب کر رہی ہیں کہ انہیں شک تو ہونا ہی تھا۔"

"کیا کہا۔ میں خراب کر رہی ہوں۔"

"میں جانتا ہوں شگفتہ۔" وہ اچانک سنجیدہ ہوگیا تھا۔ "یہ سب کچھ تم مجھے بلانے کے لیے کرتی رہی ہو۔ میں تمہارے جذبے کی قدر کرتا ہوں۔"

"تم نے سچ کہا عادل۔ میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں۔"

"میرا حال بھی تم سے مختلف نہیں ہے۔"

ہم بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ یہ سلسلہ چلتا رہا۔ پھر ایک دن واقعی بجلی کے نظام میں کوئی ایسی خرابی پیدا



ہوگئی کہ گھر اندھیرے میں ڈوب گیا۔ رات کا وقت تھا۔ کوئی اور الیکٹریشن آتا بھی نہیں۔ میں نے اماں سے کہا کہ وہ عادل کو فون کردیں۔ میں چاہتی تھی اماں خود اسے بلائیں۔ میں نے نمبر ملا کر انہیں دے دیا۔ انہوں نے بات کی اور عادل آ گیا۔ اس دن مجھے معلوم ہوا کہ باتوں میں اور ملاقات میں کیا فرق ہے۔

ہم دونوں باہر ملنے لگے۔ میں روزانہ باہر جانے کے بہانے کرنے لگی تو اماں کو شک ہوگیا۔ مجبوراً مجھے بتانا پڑا کہ منگنی ہونے کے باوجود میں عادل سے ملتی رہی ہوں۔ بس قیامت ہی تو آ گئی۔ ابا کو معلوم ہوا تو انہوں نے جوان بیٹی پر ہاتھ اٹھا دیا۔ مجھے اتنا مارا کہ میں بے ہوش ہوگئی۔ ہوش میں آئی تو اماں نے گلے سے لگا کر مجھے سمجھایا۔ میں نے انہیں عبداللہ اور عادل کا فرق سمجھایا۔ انہیں قائل کرنے کی کوشش کی۔ اماں کا دل تو ماں کا دل تھا لیکن ابا اپنی ضد پر اڑ گئے۔ عبداللہ ان کے بھائی کا بیٹا تھا۔ وہ ہر حال میں میری شادی وہیں کرنا چاہتے تھے۔

"ابا آپ کیسے باپ ہو۔ مجھے ان پڑھ عبداللہ کے حوالے کیوں کر رہے ہو۔ عادل پڑھا لکھا بھی ہے ہاتھ میں ہنر بھی ہے۔"

"تیری منگنی ہوچکی ہے۔ میں عبداللہ کے باپ کو زبان دے چکا ہوں۔"

"آپ اپنی زبان کے لیے میری زندگی کیوں برباد کر رہے ہیں۔"

"اب جو بھی ہو۔ عبداللہ سے تجھے شادی کرنی پڑے گی۔"

میں ابا سے تو کچھ نہ کہہ سکی تھی لیکن اماں سے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ اگر مجھے مجبور کیا گیا تو میں خودکشی کرلوں گی۔ یہ دھمکی کارگر ہوئی۔ ابا نے بھی سوچا ہوگا کہ بیٹی ہاتھ سے چلی جائے گی۔ انہوں نے بڑی ترکیب سے منگنی توڑ دی۔ ترکیب یہ نکالی کہ عبداللہ کی ماں سے کسی بات پر الجھ گئے۔ اس جھگڑے کو اتنا طول دیا کہ عبداللہ کی ماں نے خود ہی منگنی توڑ دی۔ عبداللہ کے باپ نے کہا بھی کہ عورتوں کے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ آپ سے تو میں نے وعدہ کیا تھا لیکن ابا نے کہہ دیا کہ میری بیٹی بیاہ کر تو اسی گھر میں جائے گی۔ جب ساس بہو میں بنے گی ہی نہیں تو میری بیٹی خوش کیا رہے گی۔ تمہاری بیوی میری عزت نہیں کرسکتی تو میری بیٹی کی عزت کیا کرے گی۔ انہوں نے عبداللہ سے بھی کہہ دیا کہ ہم تو تمہی سے شادی کرنا چاہتے تھے لیکن تمہاری ماں نہیں چاہتی۔ ماں بیٹے میں خوب جھگڑا ہوا عبداللہ نے ابا سے کہہ دیا کہ میری شادی شگفتہ سے نہ ہوسکی لیکن رشتے داری ختم نہیں ہوئی ہے۔ میں آپ لوگوں سے ملتا رہوں گا۔ ابا نے بھی کہہ دیا کہ بیٹا یہ تمہارا گھر ہے، تم آیا کرو۔

اس کے بعد میری شادی عادل سے ہوگئی۔ وہ مجھے بیاہ کر اپنے ماموں کے گھر لے گیا لیکن ایک ماہ بعد ہی میرے کہنے پر اس نے کرائے پر فلیٹ لے لیا۔

وہ جو کہتے ہیں دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں وہی میرے ساتھ ہوا تھا۔ میں تو وہی خواب آنکھوں میں لے کر آئی تھی جو ہر لڑکی کے خواب ہوتے ہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ شادی کے بعد خوب مزے ہوں گے۔ ہاتھ میں پیسے ہوں گے، خوب گھومنا پھرنا ہوگا لیکن ایک مہینے بعد ہی مجھے معلوم ہوگیا کہ عادل فطرتاً کام چور اور کاہل ہے۔ اسے نہ آگے بڑھنے کا شوق ہے نہ ترقی کرنے کا۔ آگے بڑھنا تو... درکنار، اس کے ہاتھ میں جو ہنر ہے وہ اسے بھی پوری طرح استعمال نہیں کر رہا ہے۔ جب جیب خالی ہو جاتی تو کوئی کام پکڑ لیتا۔ کچھ پیسے آ جاتے۔ وہ گھر میں پڑا رہتا۔ دو چار دن بعد دکان پر چلا جاتا ورنہ گھر ہی میں رہتا۔ اس کا فلسفہ بھی عجیب تھا۔ کہتا تھا اصل زندگی تو خوش رہنا ہے۔ آپس میں محبت ہو تو روکھی سوکھی کھا کر بھی خوش رہا جاسکتا ہے۔ میں جل کر پیٹ کی روٹی کا کہتی تو وہ ہنس کر جواب دیتا، اتنا تو کما ہی لیتا ہوں۔ میں اسے بہت کچھ کہہ جاتی تھی لیکن وہ ہنستا رہتا تھا۔ وہ مجھ سے محبت کرتا تھا اس لیے میں اس جھگڑے کو زیادہ نہیں پھیلاتی تھی۔ کہہ سن کر چپ ہو جاتی تھی۔ انہی دنوں مجھے معلوم ہوا کہ عبداللہ دبئی چلا گیا ہے۔ اب مجھے ایک اور راہ سوجھ گئی۔ اگر عادل بھی دبئی یا کہیں اور چلا جائے تو مجھے وہ سب کچھ مل سکتا ہے جو میں نے چاہا تھا۔ آخر ایک دن میں نے اس سے بات کر ہی لی۔

"عادل، آج کل لوگ دبئی بہت جا رہے ہیں۔ سنا ہے وہاں ہنر مندوں کی بہت کمائی ہے۔"

"ہوگی، مجھے کیا اور تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"تم کیوں کوشش نہیں کرتے۔"

"یہاں تمہیں کس چیز کی کمی ہے جو میں باہر چلا جاؤں۔ میری کمائی تو یہاں بھی اچھی خاصی ہے۔"

"وہاں جا کر اور زیادہ کما سکتے ہو۔"

"تم کیا چاہتی ہو۔ باہر چلا جاؤں؟"

"ہاں عادل، سال دو سال وہاں رہ آؤ گے تو

ہمارے دن پھر جائیں گے۔ میری فکر مت کرو میں ابا کے ساتھ رہ لوں گی۔"

"کمال ہے، تم بیوی ہو کر مجھے خود سے دور جانے کے لیے کہہ رہی ہو۔ یہی ہے تمہاری محبت۔"

"اس میں محبت کا سوال کہاں سے آ گیا۔ تم کیا ہمیشہ کے لیے جا رہے ہو۔"

"کیا خبر ہمیشہ کے لیے ہی تم سے جدا ہو جاؤں۔ کیا خبر پردیس میں مجھ پر کیا گزر جائے۔"

"کچھ نہیں گزرتی۔ بہت سے مرد باہر جاتے ہیں اور پھر واپس بھی آ جاتے ہیں۔"

"اچھا اب سو جاؤ، بہت دیکھ لیے خواب۔"

مجھے معلوم تھا اس جیسا کاہل آدمی کبھی باہر نہیں جائے گا۔ میں نے بھی زیادہ زور دینا مناسب نہ سمجھا البتہ میرے اس مطالبے کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ وہ باقاعدگی سے دکان پر جانے لگا۔ اس کی آمدنی بھی کچھ بڑھ گئی تھی۔ میرے شوق پورے ہونے لگے تھے۔ ایک دن معلوم ہوا میرا سابق منگیتر عبداللہ دبئی سے آیا ہوا ہے۔ وہ میرے لیے غیر تو تھا نہیں، رشتے دار تھا۔ اس دن میں اماں کے گھر گئی تو اتفاق سے وہ بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے اس کے سامنے جانا پڑا۔ اس کا رنگ صاف ہو گیا تھا۔ گلے میں سونے کی چین پڑی ہوئی تھی۔ انگلی میں انگوٹھی تھی۔ صاف لگتا تھا کہ دبئی سے آیا ہے۔ کپڑے بھی شاندار پہنے ہوئے تھا۔ وہ صرف ڈیڑھ سال بعد آیا تھا لیکن معلوم ہوا پرانے گھر کو گروا کر نیا مکان بنوا رہا ہے۔ میں دل ہی دل میں پچھتا رہی تھی کہ عبداللہ کا رشتہ ٹھکرا کر عادل سے شادی کیوں کر لی۔ اگر عبداللہ سے شادی ہو گئی ہوتی تو آج میں دبئی میں بیٹھی ہوتی۔

میں اماں کے گھر سے واپس آئی تو سخت مایوس تھی۔ عادل سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کی۔ اس کی عادت تھی کہ جب میں چپ ہوتی تھی تو وہ بھی چپ ہو جاتا تھا۔ اسے اس وقت کہیں جانا تھا۔ وہ مجھے بتائے بغیر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ مجھے یہ رویہ نہیں اپنانا چاہیے تھا۔ وہ جب رات کو گھر آیا تو میں نے زمین ہموار کرنے کے لیے بات چیت شروع کر دی۔ وہ خوش ہو گیا۔ رات میں جب ہم سونے کے لیے لیٹے تو میں نے عبداللہ کا ذکر چھیڑ دیا۔ میں یہ بتا دوں کہ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ عبداللہ سے میری منگنی ہوئی تھی۔ اسے بس یہ معلوم تھا کہ وہ ہمارا رشتے دار ہے۔

"عبداللہ دبئی سے آیا ہوا ہے۔"

"اچھا۔"

"آج میں اماں کے گھر گئی تو وہ بھی آیا ہوا تھا۔ کیا شاندار کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ اس کی تو حالت ہی بدل گئی ہے۔ سونے کی انگوٹھی انگلی میں، چین گلے میں۔ مجھے تو اس کے ہاتھ میں بندھی ہوئی گھڑی بھی سونے کی لگ رہی تھی۔ سنا ہے مکان بھی بنوا رہا ہے۔"

"کوئی غلط کام کر رہا ہوگا۔ ورنہ دبئی میں پیسے درختوں میں نہیں لگے ہوتے۔"

"آپ کو تو سب غلط کام کرتے ہوئے لگتے ہیں۔"

"صحیح کہہ رہا ہوں۔ کوئی ڈیڑھ سال میں اتنی دولت نہیں کما لیتا۔"

"میں کہتی ہوں آپ بھی دبئی چلے جائیں۔ کرائے کے مکان سے تو نجات ملے گی۔"

"میرے لیے یہاں کیا کام کم ہے جو دبئی چلا جاؤں۔"

"یہاں محنت کا صلہ ملتا کہاں ہے۔ زندگی بھر... کماتے رہیں تو بھی اسی مکان میں پڑے رہیں گے۔ آپ کہیں تو میں عبداللہ سے بات کروں۔ وہ آپ کے لیے کوئی نوکری ڈھونڈ دے گا۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں کسی کا احسان لینا نہیں چاہتا۔ مجھے جانا ہوگا تو خود چلا جاؤں گا۔"

وہ کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ میں نے بھی سوچا کہ اس وقت اتنا ہی کافی ہے۔ بار بار کہوں گی تو مان ہی جائے گا۔ میں بڑی دیر تک یہ خواب دیکھتی رہی تھی کہ عادل دبئی چلا گیا ہے۔ پھر آنکھوں میں نیند اتر آئی تھی۔

دو چار دن بعد میں نے عبداللہ کو کھانے پر اپنے گھر بلا لیا۔ مقصد یہی تھا کہ اس کی شان دیکھ کر ممکن ہے عادل کو بھی دبئی جانے کا شوق ہو۔

عادل کو برا لگا ہوگا لیکن اس نے اعتراض نہیں کیا۔ عبداللہ آیا تو میرے لیے نہایت اچھے کپڑے کا سوٹ پیس اور اعلیٰ درجے کا پرفیوم لے کر آیا۔ عادل کو گھڑی دی۔ ان تحفوں نے مجھے مزید مرعوب کر دیا۔

اب عادل میرے لیے بے وقعت ہو گیا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے اسے عبداللہ کی مثالیں دیا کرتی تھی اور تقاضے کرتی تھی کہ وہ دبئی چلا جائے لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

میں اپنی قسمت پر شاکر ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ پھر اللہ نے



مجھے ایک بیٹی سے نواز دیا۔ جی تو یہی چاہا کہ اس کا نام دبئی رکھ دوں لیکن یہ حماقت ہی تو ہوتی۔ عادل نے اس کا نام عادلہ رکھا۔

عادلہ کے پیدا ہونے کے بعد میرے پاس ہتھیار آ گیا تھا۔ میں اس کے مستقبل کے بھیانک نقشے کھینچتی تھی تاکہ عادل دبئی جانے پر تیار ہو جائے۔

یہ حربہ کارگر ہوا اور وہ نرم پڑنے لگا۔ میں نے مزید محنت کی تو وہ تیار ہو گیا۔ کسی کی معرفت اسے دبئی میں ملازمت مل گئی۔ ایک تعمیراتی کمپنی تھی جس کی آفر پر وہ دبئی جا رہا تھا۔ سوال یہ تھا کہ میں اکیلی کیسے رہوں گی۔ اس کا ایک ہی حل تھا۔ اس نے مجھے میری ماں کے گھر چھوڑا اور خود دبئی چلا گیا لیکن صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اپنی رضا سے نہیں میرے مجبور کرنے پر جا رہا ہے۔ میں نے عبداللہ کا پتا اسے دے دیا تھا کہ اس سے ملتا جلتا رہے۔

اس کے رخصت ہوتے ہی میں نے پروگرام بنانے شروع کر دیے کہ پہلی تنخواہ پر کیا کروں گی دوسری پر کیا کروں گی۔ ابا سے میں نے یہ تک کہہ دیا کہ وہ کسی اچھی جگہ زمین کی تلاش میں لگے رہیں۔ عادل جیسے ہی پیسے بھیجیں گے میں وہ زمین خرید لوں گی۔ مجھے یاد ہے ابا میری بات سن کر ہنسنے لگے تھے۔

"باؤلی ہو گئی ہے کیا۔ گاؤں بسا نہیں ڈاکو پہلے ہی آ گئے۔ وہ دبئی کمانے کے لیے گیا ہے۔ مہینے دو مہینے میں اتنا کما لے گا کہ زمین خرید لے؟"

"دبئی کی کمائی کا آپ کو اندازہ ہے؟"

"وہ وہاں اکیلا رہ رہا ہے۔ اس کے بھی خرچے ہوں گے۔ تمہیں کتنا بھیج دے گا۔"

"کتنا بھیجتا ہے آپ لوگ خود ہی دیکھ لیں گے۔"

ایک مہینا گزر گیا۔ عادل کا صرف ایک خط آیا تھا جس میں اس نے خیریت سے پہنچنے کا لکھا تھا۔ اس کے بعد نہ کوئی خط آیا نہ پیسے۔

اب تو میرے ہاتھوں کے طوطے اڑنے لگے۔ طرح طرح کے خیالات آنے لگے۔ میں نے اسے زبردستی بھیجا تھا۔ کہیں وہ مجھ سے انتقام تو نہیں لے رہا ہے۔ یہاں تھا تو کچھ نہ کچھ کما ہی رہا تھا۔ وہاں جا کر تو پیسے بھیجنا ہی بھول گیا۔ میں نے ایک غضب یہ کیا تھا کہ ایک جاننے والے سنار سے سونے کا سیٹ ادھار خرید کر لے آئی تھی کہ میرے میاں پیسے بھیجیں گے تو قیمت ادا کر دوں گی۔ اب وہ سنار بھی تقاضے کر رہا تھا۔

انہی دنوں اماں نے بتایا کہ عبداللہ آنے والا ہے۔ اس کی آمد کا سن کر کچھ ڈھارس بندھی کہ شاید اس سے کوئی بات معلوم ہو۔

عبداللہ جس دن اپنے گھر پہنچا اسی دن وہ مجھ سے ملنے آ گیا۔ عادل نے اس کے ہاتھ ایک خط اور سوٹ پیس بھیجا تھا۔

اس تحفے کو دیکھ کر میرا دل بجھ گیا۔ عادل تو سامنے تھا

نہیں میں عبداللہ پر برس پڑی۔

''تم یہ سوٹ پیس دیکھ رہے ہو؟ دبئی جا کر کوئی یہ بھیجتا ہے۔ تم نے اس سے کہا بھی نہیں کہ تم یہ کیا بھیج رہے ہو۔''

عبداللہ میری باتیں سنتا رہا۔ پھر اس نے بتایا۔ ''کمپنی کے حالات کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ تنخواہ دینے کے لائق نہیں رہی تھی، عادل بڑی مشکل سے گزارہ کر رہا تھا۔ ابھی تک تنخواہ نہیں ملی ہے۔ اگلے مہینے شاید مل جائے۔ پھر وہ بھیج سکے گا۔

میرا دل اب بھی عادل کی طرف سے صاف نہیں ہوا تھا۔ میں یہی سمجھ رہی تھی کہ وہ کاہل تو ہے ہی۔ چھٹیاں کر لیتا ہوگا۔ تنخواہ کہاں سے ملتی۔

عبداللہ ایک ہفتہ رہ کر چلا گیا۔ میں اس پر رشک کر رہی تھی کہ [illegible] جلدی جلدی چکر لگا لیتا ہے۔ کماتا ہی ہوگا۔

اگلے مہینے عادل کی طرف سے ڈرافٹ آیا لیکن صرف چار ہزار روپے کا۔ میں سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ [illegible] چار ہزار؟ میں نے عادل کو خط لکھا کہ یہ رقم میرے خرچ کے لیے ناکافی ہے، زیادہ بھیجو۔ اگلے مہینے اس نے پانچ ہزار کا ڈرافٹ بھیجا لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا کہ وہ اس سے زیادہ نہیں بھیج سکتا۔

میں نے اسے دبئی اس لیے تو نہیں بھیجا تھا کہ پانچ ہزار مجھے ملتے رہیں۔ میرے تو خواب ہی چکنا چور ہو گئے۔ اماں بھی مجھ پر برہم ہوئیں کہ پانچ ہزار کے لیے تو میاں سے الگ رہ رہی ہے۔ میں نے اس سے یہ مطلب نکالا کہ وہ مجھے کھلاتے کھلاتے تھک گئی ہیں اور اب یہ چاہتی ہیں کہ میں عادل کو واپس بلا لوں اور اس کے ساتھ رہوں۔ اماں کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا لیکن میں ان سے خوب لڑی اور بالآخر یہ سوچا کہ ان کا احسان کیوں لوں۔ میں اکیلی بھی تو رہ سکتی ہوں۔ دو مہینے مزید بہ مشکل اماں کے ساتھ گزارے اور کرائے کا مکان ڈھونڈنے لگی۔ اماں نے سنا تو بہت روئیں مجھے سمجھایا بھی۔

''اکیلے گھر میں تمہارا رہنا ٹھیک نہیں۔ دنیا باتیں بنائے گی۔''

''میں اکیلی نہیں ہوں میری بچی میرے ساتھ ہے اور پھر جب آپ لوگوں کو میرا وجود کھٹکتا ہے تو میں اکیلی بھلی۔''

ابا نے بھی مجھے روکنے کی کوشش کی لیکن میں لڑ بھڑ کر الگ ہو گئی۔ جہیز کا فرنیچر رکھا ہوا تھا میرے لیے کافی تھا۔ کچھ نئی چیزیں قسطوں پر لے لیں۔ عادل کو خط لکھ دیا کہ مجھے سات ہزار کا ڈرافٹ بھیجا کرے۔ اگر تنخواہ کم ہے تو کہیں پارٹ ٹائم کر لے۔ اگلے مہینے سات ہزار کا ڈرافٹ آ گیا۔ یہ رقم بھی میرے لیے کم تھی لیکن اس سے زیادہ کا کیا مطالبہ کرتی۔ دو مہینے بہ مشکل گزرے ہوں گے کہ عبداللہ ایک مرتبہ پھر آ گیا۔ اماں سے معلوم ہوا کہ میں الگ ہو گئی ہوں تو وہ مجھ سے ملنے چلا آیا۔

''عبداللہ تم اتنی جلدی جلدی کیسے آ جاتے ہو۔ عادل تو جب سے گیا ہے لوٹ کر آیا ہی نہیں۔''

''میرے کام کی نوعیت ایسی ہے کہ آنا پڑتا ہے۔''

''کیا کام ہے تمہارا؟''

''تم نہیں سمجھو گی۔ ویسے الگ ہو کر تم نے اچھا کیا۔ یہاں رہ کر کچھ جوڑ سکتی ہو۔''

''کیا خاک جوڑوں گی۔ وہ بھیجتے ہی کیا ہیں۔ اُن سے کہیں کوئی اور نوکری ڈھونڈیں۔''

''کہہ دوں گا۔ فی الحال تو تم یہ بتاؤ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔''

''مجھے کیا ضرورت ہوگی۔''

''یہ پانچ ہزار میری طرف سے رکھ لو۔ کبھی عادل زیادہ بھیجے تو مجھے لوٹا دینا۔''

میں نہیں لے رہی تھی لیکن اس نے زبردستی دے دیے۔ میں نے اس سے ہمدردی جتانے کے لیے یہ بھی پوچھ لیا۔

''اب تو تمہاری آمدنی بھی اچھی خاصی ہے تم شادی کیوں نہیں کر لیتے۔''

''عورت ذات سے میرا بھروسا اٹھ گیا ہے۔''

''ہماری منگنی ٹوٹی یہ ایک حادثہ تھا۔ اس میں میری بے وفائی کہاں سے نکل آئی۔''

''میں تمہیں تو نہیں کہہ رہا ہوں۔ ایک لڑکی نے مجھ سے بے وفائی کی ہے۔ وہ تم نہیں ہو۔''

''ضروری تو نہیں کہ ہر لڑکی اُس لڑکی کی طرح بے وفا ہو۔''

''سب کا حال یہی ہے مدیحہ۔''

''اس طرح تو تم مجھے بھی کہہ رہے ہو۔''

''تم شادی کر چکی ہو۔ اب لڑکی نہیں ہو۔''

''تم بھی شادی کر لو۔ شادی کے بعد وہ لڑکی لڑکی نہیں رہے گی۔''

''چھوڑو اِن باتوں کو۔ جب وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔''

میرے دل میں چور تھا۔ میں سمجھ رہی تھی کہ وہ مجھ ہی کو کہہ رہا ہوگا۔ پھر بھی میں نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اس نے بھی ظاہر نہیں کیا۔ وہ تقریباً روزانہ میرے پاس آتا رہا اور پندرہ دن بعد واپس دبئی چلا گیا۔

عادل کے خط برابر آ رہے تھے لیکن ان خطوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ وہاں رہتے رہتے اکتا گیا ہے اور پھر یہی ہوا۔ ایک دن اس کا خط آیا کہ وہ واپس آ رہا ہے۔ میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ خاندان والے سمجھ رہے تھے کہ میرا میاں دبئی گیا ہوا ہے۔ میری عزت بھی بہت ہونے لگی تھی اور اب وہ واپس آ رہا تھا۔ میں اتنے غصے میں تھی کہ اسے لینے ائیرپورٹ بھی نہیں گئی۔ وہ خود ہی میرے نئے مکان کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے چلا آیا۔ اسے میں نے اپنے سامنے دیکھا تو پہچان بھی نہیں سکی سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ ایک مرتبہ مجھے پھر عبداللہ کی یاد آئی۔ وہ دبئی جا کر کیسا صحت مند ہو گیا تھا۔ عادل کو کیا ہوا۔ نہ سونے کی چین گلے میں نہ ہاتھ میں انگوٹھی۔

''مدیحہ، جدائی کے دن ختم ہوئے۔ اب میں ہمیشہ کے لیے آ گیا ہوں۔''

''کیا کہا، تم نوکری چھوڑ کر آئے ہو؟''

''ہاں مدیحہ، اپنا وطن اپنا ہی ہوتا ہے۔ دیکھ رہی ہو میں کتنا کمزور ہو گیا ہوں۔''

''دیکھ رہی ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے دبئی سے نہیں جیل سے آئے ہو۔''

''ناراض مت ہو۔ میں نے نوکری چھوڑی نہیں ہے لیکن یہ سوچ کر ضرور آیا ہوں کہ یہاں چھوٹی سی دکان کر لوں گا۔ اگر چل پڑی تو واپس نہیں جاؤں گا۔''

''کتنا لے آئے ہو۔ عبداللہ کو دیکھو کیا ٹھاٹ ہیں اُس کے۔''

''تمہیں نہیں معلوم، وہ دو نمبر کا کام کرتا ہے۔ غیر قانونی۔''

''محنت تم سے ہوتی نہیں اور سب دو نمبری لگتے ہیں۔''

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔ وہاں رہ کر دیکھ آیا ہوں۔''

''کوئی بھی کام کر رہا ہے، دولت تو کما رہا ہے۔''

''تمہارا کیا مطلب ہے میں بھی غیر قانونی کام شروع کر دوں۔''

''تم سے وہ بھی نہیں ہوگا۔ میری تو قسمت ہی پھوٹ گئی۔''

میں نے آتے ہی اس سے لڑنا شروع کر دیا تھا۔ وہ ایک سال بعد آیا تھا اور میں چاہتی تھی ایک لمحہ گزارے بغیر واپس چلا جائے۔ میں اسے خوش رکھ کر اس کی حوصلہ افزائی کرنا نہیں چاہتی تھی لہٰذا گھر کا ماحول ایسا بنا دیا تھا کہ وہ جلد سے جلد یہاں سے بھاگنے کی کوشش کرے۔ میں نے اس سے صاف کہہ دیا کہ جب تک میرا ذاتی فلیٹ نہ ہو جائے اور میں اسے ڈیکوریٹ نہ کر لوں وہ دبئی جا کر واپس نہ آئے۔

''میں تمہارے خواب ضرور پورے کروں گا چاہے مجھے اس کے لیے کچھ بھی کرنا پڑے۔'' اس نے مجھ سے وعدہ کیا اور دبئی واپس چلا گیا۔

اس نے واقعی اپنا وعدہ پورا کیا۔ دو مہینے بعد اس نے دس ہزار کا ڈرافٹ بھیج دیا۔ اتنی رقم اس نے کبھی نہیں بھیجی تھی۔ اس سے اگلے مہینے پندرہ ہزار کا ڈرافٹ بھیجا۔ پھر بیس ہزار کا ڈرافٹ آیا۔ اب میرا سر فخر سے بلند ہو گیا تھا۔ میں عبداللہ کے سامنے تن کر بیٹھ سکتی تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس کی طرف سے ڈرافٹ آ رہے..... مگر وہ مجھے خط نہیں لکھ رہا تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ مجھ سے ناراض ہے۔ انہی دنوں عبداللہ آیا تو اس سے بھی صرف یہ معلوم ہو سکا کہ عادل نے اپنی ملازمت بدل لی ہے۔ اب عبداللہ کو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں رہ رہا ہے اور کیا کر رہا ہے۔

میں عادل کی طرف سے فکرمند ضرور تھی لیکن رقم مجھے برابر مل رہی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ خیریت سے ہے۔ میں نے فلیٹ کی بکنگ کرا لی۔ دو سال بعد یہ فلیٹ میری ملکیت ہو گیا۔ میں نے اسے شاندار فرنیچر سے آراستہ کیا۔ اب مجھے عادل کی یاد آنے لگی تھی۔ عادلہ بھی بڑی

ہورہی تھی۔ عادل پر رحم آنے لگا تھا کہ وہ میری خاطر کتنی محنت کررہا ہے۔ میں نے اسے خط لکھا کہ وہ واپس آجائے۔ کئی خطوں کے بعد اس کا جواب آیا کہ کچھ اور کمالوں پھر ہمیشہ کے لیے آجاؤں گا۔ اس بات کو بھی چھ مہینے گزر گئے۔ اس دوران اس کا کوئی خط بھی نہیں آیا۔ پھر ایک خط آیا کہ میں اسے خط نہ لکھوں وہ خود لکھے گا۔ اس نے اپنا پتا بھی نہیں لکھا تھا۔

میں نئے فلیٹ میں منتقل ہوگئی تھی لیکن درودیوار کو دیکھ کر رونا آتا تھا۔ میں یہاں آرام سے ہوں اور وہ میری صورت کو بھی ترس گیا ہے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ عبداللہ ایک مرتبہ پھر آگیا۔ مجھ سے ملنے آیا تو میں نے اس سے عادل کی خیریت معلوم کی۔ میں دیکھ رہی تھی کہ وہ کچھ گھبرا سا گیا تھا۔ اس نے صرف اتنا بتایا کہ ملاقات تو نہیں ہوئی لیکن ایک دوست کی معرفت خیریت معلوم ہوگئی تھی۔ وہ خیریت سے ہے۔

اس کی باتوں سے مجھے ذرا بھی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ صاف ظاہر ہورہا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ چھپا رہا ہے۔ اس دن کے بعد سے وہ میرے پاس آیا بھی نہیں جبکہ روز آتا تھا۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ وہ واپس جارہا ہے۔ میں خود اس سے ملنے گئی۔

"تم اب واپس جارہے ہو۔ اس سے کہنا مجھے خط لکھے۔ میں بہت پریشان ہوں۔"

اس نے مجھ سے وعدہ کیا اور دبئی چلا گیا۔

اس کو گئے ہوئے ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ معلوم ہوا وہ آیا ہوا ہے۔ میں بے قراری میں اس کے گھر کی طرف جانے ہی والی تھی کہ اماں اور ابو آگئے۔ ان کے چہرے بجھے ہوئے تھے اور آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ اماں نے آتے ہی مجھے گلے سے لگالیا اور زاروقطار رونا شروع کردیا۔ میں حیران تھی کہ ہوا کیا ہے۔

"اماں، کیا بات ہے۔ مجھے تو بتائیں ہوا کیا ہے۔ ابو آپ ہی کچھ بتائیں۔"

"بیٹا، اتنا بڑا دل کہاں سے لاؤں کہ تجھے کچھ بتاسکوں۔"

"میں نے بہت صدمے اٹھائے ہیں یہ صدمہ بھی اٹھالوں گی۔ آپ بتائیں تو۔"

وہ میری طرف سے منہ پھیر کر کھڑے ہوگئے۔ "عادل کا دبئی میں ایکسی ڈنٹ ہوا ہے۔"

"وہ خیریت سے تو ہیں؟"

"لاش اتنی مسخ ہوچکی تھی کہ اسے وہیں دفنادیا گیا۔"

"کون لایا ہے یہ منحوس خبر؟"

"عبداللہ نے بتایا ہے۔"

"جھوٹ بولتا ہے وہ۔ میں نے اس سے منگنی توڑلی تھی۔ وہ مجھ سے انتقام لے رہا ہے۔ اس نے خود اسے مارا ہوگا اور اب خبر دینے پہنچ گیا۔"

میرے منہ میں جو کچھ آیا کہتی چلی گئی اور پھر بے ہوش ہوگئی۔

ہوش میں آئی تو تفصیلات کا مجھے علم ہوا۔ اب نہ تو عبداللہ پر الزام دھرسکتی تھی اور نہ اسے جھٹلاسکتی تھی۔ میں عادلہ کو گلے سے لگاکر خوب روئی لیکن صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

اماں مجھے اپنے گھر لے آئیں جہاں میں نے عدت کے دن کاٹے۔ عبداللہ نوکری چھوڑ کر آگیا تھا۔ اسے اب یہیں رہنا تھا۔ میری عدت کے دوران وہ برابر میری خیریت دریافت کرنے کے لیے آتا رہتا تھا۔ میں اس کے سامنے نہیں آسکتی تھی۔ وہ اماں کے پاس بیٹھ کر چلا جاتا تھا۔

ان چار مہینوں میں اس نے اماں کے دل میں گھر کرلیا تھا چنانچہ عدت ختم ہوتے ہی اماں نے مجھ سے ذکر کیا کہ میں عبداللہ سے شادی کرلوں۔

"اپنی طرف سے کہتے کیا اچھا لگتا ہے۔"

"غرض ہماری ہے کہنے میں کیا حرج ہے۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ وہ خود بھی یہی چاہتا ہے، کہہ نہیں پارہا ہے۔"

"اماں مجھے سہارے کی ضرورت ہے لیکن وہ مانے گا نہیں۔"

"میں کہہ کر دیکھتی ہوں۔"

"آپ نہ کہیں، میں خود بات کروں گی۔" میں نے کہا۔

میں نے عبداللہ سے بات کی۔

"عادل کے بعد مجھ سہارے کی ضرورت ہے۔ ماں میرا ہاتھ کہیں نہ کہیں پکڑادیں گی۔ میں چاہتی ہوں تم مجھ سے شادی کرلو۔"

"مجھ سے اس امتحان کی توقع مت رکھو۔ عورت ذات سے میرا بھروسا ہی اٹھ چکا ہے۔ اب میں کہیں شادی نہیں کروں گا۔"

"کیا تم مجھے بے وفا سمجھتے ہو۔"

"تم ایک بے وفائی پہلے کرچکی ہو۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں لیکن شادی نہیں کرسکتا۔ شادی کے بعد اگر تم نے



بے وفائی کی تو میں کہیں کا نہیں رہوں گا۔ پھر تو میں تم سے محبت بھی نہیں کرسکوں گا۔"

"عبداللہ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ تمہیں کبھی نہیں چھوڑوں گی۔ تمہارا یہ وہم مٹادوں گی کہ عورت بے وفا ہوتی ہے۔"

کئی روز کی محنت کے بعد میں نے اسے شادی پر رضا مند کرلیا۔

عبداللہ سے میری شادی ہوگئی۔

اس نے مجھے اتنا خوش رکھا کہ میں عادل کا دکھ بھول گئی۔ مجھے یاد بھی نہیں رہا کہ عادل سے میری کبھی شادی ہوئی تھی۔ میں نے بھی اسے کوئی ایسا موقع نہیں دیا کہ وہ مجھے بے وفائی کا طعنہ دے۔ میں اس کا یہ خیال غلط ثابت کردینا چاہتی تھی کہ عورت بے وفا ہوتی ہے۔ دیوتا کی طرح اس کی پوجا کررہی تھی۔

شادی کو دو سال ہوگئے۔ میری بیٹی عادلہ اسکول جانے لگی تھی۔ ایک بیٹی اللہ نے مجھے اور دی۔ اس کا نام میں نے ستارہ رکھا۔ یہ واقعی میری قسمت کا ستارہ تھی۔

اس کے بعد اللہ نے مجھے کوئی اولاد نہیں دی۔ یہاں تک کہ ستارہ چار سال کی ہوگئی۔ اسے بھی اسکول میں داخل کرادیا۔ عبداللہ دونوں بیٹیوں پر جان چھڑکتے تھے۔ بہت کم باپ ایسے ہوں گے جو بیٹیوں کو اتنا چاہتے ہوں۔ مجھ سے بھی بے انتہا خوش تھے۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ مدیحہ تم نے میرے اس فلسفے کو غلط ثابت کردیا کہ عورت ذات بے وفا ہوتی ہے۔

ایک مرتبہ پھر مجھے کسی کی نظر لگ گئی۔ دونوں بچیاں اسکول گئی ہوئی تھیں۔ عبداللہ اپنے جنرل اسٹور پر تھے دبئی سے آنے کے بعد انہوں نے جنرل اسٹور کھول لیا تھا۔ میں گھر پر اکیلی تھی کہ اماں گھبرائی ہوئی آئیں۔ وہ اتنی گھبرائی ہوئی تھیں کہ منہ سے الفاظ ادا نہیں ہورہے تھے۔ میں نے انہیں بٹھایا۔ پانی کا گلاس لاکر دیا۔ جب ان کے کچھ ہوش ٹھکانے آئے تو انہوں نے عجیب وغریب خبر سنائی۔

"غضب ہوگیا مدیحہ۔"

"کیا ہوا اماں!"

"کیا بتاؤں کیا نہیں ہوگیا۔"

"اماں تم تو مجھے ہولائے دے رہی ہو۔ معلوم تو ہو کہ ہوا کیا ہے؟"

"عادل زندہ ہے۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ اس کو مرے تو سات آٹھ سال ہوگئے۔ کیا مجھے یاد نہیں۔"

"کم بخت، وہ زندہ ہے۔ کسی نے جھوٹی خبر دی تھی۔ میں خود اسے گھر پر بٹھا کر آئی ہوں۔"

"تم نے کچھ بتایا تو نہیں؟"

"میں نے کچھ نہیں بتایا لیکن میری بچی اب کیا ہوگا۔"

"کچھ نہیں ہوگا۔ میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ ابھی اسے مت بتانا کہ میں نے شادی کرلی ہے۔ اس سے معلوم تو کروں وہ تھا کہاں اور اس کے مرنے کی خبر کس نے مشہور کی تھی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے عبداللہ نے مجھ سے شادی کرنے کے لیے یہ سب کہانی گھڑی ہو۔

"میں اسی وقت اماں کے ساتھ ان کے گھر آگئی۔ یہ میری نظروں کا دھوکا نہیں تھا۔ وہ میرے سامنے بیٹھا تھا۔

اسے دیکھتے ہی میرے جذبات بے قابو ہو گئے۔ میں کسی اور کی ہو چکی تھی لیکن میں اس سے لپٹ کر خوب روئی۔

"تم کہاں چلے گئے تھے عادل۔ مجھ سے اتنے خفا تھے کہ اپنی موت کی خبر بھی اُڑا دی۔"

"یہ خبر میں نے نہیں میری قسمت نے اُڑائی تھی۔ تمہیں مجھ سے جدا کرنے کے لیے۔"

"تو کیا......"

"ہاں، خبر صحیح تھی لیکن میں زندہ تھا۔ میں نے عبداللہ کے کہنے پر جرائم پیشہ لوگوں کی ملازمت کر لی تھی۔ دراصل کوئی میرے بارے میں پولیس کو مسلسل خبریں دے رہا تھا۔ میں اِدھر اُدھر چھپتا پھر رہا تھا کیونکہ پولیس کے علاوہ کچھ غنڈے بھی میرے پیچھے لگ گئے تھے جو مجھے قتل کر دینا چاہتے تھے۔ شاید کسی دوسرے گروہ کے لوگ، مجھے ان سے ہی زیادہ خطرہ تھا اس لیے میں مسلسل بھاگ رہا تھا اور وقت گزرتا رہا پھر میں مصر چلا گیا۔ وہاں سے سیدھے آنا ممکن نہیں تھا اس لیے اتنے سال لگ گئے۔ اب آ گیا ہوں اس عہد کے ساتھ کہ پھر واپس نہیں جاؤں گا۔"

میں دیوانوں کی طرح اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ مجرم تھا لیکن میری خاطر مجرم بنا تھا۔ اس نے میری خاطر جرم کیے تھے۔ سزا مجھے ملنی چاہیے تھی لیکن سزا اسے ملنے والی تھی۔ جب اسے یہ معلوم ہوتا کہ میں نے شادی کر لی ہے تو اس پر کیا گزر جاتی۔ وہ میرے لیے غیر ہو گیا تھا لیکن میں اسے کیسے بتاتی۔ بس روئے جا رہی تھی۔ وہ بھی سمجھ رہا ہوگا کہ میں اس کی بپتا سن کر رو رہی ہوں۔

ابا میرے اشارے پر اسے اٹھا کر دوسرے کمرے میں لے گئے۔ میں اپنے فلیٹ پر آ گئی۔ دونوں بچیاں اسکول سے آ گئی تھیں۔ انہیں لے کر اماں کے گھر آ گئی۔

اتنی دیر میں ابا نے عادل کو حقیقت بتا دی تھی۔ اسے سمجھانے کی کوشش بھی کی تھی کہ وہ مدیحہ کے راستے سے ہٹ جائے۔ اس نے نکاح پر نکاح نہیں کیا ہے بلکہ تمہاری موت کا یقین ہونے کے بعد عبداللہ سے شادی کر لی ہے۔ بات معقول تھی لیکن عادل مجھے چھوڑنے کے لیے قطعی تیار نہیں تھا۔ اب ایک ہی صورت تھی کہ عبداللہ کو تیار کیا جائے کہ وہ مجھے چھوڑ دے۔ ابا اس کی دکان پر گئے۔ وہ تو مارنے مرنے پر تیار ہو گیا۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ ہرگز طلاق نہیں دے گا بلکہ عدالت میں جائے گا۔ وہ گھر بھی آیا اور زبردستی مجھے فلیٹ پر لے جانے کی کوشش کی۔ عادل موجود تھا لہٰذا دونوں الجھ پڑے۔ لڑائی کا شور سن کر محلے کے لوگ گھر میں گھس آئے۔ بڑی مشکل سے بیچ بچاؤ کرایا گیا۔ محلے والوں پر حقیقت ظاہر ہوئی تو طے ہوا مسجد کے مولوی سے فتویٰ لیا جائے۔ مولوی صاحب نے فرمایا۔

"ایسی حالت میں لڑکی نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ یہ لڑکی پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ اپنے سابق شوہر کا انتخاب کرتی ہے یا موجودہ شوہر کے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔"

اس تجویز پر دونوں نے اتفاق کیا۔ عبداللہ کے ساتھ جو خوشگوار زندگی میں نے گزاری تھی اس کے باعث اسے یقین تھا کہ میں اس کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کروں گی۔ یہی یقین عادل کو بھی ہوگا۔

ابا نے سوچنے کے لیے مجھے ایک ہفتے کا وقت دیا۔ میں اپنے فلیٹ میں اکیلی بند ہو گئی۔ مجھے فیصلہ کرنا تھا ایسا فیصلہ جو کسی کے مشورے کا پابند نہیں تھا۔ میری عجیب حالت تھی۔ کبھی عبداللہ کی مہربانیاں یاد آتی تھیں کبھی عادل کی قربانیاں۔ کبھی میرا دل عبداللہ کے حق میں بول پڑتا تھا کبھی عادل کے حق میں فیصلہ دیتا تھا۔ ایک ہفتہ گزر گیا اور میں کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکی۔ ابا مجھے لینے آ گئے۔ اماں کے گھر میں تمام لوگ موجود تھے مسجد کے مولوی صاحب بھی۔ عادل اور عبداللہ بھی۔ مجھے ایک پردے کے پیچھے بٹھا دیا گیا۔ میں ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر پائی تھی۔

مولوی صاحب کی آواز گونجی۔ "بیٹی مدیحہ! عبداللہ اور عادل میں سے تمہارا فیصلہ کس کے حق میں ہے۔ کس کے ساتھ رہنا چاہتی ہو۔"

میں نے ایک مرتبہ پھر سوچا اور میری آواز گونجی "میں اپنے سابق شوہر عادل کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔"

میں نے باریک پردے سے دیکھا۔ فیصلہ سنتے ہی عبداللہ اپنی جگہ سے اٹھ کر چلا گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نے غلط فیصلہ کر دیا ہو اور پھر میری آنکھیں بند ہو گئیں۔

ایک ہفتے بعد عبداللہ نے کسی کے ہاتھ ایک پرچہ اور طلاق نامہ مجھے بھیجا۔

"میں نے کہا تھا، عورت ذات پر مجھے بھروسا نہیں۔ دیکھا تم نے بھی بے وفائی کی۔ میں اپنی بیٹی تم سے لے سکتا تھا لیکن کیوں لیتا وہ بھی تو عورت ہے۔ بے وفائی تو اس کی سرشت میں بھی ہوگی۔"

کیا وہ سچا تھا؟ کیا میں نے واقعی بے وفائی کی؟